جنوری 2012
جلد 34 شمارہ 10
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ
کرن
37- اردو بازار کراچی

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک
پاکستان ---- 600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ---- 6000 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔
پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: khawateendigest@hotmail.com , info@khawateendigest.com

مدیرہ

اداریہ

جنوری کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
2011ء کا سورج غروب ہوگیا۔ طلوع ہونے والا سورج بہت سی امیدوں، آرزوؤں کا پیغام لے کر آیا ہے۔ ایک نئے عزم کے ساتھ کہ آگے بڑھیں۔ منزل کا تعین کریں اور پھر قدم آگے بڑھائیں۔ صرف گزرے دنوں کا شمار اور آنے والے دنوں کا انتظار مقصد حیات نہیں۔ وقت کی قدر کریں۔ جہاں ہیں جو کام کر رہے ہیں سنجیدگی اور خلوص نیت سے انجام دیں۔ کل یہی چھوٹے چھوٹے کام بڑے کاموں کا آغاز بن جاتے ہیں۔ ضرورت صرف مثبت فکر اور سوچوں کی صحیح سمت کے تعین کی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ موجودہ سال ہم سب کے لیے خوشیاں لے کر آئے۔ (آمین)
قارئین کرام کو سال نو مبارک۔

بیادِ ابن انشاء

اردو شاعری اور مزاح کی تاریخ انشاجی کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔ انشاجی کی شاعری میں آہوں کا دھواں اور درد کی گھلاوٹ ہے تو نثر پڑھنے والا بے ساختہ اپنی ہنسی نہیں روک پاتا۔ جوگ بجوگ کی کہانیاں کہتا چاند نگر کا یہ جوگی گو کہ ہمارے درمیان نہیں مگر وہ اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں آج بھی زندہ ہے۔
11 جنوری کو ان کی برسی کے موقع پر قارئین سے ان کے لیے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- بیادِ ابن انشا
- سال نو کے موقع پر مشہور شخصیات سے دلچسپ سوال و جواب،
- اداکارہ نیہا سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکارہ کرن رو کے بھاڑے کے ساتھ،
- مصنفہ مہوش افتخار اپنے بارے میں کیا کہتی ہیں
- نبیلہ عزیز کا سلسلے وار ناول،
- نایاب جیلانی، منو بار یہ ساحر اور عائشہ نصیر کے طویل مکمل ناول،
- روداد قفس کے سلسلے کی نئی کہانی سنبل جبیں کے قلم سے،
- رمشا خالد، رشک جبیں اور عفیفہ محمد بیگ کے دلچسپ ناولٹ،
- صائمہ احمد، عظمی سید افتخار اور عشنا کوثر سردار کے افسانے،
- اور مستقل سلسلے،

تحفت،

کرن کتاب "آپ اور آپ کے ستارے" کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مفت پیش خدمت ہے۔ استفادہ کریں۔

حمد باری تعالیٰ

اقبال عظیم

تیری مدحت اور میں معذور و سرتاپا قصور
میں کہاں سے لاؤں اتنا حوصلہ، اتنا شعور

صرف تیرے آسرے پر لب کشا ہوتا ہوں میں
اس سعادت کی مجھے توفیق دے ربِ غفور

غنچہ و گل آئینہ تیرے جمالِ قدس کا
ماہ و انجم سے عیاں تیری تجلی تیرا نور

ہے رواں تیرے اشارے پر نظامِ کائنات
گردشِ افلاک بھی سجدہ کناں تیرے حضور

ذرہ ذرہ خاک کا تیری عظمت کا نقیب
بوٹا بوٹا گلستاں کا تیری قدرت کا ظہور

سرخرو ہیں تیری رحمت سے ترے سجدہ گزار
سرنگوں ہے تیرے آگے کفر و باطل کا غرور

مل چکا اقبال کو سب کچھ تری سرکار سے
بخش دے اس کی خطائیں بھی مرے ربِ غفور

نعت رسول مقبول

سراج المنیر تسنیم

زباں پر محمدؐ کا نام میرے اللہ
درودوں کا لطف کلام میرے اللہ

روضۂ پاک خیرالانعام میرے اللہ
کس قدر ہے ادب کا مقام میرے اللہ

قرینہ سکھایا ہے جینے کا ہم کو
شریعت بھی کیا ہے نظام میرے اللہ

آسمان و زمین، چاند، سورج، تارے
سبھی بھیجتے ہیں سلام میرے اللہ

دل ہے مسرور یادِ محمدؐ میں لیسے !
جیسے تسنیم و کوثر کا جام میرے اللہ

سامنے مصطفےٰ کے حقیقت کیا ان کی
پھول ہوں یا کہ ماہِ تمام میرے اللہ

دعائیں قبول ہوگئیں تیری تسنیم
مدینے سے آیا پیام میرے اللہ

گیتوں کا بنجارہ

بشریٰ رحمٰن

نادرہ خاتون سے میری دوستی بہت بعد میں ہوئی۔ انشاجی کے شعروں نے میرے احساس کو بہت پہلے جگایا۔

بہت پہلے کی بات ہے اتنی دور کی کہ اب مجھے اچھی طرح یاد بھی نہیں کہ میں اسکول میں پڑھتی تھی تو کون سی کلاس میں؟ جب انشاجی کی ایک نظم میری نظر سے گزری اس عمر میں اس تعلیم کے ساتھ نقوش جیسے رسالے چھوٹی لڑکیوں کے ہاتھوں میں بہت وزنی اور بدزیب نظر آیا کرتے تھے۔ اور چونکہ میری طبع بچپن ہی سے شعروں کی طرف مائل تھی۔ اس لیے میں بڑے بڑے ادبی رسالے بڑوں سے مانگ کر گود میں رکھ لیا کرتی۔ اور پیارے پیارے شعر نقل کرلیا کرتی۔

انہی دنوں انشاجی کی یہ نظم نقوش میں پڑھی۔

یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں
یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشا جی کا نام نہ لو
کیا انشا جی سودائی ہیں

مجھے نہیں معلوم کیوں، مگر اس نظم کے اشعار کے ساتھ انشاجی کا نام بھی میرے ذہن میں رہ گیا۔

تب میں انشاجی کو کوئی عمر بھاری بھر کم اور باریش قسم کا بزرگ سمجھتی تھی۔ یا شاید یہ میری عمر کا تقاضا تھا کہ ہر شاعر ادیب ایک اونچی مسند پر نظر آتا تھا۔ پھر عمر کے ساتھ بہت سے شاعروں، ادیبوں کو پڑھا، پسند کیا، سمجھا، جانا! کچھ سے ہم آگے نکل گئے اور کچھ ہمیں پیچھے چھوڑ گئے۔ لیکن انشاجی کا ہمیشہ وہی مقام رہا۔

میں نے بعد میں سوچا کہ انشاجی کے اشعار کی پسندیدگی کی وجہ کیا ہے؟

ان کے اشعار کی سچائی، الفاظ کی سچائی، جذبے کی سچائی، وہی بات کہتے ہیں جو سب کو سمجھ آتی ہے اور سب کے لیے ہوتی ہے یا سب کے دل میں ہوتی ہے۔

وہ کوئی نئی بات کسی عجیب ڈھنگ سے نہیں کہتے یا کسی نئی بات کو گھسے پٹے انداز میں نہیں کہتے، ان کا ہر شعر ایک اعزاز ہے۔ سچائی کا اعتراف، اس لیے وہ ہر دل میں اتر جاتا ہے۔

میں شاعر نہیں، نقاد نہیں، اور نہ میزان کے اصولوں سے واقف ہوں۔ میں نے اپنے اندازے کے مطابق اچھے شعر کی ایک پہچان رکھ چھوڑی ہے۔ اچھا شعر ایک ایسا احساس ہے، جو شاعر کے دل سے اٹھتا ہے اور آپ کے دل سے جا ٹکراتا ہے۔ جب تک شعر دل سے نہ ٹکرائے وہ احساس کو جھنجوڑتا نہیں۔ اور جب احساس کو چھو لیتا ہے تو ہمیشہ کے لیے آپ کے ذہن میں بسیرا کرلیتا ہے۔

اچھا شعر ایک بار پڑھنے یا سننے سے ہمیشہ کے لیے یاد رہ جاتا ہے۔ اور مجھے آج بھی انشاجی کے کئی شعر یاد ہیں۔

سیدھے، سچے، سندر! ایک دم سے سامنے آتے ہیں۔ بے یار سندری کی طرح۔ پہلی چھب میں دل میں اتر جاتے ہیں۔

یا۔ بالکل ایسے جیسے آپ چمن میں چہل قدمی کررہے ہوں۔ تو آپ کو محسوس ہو پیچھے سے کوئی آپ کا دامن کھینچ رہا ہے، تنبیہ کررہے ہیں تو وہاں کوئی پیارا

سامن موہنا سا بچہ ہو، آنکھوں میں شرارت، ہونٹوں پر مسکراہٹ، چہرے پر زندگی کی سرخی۔

تب جھنجلاہٹ پیار میں بدل جاتی ہے۔

انشاجی کے شعر کبھی ایک معصوم بچے کی صورت، کبھی ایک بنجارے کی پکار، کبھی ایک سوداگر کا روپ، کبھی بھکاری کی آس، کبھی آشاؤں کی نراس، خود ہی سنتا خود ہی روتا۔

اور پھر اپنے ہی آنسوؤں کا مذاق اڑاتا۔

نہ زندگی سے بہت شاکی، نہ دوستوں سے بہت نالاں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے، ایک بنجارہ چمٹا بجاتا چلا آرہا ہے، گلی گلی گھومتا ہر دروازے پر دستک دیتا ہے دروازہ کھلتا ہے تو وہ کچھ مانگتا نہیں، اگلے دروازے پر چلا جاتا ہے، وہ مانگنے نہیں آیا، وہ تو ایک پیغام دینے آیا ہے، دروازہ کھلا رکھنا، انتظار کا پیغام، آس کا پیغام، کل کا پیغام۔

نگری نگری گھوم رہے ہیں، سکھیوں اچھا موقع ہے روپ سروپ کی بھکشا دیدو ہم اک پھیلا دامن ہیں

☼ ☼ ☼

آوارہ و سرگرداں، کفنی بہ گلو پہچان
داماں بھی دریدہ ہے گدڑی بھی سنبھالی ہے

☼ ☼ ☼

ہم ایسے سختی کی نظر ہم ہیں فقیر رہ گزر
رستہ کبھی روکا تیرا دامن کبھی تھاما تیرا

☼ ☼ ☼

شاعر ہے کہ عاشق ہے جوگی ہے کہ آوارہ

نہ ان کی گدڑی میں تانبا تا مانگے لائیں

پریم کا کاسہ روپ کی بھکشا گیت غزل دوہے کوتائیں
دل اک کٹیا دشت کنارے

☼ ☼ ☼

لیکن یہ جوگی دل والا
لے کوری کنگال نہیں ہے

☼ ☼ ☼

انہوں نے اپنے شعروں میں ہندی اور سنسکرت الفاظ کا خوب صورتی سے استعمال کیا ہے۔ اور ایسی جگہ یہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ جہاں ان کے معانی اہم اور حسن دوبالا ہو گیا ہے اس روش نے ان کی شاعری کو ایک انفرادیت بخشی۔

دل پیت کی آگ میں جلتا ہے
ہاں جلتا رہے اسے جلنے دو
اس آگ سے لوگو دور رہو
ٹھنڈی نہ کرو پنکھا نہ جھلو
ہم رات دن یوں ہی سلگتے رہیں
کوئی پوچھے کہ ہم کو نا پوچھے
کوئی ساجن ہو کہ دشمن ہو
تم ذکر کسی کا مت چھیڑو
سب جان کے سپنے دیکھتے ہیں
سب جان کے دھوکے کھاتے ہیں
دیوانے سادہ ہی سہی!
اتنے بھی سادہ نہیں یارو!
کس میٹھی تپش کے مالک ہیں
ٹھٹھری ہوئی آگ کے انگیارے
تم نے تو کبھی سینکا ہی نہیں
کیا سمجھو تم کیا جانو

☼ ☼ ☼

چونکہ انہوں نے جوگیوں، قلندروں والا انداز اختیار کیا' اس لیے ان کی شاعری میں عجز اور انکساری ہے۔ انکساری عشق کی ریت بھی ہے۔ مگر یہ انکساری' دنیا' دنیاداری اور جاہ و حشم سے دور لے جاتی ہے۔ وہ تو خود دل کی دولت سے مالا مال ہیں۔ اور دل کا کشکول میں مانگتے ہیں اور جب نہیں ملتا تو اداس ہو جاتے ہیں۔
تم نے عجیب روگ ہے جی کو لگایا
تم نے ہماری بات نہ مانی اداس ہو

☼ ☼ ☼

دیدہ و دل نے تو دردی!

اپنے پات بھی کی تو کس سے کی
وہ تو درد کا بانی ٹھیرا
وہ کیا درد بٹائے گا

☼ ☼ ☼

جی بہلتا ہی نہیں اب کوئی ساعت کوئی پل
رات ڈھلتی ہی نہیں چار سے پہلے
ہم کسی در پہ نہ ٹھٹکے نہ کہیں دستک دی
سینکڑوں در تھے میری جاں تیرے در سے پہلے

☼ ☼ ☼

اپنی تقدیر سنواری نہ لوگوں کے کام آئے
پھر بھی ہم پہ ایک جہاں کے آنے تھے الزام آئے
اب تک تو دیوانوں میں سب سے اوپر اپنا نام آئے

☼ ☼ ☼

اب سے وارث طبیعت پہ بھی قدغن ہوگی
اب خیالوں پہ بھی پہرہ سا رہے گا کچھ روز
بیٹھ جانے دیں بگولوں کی مچلتی ہوئی گرد
سونی راہوں میں دھندلکا سا رہے گا کچھ روز
قافلے تازہ سیاحت پہ روانہ ہوں گے
یہ مسافر ابھی تھکنا سا رہے گا کچھ روز!
اور جب بھی لوگوں کی بے حسی اور ناقدری پر رونا آیا تو خود ہی کو کوسا' نہیں کچھ نہیں کہا۔

☼ ☼ ☼

آنکھیں موند کنارے بیٹھو' من کے رکھو بند کواڑ
انشا جی لو دھاگا لو' لب سی لو خاموش رہو!
یوں لب سی لینا بھی ہستیا کی ایک منزل ہے' اس لیے کہ۔
اپنوں بے گانوں سے ڈرتے گونگی بہری بات کہیں
داغ جگر کو لالہ رنگیں اشکوں کو برسات کہیں
سورج کو سورج نہ پکاریں دن کو اجلی رات کہیں

☼ ☼ ☼

زندگی میں ایک منزل ایسی بھی آتی ہے

☼ ☼ ☼

اب نگاہوں میں نہ خواہش ہے' نہ حسرت' نہ ملال
اب یہاں لب پہ کہاں حرف سوال آتا ہے
ہم نے اپنے کو بہت دیر سنبھالا لیکن
دل ہے پتھر تو نہیں اس میں تو بال آتا ہے
اب ہمیں کس کی محبت کا یقین آئے گا
ان کی بے زار نگاہوں کا خیال آتا ہے

☼ ☼ ☼

اب شکایات و سوالات سے کیا حاصل ہے
کس لیے دل کو سر زلف دوتا باندھا تھا
تم کو انجام محبت کی خبر تھی کہ نہیں!
تم نے کیا سوچ کے پیمان وفا باندھا تھا
ہجر کو واقف نصیب و گراں سمجھے تھے
کیوں فقط اپنے ہی نالے کو رسا باندھا تھا

☼ ☼ ☼

ان کے نغموں میں موسیقی ہوتی ہے۔ اور یہ موسیقی وہ خوب صورت الفاظ کے موزوں استعمال سے پیدا کرتے ہیں۔ ایسے لگتا ہے' شعر نہیں پڑھ رہے بلکہ خوشنما پتیوں اور پھولوں کی رم جھم برس رہی ہے۔ ایک جھرنا ہے جو دلاویز اور اثر انگیز الفاظ کی لے پر دھیرے دھیرے بہہ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جو نغمے گائے گئے وہ بہت مقبول ہوئے۔ بلکہ زبان زد خاص و عام ہوئے۔
شعروں کی اپنی موسیقی اور گائیک کی موسیقی نے مل کر انہیں دو آتشہ کر دیا۔
انشا جی نثر کے بھی بادشاہ تھے۔
خصوصاً مزاحیہ نثر کے۔ مجھے انشا جی کا مزاح بطور خاص پسند آتا ہے۔ پہلے پہل میں انہیں ایک اچھا شاعر سمجھتی تھی' جب ان کے سفرنامے چھپے تو مجھے احساس ہوا وہ طنز و مزاح کی نگری میں ایک نیا انداز لے آئے ہیں۔ پھر میں ان کی نثر بھی ذوق و شوق سے پڑھنے لگی۔

انشا جی ہنسانے کے لیے زور نہیں لگاتے اور نہ ہی گدگدی کرتے ہیں۔
کھردری زمین پر مشکل اور نامانوس الفاظ کے بیلچے بھی نہیں مارتے اور نہ دور از قیاس تشبیہات و استعارات کی بھول بھلیوں میں گرفتار کر کے تماشا دیکھتے ہیں۔
ان کی زمین سادہ ہوتی ہے۔ سادہ مگر زرخیز بیج ڈالتے جاؤ سبزہ سر اٹھاتا آئے گا۔
پڑھتے چلے جاؤ' جی میں اترتا چلا جاتا ہے' کہیں بھی رک کر ادھر ادھر نہیں دیکھنا پڑتا۔ نہ لطف لینے کے لیے ذہن پر زور ڈالنا پڑتا ہے۔
ایسے لگتا ہے ہم ان کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں' ان کے روبرو بیٹھے ہیں۔ فون پر ان کی گفتگو سن رہے ہیں' ان کی خود ساختہ حماقتوں اور مہموں میں شریک ہیں۔
ہم ہوتے تو ہمارے ساتھ بھی یہی کچھ پیش آتا اور ہمارا رد عمل کچھ اس سے بہتر نہ ہوتا۔
ایسے لگتا ہے انشا جی کو دلچسپ اور مزے دار باتیں کرنے کی عادت ہے۔ دلچسپ گفتگو کرنے والا انسان محفل میں شریک ہر شخص کی توجہ لوٹ لیتا ہے۔ یہی خوبی ان کی کتابوں میں ہے' وہ کسی خاص طبقے کے لیے نہیں لکھی گئیں۔ ہر فرد کے لیے ہیں اور ہر قسم کا آدمی خواہ وہ زیادہ تعلیم یافتہ ہو یا کم' اپنی اپنی ایج کے مطابق لطف لے سکتا ہے۔ اور پھر جب بھی پڑھو نئے سرے سے لطف آتا ہے۔ عام فہم' سادہ' سلیس' رواں دواں اور خوب صورت زبان روزمرہ میں اتنا صاف ستھرا مزاح تخلیق کرنا کچھ انشا جی کا خاصہ ہے۔
بعض اوقات پرانے لطیفوں اور محاوروں کو اتنی خوب صورتی سے استعمال کرتے ہیں کہ ان میں نئی زندگی نئی تازگی آجاتی ہے۔
ڈاکٹر اختر حسین گرمی سے بہت مضطرب تھے۔ بولے "تمہاری یہ کیفیت کیوں نہیں۔" ہم نے عرض کیا۔ "بندہ کچھ روز ملتان رہ آیا ہے۔"

٭ ٭ ٭

ہوشنگ تو یہ سن کر حیران ہوا کہ ہم روز نہاتے ہیں، بولا۔ "میاں جی تم تو پانی کے کیڑے ہو۔ میں تو جمعے کے جمعے حمام جاتا ہوں۔"

٭ ٭ ٭

"ایک کتا بھی وہ پاکستان سے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ جس کا نام کراچی خاں رکھا تھا۔ اور اس سے اردو بولتے تھے۔ اس سے انہوں نے ہمارا تعارف کرایا۔ ہمارے ہاتھ چٹوائے' ہماری پتلون چٹوائی' ہمارا تھیلا چٹوایا۔ ہم کتوں کو منہ نہیں لگاتے' منہ تو کیا ہاتھ تک نہیں لگاتے' اس وقت جی کڑا کر کے نہایت خندہ پیشانی سے خواجہ سگ پرست بنے رہے۔"

اچھے شعر کی طرح اچھا مزاح بھی ہمیشہ کے لیے ذہن میں رہ جاتا ہے۔ ان کی کتابوں میں بعض ایسے خوب صورت فقرے ہیں۔ جو ابھی تک میرے حافظے میں ہیں۔

اور ہر بار جب میں دہراتی ہوں۔ ایک بے اختیار مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر پھیل جاتی ہے' یہی بے اختیار مسکراہٹ اچھے مزاح کی پیداوار ہوتی ہے۔ قہقہہ ایک عارضی سا اثر ہے۔

اگر کوئی شخص ان کی کوئی کتاب پڑھ رہا ہو تو اس کے چہرے سے ہی آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ مزاح پڑھ رہا ہے۔

پہلی خوبی تو انہماک ہے۔ اور پھر اس محویت کے عالم میں ایک بے اختیار سی مسکراہٹ گاہے بگاہے لبوں پر نمودار ہوتی ہے۔ اور پھر وہ پھیلتے پھیلتے پورے چہرے پر محیط ہو جاتی ہے۔

کہ قاری خود بخود شگفتہ اور خوش و خرم دکھائی دینے لگتا ہے۔ اس کے بعد جب تک کتاب ختم نہ کر لیں' چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ اور کتاب جلدی ختم ہو جاتی ہے۔

کیونکہ ثقیل نہیں ہوتی اس لیے قاری سوچتا ہے بس یہ تو ختم ہو گئی۔

چھوٹے چھوٹے ننھے ننھے فقرے اور ان میں بڑی بڑی باتیں' بڑے بڑے اشارے۔

"ہمارا آدھا وقت تو غسل خانے میں صرف ہو جاتا ہے۔ من کا میلا پن دور نہیں کر سکتے تو تن تو اجلا رہے۔"

٭ ٭ ٭

ہمیں کیمرے وغیرہ پسند نہیں۔ مصوری اور تصویر کشی ہمارے شوق وغیرہ نہیں۔ مداحوں کے لیے ہم نے شاعری سیکھ لی ہے' اسی سے کام نکل آتا ہے۔

"تھوڑی دیر بعد غور کرنے پر معلوم ہو گیا کہ ہمارا دایاں ہاتھ کون سا ہے۔ چنانچہ ادھر کو روانہ ہوئے' کبھی کعبہ میرے پیچھے تھا کلیسا میرے آگے' کبھی کلیسا میرے پیچھے تھا اور۔۔۔

ہم تو خیر فرنچ میں اتنی دستگاہ رکھتے تھے کہ اس شخص کو مسٹر کی بجائے موسیو کہہ کر خطاب کیا۔ لیکن وہ شخص انگریزی سے بالکل کورا نکلا۔ کاندھا جھٹک کر رہ گیا۔"

"سوئٹزرلینڈ کے بینک دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ ہزاروں' لاکھوں روپے کا کاروبار کرتے ہیں' رازداری ان کا اصول ہے' دنیا کے بڑے بڑے حکمران اور سیاست دان اور ملک التجار ان بینکوں میں پیسے جمع کرا دیتے ہیں کہ کل فلاں تخت کا تختہ ہوا تو سوئٹزرلینڈ جا رہیں گے یا اس جمع جتھے کے بل پر کہیں اور بیٹھ کر عیش کریں گے اور بقیہ عمر یاد خدا میں گزار دیں گے۔

ہم نے بھی پیسے جمع کراتے وقت خزانچی سے کہہ دیا' "میاں رقم کا کانوں کان کسی کو پتا نہ چلے۔ ہمارے ملک کا قانون بہت سخت ہے' کوئی شخص باہر روپیہ نہیں رکھ سکتا۔" اطمینان دلوایا' آپ کے ملک کے اور بہت سے روسا اور سیاست دانوں' بعض سابق وزیروں کے اکاؤنٹ ہمارے یہاں ہیں' بعض تو سودے کر کے اپنا کمیشن سیدھا یہاں جمع کرا دیتے ہیں۔"

ہم نے کہا: "تم لوگوں کا اصول رازداری ہے۔ اس لیے سب کے نام تو نہیں پوچھتے' چند ایک کے بتا دو۔ ہم اپنے کالم میں شاید لکھ دیں۔ ویسے کسی کو نہیں بتائیں گے۔"

٭ ٭ ٭

"ہمارے خیال میں تو اچھی خاصی جگہ ہے' جنت ہمیں کوئی بھیجے گا نہیں۔ ورنہ ہمیں تو کوئی اعتراض نہ ہو۔ فرمانے لگے کیا پتا میاں وہاں جانا ہی پڑ جائے۔ آدمی ہمارا کوئی دم تحریر تو ہوتا نہیں "کراما" کاتبین اپنے روزنامچوں میں جو جی چاہے لکھ دیں' جو جی چاہے حذف کر دیں۔"

٭ ٭ ٭

ہوٹل سال سال میں تو رات جوں ہی دامان خیال یار کو پکڑنے کے لیے کروٹ بدلی' زمین پر آ رہے۔

٭ ٭ ٭

"چمن میں ابھی بقدر رانگ بلبل ہے۔"

٭ ٭ ٭

"ہماری آنکھوں کے آگے ستارے ناچنے لگے' ہمیں کبھی گمان نہ ہوا تھا کہ حکومت برطانیہ ہماری پشت میں یوں چھرا گھونپے گی۔ ہم سے صلاح کیے بغیر سٹرلنگ کی قیمت گھٹا دے گی۔"

٭ ٭ ٭

"انہوں نے جتایا یہاں اہل علم کی قدر تو ہے' لیکن میدان تحریر کا مطلب ہے لبریشن اسکوائر' تحریر کا لفظ حریت کا رشتہ دار ہے۔ ہم نے کہا۔ پھر محرر' چٹھی محرر وغیرہ کا بھی یہی مطلب ہوا کہ اپنے عمل میں آزاد ہیں' جو چاہیں' وصول کریں' فرمایا۔ وہ بات اپنے ہاں کی ہے۔"

٭ ٭ ٭

"بے شک وہ آئے اور راستہ میں حیران ہوئے کہ یہاں صبح ایسی ہوتی ہے۔ سپیدہ صبح اسے کہتے ہیں۔ ہم نے کہا تم نے آج دیکھی ہے صبح۔ ہم تو کئی بار سورج کو نکلتے دیکھ چکے ہیں۔ فرمایا۔ ارے کیا میر اشعار چرند پرند میں کرتے ہو۔ یہ کوئی بھلے مانسوں کے اٹھنے کا وقت ہے۔"

ہوائی اڈے پر پہنچ کر گاڑی سے کے ایل ایم کے کاؤنٹر تک ہمارا سوٹ کیس بھی وہی اٹھا کر لے گئے۔ ہم نے واجبی سی نہ نہ کی پھر چپ رہے۔ اس شخص کو جو حسینوں کے ناز تک نہیں اٹھا سکتا۔ ہم نے سوٹ کیس اٹھائے دیکھا تو طے کیا ہم اس احسان کا بدلہ چکائیں گے۔ دو' تین ہفتے تک اس کے بارے میں کوئی چبھتا ہوا کالم نہ لکھیں گے۔

انشا جی کا سا انداز کون' کہاں سے لائے گا؟ چلتے جاتے ہیں' باتیں کرتے جاتے ہیں' ہنساتے جاتے ہیں پر جہاں جہاں چور کی داڑھی میں تنکا ہے' وہیں وہیں' ہاتھ اٹھ جاتے ہیں خود بخود۔

انشا جی تو شاعر تھے۔ شاعر خوب صورتیوں کی تلاش

میں رہتے ہیں' چاند ہو' ستارے ہوں' دھرتی ہو' آکاش ہو' جھرنے ہوں' آبشار ہوں' وادیاں ہوں' صحرا ہوں' شہر ہوں' کوچے ہوں' پری زاد ہو یا پری پیکر! شاعر ایک چلتا پھرتا الاؤ ہوتے ہیں۔ جنہیں حسن کی ٹھنڈک درکار ہوتی ہے۔ اور عشق کا سودا' پھر وہ مزاح نگار کیسے بن گئے۔

مزاح نگار کے اندر ایک ناسور ہوتا ہے۔ جب وہ اس کی جھلک دنیا کو نہیں دکھانا چاہتا تو اپنے اردگرد مسکراہٹوں کے جال بنتا رہتا ہے۔

ہنسانے والے عظیم بھی ہوتے ہیں اور بزدل بھی ہوتے ہیں۔ بڑی بہادری سے سینہ تان کر کھڑے ہو جاتے ہیں' حوصلے کا خود چن لیتے ہیں اور خوشیوں کی تقسیم شروع کر دیتے ہیں۔ کہتے ہیں ہم جیت گئے۔ لوگ دامن پھیلائے مسکراہٹیں مانگنے آتے ہیں۔

لیکن ایک دن اچانک' بالکل چپ ہو جاتے ہیں اور گم سم!

حد ہوتی ہے' برداشت کی بھی!

میں انشا جی کو نہیں جانتی' بہت سے ادیبوں اور شاعروں کو ان کے کلام کے توسط سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ پڑھنے والے عام طور پر اپنے اندازے کے مطابق ان کی شخصیت کا ایک خاکہ بنا لیتے ہیں۔

یوں تو انہیں اخبار اور ٹی وی میں اکثر دیکھا تھا' مگر صرف ایک بار میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بھی برائے نام سی۔

اپریل 1975ء میں کراچی گئی تو نادرہ خاتون نے مجھے کھانے پر بلایا۔ اس سے پیشتر میری اور نادرہ کی خط و کتابت تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ اور کچھ عرصہ پیشتر ہی مجھے معلوم ہوا تھا کہ ابن انشا نادرہ کے بھائی ہیں۔

ان کے گھر جانے پر مجھے معلوم ہوا کہ ابن انشا اور نادرہ سب ایک ساتھ رہتے ہیں۔ کیونکہ وہاں انشا بھائی اور ریاض بھائی موجود تھے۔

چونکہ ان کی موجودگی بالکل غیر متوقع تھی۔ اس لیے میں نے ذہنی طور پر اپنے آپ کو ان سے سوال و جواب کے لیے تیار نہیں کیا تھا۔

میں وہاں بیٹھی سوچتی رہی۔

ان کے اشعار سے بات شروع کی جائے جنہوں نے بہت عرصہ پہلے میرے ذہن پر قبضہ کیا۔ یا ان کے سفرناموں سے سلسلہ کلام شروع کیا جائے۔ یا کالم کا ذکر چھیڑا جائے۔ یا پھر خاموش بیٹھا جائے اور ایک مشہور قلم کار کو دیکھا جائے۔ اتنے میں وہ ابتدا کر چکے تھے۔

شاید اردو ادب کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔ یا نئے لکھنے والوں کے بارے میں۔ غالباً" ادیب خواتین بھی زیر بحث آئیں۔

میں چاہ رہی تھی موضوع بدل کر انشا جی کی طرف لایا جائے کہ وہ بولے۔

"آپ کی کوئی بھی تحریر کہیں چھپے محمد ریاض ضرور پڑھتے ہیں۔ یہ آپ کے بہت بڑے مداح ہیں' لیکن۔ ان سے بڑا میں ہوں۔"

مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ میں جو اتنی دیر سے ان کی تعریف میں کہنے کے فقرے سوچ رہی تھی۔ شرمندہ سی ہو گئی۔ پھر جوابی کارروائی میں کچھ کہنا مجھے اچھا نہ لگا اور میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں بھابی وغیرہ سے گپ شپ لگانے چلی گئی۔

واپسی پر وہ سب لوگ مجھے اور بچوں کو گیٹ تک چھوڑنے آئے۔ میرے بچوں کو بھی انہوں نے کہانیوں کی بہت سی کتابیں دیں اور نادرہ کی زبانی میری کچھ باتیں سننے کے بعد بولے۔

"مجھے مکئی کی روٹی اور ساگ بہت پسند ہے۔ سنا ہے آپ بہت اچھا پکاتی ہیں اور آپ کے ہاں تازہ مکھن بھی ہوتا ہے۔ جب لاہور آؤں گا تو آپ کے ہاں کھانے کے لیے ضرور آؤں گا۔"

"ضرور' ضرور۔" میں نے کہا۔

راستے میں میرے بیٹے مبشر نے پوچھا۔

"امی یہ ابن انشا تھے؟"

میں نے کہا۔ "ہاں"

بولا۔ "امی یہ تو بہت اچھے ہیں۔"

"اچھا۔" میں نے پوچھا۔ "تم نے کیسے جانا؟"

"دیکھیں نا کتنے پیار سے ہمارے ساتھ بول رہے تھے اور پہلی ہی ملاقات میں اتنی کتابیں دے دی ہیں۔"

"ہاں بیٹا! تم نے ٹھیک کہا ہے اچھے اور بلند اخلاق لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"امی سب رائٹر ایسے ہوتے ہیں؟" میرے بیٹے نے پھر پوچھا۔

اور مجھے ہنسی آگئی۔

☼ ☼ ☼
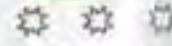
مگر وہ میرے ہاں ساگ اور مکئی کی روٹی کھانے کبھی نہیں آئے۔ میں نے کئی بار سوچا جب وہ لاہور آئیں گے تو انہیں اپنے ہاں بلاؤں گی۔ اس دن کا ادھار بھی چکاؤں گی۔ اور بھی بہت سی باتیں تھیں کہنے کی۔

لیکن مجھے کبھی علم ہی نہ ہو سکا۔ وہ کب لاہور آئے اور کب چلے گئے۔

البتہ رحمٰن کے ساتھ ان کی باہر ہی باہر دو چار ملاقاتیں ہوئیں۔ جب میں نے پتا کیا معلوم ہوا وہ جا چکے ہیں۔

پچھلے سال ایک بار نادرہ سے فون پر بات ہوئی تو اس نے مجھے بتایا۔ انشا جی بمعہ فیملی لندن جا رہے ہیں۔

نادرہ کی آواز میں خاصی تشویش تھی۔ اور وہ کہہ رہی تھی آج کل ان کے جانے کی بہت پریشانی ہے وغیرہ وغیرہ۔

میں بہت حیران ہوئی' جبکہ وہ اتنی اچھی پوسٹ پر جا رہے ہیں اور وہ ہمیشہ ہی جاتے رہتے ہیں تو نادرہ اتنی بوکھلائی ہوئی کیوں ہے' پھر میں نے سوچا' پیار کرنے والے بھائی جب بھی پردیس جائیں' بہنیں دل گرفتہ ہو جاتی ہیں' پھر بار بار پوچھنے پر اس نے صرف اتنا ہی بتایا کہ ان کے گلے میں کوئی تکلیف ہے اور وہاں ان کا آپریشن ہو گا۔

☼ ☼ ☼

گرمیوں میں جب رحمٰن یورپ سے واپس آئے تو انہوں نے مجھے بتایا لندن میں وہ انشا بھائی سے ملے تھے' انہوں نے کہا' میں ان کے گھر فون کر کے سب لوگوں کو بتا دوں کہ وہ خیریت سے ہیں۔

میں نے پوچھا' وہاں ان کے گلے کا آپریشن ہونا تھا' کیا ہو گیا؟"

بولے۔ "ہاں۔"

میں نے کہا۔ "کیا وہ اب بالکل ٹھیک ہیں؟"

وہ بولے۔ "ہاں۔"

"تکلیف کیا تھی انہیں؟" میں نے پھر پوچھا۔

"پتا نہیں۔" یہ کہہ کر رحمٰن نے رسالہ اٹھایا اور پڑھنے لگے۔

بڑا ادھورا جواب تھا۔ جس سے مجھے کچھ تجسس

ہوا۔

دوسرے دن میں نے نادرہ خاتون کو فون پر ان کی خیریت جتائی اور ان کے بارے میں وہی سوال کیا۔

نادرہ نے بھی بڑے سکون سے میرے سوال کا جواب دیا اور کہا۔

"ان کا آپریشن کامیاب ہو گیا ہے۔ آج کل انہیں تلی کی تکلیف ہے' شاید ایک اور آپریشن ہو۔"

ہم دونوں نے ان کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا اور فون بند کر دیا۔

پھر ایک دن میں نے نادرہ کو فون کیا۔ انشا بھائی کا حال پوچھا۔ وہ ابھی تک پر امید تھی۔ میں نے پوچھا۔

"ان کے گلے کا آپریشن کیوں ہوا تھا؟"

بولی۔ "کچھ غدود بڑھ گئے تھے۔"

میں نے پوچھا۔ "آپریشن کامیاب ہو گیا ہے؟"

بولی "ہاں۔ اللہ کا شکر ہے وہ آپریشن تو بالکل کامیاب ہوا ہے۔"

"پھر اب کیا تکلیف ہے؟"

"اب کچھ دماغی سی تکلیف اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔"

"کیا پھر آپریشن ہو گا؟"

"شاید' پتا نہیں' ریاض بھائی پھر جا رہے ہیں۔" وہ کہے جا رہی تھی۔ "اب تو ٹھیک ہیں۔ دعا کرو' جلدی اچھے ہو جائیں۔"

اور میں دعا کرتی رہی تھی۔

ہم دونوں دعا کر رہی تھیں۔

کیونکہ مایوسی کے باوجود انسان معجزہ دیکھنے کا خواہاں ہوتا ہے۔ اسی معجزے کے منتظر ان کے بہن' بھائی' عزیز دوست' احباب اور قارئین تھے۔

دسمبر میں ریاض بھائی لاہور آئے تھے۔ اور انہوں نے فون پر کہا تھا۔

"وہ لندن جا رہے ہیں' کیونکہ انشا بھائی کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔"

میں بہت سی دعائیں بھیجنا چاہتی تھی۔ مگر تشویش نہیں بھیجنا چاہتی تھی۔ پھر کچھ دنوں بعد وہ خبر سنی۔

جس کے لیے ذہن تیار نہیں تھا۔ حالانکہ اس خبر کے سائے دنوں پہلے لہرا رہے تھے۔ چونکہ ایسی خبریں عالم بالا میں تیار کی جاتی ہیں۔ اس لیے بنی نوع انسان کی مرضی کے بغیر دنیا میں نشر کی جاتی ہیں۔

☼ ☼ ☼

بارہ جنوری کو میں پشاور میں تھی' وہاں کسی شادی کے سلسلے میں گئی ہوئی تھی۔ وہ دن سارا ہنگاموں کی نذر ہو گیا۔ رات گئے آکر ہوٹل میں سو گئے۔ تیرہ کی صبح کو میں تیار ہو کر نیچے ہوٹل کے لاؤنج میں آئی۔ سامنے میز پر پشاور کا ایک انگریزی روزنامہ پڑا تھا۔ اس کو اٹھا لیا' پہلے صفحے پر ہی ابن انشا کا نام دیکھ کر میں چونکی۔

پھر ساری خبر روح فرسا تھی۔

میں وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔

مجھے یاد ہے وہ دن انتہائی سرد تھا۔ آسمان تا زمین برف سی پڑ رہی تھی۔ بدلیاں رات سے رو رہی تھیں۔ اور سورج کہیں روپوش ہو چکا تھا۔

فضا دھندلی دھندلی تھی۔

میں نے بہت سے گرم کپڑے پہن رکھے تھے۔

مگر میرے احساس پر ٹھنڈی ٹھنڈی برف گرنے لگی۔

اداسی کی برف۔

قنوطیت کی برف۔

یاسیت کی برف۔

وہاں شادی والے گھر میں گم صم بیٹھی سوچتی رہی۔ ہر روز سینکڑوں لوگ مرتے ہیں۔ اور سینکڑوں شادیاں ہوتی ہیں۔ یہ سب وہ مالک اوپر بیٹھا دیکھ رہا ہے اور یہ سب اس کے اشارے پر ہو رہا ہے۔

کتنے ہی شاعر' کتنے ہی ادیب اٹھ جاتے ہیں۔ ہاں ان کے جانے کی خبر سن کر اتنا افسوس ضرور ہوتا ہے ایک انسان جو دنیا کو کچھ دے رہا تھا' چلا گیا۔

لیکن اس طرح دکھ کی لہریں دل میں نہیں اٹھتیں۔ آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ جاتے ہیں۔

اور یہ بات بے معنی سی لگ رہی ہے۔

میرا انشا جی سے کیا ناتا تھا؟

اس لیے کہ نادرہ میری دوست ہے۔ اور انشا جی نادرہ کے پیارے بھائی تھے۔

بھائی محمود ریاض مجھے اپنی چھوٹی بہن سمجھتے ہیں۔ اور ان کا سارا گھرانہ میرا احترام کرتا ہے۔

نہیں' میرے ذہن نے کہا۔ رشتے' ناتے' تعلقات' موت' نسب اپنی جگہ برحق۔ یہ ہر انسان کا اپنا ذاتی وصف ہوتا ہے۔ مگر آپ ملو یا نہ ملو' اس کو دیکھو یا نہ دیکھو۔ اس سے فرق نہیں پڑتا۔

ہر انسان اپنے کردار اور اپنے عمل کی خوشبو اس دنیا میں چھوڑ جاتا رہتا ہے۔ کسی فن کی صورت میں' ہو یا کسی فن کی صورت میں' شعر کی صورت میں ہو' یا تصویر کی صورت میں۔

جہاں جہاں' جس جس دل سے وہ خوشبو جا ٹکراتی ہے' وہاں ایک مقام بنا لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے آج ہزاروں لاکھوں دل انشا جی کی یاد میں رو رہے ہیں۔

ہزاروں دشت اب میرے جنوں کی یادگاریں ہیں
جہاں پہنچا وہیں کچھ خاک دامن کی اڑا لایا۔

انشا جی کون تھے' کیا تھے۔

شاید کوئی جوگی تھے' یا بنجارے' نگر نگر' قریہ قریہ گھومتے تھے۔ اچھا بول بولتے تھے' کیونکہ سب سے اچھی خیرات میٹھے بول ہیں۔

وہ دیوانے تھے۔

دیوانے مجذوب ہوتے ہیں۔

مجذوب قلندر ہوتے ہیں۔ اور قلندر کو لاگ لپیٹ سے کیا کام!

جوگی کا نگر میں ٹھکانا کیا؟

جوگی کو تو ہر حال جانا ہی تھا۔

اک جوگن بھی تھی خیالوں میں' جو سندر تھی' شرمیلی تھی' دل کی رانی تھی' مگر بے وفا تھی۔

اس کی بے وفائی کا رونا روتے رہے۔

وہ دلہن کی تھی۔

آخر وفا دے گئی۔

اب کوئی آئے تو کہنا کہ مسافر تو گیا
یہ بھی کہنا کہ بھلا اب بھی نہ جانا لوگو!
راہ تکتے ہوئے پتھرا سی گئی تھیں آنکھیں
آہ بھرتے ہوئے چھلنی ہوا سینہ لوگو!
ہونٹ جلتے تھے جو بھی لیتا تھا آپ کا نام
اس طرح اور کسی کو نہ ستانا لوگو!

ہاں جانے سے پہلے ایک سوال اور بھی کیا ہو گا؟

بخشش میں تامل ہے اور آنکھ جھکالی ہے
کچھ در پہ تیرے مولیٰ یہ بات ہی نرالی ہے
انشا کو بھی رخصت کر انشا کو بھی کچھ دے دے
انشا سے ہزاروں ہیں' انشا بھی سوالی ہے

پھر جب جی کا پچھتانا پڑا ہو گا تو انہوں نے سمجھ لیا ہو گا۔

لے چلی جی کی بے قراری دور!
ہم سمجھتے تھے اپنی باری دور!
اب عمر کی نقدی ختم ہوئی
اب ہم کو ادھار کی حاجت ہے

یہ ہمیشہ رہنے والی نظم ہے۔ اور انسان کی بے چارگی اور بندگی کا ایک نادر نمونہ! صرف اسی نظم کی وجہ سے نہیں' اپنی تحریروں' اپنے شعروں اور اپنی نیکیوں کی وجہ سے انشا جی ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ نادرہ جی! آپ کو فخر ہونا چاہیے' آپ کے ایسے بھائی تھے اور ایسے بھائی صدیوں میں کہیں پیدا ہوتے ہیں۔

بھابھی' آپ بھی اپنے آنسو پونچھ لیں۔ اور ان ننھے منے بچوں کو ہر روز اپنے ابا کی کہانیاں سنایا کریں۔

ممکن ہے کبھی ایسا ہو کہ اس خاندان میں کوئی اور ابن انشا آ جائے۔

دروازہ کھلا رکھنا۔

☼ ☼

نیہا سے ملاقات

شاہین رشید

چند سال قبل ایک سوپ بہت مقبول ہوا تھا "کاجل" کے نام سے دبئی میں یہ سیریل شوٹ کیا گیا اور اس کا ہر کردار مقبول ہوا۔ مرکزی رول "مونا لیزا" اور ایک انڈین فنکارہ نے کیا تھا۔

مونا لیزا کی چھوٹی بہن کا رول اداکارہ "نیہا" نے کیا اور سب یہی سمجھتے تھے کہ یہ فنکارہ بھی انڈین ہیں۔ کیونکہ ان کا لباس ان کا بولنا اور ان کی اداکاری کا انداز بالکل انڈین فنکاراؤں کی طرح تھا۔ کاجل ختم ہوا اور نیہا بھی غائب ہو گئیں۔ مگر پھر جب یہ ایک آدھ سیریل میں نظر آئیں تو پتا چلا کہ یہ تو پاکستان کی فنکارہ ہیں۔ تب ہمارا دل چاہا کہ ان سے آپ کی ملاقات کروائی جائے "نیہا" اب تک کافی کامیاب ڈراموں میں کام کر چکی ہیں اور "آذر کی آئے گی بارات" میں "عشی" کا رول تو انہوں نے بہت ہی عمدگی سے کیا۔ نیہا سے کی گئی باتیں آپ کی نذر ہیں۔

★ "کیسی ہیں نیہا؟"

✲ "جی بالکل ٹھیک۔"

★ "کافی دنوں سے آپ کا کوئی سیریل نظر نہیں آرہا۔ خیریت؟"

✲ "بالکل خیریت ہے۔ بس آن ایئر آنے باقی ہیں۔ کچھ تیار ہیں اور کچھ انڈر پروڈکشن ہیں اور مختلف چینلز سے میرے ڈرامے چلتے رہتے ہیں۔"

★ "چند چینل ڈراموں کے لیے مخصوص ہیں اور رائٹر اور پروڈیوسر' ڈائریکٹرز کے نام پر بھی ڈرامے دیکھے جاتے ہیں۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

✲ "ہاں جی یہ ٹھیک ہے کہ ڈراموں کے لیے کچھ مخصوص چینل ہیں جہاں تک رائٹر اور ڈائریکٹر کی بات ہے تو سچ بات یہ ہے کہ میں رائٹر کا نام نہیں دیکھتی۔ میں تو صرف ڈائریکٹر کا نام دیکھتی ہوں۔ مثلاً "اگر بابر جاوید کام کریں گے تو رائٹر تو اچھا ہی ہو گا۔ بابر جاوید نے ابھی تک جتنے بھی سیریلز اور سوپ کیے ہیں وہ سب سپرہٹ گئے ہیں۔"

★ "آپ اچھی پرفارمر ہیں' کئی ڈراموں میں کام کر چکی ہیں۔ مگر کیا بات ہے کہ ابھی تک آپ کو لیڈنگ رول نہیں ملا؟"

✲ "ہاں۔۔۔ یہ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں اور یہ تو ڈائریکٹرز سے پوچھیں کہ وہ مجھے مرکزی رول کے لیے کیوں نہیں بک کرتے۔ لیکن اس فیلڈ میں میرے سینئرز نے اور میرے ڈائریکٹرز نے ایک بات مجھے سمجھائی ہے کہ اداکاری میں سب سے اہم چیز پرفارمنس ہوتی ہے اور چاہے بہت مختصر ہی رول کیوں نہ ہو اسے آپ اتنا اچھا نبھائیں کہ لوگ آپ کو یاد رکھیں۔ اب اگر ایک فنکارہ لیڈنگ رول کر رہی ہے اور اچھی پرفارمنس نہیں دے رہیں اور اس کے مقابل وہ فنکارہ جو چند سین میں آتی ہے اور اچھا پرفارم کر کے چلی جاتی ہے تو نقش تو وہی چھوڑے گی نا جو اچھا پرفارم کر کے گئی ہے۔ کمرشل کو ہی دیکھ لیں چند سیکنڈ ہوتا ہے اور رول کو تلاش کرنا آتا ہے۔ تو ساری بات پرفارمنس کی ہوتی ہے۔"

★ "کمرشلز بھی کیے آپ نے۔۔۔ اور سارا دن کی کیا مصروفیات ہیں؟"

✲ "کمرشلز تو میں نے بہت ہی کیے ہیں۔ میں نے تو شروعات ہی کمرشلز سے کی ہے۔ ریمپ پہ واک کی' فیشن شوز بھی کرتی ہوں اور سارا دن کی مصروفیات کچھ یوں ہیں کہ ہم صبح گھر سے نکلتے ہیں رات کو تقریباً" ساڑھے دس گیارہ بجے آتے ہیں۔ تو دس پندرہ منٹ بیٹھ کر ٹی وی دیکھ لیتی ہوں یا پھر آپ کے ڈائجسٹ کا مطالعہ۔۔۔ ڈائجسٹ مجھے اس لیے اچھے لگتے ہیں کہ ان میں شائع ہونے والی کہانیاں ہمارے معاشرے کی عکاسی کرتی ہیں۔"

★ "ایک بات تو بتائیں کہ آپ کا نام سائرہ شبیر ہے۔ پھر آپ نیہا کے نام سے کیوں آتی ہیں فلمی ایکٹرس نام بدلتی ہیں مگر ٹی وی آرٹسٹ تو نہیں بدلتیں؟"

✲ ہنستے ہوئے "بس نیہا مجھے بہت پسند ہے اور جب میں نے اسٹارٹ لیا تھا تو نیہا کے نام سے ہی شروع کیا۔ حالانکہ مجھے سب نے کہا کہ سائرہ اتنا اچھا نام ہے۔ کیوں نیہا کے نام سے آتی ہو۔ تو میں نے تبدیل کرنا بھی چاہا مگر پھر ہوا نہیں۔"

★ "آپ کے لیے تو لکی ثابت ہوا اور کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟"

✲ "بالکل جی۔۔۔ میرے لیے بہت لکی ثابت ہوا اور نیہا کا مطلب نہال ہوتا ہے اور دس اپریل کو لاہور میں پیدا ہوئی۔ ستارہ Aries ہے میری ہائیٹ 5 فٹ 8 انچ ہے اور میں گریجویٹ ہوں۔ انٹیریئر ڈیکوریشن کے کورسز کیے ہیں۔ مجھے گھر سجانے کا بہت شوق ہے۔۔۔ اور جناب ہم تین بہنیں ہیں اور ایک بھائی ہے' بہنوں ہی میں میں تیسرے نمبر پر ہوں اور بھائی مجھ سے چھوٹا ہے۔"

★ "گھر بسایا؟"

✲ "ہاں گھر بسایا اور پھر ختم بھی ہو گیا۔۔۔ اور ماشاء اللہ سے میرا ایک بیٹا ہے اور وہ تقریباً" چار سال کا ہے اور بس کچھ وجوہات کی بنا پر شادی زیادہ عرصہ نہ چل سکی اور یہ سب قسمت کی بات ہے۔ شادی ارینج ہو یا لو کامیابی کے لیے کوئی پیمانہ نہیں ہے۔

میری شادی میری پسند کی تھی۔ کامیاب نہیں ہوئی اس لیے علیحدہ ہو گئے۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ دوبارہ شادی کب کرنی ہے۔ تو ابھی میرا فی الحال کوئی ارادہ نہیں ہے۔ پھر یہ میرا پرسنل معاملہ ہے۔ لوگوں کو میرے کام سے دلچسپی ہونی چاہیے میری پرسنل لائف سے نہیں۔ سب کو بتا دوں کہ میری زندگی بہت اچھی گزر رہی ہے۔ اللہ نے بہت پیارا سا بیٹا دیا ہے۔ اسکول جاتا ہے اور میری والدہ میرے ساتھ رہتی ہیں تو وہی میرے بیٹے کی دیکھ بھال بھی کرتی ہیں۔"

★ "اس فیلڈ میں کیسے آئیں۔۔۔ کس نے متعارف کرایا؟"

✲ "اپنے شوق کی خاطر آئی اور سب سے زیادہ کریز تھا مجھے کمرشلز میں آنے کا اور جب پہلا کمرشل آن ایئر ہوا تو اس کے بعد تو کمرشلز کی لائن ہی لگ گئی اور سب

سے پہلے "ریمپ شو" شایان ملک کے ساتھ کیا تھا اور شایان ملک تک اس طرح پہنچی کہ جب میرے دو تین کمرشلز ہٹ ہوئے تو ایک فوٹو گرافر ہیں ملا مشتاق ان کو میں نے اپنی تصاویر دیں۔ تو ان دنوں شایان ملک کو لمبے قد والی لڑکیاں چاہیے تھیں ریمپ پہ ماڈلنگ کرنے کے لیے تو جب میری تصاویر شایان ملک نے دیکھیں تو مجھ سے رابطہ کیا اور یوں میں نے ان کا پہلا فیشن شو کیا۔"

★ "پھر ڈراموں میں کیسے آئیں؟"

✻ "ڈراموں میں مجھے کاظم پاشا صاحب نے متعارف کرایا۔ ان کے کھیل "بی غسترجی" کے نام سے جو کہ ایک نجی چینل سے آیا تھا اور سٹ کام تھا پھر جاوید فاضل کے کھیل "تم کہاں ہم کہاں" کیا۔ جاوید فاضل صاحب کی ڈانٹ بہت مشہور ہے ان کے ساتھ کام کرنے کے بعد میں نے سوچ لیا کہ اب ڈراموں میں کام نہیں کروں گی میرے لیے کمرشلز ہی بہتر ہیں۔ لیکن مجھے بدر خلیل اور فیصل قریشی نے سمجھایا اور کہا کہ ماڈلنگ بھی جاری رکھو لیکن اداکاری کو مت چھوڑو کیونکہ اداکاری دیر تک چلنے والی چیز ہے اور اداکاری تمہیں بہت دور تک لے جائے گی۔"

★ "اور یہی بات تو یہ ہے کہ آپ کو شہرت بھی اداکاری سے ہی ملی ہے؟"

✻ "ٹھیک کہا آپ نے اداکاری کرنے سے بہت اعتماد آتا ہے، سامنے والے سے بات کرنے کا طریقہ آتا ہے۔ ماحول کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ ہر طرح کے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ کچھ ماڈلز ایسی ہیں جو صرف ریمپ پہ ماڈلنگ کرتی ہیں اور اگر آپ ان سے بات کرنا چاہیے تو وہ بات نہیں کر سکیں گی کیونکہ ان میں خود اعتمادی ہی نہیں ہوتی، وہ بولڈ نہیں ہوتیں۔ بولنے کے معاملے میں۔ وہی ماڈلز بولڈ ہوتی ہیں جو اداکاری بھی کرتی ہیں۔"

★ "اب تک جتنے سیریل کیے ہیں۔ کون سے مقبول ہوئے ہیں؟"

✻ "کاجل جو کہ دبئی میں بنا تھا وہ بہت مقبول ہوا تھا پھر "ڈولی کی آئے گی بارات" اور "گی آئے گی بارات" ہمدھن" بہت زیادہ مقبول ہوئے۔ بلکہ میری پہچان کا ذریعہ بنے۔"

★ "آپ نے کمرشلز سے آغاز کیا اور کمرشلز میں کافی کمائی ہے۔ سب کچھ کیسا لگا اور پہلے کمرشل کا کیا ملا تھا؟"

✻ "مجھے پہلے کمرشل کے 30 ہزار ملے تھے اور میں نے اپنا پہلا پورٹ فولیو ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کو بھیجا اور انہوں نے مجھے "فوراً" بلایا اور یوں میرا پہلا کمرشل "نمک بسکٹ" کا تھا اور اس کے بعد تو لائن لگ گئی تھی اور میں ______ جب مجھے پہلے کمرشل کے 30 ہزار ملے تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ کیونکہ جب میں نے اپنا پورٹ فولیو بنایا تو میں نے اپنے فوٹو گرافر کو پندرہ ہزار روپے تھے اور پندرہ ہزار دے کر میری جان نکلی جا رہی تھی۔ تو میرے فوٹو گرافر نے کہا کہ اگر تمہارا پورٹ فولیو پسند آیا تو تمہارے پیسے دگنے چوگنے ہو کے ملیں گے اور اس کی بات سچ ثابت ہوئی اور واقعی مجھے ڈبل پیسے مل گئے اور پھر ایسی مصروفیات ہوگئیں کہ اپنے رشتے داروں سے ملنے کا بھی ٹائم نہیں ملا۔"

★ "آپ کا ماشاء اللہ بیٹا ہے۔ ماں کی مصروفیت کی وجہ سے آپ کو مس تو کرتا ہوگا؟"

✻ "ہاں کیوں نہیں مگر میں جو کچھ کر رہی ہوں اسی کے لیے کر رہی ہوں۔ سارا دن وہ امی کے پاس ہوتا ہے اور رات کو میرے پاس اور یہی بات کہ پہلے میرا حلقہ دوستوں کا اور رشتے داروں کا بہت وسیع ہوتا تھا مگر اب میرا سب سے اچھا دوست میرا بیٹا ہے۔ کام کر کے فوراً گھر کی طرف بھاگتی ہوں۔"

★ "موڈ کب خراب ہوتا ہے اور غصے میں کھانے سے لڑائی ہوتی ہے؟"

✻ "میرا موڈ اسی وقت خراب ہوتا ہے جب کوئی کام میری مرضی کے بغیر ہو۔ بس تو پھر اپنا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے اکیلی ہی لونگ ڈرائیو پہ نکل جاتی ہوں اور غصہ ہو یا موڈ خراب ہو کھانے سے کوئی لڑائی نہیں ہوتی، کیونکہ کھانے کے لیے تو انسان جیتا ہے اور میں دونوں

سالنوں میں زیادہ کھاتی ہوں۔ میں نے زندگی میں کافی دھوکے کھائے ہیں اس لیے میں اب کسی پر بھروسہ نہیں کرتی اور آپ کو شاید سن کر حیرانی ہوگی کہ میں اپنے سیدھے ہاتھ میں تسبیح رکھتی ہوں۔"

★ "کیوں؟"

✻ "پتا نہیں کیوں؟ میں جو زندگی گزار رہی ہوں شوبز کی۔ وہ پتا نہیں ٹھیک ہے یا غلط ہے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے، کچھ کہتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے۔ لیکن میں یہ کہتی ہوں کہ اللہ کا شکر ہے اس فیلڈ میں آکر مجھے کوئی نقصان نہیں ہوا اور نہ ہی میں نے کسی کو نقصان پہنچایا ہے۔ میں جاب کی طرح اس کام کو لیتی ہوں۔ کام کرتی ہوں اور گھر آجاتی ہوں۔ میں نے کوئی سوشل لائف نہیں رکھی ہوئی۔ لوگ کہتے ہیں دوسروں پر بھروسہ کرو گی اور لائف کو سوشل کرو گی تو آگے بڑھو گی۔ مگر میں کہتی ہوں کہ نہیں میں جیسی ہوں ویسی ہی اچھی ہوں۔"

★ "آپ نے پسند سے شادی کی ناکامی ہوئی اور ابھی تک دوبارہ شادی نہیں کی تو کیا محبت ایک بار ہوتی ہے؟"

✻ "میں تو یہی سمجھتی ہوں کہ محبت ایک ہی بار ہوتی ہے۔ کیونکہ مجھے تو ایک ہی بار ہوئی تھی اور یہ حقیقت بھی ہے پتا نہیں کیوں لوگ کہتے ہیں کہ محبت بار بار ہوتی ہے۔ میں اپنی دوستوں کو دیکھتی ہوں۔ اپنے اردگرد دیکھتی ہوں کچھ مہینے کے بعد ان کی محبتیں بدل رہی ہوتی ہیں۔ تو میں کہتی ہوں کہ کیسے ہو تم لوگ میری زندگی میں تو ایک کے سوا کوئی دوسرا آیا ہی نہیں ہے۔ جبکہ ہماری علیحدگی کو بھی تقریباً پانچ سال ہو گئے ہیں۔"

★ "باشعور انسان اپنی خوبیوں پر خامیوں پہ خود بھی نظر رکھتے ہیں۔ کبھی اپنا تجزیہ کیا؟"

✻ "ہاں بہت۔ میں اپنے بارے میں بہت سوچتی ہوں۔ میں دوسروں پر بھروسہ نہیں کرتی اور مجھ میں سب سے بڑی برائی یہ ہے کہ میں ہر بات کو نگیٹو سوچتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ میں اچھا اچھا سوچوں۔ پوزیٹو سوچوں۔ لیکن کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ میرے لیے نگیٹو سوچنا زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ میں ایک اکیلی عورت کی حیثیت سے اپنی ماں کے ساتھ رہ رہی ہوں۔ تو نگیٹو سوچ کی وجہ سے میں بہت سکون کی زندگی گزار رہی ہوں۔ دوسروں پر بھروسہ کرنے سے نقصان ہی ہوتا ہے۔ میں تو سب کو یہی کہتی ہوں کہ اپنا کام کرو اور گھر آجاؤ۔"

★ "پلاننگ سے چلتی ہیں؟ یا قسمت پر یقین ہے؟"

✻ "نہیں پلاننگ سے نہیں چلتی۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے قسمت پر سو فیصد یقین ہے۔ اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ جو اس نے قسمت میں لکھ دیا وہ ہی ملے گا لوگ کہتے ہیں کہ اگر آپ اس فیلڈ میں نہ رہیں تو کیا کریں گی تو میں یہی کہتی ہوں کہ لانے والا بھی تو خدا تھا۔ اس نے اس فیلڈ میں میرا رزق لکھا ہے۔ اگر وہ اس فیلڈ سے میرا رزق ختم کر دے گا تو کہیں اور لکھ دے گا اور میں وہاں چلی جاؤں گی۔"

★ "خواب دیکھتی ہیں؟"

✻ "ہاں کیوں نہیں۔ نیند والے بھی دیکھتی ہوں اور جاگنے والے بھی دیکھتی ہوں۔ جاگنے والا خواب تو یہ ہے کہ میں اپنے بیٹے کو پائلٹ بنانا چاہتی ہوں اور اسے بہت اعلا مقام پر دیکھنا چاہتی ہوں اور اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ تب تک کی زندگی کی مہلت ضرور دینا اور تب تک مجھے مالی طور پر کمزور نہ کرنا۔"

★ "اپنی زندگی سے مطمئن ہیں؟"

✻ "میں اپنی زندگی سے مطمئن ہوں۔ مجھے اپنے اللہ تعالیٰ سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ میری زندگی میں ایک شخص آیا جس نے مجھے بالکل بدل دیا اور اللہ نے اس کو میری زندگی میں اس لیے بھیجا تھا کہ میری زندگی بدل جائے۔"

★ "مثلاً کیا تبدیلی آئی؟"

✻ "شادی سے پہلے میں ایک لاپروا تام بوائے اور مستی کرنے والی لڑکی تھی اور کسی کی کوئی پروا نہیں کرتی تھی اداکاری میں بھی سنجیدہ نہیں تھی۔ پھر میری شادی ہوئی۔ اللہ نے مجھے بیٹا دیا۔ اور پھر زندگی میں یہ تبدیلی آئی کہ میں ایک سنجیدہ اور میچور لڑکی بن گئی۔"

★ "پھر کیا ہوا۔۔۔ کیوں علیحدگی ہوئی؟"

✻ "پتا نہیں کیوں ایسا ہوا۔۔۔ سوچتی ہوں کہ میرے بیٹے کا کیا قصور تھا۔ بہت معصوم بہت پیارا ہے اور میں نے بھی کسی کا برا نہیں چاہا میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا میں نے تو بہت دل سے چاہا تھا کہ میں اپنے گھر کو بساؤں 'پھر کیوں میرے ساتھ ایسا ہوا؟ بس یہی سوچتی رہتی ہوں۔"

★ "کس قسم کی تقریبات میں جانے سے گھبراتی ہیں اور اگر خدانا خواستہ آپ کو پتا چلے کہ آپ دنیا چھوڑنے والی ہیں تو کون آئے گا آپ کے پاس؟"

✻ "مجھے شادیوں کی تقریبات میں جانا پسند نہیں ہے۔ بہت دیر ہو جاتی ہے اور مجھے دیر تک گھر سے باہر رہنا پسند نہیں اور جہاں تک دنیا سے گزر جانے کی بات ہے تو سچی بات ہے کوئی نہیں آئے گا۔ سوائے میری ماں اور میرے بیٹے کے۔۔۔ کہ ان سے زیادہ مخلص میرے خیال سے کوئی نہیں ہے اور جب میں گھر جاتی ہوں تو سب سے پہلے میرا دل چاہتا ہے کہ اپنے بیٹے کو گلے لگاؤں اور ڈھیر سارا پیار کروں۔"

★ "ابھی دنیا سے گزر جانے کی بات ہو رہی تھی تو موت سے ڈر لگتا ہے؟"

✻ "مجھے موت سے ڈر نہیں لگتا۔ کیونکہ اس نے تو ایک دن آنا ہے۔ مگر گھبراتی ہوں تو اس بات سے کہ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو میرے بعد میرے بیٹے کا کیا ہو گا۔ اس کا خیال کون رکھے گا۔ اس بات سے اکثر پریشان رہتی ہوں۔ لیکن اپنی پریشانی کا اظہار کسی سے نہیں کرتی اور خوش رہتی ہوں۔"

★ "آپ نے کہا کہ لونگ ڈرائیو بہت پسند ہے۔ تو اکیلی ہوتی ہیں یا کسی کے ساتھ جاتی ہیں؟"

✻ "میں جب بہت پریشان ہوتی ہوں تو اکیلی جاتی ہوں اور جب خوش ہوتی ہوں تو پھر بیٹے کے ساتھ جاتی ہوں اور بڑا مزا آتا ہے اس کے ساتھ اگرچہ وہ ابھی چار سال کا ہے لیکن کار میں بیٹھتے ہی پہلے وہ سی ڈی پلیئر آن کرتا ہے اور اپنی پسند کے گانے سنتا ہے۔ آج کل کے بچے بہت تیز ہیں۔ شیلا اور اسے کا گانا "انگارہ" بہت پسند ہے اسے۔"

★ "لوگ پہچان کر کیا ریمارکس دیتے ہیں؟ تنقید کرتے ہیں یا تعریف؟"

✻ "تنقید تو کبھی بھی کسی نے نہیں کی 'ہمیشہ مجھے تعریف ہی ملی ہے اور لوگ جب ملتے ہیں تو نا صرف بہت تعریف کرتے ہیں بلکہ میری مسکراہٹ کی بہت تعریف کرتے ہیں کہ آپ مسکراتی ہوئی بہت اچھی لگتی ہیں۔ میری شخصیت کو دیکھ کر کوئی بھی یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ میرے اندر کتنا دکھ اور کتنا کرب ہے' سب یہی سمجھتے ہیں کہ میں جتنی باہر سے خوش نظر آتی ہوں اتنی ہی اندر سے بھی خوش ہوں 'جبکہ ایسا نہیں ہے۔"

★ "سیاست سے دلچسپی ہے؟ کیا سوچتی ہیں پاکستان کے بارے میں؟"

✻ "پاکستان کے حالات دیکھ کر بہت افسوس ہوتا ہے زلزلے اور سیلاب تو خدائی آفات ہیں ان پر کسی کا زور نہیں ہے 'لیکن ہمارے ملک کے حکمران جو لٹیرے ہیں ان کو دیکھ کر بہت غصہ آتا ہے انہیں کوئی احساس نہیں ہے کہ ہم جی کیسے رہے ہیں۔ بس خود کھانے میں لگے ہوئے ہیں اور عوام کے منہ سے نوالے بھی چھین رہے ہیں۔"

★ "گھر داری سے لگاؤ ہے؟"

✻ "گھر داری کرتی ہی خود ہوں۔ کبھی ماسی نہیں رکھی۔ مجھے اچھا لگتا ہے اپنے کام خود کرنا اپنے گھر کے کام کرنا۔ بازار سے بھی جو کچھ لانا ہو خود ہی لاتی ہوں۔ آرٹسٹوں والے نخرے نہیں ہیں مجھ میں اور ہاں ابھی سیاست کی بات ہو رہی تھی تو میں آپ کو بتاؤں کہ مجھے بہت سے ممالک جانے کا اتفاق ہوا لیکن سری لنکا جا کر مجھے احساس ہوا کہ یہ ہم سے کم کرنسی والا ملک ہے لیکن انہوں نے اپنے عوام کو کتنی سہولیات دی ہوئی ہیں۔ ہمارے ملک میں کیا کچھ نہیں ہے مگر ہم ان سے فائدہ ہی نہیں اٹھاتے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے نیہا سے اجازت چاہی۔

✿ ✿

دو کا پہاڑہ

کرن خان

شاہین رشید

1 "کوئی وہ نام جن کے لیے آپ کی خواہش ہو کہ وہ نام میرے ہوتے؟"

☆ "نہیں ایسی کوئی بات نہیں 'کیونکہ "کرن" نام مجھے بہت پسند ہے۔ اس نام پہ خوش ہوں۔ اس لیے کہ بہت کم لوگوں کا نام "کرن" ہوتا ہے باقی نام تو بہت کامن ہیں۔۔۔ مجھے میری امی بتاتی ہیں کہ میرا پہلا نام عائزہ تھا شاید وہ نام میرے لیے ٹھیک نہیں تھا اس لیے "کرن" رکھا گیا اور "کرن" میرے لیے اچھا ثابت ہوا۔"

2 "آپ کے دو لکی نمبر؟"

☆ "سات اور دو۔"

3 "دو تاریخی ادوار جس میں آپ جانا چاہتی ہیں؟"

☆ "ایک تو میں اپنے والدین کے دور میں جانا چاہتی ہوں کہ جب ان کی شادی ہونے والی تھی تو وہ کیا محسوس کرتے تھے 'کیسی زندگی گزارتے تھے۔ اور تو کوئی ایسا دور نہیں کہ جس میں جانے کی خواہش ہو۔"

4 "دو افراد جن کے ایس ایم ایس کے جواب آپ فوراً دیتی ہیں؟"

☆ "میں ہر اس شخص کے ایس ایم ایس کا جواب فوراً دیتی ہوں جس میں مجھ سے کوئی بات پوچھی گئی ہو۔ ہاں دیگر فارورڈ ایس ایم ایس کے جواب فوراً نہیں دیتی۔"

5 "کوئی دو بری عادتیں جن سے آپ نجات چاہتی ہیں؟"

☆ ہنستے ہوئے "میں تو سمجھتی ہوں کہ جتنی بری تھیں ان سب سے نجات حاصل کر لی ہے۔ ایک عادت یہ ہے کہ میں چاہتی ہوں کہ میں میٹھا نہ کھاؤں۔ کیونکہ فیملی میں زیادہ تر لوگوں کو شوگر ہے۔ تو میں چاہتی ہوں کہ احتیاط کر لوں اور دوسری بری عادت یہ ہے کہ مجھے بھولنے کی عادت ہے۔"

6 "دو جھوٹ جو آپ اکثر بولتی ہیں؟"

☆ "ایک تو یہ کہ جیسے کسی نے مجھے کوئی کام کہا ہے تو میں کہتی ہوں کہ میرے پاس ٹائم نہیں ہو گا۔ بس اسی طرح کے جھوٹ ہوتے ہیں کہ کسی کو کوئی نقصان نہ ہو۔"

7 "اپنے بارے میں کن دو باتوں کو سن کر غصہ آجاتا ہے؟"

☆ "اگر کوئی میرے بارے میں کوئی بات بھی کرتا ہے تو میں ری ایکٹ نہیں کرتی کہ لوگوں کی تو عادت ہوتی ہے اور مجھے کوئی برا بھی کہے تو مجھے برا نہیں لگتا۔

کیونکہ ہر کوئی اپنے انداز سے سوچتا ہے۔"

8 "حالات حاضرہ کے دو اینکر جو آپ کے خیال میں سفارش سے آئے ہیں؟"

☆ "مجھے چونکہ سیاست سے کوئی لگاؤ نہیں ہے اس لیے میں حالات حاضرہ کے پروگرام بھی نہیں دیکھتی۔ ان کے بارے میں کچھ کہہ بھی نہیں سکتی۔"

9 "مارننگ شو کے دو بہترین اینکر آپ کی نظر میں؟"

☆ "شائستہ واحدی اور عروج ناصر اور سدرہ اقبال کا نام بھی لکھیں۔"

10 "دو دوست جن پر آپ بھروسہ کر سکتی ہیں؟"

☆ "ہما اور سلیمہ۔"

11 "دو مشہور شخصیات جن کے ساتھ آپ دنیا گھومنا چاہتی ہیں؟"

☆ "رنبیر کپور بس اور کوئی نہیں۔"

12 "دنیا کی دو ایسی شخصیات جن کی قسمت پر آپ کو رشک آتا ہے؟"

☆ "مجھے کسی کی قسمت پر رشک نہیں آتا۔ کیونکہ جو اللہ نے قسمت میں لکھ دیا ہے وہی اسے ملے گا جو میری قسمت میں لکھا گیا ہے وہ مجھے مل کر رہے گا۔ کسی کی قسمت پر رشک کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

13 "دو تہوار جو آپ شوق سے مناتی ہیں؟"

☆ "عیدالفطر اور دیگر تہوار کے ہم شو کرتے ہیں تو ایک لحاظ سے منانا ہی ہو جاتا ہے۔ بس مجھے تو ذاتی طور پر عیدالفطر ہی اچھا لگتا ہے۔"

14 "دن کے چار پہر میں سے کون سے دو پہر اچھے لگتے ہیں؟"

☆ "علی الصبح اور رات۔"

15 "پہلی ملاقات میں کون سے دو جملے لازمی بولتی ہیں؟"

☆ "السلام علیکم اور جی فرمایئے۔"

16 "دو کھانے جن کو کھا کر آپ کبھی بور نہیں ہوتیں؟"

☆ "دال چاول اور قیمہ۔"

17 "دو افراد جن سے معافی مانگنے میں شرم محسوس نہیں ہوتی؟"

☆ "کسی سے بھی شرم محسوس نہیں کرتی۔ اگر میری غلطی ہوتی ہے تو معافی مانگ لیتی ہوں۔"

18 "دو پسندیدہ کھلاڑی جن کی وجہ سے آپ کرکٹ میچ دیکھتی ہیں؟"

☆ "اور اگر میں کہوں کہ مجھے کرکٹ ہی پسند نہیں ہے تو؟"

19 "سات دنوں میں کون سے دو دن اچھے لگتے ہیں؟"

☆ "پیر اور جمعہ۔"

20 "دو لمحے یا وقت جن کے لیے آپ چاہتی ہیں کہ ٹھہر جائیں؟"

☆ "کسی سے بہت دنوں بعد ملوں تو دل چاہتا ہے کہ ان کے ساتھ وقت گزارتی ہوں۔ دل چاہتا ہے کہ وہ لمحے ٹھہر جائیں۔"

21 "دو چیزیں جنہیں لیے بغیر آپ گھر سے نہیں نکلتیں؟"

☆ "موبائل فون اور والٹ۔"

22 "دو الفاظ جو آپ بہت زیادہ استعمال کرتی ہیں؟"

☆ "شکریہ اور الفاظ تو نہیں لیکن مسکراہٹ کے ذریعے بھی اظہار کرتی ہوں۔"

23 "بارہ مہینوں میں کون سے دو مہینے اچھے لگتے ہیں؟"

☆ "فروری اور جون۔"

24 "اپنے گھر کی دو جگہیں جہاں آپ کو سکون ملتا ہے؟"

☆ "اپنا کمرہ اور ایک وہ جگہ جہاں سارے مل کر بیٹھے ہوں خواہ وہ ڈرائننگ روم ہو یا کوئی کمرہ۔"

25 "گھر کے دو کام جو آپ کو پسند نہیں؟"

☆ "کپڑے دھونا تو بالکل پسند نہیں اور جھاڑو پونچھا کرنا۔"

26 "دو پسندیدہ پکنک پوائنٹ؟"

☆ "پکنک کے لیے کوئی خاص جگہ نہیں ہے۔ کھانے کی جگہ پر بھی پکنک ہو سکتی ہے اور کوئی ساحل

ہو سکتا ہے اور گھر کا لان بھی ہو سکتا ہے۔"

"دو سیاست دان جو ملک کے لیے بوجھ ہیں؟"

"میرا خیال ہے کہ جن کی حکومت چل رہی ہے وہ سب کے لیے بوجھ ہیں۔"

"کن دو ممالک کی ترقی سے متاثر ہیں؟"

"ملائیشیا اور ترکی۔"

"کون سے دو رنگ کے لباس پسند ہیں؟"

"بلیک اینڈ وائٹ۔"

"اپنے ملک کے دو پسندیدہ شہر؟"

"نتھیا گلی اور کراچی۔"

"اگر ایک دن کے لیے ساری دنیا سو جائے تو آپ کون سی دو چیزیں لیں گی؟"

"یہ تو بری بات ہے کہ سب سو جائیں ان کی نیند اڑا دوں گی تاکہ وہ نہ سوئیں اور زندگی کو انجوائے کریں یورو اور ڈالر لے کر امریکہ اور یورپ گھومنا چاہوں گی۔"

"دو تاریخی شخصیات جن سے ملنے کی خواہش ہے؟"

"آئن اسٹائن اور جیو پیٹرو۔"

"لڑکوں کے لیے کوئی دو نصیحتیں؟"

"لڑکیوں سے جھوٹ نہ بولیں اور ان کا دل نہ دکھائیں۔"

"سال کے چار موسموں میں سے دو پسندیدہ موسم؟"

"سردیاں اور سردیاں۔"

"لڑکوں کی دو ناپسندیدہ عادتیں؟"

"صاف نہیں رہتے، اپنے آپ کو صاف ستھرا رکھا کریں اور ہر وقت اس زعم میں نہ رہا کریں کہ ہم لڑکے ہیں۔"

"صبح اٹھتے ہی کون سے دو کام پہلے کرتی ہیں؟"

"آنکھیں کھولتی ہوں اور پھر واش روم جاتی ہوں۔"

"دو جنہوں نے آپ کی زندگی بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہو؟"

☆ "میرے والد اور وہ سب لوگ، جو میری زندگی میں آئے۔ انہوں نے کوئی نہ کوئی پارٹ ضرور پلے کیا میری زندگی بنانے میں۔"

38 "آپ کے نزدیک دنیا کے دو خوب صورت ترین مرد؟"

☆ "میرے والد صاحب اور میرا بیٹا۔"

39 "دو پسندیدہ پروفیشن؟"

☆ "شوبز اور ٹیچنگ۔"

40 "دنیا کے دو بہترین سیاست دان آپ کی نظر میں؟"

☆ "سیاست میں دلچسپی ہی نہیں ہے۔"

41 "والدین کی دو نصیحتیں جو آپ نے گرہ سے باندھ لی ہوں؟"

☆ "ہر حال میں اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرنا اور جھوٹ بالکل نہیں بولنا۔"

42 "اپنے دو پروگرام جو آپ فراموش نہیں کر سکتیں؟"

☆ "جو آج کل کر رہی ہوں۔ ایک مسالا چینل کا پروگرام اور ہم کا مارننگ شو۔"

43 "اپنے کیے گئے دو فیصلے جو غلط ثابت ہوئے ہوں؟"

☆ "بہت ساری غلطیاں کی ہیں مگر ان سے بہت کچھ

سیکھنے کو ملا ہے۔ اس لیے دو کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

44 "پانچ وقت کی نمازوں میں کون سے دو وقت کی نمازیں لازمی پڑھتی ہیں؟"

☆ "الحمدللہ پانچوں وقت کی پڑھتی ہوں۔"

45 "کن دو باتوں سے پرہیز کرتی ہیں؟"

☆ "کسی کا دل دکھانے سے اور غلط بات کہنے سے۔"

46 "بیرون ملک شاپنگ میں کیا دو چیزیں لازمی خریدتی ہیں؟"

☆ "دو نہیں بہت ساری چیزیں خریدتی ہوں دو کا نام تو لے ہی نہیں سکتی۔"

47 "دو لوگ جن کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"

☆ "والد صاحب کے اور ممی کے غصے سے۔"

48 "کن دو لوگوں کی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیتیں؟"

☆ "والدین کی اور بیٹے کی تعریف میں۔"

49 "دو پسندیدہ مشروب جن کے بغیر آپ نہیں رہ سکتی؟"

☆ "پانی اور ملک شیک۔"

50 "ملک میں کون سی دو تبدیلیاں ضروری ہیں؟"

☆ "لوگوں کو اپنی سوچ کو بدلنا ہو گا اور تعلیم عام ہو جائے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

51 "آج کے دور کے دو پسندیدہ گلوکار؟"

☆ "بہت سارے ہیں اور کوئی ایک وقت میں ایک پسند نہیں ہے۔ سب کے لیے وجہ پسند علیحدہ علیحدہ ہے۔"

52 "شادی کی دو رسمیں جو انجوائے کرتی ہیں؟"

☆ "ڈھولکیاں اور مہندی۔"

53 "دو باتیں جن سے آپ کا موڈ خراب ہو جاتا ہے؟"

☆ "کوئی پلان بناؤں اور وہ پلان پورا نہ ہو یا کوئی اس کو تبدیل کر دے اور دوسری بات یہ کہ کوئی وقت پر نہ پہنچے تو۔"

54 "اپنے لباس میں کن دو باتوں کا خاص خیال رکھتی ہیں؟"

☆ "بہت شوخ نہ ہو اور ایسا لباس ہو جو میں ہر جگہ آسانی سے بغیر کسی جھجک کے پہن کر چلی جاؤں۔"

55 "کن دو افراد کے ساتھ بارش انجوائے کرتی ہیں؟"

☆ "دوستوں کے ساتھ اور اپنے بیٹے کے ساتھ۔"

56 "کن دو کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"

☆ "چھپکلی اور لال بیگ۔"

57 "دو ریسٹورنٹ جہاں کھانا کھانے میں مزا آتا ہے؟"

☆ "میکڈونلڈ اور کے ایف سی۔"

58 "دو چینلز جو آپ شوق سے دیکھتی ہیں؟"

☆ "ہم اور دیگر انٹرٹینمنٹ۔"

59 "دو تبدیلیاں جو آپ اپنی شخصیت میں لانا چاہتی ہیں؟"

☆ "کہ اگر مجھے کوئی بات سمجھائے تو میں اسے مان لوں اور اپنے بڑوں کی بہت زیادہ بات مانوں۔"

60 "اپنے ملک کے دو شاپنگ مال جہاں سے شاپنگ کرتی ہیں؟"

☆ "پلازہ اور پارک ٹاور۔"

61 "کھانے کی ٹیبل پہ کون سی دو چیزیں نہ ہوں تو کھانے کا مزا نہیں آتا؟"

☆ "کوئی ایسی بات نہیں۔ آرام سے ہر چیز کھا لیتی ہوں۔"

62 "اپنے بیگ یا والٹ میں کون سی دو چیزیں لازمی رکھتی ہیں؟"

☆ "اے ٹی ایم کارڈ اور شناختی کارڈ۔"

63 "کون سی دو شخصیات کو اغوا کرنا چاہیں گی اور تاوان میں کیا وصول کریں گی؟"

☆ "بہت مزے کا سوال ہے۔ صدر آصف علی زرداری کو اغوا کرنا چاہوں گی اور تاوان میں سارا ملک لینا چاہوں گی۔ بس یہی مل جائے تو بہت ہے۔"

☆

اُترے مری خاک پہ ستارے

آدم آفتاب

پروفیسر سحر انصاری (شاعر و ادیب)

1 یہ باتیں بظاہر غیب کی لگتی ہیں، لیکن زمینی حقائق بھی بہت کچھ ظاہر کرتے ہیں۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاید حالات میں کچھ بہتری کی امید بہرحال موجود ہے۔ گزشتہ سال دو، تین بڑے اندوہناک واقعات ملک میں رونما ہوئے۔ جس سے خارجہ پالیسی اور حکومت کو خاصا دھچکا لگا۔ مگر ان سب کے باوجود ہمارے حکمران نے اچھا موقف اختیار کیا۔ جس سے بہتری کے اسباب بہرحال نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ 2012ء میں معاشی صورت حال پر خاص توجہ دینی ہوگی۔ برآمدات، زراعت اور تعلیم و صحت زیادہ توجہ کے متقاضی ہیں۔

ملک کو بہت سے مسائل درپیش ہیں۔ اندرونی اور بیرونی دباؤ کے زیر اثر پاکستان اپنی بقا کی جدوجہد میں ہے۔ بہت سے مسائل حکومتی اور ادارتی سطح پر توجہ کے متقاضی ہیں۔

2011ء کا ڈھلتا سورج اپنے دامن میں بدامنی، کرپشن، دہشت گردی، خوف و ہراس، آہیں اور سسکیاں لے کر ڈوب چکا ہے۔

2012ء کا نیا سورج امید کی نئی کرنوں کے ساتھ طلوع ہوا ہے اور یہی پیغام دے رہا ہے کہ منزل ابھی دور ہے، لیکن ایک دیا بہرحال روشن ہے کہ چلتے رہے تو یہ کارواں اپنی منزل ضرور پالے گا۔ دیے سے دیا جلے گا۔ پاکستان کا ڈولتا وجود ایک دن مستحکم ملک کے طور پر ابھر کر سامنے آئے گا۔ ایک ایسے پاکستان کی صورت جس کا خواب ہمارے قائد نے دیکھا تھا اور اس خواب کی تعبیر کے لیے ایک جھنڈے تلے قوم کو یکجا کیا۔ ہمیں قائد کے روشن پاکستان کا خواب سچا کرنا ہے۔۔۔ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنے حصے کا کام کرنا ہے۔ کہ!

گھر تو آخر اپنا ہے
اور اس گھر کو مستحکم بنانا ہے۔

اس سلسلے میں اداکاروں اور ادیبوں سے سروے کیا ہے۔ دیکھتے ہیں کہ وہ اس کا کیا جواب دیتے ہیں۔

سوالات

1 2012ء میں پاکستان کا مستقبل کیا ہوگا؟
2 جمہوریت کے استحکام اور معاشرے کی بہتری کے لیے کیا میڈیا اپنی ذمہ داری بہ احسن نباہ رہا ہے؟
3 اگر آپ کو ملک کا وزیراعظم بنا دیا جائے تو آپ سب سے پہلے کیا اقدامات کریں گے؟

2 اس کے بارے میں کچھ کہنا ذرا مشکل ہے۔ میڈیا رول پلے تو کر تا ہے۔ مگر اس کے باوجود بہت واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ میڈیا کچھ شخصیات اور پارٹیوں کے حوالے سے جانبداری کا مظاہرہ کرتا ہے۔

3۔ اگر مجھے وزیراعظم کا عہدہ ملا تو سب سے پہلے تعلیم اور صحت کے شعبوں پر توجہ دوں گا۔

فرحت عباس شاہ (شاعر)

1 ہم خوش امید لوگ ہیں۔ شاعر ہمیشہ خوش امید ہوتے ہیں۔ 2012ء میں توقع ہے کہ اچھا ہی ہوگا۔ جمہوری حکومت کو اپنی مدت پوری کرنی چاہیے۔ نئے لوگ جو آرہے ہیں، وہ تازہ دم ہیں۔ انہیں موقع ملنا چاہیے۔ ان سے بہتری کی امید کی جاسکتی ہے۔

2 بالکل بھی نہیں، ایک افراتفری کی کیفیت ہے۔ رسہ کشی ہے۔ مقابلہ بازی نظر آتی ہے۔ میڈیا کے جو رولز ہونے چاہئیں وہ بالکل بھی نظر نہیں آتے بلکہ انفرادی مفادات پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ مجموعی طور پر رول ادا کرنے میں میڈیا ناکام ہے۔ کوئی ڈائریکشن نہیں ہے۔ میڈیا بے مہار ہو کر رہ گیا ہے۔

3 اس کے لیے معافی مانگ لوں گا۔ حکومت سے بہتر ہے کوئی نوکری کرلوں پر حکومت مشکل ہے۔

وصی شاہ (شاعر و ادیب)

1 پاکستان کا مستقبل کچھ غیر یقینی سا ہے۔ اس لیے کہ کوئی سیاسی قوت نظر نہیں آرہی جو پاکستان کو درپیش اندرونی یا بیرونی مشکلات سے نکال سکے۔ لیکن پھر بھی اچھے کی امید ہے۔ اچھی سوچ ہو تو بہتری ضرور آئے گی۔

2۔ میں سمجھتا ہوں کہ جمہوریت کو لانے میں میڈیا نے بہت اہم رول ادا کیا۔ یہ ایک مثبت پہلو ہے۔ مگر اس کے بعد کا رول میڈیا کا خاصا منفی رہا ہے۔ بہت سارے ایشوز جو جمہوریت کے خلاف تھے۔ ان کو بہت زیادہ ہائی لائٹ کیا گیا۔ جس سے جمہوریت کو نقصان بھی پہنچا ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ میڈیا کا رول مثبت اور منفی دونوں طرح سے ہے۔

3 پہلی بات تو یہ ہے کہ میں اس ریس میں نہیں ہوں۔ اگر کسی کو بنایا جائے تو سب سے زیادہ توجہ تعلیم پر دینا ہوگی۔ تعلیم ایک ایسی چیز ہے جو پاکستان میں بہت بڑی تبدیلی لے کر آئے گی۔

عاصمہ شیرازی (اینکر پرسن)

1 پاکستان کا مستقبل روشن ہے۔ پر شرط یہ ہے کہ۔

بقیہ صفحہ 261 پر

نبیلہ عزیز

درِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دونوں بہن بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ اقبال مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے

[illegible] نہیں دیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین [illegible] دوسروں کو [illegible] دیتا ہیں۔

۱۷

سترہویں قسط

رات بہت سرد تھی۔
برف کی ہلکی ہلکی سی پھوار اب بھی جاری تھی اور اس ٹھٹھرا دینے والے موسم میں کوریڈور سے باہر مین ڈور کے سامنے والے حصے میں ٹہلتے منصور حسین کی ٹانگیں شل ہو چکی تھیں وہ کل اور آج کی مسلسل ڈرائیو سے کافی تھکا ہوا تھا اور اوپر سے سردی نے برا حال کر رکھا تھا نیند اور تھکن کی وجہ سے اس کی آنکھیں بھی کافی بوجھل ہو رہی تھیں وہ سر جھکائے چادر لپیٹے دائیں بائیں ٹہل رہا تھا اسے پتا تھا کہ اگر وہ تھوڑی دیر کے لیے بھی اپنے کمرے میں گیا تو اسے نیند آجائے گی اور آنر صاحب خوامخواہ اس پہ خفا ہوں گے اس لیے وہ اپنی ڈیوٹی ایمانداری سے نبھاتے ہوئے اپنے آپ کو سردی کے حوالے کیے ہوئے تھا۔
"منصور حسین۔" اپنے عقب سے اجنبی آواز سن کر منصور حسین چونک کر پلٹا سامنے کوئی اور نہیں اس بنگلے کا چوکیدار کھڑا تھا جس کے ساتھ منصور حسین کی صبح بھی ملاقات ہو چکی تھی۔
"ہوں۔" اس نے صرف "ہوں" کہنے پہ اکتفا کیا تھا۔
"یہاں تو بہت ٹھنڈ ہے؟"
"ہاں! جانتا ہوں۔"
"پھر یہاں کیوں ٹہل رہے ہو۔؟" چوکیدار نے حیرانی سے پوچھا۔
"مجبوری ہے" آرڈر ملا ہے یہاں ٹہلنے کا۔" منصور حسین کا لہجہ طنزیہ اور تلخ سا ہو گیا۔
"او اچھا۔ لیکن اتنی ٹھنڈ میں کب تک اس طرح ٹہلتے رہو گے۔؟ اگر کہو تو کوئلوں والی انگیٹھی لا دوں؟" چوکیدار کو اتنی سردی میں ٹہلتے منصور حسین سے کافی ہمدردی محسوس ہوئی۔
"ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میری گھر والی نے کوئلے دہکائے ہیں۔ تم کہتے ہو تو لے آتا ہوں۔" چوکیدار کافی کھلے دل کا اور مہمان نواز لگتا تھا اس سے منصور حسین کی سردی دیکھی نہیں جا رہی تھی۔
"ارے نہیں یار' تمہاری مہربانی! میں ایسے ہی ٹھیک ہوں 'تمہاری گھر والی نے تمہارے لیے کوئلے دہکائے ہیں' تم بھی تھکے ہوئے ہو گے بس آتش لو جا کر۔" اس نے چوکیدار کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے تھپکا اور اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کی پیشکش سے انکار کر دیا۔
"ارے یار! ہم تو روز یہ آتش لیتے رہتے ہیں اور اگر نہ بھی لیں تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم تو اس موسم کے عادی ہو چکے ہیں 'لیکن تم یہاں نئے ہو' تم عادی نہیں ہو' اس لیے ڈر ہے کہ موسم تم پہ اثر نہ کر جائے۔" چوکیدار کے متفکر سے خیال پہ منصور حسین کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔
"کیا مجھے دیکھنے کے بعد بھی تمہیں یہ لگ رہا ہے کہ موسم مجھ پہ اثر کر جائے گا۔؟" منصور حسین کا اشارہ اپنی صحت کی طرف تھا۔
"کیوں منصور حسین تم انسان نہیں ہو کیا؟ جس پہ موسم اثر نہیں کر سکتا؟" چوکیدار کا سوال بھی بجا تھا۔
"انسان ہوں یار! لیکن ایک مرد ہوں' اور مرد پہ موسم اثر نہیں کرتے' مرد پہ عورت اثر کرتی ہے' صرف عورت۔ اور موسم عورت پہ اثر کرتے ہیں ان تینوں کا ازل سے تال میل ہے آپس میں' مرد' عورت اور موسم تینوں کو کبھی ایک جگہ اکٹھا کر دو تو قیامت کا پاگل پن اٹھائیں گے۔" منصور حسین کا جواب بھی بجا تھا چوکیدار واقعی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔
"کیا بات کہی ہے منصور حسین' دل خوش ہو گیا ہے اور اسی خوشی میں تمہارے لیے چائے کا ایک کپ بھی ہو گیا۔" چوکیدار منصور حسین کو شاباش دیتے ہوئے پلٹ کر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد ہی وہ اس کے لیے دہکتے کوئلوں والی انگیٹھی لے آیا تھا اور پھر اسے انگیٹھی کے قریب کرسی بھی کھینچ دی۔

"تم بیٹھ کر ہاتھ سینکو میں چائے لے آؤں۔" وہ دوبارہ اپنے کوارٹر کی سمت چلا گیا اور منصور حسین کرسی پہ بیٹھ کے آگ کی تپش سے لطف اندوز ہونے لگا تھا دہکتے سرخ انگارے انگیٹھی میں جیسے بھڑک رہے تھے اور وہ ان دہکتے بھڑکتے کوئلوں پہ نظر جمائے نہ جانے ان میں کیا کھوج رہا تھا کہ اسے چوکیدار کی واپسی کا بھی احساس نہیں ہوا۔
"لو منصور حسین چائے پیو۔" چوکیدار نے چائے کا بھاپ اڑاتا کپ اس کے چہرے کے سامنے کیا تھا وہ اپنی بیوی سے کڑک گرم تازہ چائے بنوا کے لایا تھا منصور حسین نے چونک کر اسے دیکھا پھر مسکرا دیا۔
"مہربانی ہے یار' کافی زحمت کی ہے تم نے۔" وہ اس کے ہاتھ سے کپ تھامتے ہوئے کافی ممنون سے لہجے میں بولا۔
"ارے! زحمت کیسی۔؟ تم مہمان ہو یہاں' اور دوسری بات کہ تم ملازم ہو اور ایک ملازم کی حالت کو ایک ملازم ہی سمجھ سکتا ہے' مالک لوگ اپنا تو خیال کر لیتے ہیں' تمہارے اور میرے جیسے ملازموں کا نہیں کرتے' اس لیے ایک دوسرے کا خیال اور احساس ہمیں خود کرنا چاہیے' مالکوں سے ایسی امید فضول ہوتی ہے۔" چوکیدار مسکرا کے کہتے ہوئے دوسری کرسی کھینچ کے اس کے مقابل ہی بیٹھ گیا۔
"ارے نہیں یار! ایسی کوئی بات نہیں ہے' ہمارے مالک لوگ اتنے برے بھی نہیں ہیں' کافی خیال رکھتے ہیں' اب یہی دیکھ لو میں نے یہاں آنا تھا اور میرے پاس گرم کپڑے بھی نہیں تھے اس لیے علیزے بی بی نے پیسے دیے اور میں جا کر اپنے لیے گرم کپڑے اور یہ گرم چادر لے آیا' اب اگر یہاں سردی میں میں اپنی ڈیوٹی نبھا رہا ہوں تو میرے پاس گرم کپڑوں کا تھوڑا بہت سہارا تو ہے نا۔؟ اگر یہ بھی نہ ہوتا تو میں واقعی ٹھٹھر رہا ہوتا' اس سے اب تم ہی اندازہ لگاؤ کہ ہمارے مالک اچھے ہیں یا برے۔؟" منصور حسین نے اپنے مالکوں کی طرف داری کی اور چوکیدار مزید کچھ نہیں کہہ سکا وہ اس کے جواب پہ خاموش ہو گیا لیکن تھوڑی دیر بعد منصور حسین اسے دوبارہ سے اپنے ساتھ باتوں پہ آمادہ کر چکا تھا ان دونوں کی کچھ دیر کے لیے محفل جم گئی تھی۔
"تم سگریٹ بھی پیتے ہو۔؟" چائے کے بعد منصور حسین نے سگریٹ اور ماچس کی ڈبیا نکالی تو چوکیدار نے بے ساختہ پوچھ لیا۔
"ہاں یار! شراب مہنگی ہے وہ نہیں پی سکتا سگریٹ سستا ہے اس لیے پی لیتا ہوں۔" اس نے سگریٹ کو دیکھتے ہوئے استہزائیہ سے انداز میں کہا اور پھر سگریٹ کو ہونٹوں میں دبا کر ماچس کا شعلہ جلا لیا۔ لیکن سرد ماحول اور سرد ہوا کے باعث ماچس کی تیلی کا یہ ننھا سا شعلہ فوراً بجھ گیا تھا وہ ایسے سرد موسم کی تاب نہیں لا پایا تھا اس لیے منصور حسین کو ایک اور تیلی جلانی پڑی لیکن اب کی بار منصور حسین نے اس شعلے کو ہاتھ کی اوٹ کا سہارا دیا اور اپنے ہاتھ کی سمت ذرا سا جھکتے ہوئے سگریٹ کا کش لیا اور سگریٹ سلگا لیا۔
"یہ بھی نہ پیا کرو۔" چوکیدار نے منع کیا تھا۔
"جس روز یہ بھی مہنگا ہو گیا اس روز نہیں پیوں گا۔" اس نے انگلیوں میں دبے سگریٹ کو دیکھ کر سر جھٹکا۔
"اچھی بات ہے۔" چوکیدار مسکرایا۔ اور منصور حسین ادھر ادھر دیکھنے لگا چوکیدار کی باتیں اور سوال و جواب اب بھی جاری تھے ان کی نشست کافی دیر قائم رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

مری میں کوئی سینما نہیں تھا جہاں وہ فلم دیکھنے کے لیے جاتے' یہاں کسی نے اپنی رہائش گاہ کو سینما کا روپ دے رکھا تھا بڑے سے وسیع و عریض ڈرائنگ روم کو ہر چیز سے خالی کر کے پورے ہال میں کرسیوں کا انتظام کر رکھا تھا

اور ایک صاف دیوار پہ پروجیکٹر کے ذریعے فلم دکھائی جاتی تھی۔ یہاں کا ماحول بھی ان سب کو خاصا دلچسپ لگا تھا۔ ان کے علاوہ اور بھی چند منچلے اور بے فکرے لوگ موجود تھے۔

"حرمت! تم لوگ کھانے کے لیے کچھ لوگی۔؟" یہاں موجود ہر آدمی کے ہاتھ میں کھانے کے لیے کوئی نہ کوئی چیز ضرور تھی جسے دیکھ کر آذر کو لڑکیوں کا خیال آیا تھا۔

"جی! میں پاپ کارن لوں گی۔" حرمت نے فوراً" اپنی پسند بتادی۔ پھر باری باری سب نے اپنی پسند آذر کو بتائی۔ آذر سرہلا کر پلٹ گیا لیکن کچھ یاد آنے پہ دوبارہ ان کی سمت پلٹا تھا۔

"ارے کومل! آپ نے تو کچھ بتایا ہی نہیں۔۔؟" اس نے انوشہ کے ساتھ ایک سائیڈ پہ کھڑی کومل سے حیرت سے استفسار کیا تھا۔

"آپ نے کچھ پوچھا بھی تو نہیں۔۔؟" کومل نے آہستگی سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔

"پوچھا تو میں نے انوشہ اور جویریہ سے بھی نہیں، پھر بھی انہوں نے اپنی پسند بتادی ہے۔" آذر کے جواب پہ کومل لاجواب ہوگئی تھی۔

"اپنی پسند بتادینا اچھا ہوتا ہے، سامنے والے کو بندے کی پسند اور ناپسند کا پتا تو چل جاتا ہے نا؟ اور اس طرح دوسرا بندہ آگاہ بھی ہوجاتا ہے، بڑے فائدے ہوتے ہیں پسند بتادینے کے۔" انوشہ نے فوراً" مداخلت کی تھی اور کومل نے چونک کے دیکھا۔ انوشہ کی بات ذو معنی تھی۔

"بتائیے اپنی پسند میں سن رہا ہوں۔" آذر انتظار میں کھڑا تھا۔

"آئس کریم۔" کومل نے آہستگی سے کہا۔

"آئس کریم۔؟ اس موسم میں۔۔؟" آذر کو اچنبھا ہوا۔

"جی! اس موسم میں۔" کومل نے سرہلایا۔

"لیکن کومل اس موسم میں آئس کریم سے گلا خراب ہوجائے گا' بیمار پڑجاؤ گی۔" آذر نے اسے باز رکھنا چاہا۔

"اسی موسم میں ہی تو آئس کریم کھانے کا مزا آتا ہے' آپ بھی ٹرائی کرکے دیکھیں۔" کومل بے ساختہ کہتے ہوئے مسکرائی تھی۔

"اوکے ایزیو وش۔" اس نے کندھے اچکائے اور زین کو ساتھ لے کر باہر نکل گیا تھا اس گھر سے باہر ہی چھوٹی سی کینٹین بنی ہوئی تھی وہیں پہ کھانے پینے کی ہر چیز دستیاب تھی تھوڑی دیر بعد وہ ان سب کی پسند کی تمام چیزیں لے آیا تھا لڑکے پہلے ہی کچھ نہ کچھ کھاتے پھر رہے تھے اور اتنے میں فلم بھی اسٹارٹ ہوگئی وہ سب اپنی اپنی جگہ پہ لگ کے بیٹھ گئے تھے کومل' آذر کے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

علیزے اپنے روم میں آتے ہی گہری نیند سوگئی تھی سردی اور تھکن کی وجہ سے جیسے ہی اسے بستر کی نرمی اور کمرے میں موجود ہیٹر کی گرمائش میسر آئی اس کی پلکیں فوراً" ہی بند ہونے لگیں اور چند سیکنڈز میں ہی وہ پرسکون اور گہری نیند کی وادیوں میں اتر گئی تھی اسے یہ بھی خبر نہیں تھی کہ باہر موسم اپنی کن جولانیوں پہ ہے۔؟ وہ جس کروٹ سوئی تھی اتنی دیر اسے اسی کروٹ پہ گزر گئی تھی بہت دیر گزر جانے کے بعد اسے نیند میں ہی تھکن کا احساس ہوا تو اس نے دائیں طرف سے بائیں طرف کروٹ بدلی اور کروٹ بدلتے ہوئے ہی اس کی آنکھ کھل گئی تھی اس نے سرسری سے انداز میں دیکھا اور دوبارہ پلکیں موندلی تھیں لیکن پلکیں موندنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ اس نے کوئی غیر معمولی چیز دیکھی ہے۔ جس کی وجہ سے علیزے نے یکدم پٹ سے آنکھیں کھول دی تھیں۔

دائیں طرف کھلنے والی کھڑکی کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا اور پردے پہ کسی آدمی کا سایہ لہرا رہا تھا۔ اور پردہ بھی ہل رہا تھا۔ علیزے کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور اس کے دل و دماغ میں خوف کی ایک لہر سرائیت کرگئی تھی۔

"کک۔۔ کون۔۔ ہے۔۔؟" اس نے خوف زدہ سے لہجے میں پوچھنے کی کوشش کی لیکن اس پہ ایسی وحشت سوار ہوئی تھی کہ حلق سے اس کی آواز ہی نہ نکل سکی اور اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ اپنے بستر سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس جاتی اور یہ دیکھ لیتی کہ باہر کون ہے؟

"پاپا۔" علیزے نے گھٹی گھٹی سی آواز میں اپنے پاپا کو پکارا جیسے وہ اس کے پکارنے پہ فوراً" اس کے پاس پہنچ جائیں گے' علیزے کو اپنی موت اپنے بہت قریب محسوس ہورہی تھی' دل تھا کہ اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا جارہا تھا اور خوف تھا کہ اس کی روح کھینچ رہا تھا علیزے کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے باہر سے سرگوشیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی اور ان سرگوشیوں میں کوئی کیا کہہ رہا تھا اسے کچھ خبر نہیں تھی۔

"آذر بھائی۔" اس کی دوسری پکار آذر بھائی کے لیے تھی لیکن وہ اپنے پاپا کو اور آذر بھائی کو یہاں بستر میں بیٹھے بیٹھے نہیں بلاسکتی تھی' انہیں بلانے کے لیے اسے فون کی ضرورت تھی لیکن اسے یہ بھی یقین تھا کہ آذر بھائی کے آنے تک وہ زندہ نہیں بچے گی لیکن پھر بھی لرزتے کانپتے ہاتھوں سے وہ موبائل ٹٹولنے لگی اور سائیڈ ٹیبل سے موبائل ٹٹولتے ہوئے پانی کا جگ دھڑام سے زمین پہ گرا اور چکنا چور ہوگیا تھا علیزے خود بھی چیخ کے اٹھ بیٹھی تھی اس نے وحشت زدہ ہوکر یکدم کھڑکی کی سمت دیکھا جہاں سے کسی نے ہاتھ اندر بڑھا کر کھڑکی کا پٹ زور سے بند کردیا تھا اور اس منظر پہ علیزے کی چیخ بڑی بے ساختہ تھی وہ یکدم بستر سے چھلانگ مار کے اتری اور دروازہ کھول کے باہر بھاگ نکلی تھی۔

ٹھنڈے فرش پہ ننگے پیر اور ننگے سر بھاگتی ہوئی وہ چیخ رہی تھی اس کا رخ کوریڈور کی سمت تھا اور کوریڈور سے باہر لاؤنج میں منصور حسین بھی اس کی چیخوں کی آواز پہ بری طرح چونک گیا تھا۔

"علیزے بی بی۔۔؟" وہ اندر کی چویشن سے پریشان اپنی جیب سے ریوالور نکال کے کوریڈور کی سمت لپکا لیکن علیزے کوریڈور کا تمام فاصلہ طے کرتی ہوئی آئی اور سامنے سے آتے منصور حسین سے بری طرح لپٹ گئی۔ اور منصور حسین اس کے اس طرح لپٹ جانے پہ ساکت و صامت رہ گیا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا' علیزے بی بی اس کے سینے سے آلگی تھیں۔۔؟ حیرت تھی' نہ قیامت تھی' کچھ اور ہی عالم تھا' علیزے کا چہرہ منصور حسین کے گرد بڑی گرم چادر میں چھپ گیا تھا اتنا کہ منصور حسین کے سینے سے لگ گیا تھا۔

"علیزے بی بی۔" منصور حسین نے اپنے مضبوط اعصاب اور بلند کردار کا ثبوت دیتے ہوئے اسے احتیاط سے متوجہ کیا تھا۔

"میرے۔۔ ڈرائیور! وہ۔ وہ۔ میرے۔ کمرے میں۔۔ کوئی۔۔ آدمی۔۔ کوئی۔۔ آدمی گھسنے کی۔۔ کک۔۔ کوشش۔۔ کررہا تھا۔" علیزے بے ربط سے لہجے میں بمشکل بول پائی تھی۔ منصور حسین یکدم چونک گیا تھا۔

"کوئی آدمی۔۔؟ کب؟ آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔؟" منصور حسین نے اسے پیچھے ہٹا کر اس کے کمرے کی سمت بڑھنا چاہا تھا لیکن علیزے اس سے الگ ہوکر پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھی منصور حسین جھنجلا گیا اس نے علیزے کو دونوں کندھوں سے تھام کے اسے خود سے الگ کیا وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔

"آپ میرے پاس کیوں چھپ رہی ہیں؟ میں آپ کا ملازم ہوں ملازم' آپ کا ڈرائیور منصور حسین' کچھ اور مت سمجھے مجھے۔" اس نے علیزے کو ذرا سا جھنجوڑ کے اسے ہوش دلایا تھا تاکہ اس کے حواس ٹھکانے پہ

آجائیں کیونکہ منصور حسین کو پتا تھا کہ وہ ایسی حرکت بدحواسی میں کر رہی ہے اور وہ اس کے جھنجوڑنے پہ واقعی ہوش میں آگئی تھی اور ہوش میں آتے ہی اسے پہلا خیال منصور حسین کے ہاتھوں کے لمس کا آیا تھا وہ یکدم چونک کے پیچھے ہٹی اور اس کے پیچھے ہٹتے ہی منصور حسین کو اس کی بدحواسی کا مزید احساس ہوا تھا وہ ننگے پاؤں اور ننگے سر کھڑی تھی۔ منصور حسین اپنی گرم چادر اس کی سمت بڑھاتے ہوئے اس سے نظر چرا کر اس کے کمرے کی طرف بڑھ گیا علیزے کو بھی اپنے دوپٹے کی کمی کا احساس ہوا تھا اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی چادر اپنے اردگرد اوڑھ لی اور کوریڈور میں تنہا کھڑے رہنے کی بجائے وہ بھی منصور حسین کے پیچھے اپنے کمرے میں چلی آئی وہ اس کے کمرے کی تمام لائٹس جلا چکا تھا۔

"کیا ہوا ہے یہاں؟ کہاں دیکھا ہے آپ نے کسی آدمی کو۔۔؟" منصور حسین اس کے پورے کمرے میں جائزہ لیتے ہوئے کھوجتی نظروں سے دیکھ رہا تھا بیڈ کے قریب فرش پہ پانی گرا ہوا تھا اور شیشے کے جگ کے ٹوٹے ہوئے کانچ کافی دور تک بکھرے ہوئے تھے قریب ہی علیزے کا موبائل بھی پانی میں گرا ہوا تھا۔

"وہاں کھڑکی کے پاس۔" علیزے نے ڈرتے ڈرتے اشارہ کیا۔ منصور حسین کانچ کے ٹکڑوں کو اپنے بوٹوں تلے روندتا ہوا کھڑکی کے قریب چلا آیا کھڑکی کے پٹ آپس میں ملے ہوئے تھے لیکن کھڑکی کا لاک واقعی کھلا ہوا تھا اس نے پردہ ہٹا کر اپنا ریوالور ریڈی کیا اور یکدم دونوں پٹ کھول دیے لیکن باہر کوئی بھی نہیں تھا منصور حسین نے کھڑکی سے باہر سر نکال کے جھکتے ہوئے دائیں بائیں دیکھا۔ لیکن وہاں تو دور دور تک کسی کا نام و نشان تک نہیں تھا ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔

"یہاں تو کوئی نہیں ہے علیزے بی بی۔۔؟" اس نے پلٹ کر دم سادھے کھڑی خوف زدہ سی علیزے کو دیکھا۔

"وہ یہاں ہی کھڑا تھا اس نے' اس نے جگ گرنے کی آواز سن کر کھڑکی بند کر دی' وہ بھاگ گیا ہوگا۔" علیزے کہتے ہوئے رو پڑی تھی اس کا پورا جسم لرز رہا تھا دوسری بار ایسا ہوا تھا کہ وہ کسی بڑے حادثے سے بچ نکلی تھی لیکن ہر بار تو ایسا نہیں ہو سکتا تھا نا۔۔؟

"وہ کون تھا۔۔؟ کیسے آیا اور کیسے بھاگ گیا۔۔؟ گیٹ کے سامنے اور چوکیداری کے باہر تو میں پہرہ دے رہا تھا۔۔؟" منصور حسین کو حیرت اور پریشانی ہو رہی تھی اس کی موجودگی میں علیزے بی بی کو کچھ ہو جاتا تو وقار آفندی کے سامنے اسے ہی جوابدہ ہونا پڑتا' انہوں نے علیزے کی حفاظت اسی کے ذمے لگا کر بھیجا تھا منصور حسین کو سوچ کر ہی معاملے کی سنگینی کا احساس ہو گیا اسی لیے وہ زیادہ پریشان ہو رہا تھا۔

"آپ بیٹھیں میں ابھی آتا ہوں۔" وہ باہر نکلنے لگا۔

"نہیں ڈرائیور! تم کہیں نہیں جاؤ گے۔" علیزے اکیلے پن سے ڈر رہی تھی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ ٹھہر گیا۔

"مجھے اکیلے ڈر لگ رہا ہے۔"

"اور مجھے آپ کے ساتھ ڈر لگ رہا ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"کچھ نہیں۔" منصور حسین کہہ کے باہر نکل گیا اور وہ لان کے اس حصے کی طرف آیا جہاں علیزے کے کمرے کی کھڑکی کھلی تھی' کھڑکی سے باہر لان کی روندی ہوئی گھاس سے لگ رہا تھا کہ واقعی وہاں کوئی آیا تھا اس نے اس بنگلے کی چھوٹی چھوٹی دیواروں کو دیکھا جہاں سے کوئی بھی کود کر باآسانی اندر آ سکتا تھا منصور حسین ان سب دیواروں سے جھانک کے بھی دیکھ آیا تھا لیکن اسے کوئی مشکوک آدمی نظر نہیں آیا بلکہ منصور حسین سوچ رہا تھا کہ جو بھی یہاں آیا تھا اس کی اسپیڈ بہت تیز تھی جو وہ اتنی جلدی غائب ہو گیا۔

"کوئی ملا۔۔؟" وہ واپس آیا تو علیزے نے چھوٹتے ہی استفسار کیا تھا۔

"اگر کسی نے ملنا ہوتا تو بھاگنے کی ضرورت کیا تھی بھلا۔۔؟" وہ مایوسی سے کہہ رہا تھا

"اب کیا ہوگا۔۔؟" علیزے پوچھتے ہوئے بھی ڈر رہی تھی وہ کافی خوف زدہ اور ڈری سہمی سی لگ رہی تھی اور اوپر سے ٹھنڈ کی وجہ سے اس کی رنگت الگ نیلی پیلی ہو رہی تھی۔

"میں آذر صاحب کو کال کر کے گھر بلاتا ہوں۔"

"نن نہیں۔۔ تت۔۔ تم ان کو کال مت کرو۔" علیزے نے بے ساختہ اسے روک دیا۔

"کیوں علیزے بی بی۔۔؟ اتنی بڑی بات ہو گئی ہے اور آپ۔۔؟" منصور حسین کو حیرت ہوئی۔

"اس سے پہلے اس سے بھی بڑی بات ہو چکی ہے اور تمہیں نہیں پتا کہ اس بات کا کتنا اثر ہوا تھا سب کتنے پریشان اور ڈسٹرب ہوئے تھے' اتنے دن حویلی کے سب لوگ اسی پریشانی کے زیر اثر رہے تھے اور اب بھی یقیناً" ایسا ہی ہوگا۔" علیزے پریشان اور کشمکش کا شکار تھی۔ منصور حسین کو اس کی بات پہ تعجب ہوا تھا۔

"لیکن علیزے بی بی۔۔"

"پلیز ڈرائیور! میں بہت پریشان ہوں' کیونکہ میں اپنی وجہ سے کسی کو پریشان نہیں کرنا چاہتی' پہلے ہی سب میری وجہ سے اتنا پریشان رہتے ہیں اور اب میری وجہ سے ان کا پروگرام خراب ہو' میں یہ نہیں چاہتی۔" علیزے کا لہجہ روہانسا ہو رہا تھا اس کے حلق میں آنسوؤں کا گولا سا اٹک گیا وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کے صوفے پہ بیٹھ گئی۔

"تو اس میں آپ کا کیا قصور ہے علیزے بی بی۔۔؟"

"میرا کوئی قصور نہیں ہے تو اس میں دوسروں کا کیا قصور ہے کہ میری وجہ سے وہ سب بھی ڈسٹرب ہوں۔" علیزے کی آواز بھیگ رہی تھی۔

"اس میں ڈسٹرب ہونے کی کیا بات ہے۔۔؟"

"تم سمجھ نہیں رہے' اس میں ڈسٹرب ہونے کی ہی تو بات ہے' پاپا کو یا آذر بھائی کو پتا چلے گا تو وہ فوراً" واپسی کا آرڈر دے دیں گے اور یہ سب جو اتنی خوشی خوشی گھومنے پھرنے کے لیے آئے ہیں ان کا موڈ خراب اور پروگرام ادھورا ہو کے رہ جائے گا' بلکہ آئندہ کبھی بھی اجازت نہیں ملے گی' ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سب پہ پابندی لگ جائے گی۔" علیزے بنیادی طور پہ ایک ڈری سہمی اور ڈرپوک سی لڑکی تھی اس وقت بھی اس کے دل میں خوف پوری طرح سے موجود تھا لیکن وہ اپنے اندر کے اس خوف کو دبائی ہوئی باقی سب کا خیال کر رہی تھی اسے پتا تھا کہ پاپا کا غصہ الٹا سب پہ ہوگا اور اسے ساتھ لانے والے آذر بھائی کو بھی پاپا کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔

"لیکن علیزے بی بی! اگر کوئی نقصان ہو گیا تو۔۔؟" منصور حسین کو اندر ہی اندر پریشانی لاحق تھی اسے بھی بار بار وقار آفندی کا ہی خیال آ رہا تھا۔

"نہیں ہوگا نقصان' تم رجو کو کہو آکر میرے کمرے میں سو جائے' میں اب لائٹ جلا کر سوؤں گی اور سنو' تم صرف گیٹ کی طرف ہی نہیں باقی گھر کی طرف بھی دھیان رکھنا' دیواریں کافی چھوٹی ہیں۔" اس نے منصور حسین کو تاکید کی اور منصور حسین اسے دیکھ کے رہ گیا' وہ چھوٹی سی کم عمر اور کمسن سی لڑکی دوسروں کے خیال سے اپنے اندر کا خوف اندر ہی دبا کر بہادری اور سمجھداری کا ثبوت دے رہی تھی۔ منصور حسین کو اس لمحے وہ معصوم سی لڑکی اچھی اور بہت پیاری لگی وہ بے ساختہ اسے ہی دیکھے گیا۔

"ڈرائیور۔۔" علیزے نے اسے یوں کھڑے دیکھ کر متوجہ کیا۔ وہ یکدم چونک گیا۔

"میں نے تم سے کچھ کہا ہے' سنا تم نے۔۔؟"

"ویری... جی... سب سن لیا ہے' ابھی بھیجتا ہوں۔" وہ فوراً" اس کے کمرے سے باہر نکل آیا اور رجو کو دوکا علیزے کے کمرے میں بھیج دیا' مگر اس کے باوجود منصور حسین کی پریشانی اور سوچ کم نہیں ہوئی تھی وہ اب زیا چوکس ہو کر جاگ رہا تھا اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اچانک یہ سب کیا ہوا ہے...؟

"کیا علیزے بی بی کا دشمن اتنا باخبر ہے کہ وہ ان کے پیچھے مری بھی پہنچ گیا ہے تو کیا واقعی علیزے بی بی کی جا کو خطرہ ہے...؟ لیکن ان کے دشمن نے انہیں ابھی تک کوئی نقصان نہیں پہنچایا... ہو سکتا ہے وہ موقع کی تلا میں ہو...؟" منصور حسین کے ذہن میں طرح طرح کی سوچیں اور طرح طرح کے سوال اٹھ رہے تھے' اسے ا مسئلے کا کوئی سر پیر نظر نہیں آرہا تھا' ریشم کی گتھی کی طرح ہر ڈوری الجھی ہوئی تھی اور سلجھنے کا نام ہی نہیں لے رہ تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ نرم بستر پہ اوندھی لیٹی گہری نیند سو رہی تھی جب اچانک اس کے سیل پہ اولڈ رنگ بجنے لگی۔

اس نے اس رنگ کی آواز سے بچنے کے لیے تکیہ اٹھا کر اپنے سر پہ رکھ لیا تاکہ اس کی نیند ڈسٹرب نہ ہو' دوسری طرف والا شاید کچھ زیادہ ہی ڈھیٹ یا مجبور تھا جو اسے بار بار رنگ کر رہا تھا' مدحیہ نے بالآخر غصے سے بھنا ہوئے تکیہ پرے پھینکا اور سیل اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

"ہیلو... ؟" اس کا غصہ اور بے زاریت اس کی ایک ہیلو میں ہی سمٹے ہوئے تھے۔

"میڈی! میں جبزی بات کر رہا ہوں۔" دوسری طرف کی آواز سن کر اسے مزید غصہ آیا۔

"یہ بھی کوئی وقت ہے بات کرنے کا...؟"

"میڈی... ! میں اس وقت مشکل میں ہوں۔" وہ بے چارا پریشان لگ رہا تھا۔

"مشکل میں... ؟ کیا مطلب... ؟" وہ کروٹ بدل کر سیدھے ہوتے ہوئے بولی۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا نا میں پاکستان آرہا ہوں... تو یار! میں اس وقت پاکستان میں ہوں۔"

"واٹ؟ پاکستان میں... ؟" وہ کرنٹ کھا کے اک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

"ہاں! پاکستان میں۔"

"مگر کہاں ہو؟"

"لاہور ایئر پورٹ پہ ہوں۔"

"اف مائی گاڈ... ! تم نے مجھے بتایا بھی نہیں؟" مدحیہ ایک تو نیند سے اٹھی تھی اور ایک جبزی کی اچانک آمد وہ حقیقتاً" پریشان ہو گئی اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے...؟

"میں نے سوچا تھا کہ تمہیں اچانک سرپرائز دوں گا' لیکن یہاں آکر مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ کہاں جاؤں اور کروں... ؟ تمہارے گھر کا پتا مجھے معلوم ہے' اسی لیے پریشان ہو کر تمہیں کال کی ہے۔" جبزی خود بھی شرمند ہو رہا تھا۔

"کیا بات ہے میڈی؟ تمہیں میرا آنا اچھا نہیں لگا...؟" مدحیہ کو خاموش دیکھ کر جبزی نے ساختہ پوچھا تھا۔

"ہوں؟ نہیں ایسی بات نہیں ہے تم وہیں ٹھہرو' میں ابھی آرہی ہوں۔" مدحیہ نے کہہ کر فون بند کر دیا او کمبل پرے ہٹا کر بستر سے اٹھ گئی' باتھ روم میں جا کر چہرے پہ پانی کے چھپاکے مارے اور تولیے سے چہرہ پونچھ ہوئی باہر نکل آئی' بلیک ٹراؤزر پہ اس نے وائٹ ہاف سلیوز ٹاپ پہن رکھا تھا اور ٹاپ کے اوپر ہی اس نے بلیک لانگ جرسی پہن لی' بالوں کو پونی میں جکڑ کے اپنا گرے کلر کا گرم مفلر کھینچا اور اپنے سر اور گردن کے ارد گرد لپیٹ

کر جوگرز کے گاڑی کی چابی، موبائل اور بیگ اٹھائے اور کمرے سے نکل آئی وہ کافی عجلت سے سیڑھیاں اتری تھی جس پہ ڈرائنگ روم میں ٹہلتے ممتاز حیات نے چونک کر دیکھا انہیں اپنے گھر میں اتنی جلدی کسی کے اٹھنے کی ہرگز امید نہیں تھی لیکن مدحیہ کو دیکھ کر انہیں اچنبھا ہوا تھا۔ وہ بھی انہیں دیکھ چکی تھی لیکن انہیں نظرانداز کرتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی۔

"رکو! کہاں جا رہی ہو تم۔۔؟" ان کی آواز پہ مدحیہ کے قدم ٹھہر گئے تھے وہ ان کے سوال پہ بہت خوش ہوئی تھی۔ اس نے ایڑیوں کے بل گھوم کر انہیں دیکھا۔

"ایئرپورٹ۔" مختصر سا جواب دیا تھا۔

"ایئرپورٹ۔۔؟" انہوں نے جواباً دہرایا تھا۔

"جی ایئرپورٹ، اپنے بوائے فرینڈ کو لینے کے لیے جا رہی ہوں، انگلینڈ سے آیا ہے، صرف مجھ سے ملنے کی خاطر۔" اس نے اک اک لفظ پر زور دیتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ کیا بکواس کر رہی ہو تم۔۔؟ نبیل کہاں ہے۔۔؟ اسے تمہاری بے ہودہ حرکتوں کا پتا نہیں ہے شاید۔۔؟" وہ یکدم غصے سے دھاڑے تھے۔ مدحیہ کے لبوں پہ ایک استہزائیہ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"یہی تو مجھے افسوس ہے کہ نبیل بھائی کو آپ کی بے ہودہ حرکتوں کا بھی پتا نہیں ہے شاید، ورنہ وہ آپ کو کب کا ذلیل کر کے اس گھر سے نکال چکے ہوتے۔" مدحیہ ممتاز حیات کے سامنے جب بھی بولتی تھی آگ اگلتی تھی اس کا دل چاہتا تھا وہ اپنے بدکردار باپ کو آگ لگا کر جلا دے، بھسم کر ڈالے ان کو، لیکن اس کی بے بسی تھی کہ اس کا بس نہیں چلتا تھا۔

"اپنی زبان کو لگام دو۔"

"آپ جیسے گھٹیا اور بے لگام انسان کی اولاد ہوں میں، مجھے کون لگام ڈال سکتا ہے بھلا۔۔؟" وہ ممتاز حیات کو بے عزت کرنے کا کوئی بھی موقع ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی شاید۔

"بکواس بند۔"

"ایم سوری! میں لیٹ ہو رہی ہوں، جبزی ایئرپورٹ پہ میرا انتظار کر رہا ہو گا، آپ کی یہ تکرار پھر کبھی سہی۔" مدحیہ ان کا خون جلاتی ہوئی اطمینان سے پلٹ کر کوریڈور عبور کر گئی اور پیچھے ممتاز حیات کا خون کھولتا رہ گیا۔ ممتاز حیات کو اس کے بوائے فرینڈ کا سن کر غصہ آیا تھا مدحیہ کے لیے یہ بہت بڑی بات تھی اس کا مطلب تھا کہ جو وہ سوچتی تھی، جو وہ چاہتی تھی وہ کر سکتی تھی۔۔؟

"ہوں! جبزی بہت اچھا کیا کہ تم پاکستان آ گئے۔" وہ ڈرائیو کرتے ہوئے جبزی کو دل ہی دل میں شاباش دے رہی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ ایئرپورٹ پہ موجود تھی اور جبزی کو ڈھونڈ رہی تھی۔

"میڈی۔" وہ ایئرپورٹ پہ موجود تمام نئے پسنجرز میں جبزی کو ڈھونڈ رہی تھی جب اسے اپنے عقب سے جبزی کی آواز سنائی دی۔

"جبزی۔" وہ بے ساختہ پیچھے پلٹی۔

"ہائے۔" جبزی نے بہت ہی دھیمے سے لہجے میں کہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے اندر امڈنے والی خوشی اور جذبے کو دبا رہا ہو۔

"کیسے ہو۔۔؟"

"پتا نہیں۔" جبزی نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔

"لگتا ہے پاکستان آ کر حواس گم ہو گئے ہیں تمہارے۔۔؟" مدحیہ نے دلچسپی سے اسے دیکھا تھا۔

"پتا نہیں۔"

"اف جبزی۔" مدحیہ اسے گھورتے ہوئے چیخ اٹھی تھی اور جبزی یکدم قہقہہ لگا کے ہنس پڑا جس پہ مدحیہ بھی اپنی مسکراہٹ روک نہیں پائی۔

"اچھی لگ رہی ہو۔" اس نے مدحیہ کو دیکھتے ہوئے تعریف کی۔

"اتنے دنوں بعد دیکھ رہے ہو اس لیے، ورنہ اتنی اچھی بھی نہیں لگ رہی میں نیند سے اٹھ کے ایسے ہی آ گئی ہوں۔" مدحیہ نے منہ بنا کے کہا تھا۔

"کیونکہ تمہیں پتا تھا کہ تم ایسے بھی اچھی ہی لگتی ہو۔" جبزی کی بات پہ مدحیہ یکدم کھلکھلا کے ہنسی تھی وہاں موجود کئی لوگ بار بار پلٹ کر انہیں دیکھ رہے تھے اور لوگوں کو دیکھنے کی وجہ سے جبزی تھا، پاکستانی مسلم لڑکی کے ساتھ انگریز لڑکا سب کے لیے دلچسپی اور تجسس کا باعث تھا۔

"ہوں! یہ بھی ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن کیا اب مجھے یہیں ایئرپورٹ پہ کھڑا رکھو گی۔۔؟ کافی تھک چکا ہوں میں۔" جبزی نے خود ہی اسے احساس دلایا تو مدحیہ بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔

"او کے او کے! چلو میرے ساتھ۔" وہ ہنستی ہوئی اسے کہہ کر آگے بڑھ گئی اور جبزی اپنے سامان والی ٹرالی دھکیلتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے آ گیا تھا۔ مدحیہ نے گاڑی کی ڈگی کھول کر اس کا سامان رکھوایا اور خود فرنٹ ڈور کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ گئی ساتھ ہی جبزی کے لیے اپنے برابر والی سیٹ کا ڈور کھول دیا تھا۔

"تھینک یو۔" جبزی نے بیٹھتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور مدحیہ پارکنگ سے گاڑی نکالنے لگی۔

"کتنے بجے کی فلائٹ تھی تمہاری۔۔؟" وہ ایئرپورٹ کے وسیع و عریض احاطے سے گاڑی نکالتے ہوئے جبزی کی سمت متوجہ ہوئی۔

"پانچ بجے کی۔"

"اور تم نے مجھے چھ بجے کال کی۔۔؟" اسے ٹائم بھی یاد تھا۔

"ہاں! ایک گھنٹہ تو باہر نکلنے میں ہی لگ گیا تھا۔"

"ہوں! اور سناؤ برائن، شیلے، کرسٹینا وغیرہ کیسے ہیں۔۔؟" وہ ایک روڈ سے یوٹرن لیتے ہوئے بولی۔

"سب ٹھیک ہیں اور سب ہی تمہیں مس کرتے ہیں۔۔؟" جبزی بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

"لیکن تم جیسا مس تو نہیں کرتے نا۔۔؟ تم نے مجھے مس کیا اور ملنے چلے آئے۔۔؟" مدحیہ مسکرا رہی تھی۔

"میرے مس کرنے کی شدت کو جانتی ہو۔۔؟" جبزی کا لہجہ دھیما مگر سوال بہت گہرا تھا مدحیہ ایسے سوال اور ایسی باتیں اکثر اگنور کر جاتی تھی۔

"شدت ہی تو ہے جو تم یہاں تک آ گئے ہو۔" مدحیہ نے جواب تو دیا تھا مگر سرسری سے انداز میں۔

"یعنی تمہیں شدت کا احساس نہیں ہے۔" جبزی نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ مدحیہ نے سن کر بھی ان سنی کر دیا اس معاملے پہ اگر مدحیہ نے جبزی کی کبھی بھی پذیرائی اور حوصلہ افزائی نہیں کی تھی وہ اپنی حد میں سمٹ کر رہ جاتی تھی۔

"کہاں لے کر جا رہی ہو۔۔؟" جبزی نے کچھ خیال آنے پہ پوچھا تھا۔

"اپنے گھر۔"

"نہیں میڈی! میں تمہارے گھر نہیں جانا چاہتا۔"

"تو پھر۔۔؟"

"میں کسی ہوٹل میں رہنا چاہتا ہوں۔"
"ہوٹل میں کیوں۔۔؟" مدیحہ نے اسے تعجب سے دیکھا۔
"بس میں ہوٹل میں ایزی فیل کروں گا۔"
"تو میرے گھر میں کیا پرابلم ہے۔؟"
"پرابلم کچھ بھی نہیں ہے۔ بس میں آزاد اور ریلیکس رہنا چاہتا ہوں' پلیز تم کسی اچھے سے ہوٹل کا رخ کرو۔" جھوزی اپنے کہے پہ قائم تھا۔
"کیا تم میری فیملی کی وجہ سے ایسا کہہ رہے ہو۔؟"
"نہیں میں اپنی وجہ سے ایسا کہہ رہا ہوں۔" وہ نہیں مان رہا تھا۔
"جھوزی! تم میرے مہمان ہو۔ تمہیں میرے ساتھ گھر چلنا چاہیے۔" وہ بھی ماننے کو تیار نہیں تھی۔
"دیکھو میڈی! میں تمہارا ہی مہمان ہوں' چاہے تمہارے گھر جاؤں یا نہ جاؤں۔"
"یہ کیسے مہمان ہو تم۔؟"
"بس تم سمجھ کر بھی نہیں سمجھوگی۔" جھوزی نے فوراً کہا۔
"بالکل۔"
"بہت ضدی ہو تم۔"
"تمہیں اب پتا چلا ہے۔؟" وہ ہنسی تھی۔
"بہت پہلے سے جانتا ہوں۔"
"لیکن پھر بھی ٹھیک طرح سے نہیں جانتے۔" وہ مایوسی سے سر ہلا رہی تھی اور پھر جھوزی کے اصرار پہ مجبوراً اسے ہوٹل کا رخ کرنا پڑا وہ اسے شہر کے مہنگے ترین ہوٹل میں لے آئی تھی' اس کے لیے کمرا ریزرو کروایا اور اسے کمرے میں چھوڑ کر "آرام کرنے کا کہہ کے واپس آ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

عدیل کو تین چار دن ہو گئے تھے وہ کام پہ نہیں جا سکا تھا لیکن اس نے فون کر کے باؤ امتیاز کو اپنی غیر حاضری کی وجہ ضرور بتا دی تھی وہ بھی سن کر بہت پریشان ہوئے تھے انہوں نے اسپتال آنا بھی چاہا تھا لیکن عدیل نے انہیں منع کر دیا کیونکہ امی اور اباجی کو تو اس نے بتایا ہی نہیں تھا کہ وہ کسی ورکشاپ میں کام کرتا ہے' اگر باؤ امتیاز اباجی کی عیادت کے لیے آ جاتے تو یقیناً" اس کا راز کھل جاتا اسی لیے اس نے انہیں روک دیا تھا لیکن وہ دوسروں کو روکنا بھول گیا' اباجی آج ہی اسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر آئے تھے اور وہ تینوں بھی ان کی عیادت کے لیے آج ہی آ گئے تھے۔ عدیل اباجی کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا جب باہر دروازے پہ دستک ہوئی تھی۔
"میں دیکھتا ہوں۔" وہ عابدہ خاتون کو اٹھنے سے منع کرتے ہوئے خود اٹھ کر باہر نکل آیا۔
"کون ہے۔؟" اس نے پوچھتے ہوئے دروازہ بھی کھول دیا۔
"السلام علیکم۔" سب سے پہلے چھوٹے نے سلام میں پہل کی تھی اور عدیل ٹھٹک گیا تھا۔
"وعلیکم السلام۔" عدیل انہیں دیکھ کر قدرے پریشان ہو گیا تھا اس نے ان سے کافی پریشان سے انداز میں ہاتھ ملایا تھا۔
"کیسے ہو استاد۔؟ چاچا جی کیسے ہیں۔؟" سلو نے ہاتھ ملاتے ہوئے اس کا حال پوچھا تھا۔
"ہوں! ٹھیک ہوں۔" عدیل نے کافی مختصر سا جواب دیا تھا۔

"کیا بات ہے۔؟ کوئی پریشانی ہے استاد۔؟" چھوٹا بھی اس کا متفکر سا چہرہ بھانپ چکا تھا۔
"نہیں! نہیں! ایسی کوئی بات نہیں ہے' آؤ تم لوگ اندر آ جاؤ۔" عدیل اب انہیں واپس تو نہیں لوٹا سکتا تھا اس لیے خود کو کمپوز کرتے ہوئے سامنے سے ہٹ گیا تھا وہ تینوں آگے پیچھے اندر داخل ہوئے تھے ان تینوں کے ہاتھ میں بے شمار شاپر تھے وہ کافی زیادہ فروٹ اور کھانے پینے کی چیزیں لائے تھے۔
"یار! اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔؟" عدیل نے وہی گھسا پٹا سا روایتی جملہ دہرایا۔
"یہ ہم تمہارے لیے نہیں اپنے انکل کے لیے لائے ہیں۔" چھوٹے نے مسکرا کے کہا۔
"انکل۔؟" عدیل نے چھوٹے کے اسٹائل پہ حیرت سے اسے دیکھا۔
"یس انکل' تمہارے فادر ہمارے انکل ہی تو ہیں۔" چھوٹے کا لب و لہجہ بدل گیا سلو اور جیدی بے ساختہ مسکرا دیئے تھے۔
"عدیل! باہر کون ہے بیٹا۔؟" عابدہ خاتون نے آواز دے کر پوچھا تھا۔
"السلام علیکم آنٹی! ہم ہیں عدیل صاحب کے کولیگ۔" سلو نے آگے بڑھ کر انہیں سلام کیا اور اپنا تعارف کروایا تھا۔
"وعلیکم السلام! آؤ آؤ بیٹا بیٹھو تم لوگ۔" عابدہ خاتون فوراً" اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں اور عدیل ان تینوں کے انداز دیکھ کر حیران رہ گیا تھا انہوں نے عدیل کا بھرم رکھ لیا تھا ورنہ وہ تو ان کی آمد پہ بری طرح پریشان ہو گیا تھا۔
"تھینک یو آنٹی! انکل کیسے ہیں۔؟"
"اللہ کا شکر ہے بیٹا! اب تو پہلے سے بہت بہتر ہیں۔"
"ہم تو بہت دنوں سے آنا چاہ رہے تھے لیکن عدیل صاحب نے خود ہی منع کر دیا' ہمارے سینئر ہیں یہ' اس لیے ان کی بات سے انحراف بھی نہیں ہو سکتا۔ مگر آج سوچا کہ اپنی مرضی ہی کر لیں۔" چھوٹے نے مسکرا کے کہا تھا اور عدیل غش کھا کے گرنے کو تھا وہ ان تینوں کو آنکھیں پھیلا پھیلا کے دیکھ رہا تھا ورکشاپ میں وہ کیا نظر آتے تھے اور اس وقت کیا نظر آ رہے تھے۔؟ عدیل کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔
"بیٹا! آپ لوگ بیٹھو باتیں کرو میں چائے بھجواتی ہوں۔" وہ وہاں سے باہر نکل گئیں اور وہ تینوں فاروق نیازی کی سمت متوجہ ہو گئے فاروق نیازی انہیں دیکھ کر خوش ہوئے تھے۔
"انکل۔! آپ کا بیٹا بہت ذہین اور بہت انٹیلی جینٹ ہے' ہم آفس میں انہیں اپنا استاد مانتے ہیں' کیوں استاد۔؟" چھوٹے نے شرارت سے کہتے ہوئے عدیل کی سمت دیکھا تھا۔
"لیکن حقیقت میں تو تم خود استاد ہو۔" عدیل کو اعتراف کرنا ہی پڑا کہ چھوٹا ہی سب کا استاد ہے' ہر کام میں ماہر۔ ہر بات میں آگے۔
"مان گئے نا استاد۔؟" چھوٹا یکدم قہقہہ لگا کے ہنسا تھا ان کی ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ اور نوک جھوک میں فاروق نیازی کا دل بہل گیا تھا ان کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ خوش ہوئے ہیں۔
"مان گئے جناب' مان گئے' آج تو تم تینوں کی ڈریسنگ بھی بہت کمال کی ہے۔" عدیل نے ان کی پینٹ شرٹ کی طرف اشارہ کیا تھا۔
"عدیل صاحب! آپ جانتے تو ہیں ہماری ڈریسنگ تو ہر روز ہی کمال کی ہوتی ہے اب ورکشاپ کے مکینکوں کی طرح گندے کپڑے پہن کر تو نہیں گھوم سکتے نا۔؟" وہ باتوں باتوں میں سب کچھ کہہ بھی گیا تھا اور عدیل اس کی اس چالاکی پہ اپنی مسکراہٹ روک نہیں پایا تھا۔
"چائے۔" وہ چاروں خوش گپیوں میں مصروف تھے جب نسوانی آواز پہ یکدم بریک لگ گئے عدیل نے گردن

موڑ کر دیکھا ایمن ٹرے لیے کھڑی تھی۔

"ایمن۔!" عدیل فوراً کھڑا ہو گیا تھا اور چھوٹی سی ٹیبل کھینچ کے ان تینوں کے سامنے رکھنے لگا، لیکن اپنے دھیان اور اپنی ترنگ میں ہنستے چھوٹے کی نظریں بلا ارادہ ہی ایمن پہ جا ٹھہری تھیں۔

بھولی بھالی معصوم سے چہرے والی، سادہ سی لڑکی چھوٹے کو ایک پل میں چھوٹے سے بڑا بنا گئی تھی اس کی ہنسی تھم چکی تھی۔

"کیا بات ہے شہریار صاحب؟ آپ چپ کیوں ہو گئے؟" سلو نے چھوٹے کو اس کے پورے نام سے مخاطب کرتے ہوئے ٹہوکا دیا۔

"نن نہیں۔ کچھ نہیں۔" اس نے یکدم چونکتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"شہریار۔؟" عدیل نے بھی بے ساختہ چونک کر دیکھا تھا وہ چھوٹے کا اصلی نام پہلی مرتبہ سن رہا تھا۔

"دیکھیے انکل۔ عدیل صاحب ایسے ری ایکٹ کر رہے ہیں جیسے اپنے کولیگ کے نام کا بھی پتا نہ ہو۔" چھوٹے نے پھر بات سنبھالی تھی اور عدیل سنبھل گیا تھا۔

"تھینک یو۔" چھوٹے نے ایمن کے ہاتھ سے چائے کا کپ پکڑتے ہوئے شکریہ ادا کیا کیونکہ عدیل فاروق نیازی کی سمت متوجہ تھا شوشے ان کا منہ صاف کر رہا تھا۔ سلو اور جیدی نے بھی شکریہ ادا کیا تھا ایمن خاموشی سے کچھ بھی کہے بغیر باہر نکل گئی لیکن چھوٹے کے دل و دماغ میں اپنا نقش چھوڑ گئی اور چھوٹے کی کیفیت باقی دونوں سے بھی چھپی ہوئی نہیں رہ سکی تھی وہ اب سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

تو یقین کر تو یقین کر وہ رائیگاں وہ رائیگاں
میری زندگی سے نکل گیا جو لمحہ تیرے خیال کا

اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو اس کی کنپٹیوں سے لکیر بناتے ہوئے اس کے بالوں میں جذب ہو رہے تھے، وہ بے آواز رو رہی تھی شاید اسے خود بھی احساس نہیں تھا کہ وہ رو رہی ہے اس کی ذات پہ رنج کا عالم تھا اور اس عالم میں وہ بے طرح یاد آ رہا تھا اتنا کہ اس کے بغیر زری کو اپنی سانسیں بھی سینے کا بوجھ لگنے لگی تھیں یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ وہ بے دم سے انداز میں راکنگ چیئر پہ جھول رہی تھی جب پورے گھر کے سناٹے میں لینڈ لائن فون کی گھنٹی گونج اٹھی۔ لیکن زری میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اٹھ کر فون اٹینڈ کرتی، وہ جیسے تھی، ویسے ہی پڑی رہی۔

"زری۔ فون اٹینڈ کرو، میں قرآن پاک پڑھ رہی ہوں۔" نگارش نے اپنے بیڈ روم سے اسے آواز دی اور مجبوراً" زری کو اپنے آپ کو سنبھالنا پڑا ورنہ یقیناً" نگارش کا غصہ اور ناراضی سہنا پڑتی، اسی لیے وہ گہری سانس کھینچتی ہوئی راکنگ چیئر سے اٹھی اور اپنے آنسو پونچھ کر فون سیٹ کے پاس آ گئی تھی۔

"السلام علیکم۔" دل آور شاہ کی طرح سلام میں پہل کرنے کی عادت تھی اس کی، لیکن اس کی آواز سن کر دوسری طرف خاموشی چھا گئی تھی نبیل کو یقین کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ اس کا فون زری نے ریسیو کیا ہے۔

"السلام علیکم۔" زری نے اس خاموشی کو توڑنے کے لیے دوبارہ سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام۔ کیسی ہیں آپ۔؟" دوسری طرف کی آواز لو دے رہی تھی۔

"کون۔؟" زری نے اس مدھم اور ٹھہری ہوئی آواز کو پہچاننے کی کوشش کی۔

"نبیل حیات۔"

"ارے آپ۔؟ کیسے ہیں؟" زری کی الجھن حل ہو گئی تھی۔

"جیسی آپ ہیں؟"

"کیا مطلب۔؟"

"مطلب اداس۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"یہ میں نہیں کہہ رہا آپ کی آواز کہہ رہی ہے۔"

"میری آواز۔؟" زری ٹھٹکی۔

"آپ کی آواز کہہ رہی ہے کہ آپ روئی ہیں، آپ کی آواز پہ آنسوؤں کا بوجھ ہے۔" نبیل تو یوں کہہ رہا تھا جیسے اس کے سامنے بیٹھ کے اسے دیکھ رہا ہو۔

"آپ کو شاید کوئی وہم ہو رہا ہے۔؟" زری نے سر جھکا

"تو آپ میرا وہم دور کر دیں نا۔؟ کہہ دیں کہ آپ اداس نہیں ہیں اور آپ روئی بھی نہیں ہیں، آپ جھوٹ بھی کہیں گی تو میں مان جاؤں گا، میں دل آور نہیں ہوں جو سچ بات بھی نہیں مانتا۔" نبیل نے بات کرتے کرتے ایک مثال کے طور پہ دل آور کا نام لیا تھا مگر زری تھی کہ اس کا دل دھڑک دھڑک گیا بلکہ اس کے نام پہ تو زری کا رواں رواں دھڑکتا تھا۔ اگر اس کی یہ دھڑکن نبیل حیات سن لیتا تو یقیناً" دوسری بات نہ کرتا۔

"آپ نے شاید عبداللہ بھائی سے بات کرنے کے لیے فون کیا ہے۔؟" زری بات ٹال گئی۔

"ہوں۔ شاید۔" نبیل نے آہستگی سے کہا۔

"وہ گھر پہ نہیں ہیں۔"

"آپ تو ہیں نا۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا مطلب ہے آپ کا۔؟" زری پہلے ہی پریشان تھی نبیل کی مبہم سی باتوں پہ اور بھی الجھنے لگی تھی۔

"میرا مطلب ہے کہ آپ کو پیغام تو دے سکتا ہوں نا؟ آپ گھر پہ ہی ہیں نا۔؟" نبیل نے اپنی بات سنبھالی کیونکہ اس کی آواز کے بعد چھانے والی خوشگوار حیرت کے باعث وہ بے ساختگی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"جی! ضرور دے سکتے ہیں۔" "وہ دراصل عبداللہ نے دل آور کو کوئی گھر دیکھنے کے لیے کہا تھا، دل آور تو شہر میں نہیں ہے اس لیے اس نے گھر دیکھنے کے لیے مجھے بھیج دیا، میں کل ہی وہ گھر دیکھ کر آیا ہوں، گھر کافی اچھا ہے، آپ عبداللہ سے کہیے گا مجھے کال کر لے، میں اسے ساری لوکیشن خود بتا دوں گا۔" نبیل نے اسے پیغام دیا تھا۔

"اوکے کہہ دوں گی۔"

"ٹھیک ہے پھر میں فون بند کرتا ہوں۔" نبیل نے بات ختم کی۔

"ایک منٹ پلیز۔" وہ بے اختیار بول اٹھی تھی اور اس کی اس بے اختیاری پہ نبیل کا دل تھم گیا تھا دھڑکنیں بھی ہمہ تن گوش ہو گئی تھیں کہ وہ کچھ کہنے والی ہے۔

"جی! میں سن رہا ہوں۔" اس نے ذرا توقف سے کہا تھا۔

"آپ نے جو گھر دیکھا ہے کیا وہ آپ لوگوں کے گھر سے قریب ہے؟" زری پوچھنا تو یہ چاہتی تھی کہ آپ نے جو گھر دیکھا ہے کیا وہ دل آور کے گھر سے قریب ہے؟ لیکن وہ چاہنے کے باوجود بھی اتنا واضح سوال پوچھ نہیں پائی تھی۔ مجبوری اور مصلحت آڑے آ گئی اور اسی مصلحت نے نبیل حیات کو خوش فہمی کی دنیا میں دھکیل دیا تھا۔

"افسوس کہ وہ گھر میرے گھر سے قریب نہیں ہے، بلکہ دل آور کے گھر سے قریب ہے۔" نبیل کے جواب نے

مایوسی اور اداسی بڑھتی زری کو پل میں خوش کر دیا تھا۔

"اوکے ابھی میں فون بند کرتی ہوں۔"

"ایک منٹ پلیز۔" اب کی بار نبیل نے اسے روک لیا تھا۔

"ایک بات پوچھوں آپ سے؟" نبیل نے ذرا سا حوصلہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی پوچھیے۔" اس نے اجازت دی۔

"آپ اداس کیوں تھیں؟" وہ نبیل کے سوال پہ ٹھٹکی پھر مسکرا دی تھی۔

"پہلے تھی مگر اب نہیں ہوں۔" زری کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ خوش ہے، تھوڑی دیر پہلے والی اداسی ختم ہو چکی تھی۔

"اب کیوں نہیں ہیں؟"

"بس کچھ نہیں، میں فون بند کر رہی ہوں' اللہ حافظ۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور فون بند کر دیا' اس کے لیے اتنی خوشی ہی کافی تھی کہ پاکستان میں ان کا گھر دل آور کے گھر سے قریب ہوگا۔ وہ فون اسٹینڈ کے پاس کھڑی اپنی خوشی سنبھال رہی تھی' جب فون کی گھنٹی دوبارہ بجنے لگی' زری کو یقین تھا کہ نبیل کا ہی فون ہے' اسی لیے اس نے دوبارہ ریسیو نہیں کیا' لیکن اسے یہ پتا نہیں تھا کہ کبھی کبھی انسان کا یقین بھی اسے دھوکا دے جاتا ہے' وہ فون سیٹ کے پاس کھڑی تھی۔ دل آور شاہ کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ لیکن اس نے اس یقین پہ ریسیو نہ کیا کہ دوسری طرف نبیل حیات ہے۔ وہ وہاں سے ہٹ کے اپنے کمرے میں آ گئی' لیکن کافی دیر بعد نگارش کی بات نے اسے چکرا کے رکھ دیا تھا۔

"دل آور بھائی کی کال کب آئی؟" وہ زری سے پوچھ رہی تھیں۔

"دل آور کی کال؟" زری کو اچنبھا ہوا۔

"ہاں! سی ایل آئی پہ تو انہی کا نمبر ہے' کیا تم نے ریسیو نہیں کیا۔" نگارش کو بھی تعجب نے گھیرا تھا۔

"سی ایل آئی پہ اس کا نمبر؟ او مائی گاڈ۔" اس نے سر پہ ہاتھ مارتے ہوئے فون کی طرف دوڑ لگائی اور اس کا نمبر دیکھ کر تو دل مٹھی میں آ گیا۔

"ہائے میں مر گئی' یہ میں نے کیا کر دیا؟ اس کا فون تو اتنی دیر بجتا رہا اور میں سمجھی کہ نبیل۔" وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی اور دونوں ہاتھوں میں سر تھام کے رہ گئی تھی۔

"اب رونے سے کیا ہوگا؟ بلکہ یہ سوچو کہ عشق میں عاشق لوگوں کا اتنا نقصان دنیا یا دوسرے لوگ نہیں کرتے' جتنا نقصان وہ خود اپنا کرتے ہیں۔ کبھی جلد بازی میں' کبھی لاپروائی میں اور کبھی شدت میں' اور بعد میں تمہاری طرح سر پکڑ کر بیٹھ کے روتے ہیں' مگر اسی رونے سے حاصل کچھ نہیں ہوتا' نہ تو دل آور بھائی کی دوبارہ کال آ سکتی ہے اور نہ ہی تم اپنی غلطی کی تلافی کر سکتی ہو' اس لیے بہتر ہے کہ یہ رونا دھونا بند کرو۔" نگارش کو اس پہ غصہ آ رہا تھا۔

"بھابھی! مجھے نہیں پتا تھا' میں تو سمجھی تھی کہ نبیل۔"

"تو کیا نبیل انسان نہیں ہے؟ کیا تم اس کی کال نہیں سن سکتیں؟" نگارش نے اسے جھڑک دیا۔ اور زری اپنی غلطی پہ دل مسوس کے رہ گئی' اس نے کال کیوں کی تھی؟ اسے تو یہ بھی پتا نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

اس نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے ساری رات جاگ کر گزاری تھی' رجو تو فوراً ہی سو گئی' لیکن

علیزے نیند کے باوجود بھی سو نہیں پائی' اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ آنکھ جھپکے گی اور کوئی وحشی اسے دبوچ لے گا اور اسی وحشی کے خوف نے اسے سکون کی نیند سونے ہی نہیں دیا تھا' حالانکہ اسے پتا تھا کہ باہر منصور حسین پہلے سے زیادہ چوکس ہو کر سو رہا ہے اور اندر رجو اس کے پاس ہے' لیکن پھر بھی وہ نیند سے آنکھ نہیں ملا پائی تھی۔

فجر کے وقت اٹھی' وضو کیا اور نماز پڑھنے کے لیے کھڑی ہو گئی' کچھ وقت عبادت میں گزرا تو ذہن پہ طاری خوف کم ہو گیا' وہ تسبیح ختم کر کے اٹھی اور جائے نماز سمیٹنے لگی' لیکن یوں ہی جائے نماز سمیٹتے ہوئے اس کی نظر اپنے بیڈ پہ رکھی منصور حسین کی بلیک کلر کی چادر پہ پڑی تھی۔

"اگر یہ چادر کسی نے میرے پاس دیکھ لی تو؟ سب ہی سوال کریں گے' وجہ پوچھیں گے کہ کیا ہوا ہے؟ او نو۔" وہ جائے نماز الماری میں رکھ کے فوراً بیڈ کے قریب آئی تھی اور اپنے کمبل میں جھانکتی ہوئی وہ چادر کھینچ لی تھی' وہ اس چادر کو گول مول کر کے لپیٹتی ہوئی باہر نکل آئی' اس کا رخ منصور حسین کے کمرے کی طرف تھا۔ علیزے کو منصور حسین کے کمرے کا پتا تو نہیں تھا' لیکن اندازہ ضرور تھا کہ وہ کسی لاسٹ والے بیڈ روم میں ہے اور اس نے لاسٹ والے بیڈ روم کے دروازے پہ ہی دستک دی' چند سیکنڈ بعد دروازہ کھولنے والا منصور حسین ہی تھا' اس کے سر پہ بندھا ہوا رومال بتا رہا تھا کہ وہ بھی وضو کی حالت میں ہے اور اس نے بھی ابھی ابھی نماز ادا کی ہے۔ اس لمحے علیزے کو دیکھ کر منصور حسین کی نظریں جھک گئی تھیں۔

"یہ تمہاری چادر دینے آئی ہوں۔" اس نے چادر منصور حسین کی سمت بڑھاتے ہوئے کہا۔

"شکریہ بی بی جی۔" اس نے جھکی نظر سے کہتے ہوئے چادر تھام لی تھی۔

"تم سوئے نہیں رات بھر؟" علیزے کو احساس ہو چکا تھا کہ وہ بھی جاگتا رہا ہے۔

"نہیں۔"

"کیوں۔؟"

"بس پریشانی میں نیند نہیں آئی۔" وہ آہستگی سے بول رہا تھا۔

"تمہیں کیا پریشانی تھی؟"

"مجھے بڑے صاحب کی طرف سے پریشانی تھی' انہوں نے آپ کی ذمہ داری' آپ کی حفاظت مجھے سونپی تھی' اس لیے آپ کی پریشانی میری پریشانی' اور آپ کا نقصان بھی میرا نقصان ہے۔"

"لیکن میں تم سے یہ کہنے کے لیے آئی ہوں کہ تم اس بات کا ذکر کسی سے بھی مت کرنا' نہ پاپا سے' نہ آذر بھائی سے۔" علیزے نے اسے منع کیا تھا۔

"میں معافی چاہتا ہوں بی بی جی' میں بڑے صاحب سے اتنی بڑی بات نہیں چھپا سکتا' یہ میرے اصول کے خلاف ہے۔" منصور حسین نے انکار کر دیا تھا۔

"تمہاری بتائی ہوئی اتنی بڑی بات پوری حویلی میں پریشانی کا پہاڑ کھڑا کر دے گی' پاپا میرا کالج جانا اور گھر سے باہر نکلنا بند کر دیں گے' آذر بھائی پھر سے ان دیکھے دشمن کی کھوج میں لگ جائیں گے' اور باقی سب افراد چپ ہو کے رہ جائیں گے۔" علیزے نے اسے اس بات کے سائیڈ ایفیکٹ بتائے تھے۔

"لیکن علیزے بی بی! بات چھپا لینا مسئلے کا حل تو نہیں ہے نا؟ اس طرح آپ کو کوئی نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔" منصور حسین بے حد پریشان اور الجھا ہوا تھا۔

"کسی نے مجھے نقصان پہنچانا ہوتا تو اب تک پہنچا چکا ہوتا۔" علیزے نے خفگی سے کہا تھا اور منصور حسین چونک گیا تھا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"میرا مطلب ہے کہ کوئی ہمیں محض ہراساں کرنا چاہتا ہے' نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔" علیزے نے کافی گہری بات کی تھی' منصور حسین کا تو اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا' وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔

"لیکن بی بی جی۔ یہ صرف آپ کا اندازہ بھی تو ہو سکتا ہے' دشمن کو کبھی کمزور نہیں سمجھنا چاہیے اور نہ ہی دشمن سے بے خبر ہو کر رہنا چاہیے' جو لوگ دشمن کو کمزور سمجھتے ہیں اور اس سے بے خبر ہو کر رہتے ہیں وہ لوگ نقصان اٹھاتے ہیں' آپ لاپروائی اور غفلت سے کام مت لیں' بڑے صاحب کو بتا دیں' وہ یقیناً سارے مسئلے کو دور کر لیں گے۔" منصور حسین اسے سمجھا رہا تھا۔

"جب مناسب لگا تب بتا دوں گی' فی الحال نہیں بتا سکتی اور اس بات کا تم بھی مت بتانا۔"

"لیکن بی بی جی! صاحب کو پتا چلا تو وہ مجھے نوکری سے نکال دیں گے' اور آئندہ کے لیے وہ مجھ پہ اعتبار بھی نہیں کریں گے۔" منصور حسین بے بس اور تذبذب کا شکار تھا۔

"اور اگر بتاؤ گے تو میں تمہیں نوکری سے نکال دوں گی۔" علیزے نے اسے دھمکی سے نوازا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں' اس مسئلے کو اپنے تک رکھو گے تو بہتر رہے گا۔"

"جی۔" وہ محض جی کہہ کے رہ گیا تھا۔

"اور سنو! سب کب آئے تھے رات کو؟" وہ جاتے جاتے پھر ٹھہر گئی تھی۔

"دو بجے آئے تھے۔"

"ٹھیک ہے' سب سو رہے ہیں' تم بھی سو جاؤ۔" علیزے اسے کہہ کے واپس پلٹ گئی اور منصور حسین اندر چلا گیا' وہ رات بھر سے جاگ رہا تھا' اب نماز کے بعد اسے نیند آنے لگی تھی' اس کا ارادہ سونے کا تھا اور علیزے بھی اب سونے کا ارادہ لے کر چلی تھی' لیکن آج شاید نیند اس کے نصیب میں نہیں تھی۔

"علیزے۔" کومل کی چبھتی ہوئی آواز پہ علیزے کے قدم وہیں کے وہیں تھم گئے تھے۔

"ارے کومل آپی! آپ جاگ رہی ہیں۔" علیزے نے نارمل سے انداز میں کہا' لیکن کومل کا انداز نارمل نہیں تھا۔

"جاگ بھی رہی ہوں اور دیکھ بھی رہی ہوں۔" کومل کے لب و لہجے میں شک بول رہا تھا' لیکن علیزے اس کے اس شک سے بے خبر تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہیں؟" اس نے لاپروائی سے پوچھا تھا۔

"منصور حسین کے کمرے میں کیا کر رہی تھیں تم؟" کومل کے سوال پہ علیزے ٹھٹک گئی تھی کہ کومل نے اسے دیکھ لیا ہے۔

"وہ۔ وہ۔ ڈرائیور کی چادر' یہاں کوریڈور میں گری ہوئی تھی' وہی اٹھا کر اسے دے کے آئی ہوں۔" علیزے نے فوراً وضاحت دی تھی' تاکہ اسے اصل بات کا پتا نہ چلے' لیکن کومل رقابت کی جلن میں کچھ برا سوچنے سے بھی باز نہیں آئی تھی۔

"اتنی اہم تھی وہ چادر۔" اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا تھا' نظروں میں ہلکی سی کاٹ تھی۔

"کومل آپی! وہ چادر ہمارے لیے اہم نہ سہی' لیکن اس کے لیے تو اہم ہے نا؟" علیزے نے پھر بھی کافی سادگی سے جواب دیا تھا۔

"اتنی اہم کہ بڑی حویلی کی لاڈلی اور نخریلی بیٹی' جس نے کبھی اپنی چادر بھی زمین سے جھک کر نہیں اٹھائی ہو گی' وہ اپنے ڈرائیور کی چادر اٹھا کر اس کے بیڈ روم میں پہنچا کے آ رہی ہے؟ واہ یار' حیرت ہو رہی ہے اور رشک آ رہا ہے

منصور حسین کی اس چادر پہ۔" کومل کو پہلی بار کوئی ایسا موقع ہاتھ آیا تھا کہ وہ تنہائی میں علیزے کو نشتر چبھو سکی۔

"کومل آپی! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" علیزے اب بھی اس کے کاٹ دار لفظوں کے مفہوم سمجھنے سے قاصر تھی۔

"میں جو کہہ رہی ہوں تم اس سے انجان بن رہی ہو۔" کومل نے کافی چبا کے کہا تھا۔

"آپ نے جو کہنا ہے صاف صاف کہیں' مجھے آپ کی ایسی باتیں سمجھ نہیں آ رہیں۔" علیزے پریشان سی الجھنے لگی تھی۔

"تم اس وقت۔"

"ارے کومل' علیزے تم لوگ یہاں کیوں کھڑی ہو؟" اپنے بیڈ روم سے نکلتی عائشہ آفندی کو دیکھ کر کومل کی ادھوری بات منہ میں ہی رہ گئی تھی۔

"پھپھو میرے کمرے میں جائے نماز نہیں تھی' میں وہ لینے کے لیے نکلی ہوں تو علیزے' منصور حسین کے کمرے سے آ رہی تھی۔ اسے اس کی چادر دے کر' وہ بھی اس وقت جب سارا عالم تاریکیوں میں ڈوبا ہوا ہے۔" کومل نے چھوٹتے ہی عائشہ آفندی کو باتوں باتوں میں اصل بات کا اشارہ دے دیا تھا اور اس کی اس بات پہ ان کی روح کانپ اٹھی تھی۔

"کومل! تم کیا بول رہی ہو' تمہیں شاید خود بھی اندازہ نہیں ہے؟" عائشہ آفندی کا لہجہ سخت تھا۔

"پھپھو! میں نے کچھ غلط۔"

"بس! اپنے کمرے میں جاؤ تم۔" انہوں نے کومل کو مزید کچھ بولنے کی مہلت نہیں دی تھی اور کومل' علیزے پہ ایک طنزیہ سی نظر ڈالتی ہوئی اپنے کمرے میں گھس گئی۔

"عائشہ پھوپھو! یہ کومل آپی۔ یہ کیا کہہ رہی تھیں؟" علیزے کا لہجہ روہانسا ہونے لگا تھا۔ کومل کی بات کے مفہوم کو وہ تھوڑا بہت سمجھ ہی چکی تھی' لیکن پھر بھی ذہن ایسا معصوم اور کورا تھا کہ وہ اس بات کو جھٹلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"چھوڑو اس بات کو' پتا نہیں وہ کیا کہہ رہی ہے' آؤ تم اپنے کمرے میں آ جاؤ' باہر بہت ٹھنڈ ہے۔" وہ علیزے کو بازو سے تھامتے ہوئے اپنے ساتھ لیے اس کے کمرے میں آ گئی تھیں' وہاں صوفے پہ رجو بھی کمبل اوڑھے سو رہی تھی۔

"رجو یہاں کیوں سو رہی ہے؟" انہیں حیرت ہوئی' علیزے کسی کو بھی اپنے کمرے میں سونے نہیں دیتی تھی۔

"میں رات کو سوتے میں ڈر گئی تھی' اس لیے رجو کو اپنے کمرے میں بلا لیا تھا۔"

"ہوں! اچھا کیا تم نے' اگر مجھے کہہ دیتیں تو میں آ جاتی تمہارے پاس۔" وہ اس کا ہاتھ سہلا رہی تھیں' لیکن علیزے کومل کی بات پہ الجھی ہوئی تھی' ذہن منتشر سا ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اک موم کی گڑیا ہے' اک پریم کہانی ہے
اک شاخ ہے نازک سی
کلیوں کی جوانی ہے
وہ پھول کی تتلی ہے
شعلہ ہے کہ پانی ہے

ہے شان سمندر کی
لہروں کی روانی ہے
وہ نور سحر ہے یا اک شام سہانی ہے
دیکھوں تو سپنا ہے
سوچوں تو کہانی ہے
کیا نام رکھوں اس کا کیا بات کہوں اس سے؟
وہ دن کا اجالا ہے وہ رات کی رانی ہے
اک موم کی گڑیا ہے اک پریم کہانی ہے

"واؤ جوورت بھائی! آپ نے تو کمال کر دیا ہے۔" انوشہ، حرمت اور انیہ وغیرہ نے دونوں ہاتھوں سے تالیاں بجاتے ہوئے اسے ستائشی انداز میں سراہا تھا۔ اس نے ان سب کی فرمائش پہ یہ نظم انہیں گٹار کی دھن پہ سنائی تھی اور اس کی آواز اور یہ دھن اتنی خوب صورت اور بار ربط تھیں کہ ان سب کو سن کر مزا آگیا تھا، بلکہ سب سراہے بغیر نہیں رہ سکے تھے ذرا فاصلے پہ بیٹھا آذر بھی مسکرا رہا تھا۔

"یہ نظم میں نے اسپیشلی علیزے کو ڈیڈی کیٹ کی ہے اور مجھے لگتا ہے یہ نظم کسی نے علیزے کے لیے ہی لکھی ہے۔" جوورت نے اعلانیہ کہا تھا اور وہاں موجود سب ہی لوگ ہنس پڑے تھے، علیزے کافی چپ چپ بیٹھی تھی، لیکن ان سب کو اپنی طرف متوجہ پا کر چہرہ جھکا لیا تھا۔

"کیا بات ہے؟ موم کی گڑیا آج اداس اور چپ چپ سی لگتی ہے۔" دانیال نے علیزے کو شرارت سے چھیڑا تھا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے بھائی۔"

"تو پھر خاموش کیوں بیٹھی ہو؟"

"کچھ نہیں بس پاپا کو مس کر رہی تھی۔" اس نے آہستگی سے کہا تھا۔

"اوہ تو یہ بات ہے تو تم ایسا کرو نا پاپا کو فون کر لو۔" دانیال نے مشورہ دیا۔

"کیا تھا، لیکن ان کا سیل بزی تھا۔"

"کوئی بات نہیں، تھوڑی دیر بعد کر لینا۔" انہوں نے اسے تسلی دی تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"لیکن اس سے پہلے کہ تم فون کرو اتنی دیر میں ہم بیت بازی کھیلتے ہیں۔" جوورت کا نیا آئیڈیا سامنے آیا تھا۔

"مجھے پوئٹری نہیں آتی۔" اس نے جیسے شرمندگی سے کہا تھا۔

"لو جی قصہ ہی ختم ہوا۔" جوورت نے گٹار سائیڈ پہ رکھتے ہوئے ہاتھ جھاڑے تھے۔

وہ لوگ اس وقت الگ الگ پتھروں پہ بیٹھے ہوئے سورج کی مدھم اور کمزور سی کرنوں سے لطف اندوز ہونے کی ناکام کوششیں کر رہے تھے، وہ صبح سے گھر سے نکلے ہوئے تھے، پہلے وہ مری کے مال روڈ پہ اودھم مچاتے رہے اور پھر جب بہت زیادہ گھومنے پھرنے کے بعد تھک گئے تو اس پہاڑی کی اس سطح پہ آنکلے جہاں ان کے تھوڑی دیر بیٹھنے اور محفل جمانے کی جگہ دستیاب ہو رہی تھی، یہاں چھوٹے بڑے ڈھیر سارے پتھر بھی تھے جن پہ انہوں نے با آسانی اپنی اپنی نشست سنبھال لی تھی اور یہاں ہی جوورت کو گٹار بجانے کا خیال آیا تھا اور شاید اس کا گٹار بجانے کا موڈ بھی ہو رہا تھا تب ہی بہت اچھا بجایا تھا۔

"آذر جو! تم میرے ساتھ چلو ہم تھوڑی دیر واک کر لیں۔" عائشہ آفندی سب بچوں کو ہنسی مذاق پہ آمادہ دیکھ کر وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"پھوپھو! میں چلوں آپ کے ساتھ۔" آذر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"ارے نہیں بیٹا! تم بچوں میں کون سا دور جا رہی ہوں، ابھی آجاتی ہوں، تم لوگ انجوائے کرو۔" وہ آذر کو منع کرتی ہوئی رجو کو ساتھ لے کر آگے بڑھ گئی تھیں، وہ جب سے یہاں آئی تھیں ان لوگوں کے ساتھ ایک بار بھی باہر نہیں نکلی تھیں، موسم بہت زیادہ خراب تھا اس لیے انہوں نے سردی میں نکلنے کا رسک نہیں لیا تھا، لیکن آج بارش اور برف باری نے تھوڑا وقفہ دیا تھا۔ تب ہی وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ باہر آگئی تھیں۔

"آپ! اپنا ہاتھ مجھے پکڑا دیں، کہیں آپ کا پیر نہ پھسل جائے۔" ایک ڈھلوانی سطح سے اترتے ہوئے رجو نے احتیاطاً" تھم کر ان کا ہاتھ پکڑنا چاہا تھا، لیکن اس ڈھلوانی سطح سے اترتے ہوئے بلا ارادہ ہی ان کی نظر اس پہاڑی کے نیچے والی سڑک پہ جا پڑی تھی اور ان کی نظروں میں پوری دنیا گھوم کے رہ گئی تھی۔ ان کو لگا جیسے زمین آسمان ایک ہو گئے ہوں اور ان کے اس تصادم پہ عائشہ آفندی گنگ سی ہو گئی تھیں، وہ ایک ہی جگہ پہ جامد ہو چکی تھیں۔

"کیا ہوا ہے بی بی جی؟ آپ رک کیوں گئی ہیں؟" رجو نے انہیں بازو ہلا کر متوجہ کیا تھا اور عائشہ آفندی حواسوں میں آتے ہی یکدم چیخ اٹھی تھیں۔

"زہرہ۔" وہ اتنی بلند آواز سے چیخ کے پکار رہی تھیں کہ آس پاس کی فضا میں بھی ان کی آواز گونج کے رہ گئی تھی۔

"زہرہ! رکو، زہرہ۔" وہ یکدم رجو سے ہاتھ چھڑا کر تیزی سے اترنے کے لیے لپکی تھیں، لیکن اتنی عجلت اور بے دھیانی کی وجہ سے ان کے قدم غیر متوازن ہو گئے تھے اور جیسے ہی ان کے قدموں نے توازن کھویا وہ لڑھکتی ہوئی زمین پہ آگری تھیں۔

"زہرہ، رکو، رجو خدا کے لیے رکواسے، وہ جا رہی ہے، زہرہ۔" عائشہ آفندی گرنے اور اتنی شدید چوٹ کے باوجود پھر سے پکارنے کے لیے اٹھی تھیں، لیکن ان کی پکار ان کی زہرہ کے علاوہ اور سب نے ہی سنی تھی اور اسے

دور جاتے دیکھ کر عائشہ آفندی مرغ بسمل کی مانند تڑپی تھیں۔

"زہرہ!" وہ زمین سے اٹھ کر اس کے پیچھے جانے کے لیے لپک رہی تھیں' جب اچانک پیچھے سے دانیال اور آذر وغیرہ نے تھام لیا تھا۔

"امی! کیا ہوا ہے' کہاں جا رہی ہیں آپ؟" دانیال ان کے مٹی سے خراب ہوئے کپڑے دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔

"دہ' وہ زہرہ۔ زہرہ کو دیکھا ہے میں نے' دانیال' جاؤ' جاؤ اسے روکو' بتاؤ اسے کہ عائشہ بلا رہی ہے۔" وہ تو جیسے پاگل ہو چکی تھیں اور آذر کے ساتھ ساتھ دانیال بھی حیران رہ گیا تھا۔

"زہرہ آنٹی؟" ان دونوں نے حیرانی سے زیر لب دہرایا تھا۔

"ہاں زہرہ' میری زہرہ۔" عائشہ آفندی کہتے ہوئے سینے پہ ہاتھ رکھ کے تڑپ تڑپ کے رو پڑی تھیں۔

"آپ روئیں مت' ہم دیکھتے ہیں۔" آذر اور دانیال انہیں باقی سب کے حوالے کر کے بھاگ کھڑے ہوئے تھے' لیکن مطلوبہ جگہ پہ بار بار تلاش کرنے کے باوجود بھی وہ انہیں کہیں نظر نہیں آئی تھیں۔ آذر اور دانیال دونوں کے ذہن میں زہرہ آنٹی کے نقش زندہ تھے' لیکن اتنے سالوں بعد ان نقوش میں کیا فرق آیا تھا یہ تو وہ بھی نہیں جانتے تھے' لیکن اگر عائشہ آفندی نے انہیں پہچان لیا تھا تو وہ دونوں بھی پہچان سکتے تھے اور اس چیز سے پتا چلتا تھا کہ ان میں زیادہ فرق نہیں آیا تھا تب ہی تو انہوں نے جلدی اور آسانی سے پہچان لیا تھا۔

"سوری پھوپھو! وہ تو کہیں بھی نہیں ہیں۔" آذر نے واپس آتے ہوئے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا تھا' اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

"وہ چلی گئی' وہ میرے دیکھتے دیکھتے تو چلی گئی ہے۔" عائشہ آفندی بے تحاشا رو رہی تھیں اور پھر وہاں سے وہ سب انہیں بمشکل واپس بنگلے پہ لے کر آئے تھے۔

"امی! بس کریں نا' کیوں اتنا رو رہی ہیں' بیمار پڑ جائیں گی۔" دانیال نے ان کا کندھا دبایا۔

"تم' تم بھائی' بھائی صاحب کو کال ملاؤ میں انہیں بتاتی ہوں۔" انہوں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا اور مجبوراً دانیال کو کال کرنا ہی پڑی تھی۔

"ہیلو۔" وقار آفندی کی آواز ایئرپیس سے سنائی دی تھی۔

"بھائی صاحب! میں عائشہ بات کر رہی ہوں۔" وہ آنسوؤں سے رندھی ہوئی آواز میں بولی تھیں۔

"عائشہ! تم رو رہی ہو' کیا ہوا ہے۔" وہ پریشان ہو اٹھے تھے۔

"بھائی صاحب! میں نے' میں نے زہرہ کو دیکھا ہے' ابھی دیکھا ہے' تھوڑی دیر پہلے۔" وہ بتاتے ہوئے پھر سے رونے لگی تھیں۔

"زہرہ کو؟" وقار آفندی کی آواز کسی گہرے پاتال میں ڈوبی ہوئی محسوس ہوئی تھی' ریسیور میں سناٹا چھا گیا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼
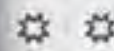
"باادب، باملاحظہ، ہوشیار، پروفیسر صاحب کی صاحبزادی اختر نیک دختر تشریف لا رہی ہیں۔" سارہ نے جیسے ہی مرکزی دروازہ وا کیا بلال نے تان لگائی۔

"احمق 'اختر نیک دختر' نہیں 'دختر نیک اختر' اور 'تشریف لا رہی ہیں' نہیں 'تشریف لا چکی ہیں'۔" علیزے نے بلال کو گھرکا جو علیزے کا سفری بیگ اٹھائے اندر چلا آ رہا تھا۔

"اردو وہ واحد زبان ہے جس کی ادائیگی میں میری بہن سے کوئی غلطی برداشت نہیں ہوتی۔" سارہ جو مرکزی دروازہ کھولے علیزے اور بلال کے اندر آنے کی منتظر تھی ان کے داخل ہونے کے بعد دروازہ بند کر کے ان کے پیچھے ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔

یہ ایک پانچ کمروں کا فلیٹ تھا۔ جو تیسرے فلور پر تھا۔ علیزے کا سفری بیگ اٹھا کر لانے سے بلال کی تو سانس بھی پھول گئی تھی۔ اس لیے وہ گرنے کے سے انداز میں صوفے پر ڈھے گیا۔

"محترمہ سارہ صاحبہ! یہ آپ میری تعریف کر رہی ہیں یا مجھ پر تنقید۔" علیزے نے پوچھا گو کہ خود علیزے بھی ایک تو لمبے سفر سے آئی تھی اور دوسرے اتنی سیڑھیاں چڑھ کے مگر سفر کی تھکن اس کے وجود پر حاوی نہ تھی۔ بلکہ لگ رہا تھا مزید چارج ہو کر آئی ہے۔

"جناب علیزے صاحبہ! یہ آپ کی تعریف تھی۔ ورنہ تنقید سے تو آج کل نقص امن کا اندیشہ رہتا ہے اور ویسے بھی جس کا کام اسی کو ساجھے اور یہ تو ہے ہی خالصتاً نجی چینلوں کے ٹاک شو کے میزبان کا کام یعنی بخیے ادھیڑنے کا کام تو وہ لوگ زیادہ بہتر طور پر کرتے ہیں۔ ہماری عوام الناس تو بڑی صابر و شاکر ہے۔ ہر چیز پر آمنا صدقنا کہتی ہے۔ کیوں بلال۔" بات کرتے کرتے سارہ نے بلال کو مخاطب کیا۔

"ہیں کیا مطلب؟" اس کی خاک سمجھ نہ آیا تھا۔ ویسے بھی وہ انگریزی میڈیم بچہ رہا تھا۔ آمنا صدقنا، نقص امن اور عوام الناس جیسے بھاری بھرکم الفاظ اس کی سمجھ میں کہاں آنے والے تھے۔ جبکہ یہ دونوں پروفیسر صاحب کی صاحبزادیاں تو گھر میں بھی برمحل اشعار اور محاورے بولا کرتی تھیں۔

"بھئی دیکھو بلال، سونامی آیا۔ ہم نے کہا آنے دو۔ 'زلزلہ آیا' ہم نے کہا وہ بھی آنے دے۔ پھر سیلاب آیا۔ ہم نے اس کا بھی استقبال کیا۔ ڈکٹیٹر آئے 'لوٹا آئے' گھوٹالا آئے ہم کہتے ہیں آنے دے۔

ہم اتنے کھلے دل اور اعلا ظرف ہیں کہ سانپ کے بل میں بار بار ہاتھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں ڈس بھائی ہم حاضر ہیں۔ ارے ہمارے جیسی قوم کی نظیر تو پوری دنیا میں نہیں ہے۔" علیزے نے کسی سیاسی لیڈر کی طرح ہاتھ نچا نچا کر تقریر کی۔

"واہ واہ، تالیاں، تالیاں۔" بلال نے پرجوش ہو کر تالیاں بجائیں۔ یہ واحد پیرایہ تھا گفتگو کا جو اسے باآسانی سمجھ آ گیا تھا اور وہ اسی بات پر پرجوش تھا اور علیزے سمجھ رہی تھی بلال اس سے متفق ہے۔

"علیزے چپ کرو۔ کیا آتے ہی تقریر جھاڑنی شروع کر دی۔ امی کے سر میں درد ہے۔ وہ سو رہی ہیں۔" سارہ نے اسے ٹوکا۔ دونوں میں دو سال کا فرق تھا اور سارہ کبھی کبھی اپنی اس دو سال کی بڑائی کا رعب جھاڑنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ پر وہ علیزے ہی کیا جو ایسے کسی رعب میں آجائے۔

"ارے ڈیئر سارہ جی۔ وہ دن ہوا ہوئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے یاد ہے ہم مذاق کرتے تھے اور آپ تقریر کیا کرتی تھیں۔ اب ہم تقریر کریں گے اور آپ مذاق کیا کرنا۔" علیزے نے سارہ کی سنجیدہ طبیعت پر چوٹ کی جو ہر وقت علیزے کو سمجھانے کا فریضہ سنبھالے رکھتی تھی۔

"واللہ کیا کہنے۔

ایسے ایسے کیسے کیسے ہو گئے
کیسے کیسے ایسے ایسے ہو گئے

سارہ نے بھی حساب چکایا اور علیزے کو 'کیسے کیسے' کی فہرست سے نکال کر ایسے ایسے کے درجے میں ڈال دیا۔

"واہ واہ۔" بلال نے پھر تالیاں بجائیں۔

"بلال کے بچے۔ تم میرے بندے ہو یا اپوزیشن کے۔" علیزے نے سارہ کے جملوں پر بلال کو تالیاں پیٹتے دیکھ کر چوٹ کی۔

"اوہ سوری۔" میں بھول گیا کہ میں "لوٹا" نہیں بلکہ میں تو وہ ہوں جو "عاطف اسلم" نے اپنے گانے میں کہا ہے۔" عاطف اسلم بلال کا پسندیدہ گلوکار تھا۔ آواز اچھی ہونے کی وجہ سے وہ میڈیکل کالج کے مختلف فنکشنز میں اکثر اس کے گانے گاتا تھا۔ ابھی بھی اس نے گلا کھنکارا۔ اپنی چھتری نکالی۔ اس کا ایک سرا بغل میں دبایا اور دوسرے حصے کو یوں تھاما گویا وہ گٹار ہو جبکہ سارہ اور علیزے اس کی حرکتیں ملاحظہ کر رہی تھیں۔

"ہاں تو سامعین سنیے۔"

"میں اک فرد ہوں یا احساس ہوں۔" اس نے گانے کے بول گنگنانے شروع کیے اور پھر عاطف اسلم کی طرح جوش میں آ گیا۔

میں اک جسم ہوں یا روح کی پیاس ہوں۔
کہ جس کی تلاش ہے دور آکاش ہے
منزل پاس نہیں کیا تو میرے پاس ہے۔

"ہے ہے اف علیزے کی بچی۔" بلال گانے کے آخری بول کے خاتمے پر زور سے بلبلایا اور اب اپنا بازو جا سہلا رہا تھا جہاں علیزے نے زور سے چٹکی کاٹی تھی۔

"کیا گلا پھاڑے جا رہے ہو۔ سارہ بتا رہی ہے کہ امی سو رہی ہیں۔ ان کے سر میں درد ہے۔" علیزے نے ٹوکا اور بلال سخت بدمزہ ہوا کہ وہ داد کا مستحق تھا اور بدلے میں جھڑکیاں مل گئی تھیں۔

"امی سو رہی ہیں نہیں ابھی سو رہی تھیں۔" امی بیڈ روم سے باہر نکل آئیں۔ امی کو آتا دیکھ کر علیزے ماں کی طرف لپکی۔ سلام کیا اور ان سے لپٹ گئی۔

"السلام علیکم پھپھو۔ آئی ایم ویری سوری وہ جوش میں آواز کچھ زیادہ ہی بلند ہو گئی۔" بلال نادم تھا۔

"نہیں بیٹا کوئی بات نہیں ماشاء اللہ کافی اچھا گاتے ہو۔" سلام کا جواب دینے کے بعد امی نے اسے سراہا اور بلال خوش ہو گیا پھر ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"چھوڑیں پھپھو۔ گھر کی مرغی دال برابر۔ یہی گانا ابھی خود عاطف اسلم نے گایا ہوتا تو یہ سارہ اور علیزے 'ہائے اللہ' 'اوئی اللہ' کر کے پٹ پٹاپٹ اسٹیج پر گر رہی ہوتیں۔" اس نے پوری بات صحیح تلفظ کے ساتھ اردو میں ادا کر کے گویا علیزے سے چٹکی کا بدلہ لیا تھا۔ علیزے کچھ نہ بولی صرف گھورنے پر ہی اکتفا کیا۔

"اب لگ رہا ہے کہ میرے گھر میں زندگی لوٹ آئی ہے۔ ورنہ مانو ایک مہینے سے گھر میں خاموشی ہی خاموشی تھی۔" امی طمانیت سے مسکرائیں اور علیزے نے یوں فرضی کالر جھاڑے گویا گھر کی اصل رونق وہی ہو۔

"کیا امی میں نے آپ کا خیال نہیں رکھا کیا؟" سارہ بچوں کی طرح ٹھنکی۔

"بالکل رکھا ہے۔ تم تو بہت خیال رکھنے والی بچی ہو میری۔ مگر وہ جو تو تا مینا کی نوک جھونک چلتی ہے وہ نہیں تھی۔" امی نے وضاحت دی۔

"یعنی امی آپ کے سر میں درد شور سے نہیں بلکہ خاموشی سے تھا۔" علیزے نے بات کی تہہ تک پہنچنا چاہا۔

"ہاں بیٹا صحیح کہہ رہی ہو۔ ہمارا شمار بھی تو اسی عوام الناس میں ہوتا ہے نا۔ ہلچل، تھمل 'ایمرجنسی' 'حادثات' بلاسٹ' مہنگائی کا شور' ان سب چیزوں کے عادی ہو جانے والوں کو سکون کیسے بھا سکتا ہے؟" امی نے ہلکی سی افسردگی سے کہا کہ آج کل ملک کی فضا میں یہ شور سا تھا اور ویسے بھی وہ ڈرائنگ روم میں کافی دیر بعد آئی تھیں مگر بیڈ روم کے ادھ کھلے دروازے سے ان لوگوں کی گفتگو ضرور ان کی کان میں پڑ رہی تھی۔

"امی آپ اتنی سنجیدہ بالکل اچھی نہیں لگتیں۔" سارہ نے بھی ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور علیزے تو پہلے ہی ان سے لپٹی ہوئی تھی۔

"ہوں۔۔۔ تو یہ بات ہے؟" امی نے دونوں کو دیکھا۔

"علیزے آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تمہیں آئے ہوئے۔ جاؤ جا کر فریش ہو۔ پھر تم سے سفر کی روداد بھی تو سننی ہے اور سارہ۔ کب سے بلال آیا بیٹھا ہے۔ یہ نہیں کہ اسے چائے پانی کا ہی پوچھ لو۔ کسی کام کی نہیں تم دونوں۔" امی نے مصنوعی غصے کا مظاہرہ کیا اور دونوں ساتھ لگی کھڑی مسکراتی رہیں۔

"ابھی تک کھڑی ہو۔ جاؤ جو کہا ہے وہ کرو اور ہاں بلال تم نے علیزے کا اتنا بوجھ ڈھویا ہے۔ تم ایسے روکھے منہ نہ جانا بس کھانا تیار ہے کھانا کھا کر جانا۔"

"نہیں پھپھو کھانے کے تکلف کی ضرورت نہیں۔" بلال نے منع کرنا چاہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر امی نے اسے جانے نہ دیا۔

"بلال 'آرڈرز آر آرڈرز' تمہیں نہیں پتا امی ہمارے گھر کی حکمران ہیں ان کا حکم تو ہمارے ابو حضور بھی نہیں ٹالتے کیا سمجھے۔" سارہ نے شربت کا گلاس بلال کو پیش کیا اور راز کی بات بتائی۔ امی اس کے انداز پر مسکرا دیں اور یہی تو سارہ چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

سارہ اور علیزے پروفیسر منصور کے باغ کی تتلیاں تھیں۔ سارہ ایم اے اکنامکس کا امتحان دے کر آج کل گھر میں امی کو آرام دے رہی تھی۔ پورا کچن آج کل اس نے اپنے ہاتھ میں لیا ہوا تھا۔ جبکہ علیزے میڈیکل کے دوسرے سال میں تھی۔ بلال ان کے ماموں کا اکلوتا چشم و چراغ اور علیزے کا ہم عمر تھا۔ ان کے میڈیکل کالج نے ایک این جی او کے اشتراک سے ایک گروپ تشکیل دیا تھا تاکہ سیلاب زدگان کی مدد اور بحالی کے لیے کام کیا جا سکے۔ علیزے اور بلال بھی اس گروپ کا حصہ تھے۔ وہ حیدر آباد اور اندرون سندھ کے مختلف علاقوں اور گاؤں میں گئے تھے۔ وہاں انہوں نے نا صرف میڈیکل کیمپ لگائے بلکہ خوراک و پانی کی فراہمی 'دواؤں کا انتظام علاج معالجہ 'بچوں اور بڑوں کی دلجوئی بھی ان کے خاص مقاصد تھے اور ان کا یہ گروپ تقریباً" ایک مہینے بعد واپس آیا تھا۔

شام میں پروفیسر صاحب کالج سے آئے تو علیزے کو گھر میں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ رات کے کھانے سے فارغ ہو کر جب وہ سب سبز چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے تب ابو نے اپنا روئے سخن علیزے کی طرف کیا۔

"ہاں بیٹا! اب بتاؤ کیسا رہا سفر اور وہاں گزارے ہوئے دن۔"

"بہت مختلف 'بہت جذباتی اور کافی کچھ سکھانے والا سفر تھا۔ ابو میڈیا کے ذریعے تو صرف بیس فیصد صورت حال ہی تک ہماری رسائی ہو پاتی ہے ورنہ حقیقت تو کہیں زیادہ تکلیف دہ ہے۔" علیزے نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ امی 'سارہ اور ابو اس کی بات دھیان سے سن رہے تھے۔

"اور ابو آپ کو پتا ہے سب سے زیادہ بے لوث کام پاک فوج نے کیا ہے۔ لوگوں کو گھر سے پانیوں سے نکالا بحفاظت محفوظ مقامات تک پہنچایا۔ صحیح طریقے سے بنیادی ضروریات زندگی کی ترسیل۔ اگر پاک فوج نہ ہوتی تو نجی ادارے اور این جی اوز بھی بہتر طور پر اپنا کام نہ کر پاتیں۔ اگرچہ کہ ابو اس ناگہانی کو گزرے کافی دن ہو گئے مگر ابھی بھی بہت تباہی ہے۔ ہر طرف پانی ہی پانی اور حکومتی سطح پر اس طرح کا کام نہیں ہو رہا جس طرح ہونا چاہیے اور یہ ستم صرف حالیہ بارشوں کا ہی نہیں 'بلکہ امیروں کی زرعی اراضی کے لیے روکے جانے والا پانی اور نہروں کے ارد گرد ناجائز تجاوزات کا بھی اس تباہی میں بڑا ہاتھ ہے۔" علیزے نے وہاں رہ کر جو کچھ محسوس کیا تھا وہ اس کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔

"دراصل بیٹا! اسے ہم تباہی نہیں بلکہ آزمائش سمجھیں تو زیادہ بہتر ہو گا اور آزمائش دو ہی وجہ سے ہے۔ ایک تو لوگوں کو جانچنے کے لیے کہ ان میں نیک کام کون کرتا ہے اور دوسرے بھٹکے ہوؤں کو راہ

راہ دکھانے کے لیے۔" ابو نے نرمی سے کہا اور پھر کچھ دیر بعد محفل برخاست ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

علیزے کو حیدر آباد سے آئے تیسرا دن تھا۔ اب تک کالج جانا اس نے دوبارہ شروع نہ کیا تھا۔ کبھی امی کے پاس گھسی ہوتی کہ کڑھی چاول بنا دیں۔ کبھی سارہ کا سر کھاتی کہ تمہارے ہاتھ کا فرنچ ٹوسٹ وہاں اتنا یاد آتا تھا کہ کیا بتاؤں۔ کبھی ابو کے بستر میں گھس جاتی اور ان کی باتیں کیے جاتی۔ ایک رات ایسے ہی ان کے پاس لیٹی یہ بھی کہنے لگی۔

"ابو جتنی اقبال کی بچوں کے لیے لکھی جانے والی نظمیں آپ نے ہمیں یاد کرائی تھیں نا۔ وہاں میں وہ سیلاب زدگان بچوں کو سناتی تھی۔ اور اس پر میں اور بلال ایکٹ بھی کر کے دکھاتے تھے۔ پہاڑ اور گلہری 'مکڑا اور مکھی 'گائے اور بکری 'ہمدردی۔ کچھ دیر کے لیے مجھے یوں لگتا تھا ابو جیسے وقت تھم گیا ہو۔ کوئی سیلابی بارشیں نہیں ہوئیں 'کوئی تباہی نہیں آئی اور وہ بچے سب میری کلاس کے بچے ہوں اور میں انہیں دھیرے دھیرے کلام اقبال سنا رہی ہوں اور پتا ہے جب آخری دن ہم اپنا سامان سمیٹ رہے تھے تو وہ بچے میرے لیے اپنی مختلف چیزیں لائے گفٹ کے طور پر۔" یاد آنے پر وہ اٹھ کر کمرے میں گئی اور چیزیں لا کر دکھانے لگی۔ وہ مٹی کے مختلف کھلونے تھے 'چھوٹی سی ہانڈی کوئی چولہا 'تھالی 'کسی نے دھاگے میں چند موتی پرو کر چوڑی کی طرح بنا کے دیا تھا۔ کوئی اپنی گڑیا اس کے لیے لایا تھا۔ کہتے کہتے اس کی آنکھیں جھلملا جاتیں اور پھر وہیں ابو سے بات کرتے کرتے کب اسے نیند آجاتی اسے پتا ہی نہ چلتا اور ابو اس کی پیشانی چوم لیتے۔

☼ ☼ ☼
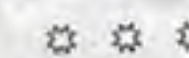
"علیزے کپڑے پریس کر لیے تم نے۔" سارہ اپنے کپڑے اٹھائے اس کے پاس چلی آئی۔

"کس لیے؟"

"ارے بھول گئیں۔ امی کے ماموں زاد بھائی کے بیٹے احسان کی شادی ہے آج۔" سارہ نے اسے یاد دلایا۔

"پلیز تم کر دو۔" علیزے نے کسلمندی سے کہا۔

"اوکے۔ میں کر دوں گی۔" سارہ نے محبت سے بہن کی طرف دیکھا۔ پچھلے دنوں اس نے علیزے کو بہت مس کیا تھا۔

شام میں منصور صاحب 'امی 'سارہ اور علیزے سب شادی میں جانے کے لیے تیار تھے۔ گاڑی جب ٹریفک سگنل پر رکی تو علیزے نے دیکھا کہ سڑک کے دونوں اطراف سیلاب زدگان کی مدد کے خیال سے مختلف جماعتوں نے شامیانے لگائے ہوئے تھے اور اشیائے خورد و نوش جمع کی جا رہی تھیں۔ مگر ایک بات جو محسوس کی جانے والی تھی وہ یہ کہ ان شامیانوں کے آگے کام کرنے والی ماسیوں 'خواجہ سراؤں اور بھیک مانگنے والوں کا رش لگا ہوا تھا۔

"سارہ یہ کیا؟ کیا یہ لوگ بھی امداد جمع کروا رہے ہیں؟"

"یہ امداد مانگنے والے ہیں ڈیئر۔ یہ سمجھتے ہیں یہ ڈھیر ان کے لیے لگا ہے۔ بس یہاں آ کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔" سارہ نے اسے بتایا 'علیزے کی نگاہوں میں تاسف تھا پھر گاڑی آگے بڑھ گئی۔

شادی ہال پہنچے تو وہاں رونق ہی اور تھی۔ عزیز و رشتہ دار تقریباً" سب ہی آ چکے تھے۔ انتظامات قابل دید تھے۔ ادھر سے ادھر پھرتے باوردی بیرے جگہ جگہ لگے واٹر ڈسپنسر 'کرسیوں اور ٹیبل کے کورز تک دولہا اور دلہن کے کپڑوں سے میچ کرتے ہوئے منتخب کیے گئے تھے۔ نکاح اور پھر اس کے بعد جب کھانا شروع ہوا تو مختلف پکوانوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ تین چار طرح کے سلاد 'مشروبات 'بریانی 'بروسٹ 'کڑاہی 'میٹھے کی دو تین ڈشز۔

سارہ اپنے لیے کھانا نکال کر لائی تو دیکھ کے حیران رہ گئی علیزے ذرا سے چاول پلیٹ میں لیے بیٹھی تھی جبکہ امی ممانی وغیرہ کے پاس تھیں۔

"کیا ہوا؟ کھا کیوں نہیں رہیں تم؟"

"ایسے ہی بس بھوک نہیں۔" علیزے نے مختصراً کہا۔

"ارے ابھی کھانا لگنے سے پہلے تو تم بھوک بھوک کا شور مچا رہی تھیں۔" سارہ جانتی تھی کہ علیزے بھوک کی کتنی کچی ہے۔ گھر میں بھی کالج سے آتے ہی اسے کھانا تیار چاہیے ہوتا تھا۔ انتظار کرنا تو اس کی سرشت میں نہ تھا۔

"کیا بات ہے۔ ایک دم تھکی تھکی لگ رہی ہو۔" سارہ نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"ہوں تھکن ہی ہو رہی ہے۔ مگر جسمانی نہیں بلکہ ذہنی تھکن۔ ایسا کرو یہ چاول بھی تم لے لو۔" کہہ کر اس نے پلیٹ اس کی سمت بڑھا دی اور خود پانی کا گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔

ہال سے واپسی پر سارہ ابو کے کان میں گھسی انہیں علیزے کے بدلے ہوئے رویے کی بابت بتانے لگی۔ ابو نے کچھ نہ کہا بس چپ چاپ سنتے رہے اور پھر جب گھر پہنچ گئے اور سب کپڑے تبدیل کر چکے تو ابو نے سارہ اور علیزے دونوں کے کمرے میں بلایا۔ امی تو خیر تھیں وہیں موجود۔

"علیزے یہاں آؤ بیٹا کوئی بات ہو گئی کیا؟ سارہ بتا رہی تھی تم نے کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔" ابو نے اپنے برابر میں بستر پر اس کے لیے جگہ بنائی۔

"ابو! آپ کو پتا ہے۔ جب ہم ٹھٹھہ، مکلی اور سجاول سے آگے کے گاؤں اور گوٹھوں میں گئے تو، وہاں اس وقت پانی کی تباہ کاری جاری تھی۔ گھر، مسجد، اسکول، کھیت، کھلیان سب پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کبھی وہاں کھیتوں میں چاول اور گنے کی مہک پھیلتی تھی مگر اب صرف خوف اور بے چینی کے سائے تھے۔

سکھ پور، مراد پور تک تو امداد پہنچی ہی نہیں تھی۔ لوگ اتنے بے بس تھے کہ بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اپنے شناختی کارڈ نکال کر آنے والوں کو دکھانے لگے کہ ہم ہی اصل متاثرین ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے ابو

جنہیں پتا ہی نا تھا۔ ملک کون چلا رہا ہے۔ جمہوریت ہوتی ہے؟ اور آمریت کیا۔

ان کی طمانیت اور سکون تو ان کی محنت میں پوشیدہ تھا۔ کئی ایکڑ اراضی، جس پر لگے اجناس ہم تک پہنچ کر ہمارے شکم کو سیر کرتے تھے۔ تو دوسری طرف تھے کے چند مویشی۔ جس کے دودھ سے بنی چائے پی کر ہمارے دن کا آغاز ہوتا تھا۔ مگر اب کچھ نہیں ہے۔ میں یہاں واپس آئی تو دیکھا کہیں کوئی فرق نہیں آیا۔ چھوٹے لوگوں سے لے کر بڑے لوگوں تک کرنے والوں اور بھیک مانگنے والوں کا ان بے چاروں کی امداد پر حق جتانے سے لے کر تو شادی ہالوں تک۔ حسی سی بے حسی ہے۔" علیزے بولنے پر آئی تو بولتی گئی۔ ابو، امی، سارہ حیران تھے۔ یہ سوچ یہ انداز کیا ان کی علیزے ہے۔

"بیٹا۔" پروفیسر منصور نے ایک گہری سانس لی۔

"میں ایک متوسط طبقے کا آدمی ہوں۔ جس کے اس کا گھر اس کی جنت ہے۔ جہاں اس کی ایک سمجھدار بیوی اور دو پیاری پیاری سی بیٹیاں ہیں ایک قدرے سنجیدہ طبیعت کی اور دوسری شرارتی سی میں جب بھر غم روزگار سے نبرد آزما ہو کر گھر کے راستے پر قدم رکھتا ہوں تو میرا دل طمانیت سے بھر جاتا ہے۔ باہر نفسا نفسی سے پرے مجھے اپنا گھر ایک مضبوط قلعہ ہے۔ مجھے خوشی ہے میں نے اور تمہاری امی نے دونوں کی پرورش بہترین خطوط پر کی ہے۔ تم دونوں سوچ اور انداز فکر مجھے ہر روز توانا کر دیتا ہے۔ مگر تمہارے لہجے سے جھلکتی یہ مایوسیت مجھے نپولین اس فقرے کی یاد دلا رہی ہے کہ "کسی دشمن کو ہرانے کے لیے ایسی حکمت عملی لڑاؤ کہ بغیر لڑے ان کی قوت مدافعت ختم ہو جائے۔"

"یاد رکھو بیٹا۔ جب سوچ میں مایوسی آجائے تو ہم بھی یقین اور ایمان سے خالی ہو جاتے ہیں اور یقین سے خالی جذبوں کے ساتھ کبھی بھی جنگ نہیں جیتی جاتی چاہے وہ آزادی کی جنگ ہو چاہے بحالی کی جنگ اور رہی بات لوگوں کی بے حسی کی تو ہم ہر ایک

پکڑ پکڑ کر حالات سے آگاہی نہیں دے سکتے مگر خود ضرور بارش کا پہلا قطرہ بن سکتے ہیں اور ہمیں بس وہی کرنا ہے۔ جو جہاں ہے اسے وہیں رہتے ہوئے اپنے حصے کا قرض چکانا ہے۔ تب ہی روشنی ہو گی تب ہی تیرگی چھٹے گی۔ یہ سال تو گزر گیا مگر سال نو کے لیے ہمیں اپنا عزم یہی رکھنا ہے۔" ابو دھیرے دھیرے کہتے جا رہے تھے اور ان کے لفظ علیزے اور سارہ کے دل پر نقش ہوتے جا رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

"علیزے، سارہ اٹھ جاؤ۔ کب تک پڑی سوتی رہو گی۔" امی دونوں کے بیڈ روم میں آئیں تو دونوں کو بے سدھ سوتے ہوئے پایا۔

"کیا امی، سونے دیں نا، آج تو سنڈے ہے۔" سارہ نے نیند سے بھری آواز میں کہا۔ مگر انداز ایک مشہور ایڈ کی نقل تھا۔

"ہاں پلیز امی سونے دیں۔" علیزے نے بھی تائید کی۔

"ٹھیک ہے سارہ۔ پھر ایسا کرتے ہیں کہ تمہاری منگنی ملتوی کیے دیتے ہیں۔ کیونکہ آج تو سنڈے ہے۔" امی نے بھی اسی کے انداز میں دہرایا اور سارہ اچھل پڑی۔ وہ بھول ہی گئی تھی کہ اس کی تو آج اپنے پھپھو زاد کزن نہال سے منگنی تھی جو ایک مکینیکل انجینئر تھے۔ فوراً بستر سے نکل کر باتھ روم کی طرف بھاگی کہ ناشتے کے بعد اسے کافی کچھ کرنا تھا۔ منی کیور اور پیڈی کیور بھی رہتا تھا۔

"یہ نہال بھائی تو بہت چھپے رستم نکلے امی مجھ سے اتنی اچھی ان کی دوستی تھی۔ مگر کبھی ہوا نہیں لگنے دی کہ سارہ کو پسند کرتے ہیں۔ میں تو ابھی جا کر فون پر ان کی گوشمالی کرتی ہوں۔" علیزے نے بھی بستر سے چھلانگ لگائی۔ نہال، پروفیسر منصور کی اکلوتی بہن بدر کے بیٹے تھے اور علیزے سے ان کی بڑی گاڑھی چھنتی تھی۔

"ارے علیزے، پہلے ہاتھ منہ دھو کر ناشتا کرو۔ پھر بات کر لینا اور اپنے رات کے فنکشن میں پہننے والے کپڑے بھی دیکھو فٹنگ وغیرہ ٹھیک ہے۔" امی نے اسے روکنا چاہا۔

"امی آپ اور سارہ لائے ہیں تو اچھے ہی ہوں گے۔" یہ کہہ کر اس نے بستر سے چھلانگ لگائی اور یہ جا وہ جا۔

اس کے بعد چھوٹے چھوٹے کاموں میں دن گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ چونکہ پھپھو جب رشتہ لے کر آئی تھیں تب علیزے حیدر آباد، ٹھٹھہ وغیرہ گئی ہوئی تھی۔ اس لیے اسے منگنی کے انتظامات کی مطلق خبر نہ تھی۔

"امی کون سا ہال بک کیا ہے، مینو کیا ہے؟ کس کس کو مدعو کیا ہے، ویسے تو منگنی کے چکر میں پڑنے سے تو بہتر تھا کہ پھپھو براہ راست شادی ہی کر لیتیں اور جو پیسے ادھر بچے وہ ہم سیلاب زدگان کی مدد کے لیے بھیج دیتے۔" پوچھنے کے ساتھ ہی علیزے نے اپنی رائے دی مگر امی نے کچھ نہ کہا۔ بس اتنا ہی کہا کہ سنڈے ابھی ختم نہیں ہوا۔ کہ سارا زور سنڈے پہ تھا۔

پھر شام میں مہمان آنا شروع ہو گئے۔ پھپھو بدر کی فیملی، ماموں کی فیملی اور خالہ کی فیملی اور سارہ کی دو سہیلیاں نازیہ اور مہک سب ملا کر بیس کے قریب مہمان تھے سارہ نے سرخ رنگ کی گوٹے کے کام والی فراک پہنی تھی جبکہ علیزے نے گلابی رنگ کی فراک پہنی تھی جس کے گلے پر کڑھائی ہوئی تھی۔ سارہ کو رسم کے لیے لایا گیا۔ نہال اور سارہ کی جوڑی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ پھپھو نے آگے بڑھ کر سارہ کو پھولوں کا زیور پہنایا پھر نہال نے اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنا دی۔ سب نے ایک دوسرے کو مبارک باد دی۔

"واہ نہال بھائی، دعوے محبت کے اور انگوٹھی پھولوں کی۔ اصلی سونے کی انگوٹھی کہاں ہے۔" علیزے نے ہاتھ نچائے۔

"سونے کی انگوٹھی۔" نہال بھائی نے ٹھنڈی

سانس بھری۔

"بہنا۔ وہ تو سیلابی ریلے میں بہہ گئی۔" نہال بھائی نے اتنے مزے سے کہا کہ سب ہنس پڑے مگر علیزے کی خاک سمجھ نہ آیا۔ اس نے پوچھنا چاہا تو ابو نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر روک دیا کہ یہ سرپرائز تھوڑی دیر بعد کھلے گا۔

پھر اس کے بعد امی اور باقی سب لڑکیوں نے ٹیبل پر کھانا چن دیا۔ ایک ٹیبل ان کے گھر کی تھی اور دو ٹیبلز ہمسایوں سے مستعار لی گئی تھیں۔ یوں بیس افراد کے کھانے کی نشستوں کا انتظام ہو گیا اور کھانے میں صرف ایک ڈش تھی۔ یعنی امی کے ہاتھ کی ذائقہ دار بریانی جو سب کو ہمیشہ سے مرغوب تھی۔ ساتھ میں سلاد اور رائتہ۔ سب کھانے سے بہت لطف اندوز ہوئے۔ جب کھانا ختم ہو چکا تب علیزے نے ابو سے درخواست کی کہ "پلیز اب تو بتا دیں کہ کیا سرپرائز تھا۔"

"ہاں بھئی میرا خیال ہے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ سرپرائز ختم کر دیا جائے۔ تو بیٹا علیزے بات یہ ہے کہ اگر ہم منگنی کا انتظام ہال میں کرتے۔ سارے عزیز رشتے داروں اور دوست احباب کو بلاتے تو دو تین طرح کے پکوان رکھنے پڑتے اور کافی خرچہ بھی ہوتا۔ دوسری طرف تمہاری پھپھو بھی اگر سونے کی انگوٹھی اور سب کی پسناونیاں لاتیں تو ان کا بھی اتنا ہی خرچا ہوتا۔ لہٰذا دونوں طرف کے جمع شدہ روپے اس بے جا نمود و نمائش پر خرچ کرنے کے بجائے ہم نے سیلاب زدگان کے فنڈ میں جمع کرا دیے کہ جس طرح آج ہم دل سے بہت خوش ہیں وہ بھی اس طرح ہماری خوشیوں میں شریک ہو جائیں۔" سنڈے ختم ہونے میں دس منٹ باقی تھے مگر ابو نے بالآخر سرپرائز ختم کر ہی دیا تھا۔ اتنے میں کنزی اور فضا علیزے کی خالہ زاد بہنیں آئس کریم پیالیوں میں نکال کر سب کے لیے لے آئیں کہ میٹھے میں آئس کریم تھی۔

"تھینک یو ابو۔" علیزے کی آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔

"نہیں بیٹا، تھینکس تو ہم سب نے تمہیں کہنا ہے کہ کبھی کبھی چھوٹے بھی اپنے بڑوں کو وہ بات سمجھا دیتے ہیں جو بڑے اپنے بڑے پن میں بھول جاتے ہیں۔" یہ کہہ کر ابو نے اپنے پیالے میں سے چمچ بھر کے علیزے کے منہ میں آئس کریم ڈالی۔ علیزے مسکرا دی۔ وہ خوش تھی اور اس سے زیادہ ابو خوش تھے کہ ان کی لاڈلی کی ہنسی لوٹ آئی تھی۔

☼ ☼

نایاب جیلانی

ساتویں قسط

بعض فیصلے عمر بھر کا پچھتاوا بن جاتے ہیں اور کہتے ہیں نا "گیا وقت دوبارہ ہاتھ نہیں آتا۔ بس ایسی ہی پچویشن اور پچھتاوے کا فیفا کو سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

شادی سے پہلے امی کے مجبور کرنے پر اس نے جاب تو چھوڑ دی تھی۔ تاہم جاب چھوڑنے کے فوراً بعد ہی اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس نے جلد بازی میں ایک غلط فیصلہ کر لیا ہے۔ اپنی صلاحیتوں اور ذہن کو زنگ آلود کرنا بھی کہاں کی عقل مندی تھی۔ مگر امی کی

مکمل ناول

منطق اس معاملے میں نرالی ہی تھی۔ حالانکہ وہ کون سا میکے سے سسرال تک کا سفر کر کے آئی تھی۔ یا پھر اسے سسرالیوں کی ناراضی کا خدشہ تھا۔ جاب کے معاملے میں سہیل نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ سو فیفا کو گھر میں بے کار بیٹھنا سخت ناگوار گزر رہا تھا۔ اور وہ چاہتی تھی کہ نفیسہ بیگم اسے جاب کی اجازت دے دیں، تاکہ وہ پھر سے جاب ڈھونڈنے کی مہم پر روانہ ہو۔

مگر بھلا ہو سہیل کی طرف سے ملنے والے پہلے ڈرافٹ کا۔ امی نے تو بانگ دہل کہہ دیا تھا۔

"اب اچھی بیویوں کی طرح آرام سے گھر بیٹھو۔ شوہر کے ذمہ نان نفقہ کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ جب وہ تمہارے اخراجات کے لیے رقم بھیج رہا ہے تو پھر تمہیں نوکری کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ میرا گزارا تو با آسانی پنشن سے ہو رہا ہے۔"

"مگر امی! میں فارغ نہیں رہ سکتی۔" وہ ان دنوں بے حد بے زار، بے زار ہو رہی تھی۔

"کچھ دنوں کی مہمان ہو، پھر خیر سے عمان چلی جاؤ گی۔ اپنے رنگ روپ کی فکر کرو، لڑکیوں کو تو ہزار طریقے آتے ہیں خود کو چمکانے کے۔ تم بھی ادھر پارلر والر چلی جایا کرو۔" امی نے لگے ہاتھوں اسے مشوروں سے بھی نوازنا شروع کر دیا۔

"مجھ سے ان فضول۔ جھنجھٹوں میں نہیں پڑا جاتا۔" وہ کیاریوں کی گوڈی کرنے میں مصروف تھی۔ نفیسہ بیگم کے کئی مرتبہ منع کرنے کے باوجود وہ مجھی سے اپنے کام میں مصروف رہی۔

"یہاں نئے پودے نہ لگا دوں؟"

"کوئی ضرورت نہیں۔" وہ سبزی کاٹتے ہوئے ناگواری سے بولیں۔

"کل جب میں جاوں گی تو واپسی پر نئے گملے بھی لاؤں گی۔" فیفا خود کلامی کے انداز میں بولی۔

"کہاں جاؤ گی؟" وہ بری طرح سے ٹھٹکیں۔

"ایک جگہ انٹرویو دینا ہے۔" اس نے چہرے پر دنیا جہان کی مسکینیت طاری کر لی۔

"اب نوکری کا خیال دل سے نکال دو۔ دیکھو بیٹی! بلا ضرورت دھکے کھانے کا کوئی فائدہ بھی ہے۔" وہ نرمی سے سمجھانے لگیں۔ جانتی تھیں کہ فیفا کو سمجھانا اور قائل کرنا مشکل کام ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک دلیل

اونٹ نکالتی تھی۔

"اپنی صلاحیت کو زنگ لگانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔ پہلے بھی تو جاب کرتی تھی نا۔ آپ نے بھی نہیں روکا۔" وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھ گئی۔

"پہلے کی بات اور تھی۔ اب تم شادی شدہ ہو۔ شوہر کی مرضی کے بغیر کوئی قدم بھی اٹھاؤ گی تو اسے

ناگوار گزرے گا۔"
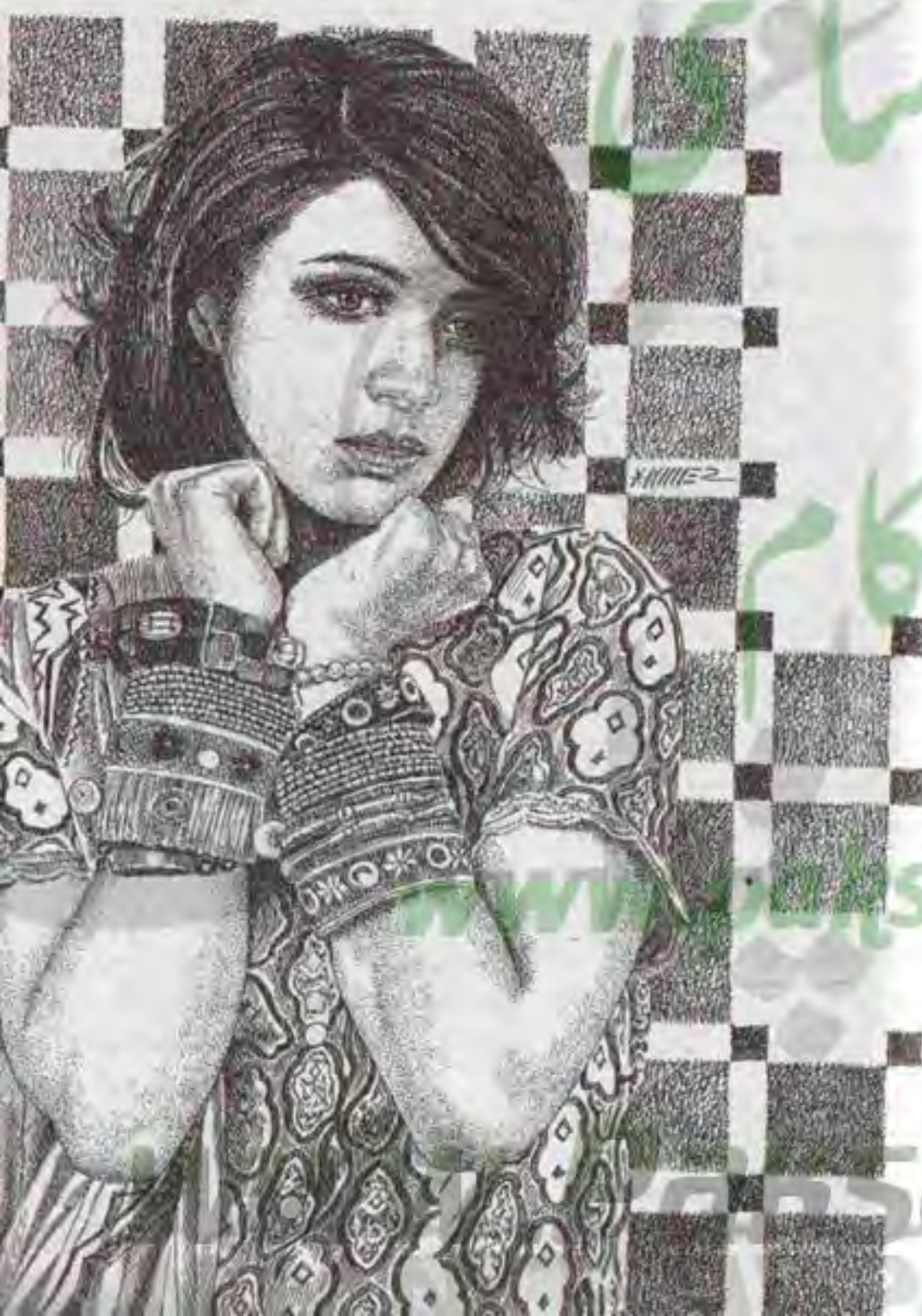
"تو یوں کہیں نا۔" فیفا گویا سمجھ کر مسکرائی۔

"سہیل سے پوچھ لیتی ہوں۔ ویسے انہیں پہلے بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔"

"سہیل کا تین دن سے فون بھی نہیں آیا۔" نفیسہ بیگم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"تم ہی رابطہ کر لیتیں۔"

"ابھی کرتی ہوں بس ذرا ہاتھ منہ دھولوں۔" فیفا کی بے تابی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ نفیسہ بیگم بس اسے دیکھ کر ہی رہ گئیں۔

تب ہی فون کی بیل گونج اٹھی تھی۔ وہ بمشکل اٹھ کر فون تک گئی تھیں۔ سہیل کا فون تھا۔ نفیسہ بیگم گویا نہال ہو گئیں۔

"ماشاء اللہ ہم ابھی تمہیں ہی یاد کر رہے تھے۔"

"اچھے لفظوں میں یا پھر۔" سہیل بھی شاید اس وقت فارغ ہی تھا۔ ورنہ تو حال احوال پوچھ کر فون رکھ دیتا تھا۔ ویسے بھی اسے گئے ہوئے فقط دو ماہ ہی تو ہوئے تھے اور اتنے مختصر عرصے میں ابھی تک اسے اپنی ساس سے بات کرنے میں جھجک محسوس ہوتی تھی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے کہ ہم تمہارا ذکر کن الفاظ میں کر سکتے ہیں۔" وہ بڑی خوشدلی سے پوچھ رہی تھیں۔ پہلی مرتبہ وہ حال احوال سے آگے کی بات کر رہا تھا۔ انہیں سہیل کی باتوں میں چھپی اپنائیت بہت اچھی لگی۔

"یقیناً" آپ تو اچھے الفاظ میں ہی یاد کر رہی ہوں گی۔ تاہم عفیفا کو مجھ سے خاصے شکوے ہوں گے۔"

"ارے نہیں تو۔" نفیسہ بیگم نے فوراً" وضاحت دینے والے انداز میں کہا۔ وہ اس کے شکوے کا مفہوم سمجھ ہی نہیں پائی تھیں۔

"عفیفا کہاں ہے؟" سہیل پوچھ رہا تھا۔ اسی پل عفیفا بھی باہر آ گئی۔

"بھلے وقت میں سہیل کا فون آیا ہے۔ اب اس سے نوکری کی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔" وہ ریسیور اسے تھما کر اشارے سے سمجھا رہی تھیں لیفا کو ہنسی آ گئی۔ نفیسہ بیگم کے چلے جانے کے بعد وہ فون کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ یہ پہلی طویل کال تھی جس کا دورانیہ پندرہ منٹ پر مشتمل تھا۔ سہیل اس سے ڈرافٹ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ ساتھ اس نے بتایا تھا کہ وہ تین، چار ماہ تک اسے لینے کے لیے آئے گا۔ تب تک اس کے کاغذات بھی تیار ہو جائیں گے۔

لیفا نے لگے ہاتھوں اس سے جاب کی بات بھی کر لی تھی۔ سہیل نے کھلے دل کے ساتھ اسے مصروف رہنے کی اجازت دے دی۔

امی نے سنا تو سر تھام لیا۔ انہیں شاید سہیل سے اتنی جلدی مان جانے کی توقع نہیں تھی۔

اگلے دن لیفا نے سارے اخبار تقریباً" چاٹ ڈالے تھے اور نفیسہ بیگم اسے اخبار میں سر کھپاتے دیکھ کر خوامخواہ پریشان رہیں۔

"بازار۔ اور کہاں جانا ہے۔ تمہیں کچھ چاہیے تو نہیں۔" وہ بٹوے میں پیسے چیک کر رہی تھیں۔ لیفا اخبار سمیٹ کر اٹھ گئی۔ ارادہ تھا کہ گیٹ بند کر کے کپڑے پریس کر لے گی۔ مگر بھلا ہو اس منحوس لائٹ کا جو عین موقع پر بے وفائی کر گئی۔

ابھی لائٹ کو کوستے ہوئے اس نے سالن پکانے کا سوچا ہی تھا جب دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ بھناتے ہوئے گیٹ تک پہنچی تھی اور بغیر پوچھے ہی گیٹ کا پٹ کھول دیا تھا۔ مگر سامنے کھڑی شخصیت کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔

"نہ جانے کیسی کیسی بددعائیں دی تھیں آپ نے اسے۔ چار سال بھی نہ جی سکی۔" شاہ نواز نیچے عدالت سجائے بیٹھا تھا۔ ثریا جہاں کٹہرے میں پشیمان پشیمان کھڑی تھیں۔ بیگ صاحب ہمیشہ کی طرح خاموش تماشائی تھے۔ وہ تو پہلے بھی کسی معاملے میں نہیں بولتے تھے۔ ہمیشہ بیگم اور شاہ نواز کے درمیان ہونے

والی جھڑپوں میں بھی کبھی انہوں نے بولنے کی جرات نہیں کی تھی۔

بیگ صاحب کی شخصیت بھی عجیب تھی۔ پہلے ماں زندہ تھی تو ان ہی کے حکم کے مطابق معاملات نمٹائے جاتے تھے۔ جیسی جابر طبیعت خاتون اول ثریا جہاں نے پائی تھی دوسری بیوی بھی گنوں کی خوب تھی۔ اینٹ اور پتھر جیسا بیر دونوں میں رہا۔ ایک دوسرے کے بخیے ادھیڑنے میں ان دونوں کا کوئی ثانی نہ تھا۔

مگر بھلا ہو شاہے کی ماں کا۔ ثریا جہاں سے مقابلے میں وہ ہار گئیں۔ ایسی نیند سوئیں کہ دوبارہ اٹھ ہی نہ سکیں۔ بیگ صاحب نے گویا سکھ کا سانس لیا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ شاید اب گھر کا ماحول بہتر ہو جائے گا۔ مگر یہ بھی ان کی بھول تھی۔

شاہ نواز نے اپنی ماں کے نہ ہونے کی ساری کی پوری کر دی تھی۔ کچھ عرصہ تک تو ثریا جہاں اس پر حاوی رہی تھیں مگر جوں ہی شاہ نواز نے اڑان بھری، پھر ثریا جہاں کے ہاتھ نہ آیا۔

انہیں اس بات کا احساس ہی نہیں تھا کہ شاہ نواز کو اپنے تلخ اور ظالمانہ رویے کی وجہ سے خود سے دور کرتی جا رہی ہیں اور کبھی ایسا بھی وقت آ سکتا تھا جب انہیں شاہ نواز جیسے گھنے شجر کی چھاؤں اور سائے کی ضرورت بھی پڑ سکتی تھی۔

بیگ صاحب کی بزدلی اور کمزوریوں نے ان کے گھر کا ماحول ہمیشہ تلخ ہی رکھا۔ وہ کبھی بھی متوازن شخصیت نہیں رہے تھے۔ نہ ہی اپنی زندگی میں انہوں نے توازن قائم رکھا تھا۔

ثریا جہاں کی تمام تر زیادتیوں کو سمجھنے کے باوجود بھی انہوں نے کبھی انہیں 'سمجھانے' بجھانے کی جرات نہیں کی تھی۔

ایک مرد کی بزدلی کا شکار پورا گھرانہ ہوتا ہے۔ جو مرد انصاف اور توازن قائم رکھنے کی اہمیت نہیں رکھ سکتا۔ اس گھر میں ہمیشہ عورت برتری حاصل کر جاتی ہے۔

عورت کی جذباتیت کے پیش نظر بہت سے معاملات میں اسے اختیارات سے دور رکھا گیا ہے۔

مرد کو حاکم بنایا گیا ہے۔ گھر کی بنیاد میں اگر ایک اینٹ بھی کچی، ٹیڑھی یا کمزور لگا دی جائے تو عمارت کے ڈھے جانے کا خدشہ لاحق ہوتا ہے۔ مرد کی ذرا سی کمزوری اور فیصلہ نہ کر سکنے کی اہلیت کا نہ ہونا بھی عمارت کو ڈھانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

بیگ صاحب، مظلوم قسم کے مردوں کے قبیلے میں سے تھے۔ شاہ نواز نے جس قسم کا ماحول اپنے گھر کا دیکھا تھا سو وہ اپنے باپ جیسے مردوں سے چڑنے لگا تھا۔ جو عورت کو اتنی چھوٹ دے دیتے ہیں۔ اتنی آزادی دے دیتے ہیں۔ ہر بات میں عورت کے فیصلے کو اہمیت دیتے ہیں اور خود تمام عمر بے دام کے غلاموں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

اور اسے بد مزاج، جھگڑالو اور غصیلی عورتوں سے

بھی انتہا درجے کی نفرت ہوگئی تھی۔ شاید یہ ہی وجہ تھی کہ حریم ماہیر عالم سے پہلی ملاقات میں ہی وہ بے حد متاثر ہوگیا تھا۔ نرم مزاج' بے حد دھیما اور پراثر بولنے والی ٹھنڈے میٹھے جھرنے جیسی لڑکی۔ سنجیدگی' وقار اور دلکشی کا پیکر۔

"تمہاری بیوی مرچکی ہے۔" ثریا جہاں کو گویا قطعاً" یقین نہ آیا۔

"جی۔ مرچکی ہے' آپ شکرانے پڑھیے۔" شاہ نواز انہیں ہلکا سا پشیمان دیکھ کر چوٹ کرنے سے باز نہ آیا۔

"اگر کسی طور طریقے سے شادی کرتے تو مجھے اتنا دکھ بھی نہ ہوتا۔" وہ اپنی شرمندگی مٹانے کو کہہ رہی تھیں۔ اپنی قسمیں اور عہد انہیں یاد آرہے تھے۔ جو رباب کے اس گھر میں آنے کے حوالے سے وہ خود سے کرتی رہی تھیں۔ خودکشی تک کی دھمکی بیگ صاحب کو دے رکھی تھی۔

"طور طریقے اور دستور کے مطابق ہی کی تھی۔" شاہ نواز نے چبا چبا کر کہا۔

"اور تمہاری بچی کہاں گئی ہے؟" کچھ بن نہ پڑا تو بات بدلنے کی غرض سے وہ منمنا کر بولیں۔

"بچی کی اطلاع آپ کو کس نے دی؟" شاہ نواز بری طرح سے ٹھٹکا۔

"تم نے خود فون کرکے بتایا تھا۔" ان کی یادداشت بھی غضب کی تھی۔

"اور آپ کے سینے پر انگارے لوٹ گئے۔ ایسی ایسی گالیوں سے نوازا' بددعائیں دی تھیں کہ بے چاری دوسرا سانس بھی نہ لے سکی۔" وہ بھرائی آواز میں جھوٹ پر جھوٹ بولے جا رہا تھا۔

"بچی بھی مرگئی۔" ثریا جہاں کے دل پر گھونسا سا پڑا۔ انہوں نے کچھ دیر کے لیے سوچا۔ کسی مری ہوئی عورت اور اس کی بچی سے بھلا کدورت کیا رکھنی۔ دنیا دکھاوے کو سہی' وہ دل ہی دل میں بہو اور پوتی کے ایصال ثواب کے لیے ایک محفل کے اہتمام کا سوچ رہی تھیں۔ اس سے دو فائدے نظر آرہے تھے۔

ایک تو شاہ نواز کی جیب پر ہاتھ آجاتا اور دوسرا لوگوں کی نظر میں وہ مزید نیک پروین بن جاتیں۔ جنہیں سوتیلے بیٹے کا بڑا ہی احساس تھا۔ حالانکہ لوگ اندھے اور بہرے نہیں تھے۔ سب دیکھتے اور سنتے تھے۔

"تم نے بتایا بھی نہیں۔" ان کی آواز پہلے سے بھی دھیمی ہوچکی تھی۔

"بتا کر کیا کرتا۔ آپ نے کون سا ان کا آخری دیدار کرنا تھا۔" شاہ نواز نے رنجیدگی سے کہا۔

"تم نے ٹرانسفر کا بھی نہیں بتایا۔" وہ پھر سے لاجواب ہوچکی تھیں۔ اسی لیے بات بدل کر بولیں۔

"اتنے دن کہاں ہے؟"

"کسی فٹ پاتھ پر تو نہیں رہا۔" وہ چبا چبا کر بولا۔

"ویسے آپ نے تو میرے گھر میں گھسنے پر بھی پابندی لگا رکھی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ گھر دادا نے اپنی زندگی میں ہی اپنے ہونے والے پوتے کے نام کردیا تھا۔" شاہ نواز بھی جتلانے سے باز نہیں آتا تھا۔ ثریا جہاں نے زور سے پہلو بدلا۔ انہوں نے تو اپنے سسر کو بھی آج تک معاف نہیں کیا تھا۔ ان کی راجدھانی وہ ان کی سوکن کے بیٹے کے حوالے جو کرگئے تھے۔ اور یہ بات نہ جانے کب شاہ نواز کو پتا چل گئی تھی۔

"تم تنہا ہی سارے دکھ جھیلتے رہے۔ اپنوں کو بتایا بھی نہیں۔" ثریا جہاں نے خوامخواہ لہجے میں رقت بھرلی۔

"کون سے اپنے؟ آپ اور صرف آپ۔" وہ تیوری چڑھا کر بولا۔

"کب آپ نے مجھے اپنا سمجھا ہے؟"

"تم بھی تو مجھے ماں کا درجہ آج تک نہیں دے سکے۔" وہ گیند اس کی طرف اچھال کر خود مطمئن ہوگئیں۔

"عورت کے پاس ایک ہی تو فن ہے' جب چاہتی ہے مظلوم بن جاتی ہے۔" شاہ نواز ان کی چالاکی پر تاؤ کھا کر رہ گیا۔

"ابھی تک میرے زخموں پر کھرنڈ نہیں آئے' اماں

حضور۔" وہ بھی ماضی کو بھول نہیں سکتا تھا۔

"ارے' تم بھی تو ناک میں دم کیے رکھتے تھے۔ اتنے نقصان کرتے تھے کہ حد نہیں۔" وہ چمک کر گویا ہوئیں۔

"اوپر والا حصہ کب سے کرائے پر دے رکھا ہے؟" معاً" اسے کچھ خیال آیا تو پوچھ بیٹھا۔

"تمہیں اعتراض ہے کیا؟" انہوں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔ آواز میں پستی نمایاں تھی۔

"جی۔" اس نے ناک بھوں چڑھائی۔

"مجھ سے مشورہ کیے بغیر آپ نے اوپر والا حصہ کرائے پر کیوں دیا ہے۔ جبکہ آپ جانتی بھی تھیں کہ میرا کمرہ اوپر ہے۔"

"تمہارے ابو نے دیا ہے۔" وہ صاف اپنا دامن بچا گئی تھیں۔

"عالم صاحب تمہارے ابو کے بڑے قریبی عزیزوں میں سے تھے۔ ان کے بیٹے نے تمہارے ابو سے بات کی تو انہوں نے اوپر والا حصہ کرائے پر دے دیا۔"

"آپ سے پوچھے بغیر۔" شاہ نواز کو قطعاً" یقین نہ آیا۔

"نہیں' پوچھا تو تھا ہی۔ راحت میری سہیلی تھی نا۔ بس اسی وجہ سے میں بھی مان گئی۔ تمہارے رہتے تنگ آچکی تھی۔ ان کے آجانے سے میرا بھی دل لگا رہتا ہے۔ بڑی اچھی بہو ہے راحت کی۔ اکثر اوپر سے ہی کھانا آجاتا ہے' مجھے تو بڑی سہولت ہوگئی ہے۔"

"پھر بھی آپ نے اپنی سہولت ہی دیکھی ہے' بڑی مطلبی ہیں آپ۔" وہ تھوڑی دیر کے لیے محفل برخاست کرکے کچن میں گیا تھا۔ چائے بنانے کے ساتھ ساتھ وہ مذاکرات بھی کیے جا رہا تھا۔ اور ثریا جہاں دل ہی دل میں تلملا رہی تھیں۔ ابھی انہوں نے اوپر بھی جانا تھا۔ حریم چائے بنا چکی تھی اور راحت بیگم ان کا یقیناً" انتظار بھی کررہی تھیں۔

"تم ذرا زبان سنبھال کر بات کرو۔" وہ اپنے لیے چائے لے کر آیا تھا صرف۔ ثریا جہاں کو اسی بات پر غصہ آگیا۔

"سوتیلی جو ہوں۔ کیوں فکر کرے گا۔ پتا بھی ہے کہ چائے کا وقت ہو رہا ہے۔ مگر صرف اپنے لیے ہی لایا ہے۔" وہ بیگ صاحب کو سنا رہی تھیں جو چپکے سے اٹھ کر باہر نکل رہے تھے۔

"میری زبان نہیں سنبھل سکتی' میم آپ کی زبان کے ڈیزائن جیسی ہے اس لیے۔" وہ بھی کہیں نہیں چوکتا تھا۔

"آپ کب تک چھڑے رہنا ہے؟" انہوں نے تلملا کر موضوع بدلا۔

"جی کیا مطلب؟" وہ سمجھ تو چکا ہی تھا' جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"شادی نہیں کرنی؟" شاہ نواز نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

"ابھی تک تو رباب کی لحد کی مٹی نہیں سوکھی۔"

"مئی کا آغاز ہونے والا ہے۔ سوکھ جائے گی جلد ہی' تم ارادہ تو کرو۔" انہیں بھی بات گھمانے میں کمال حاصل تھا۔

"کیوں جناب! آپ کی بھانجی ابھی تک کنواری بیٹھی ہے۔" شاہ نواز کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

"کیوں بھلا۔ اسے کیا مجبوری تھی جو تمہارے پیچھے جوگ لے لیتی۔ اس کے تو خیر سے تین بچے ہیں۔" ثریا جہاں نے منہ کے زاویے بگاڑ کر وضاحت کی۔

"تو کیا' کوئی اور لڑکی نظر میں ہے۔"

"تم ہاں تو کرو' دس لڑکیوں کی لائن لگادوں گی۔" ثریا جہاں نے نہال ہوکر کہا۔

"حریم جیسی لاؤں گی۔ جو میری بھی عزت قدر کرے' اچھا ہوا وہ پٹھانن مر کھپ گئی۔ ادھر آجاتی تو میرا اور اس کا گزارا ہونا مشکل تھا۔ پشتو میں نہ جانے مجھے کون کون سی گالیوں سے نوازتی رہتی۔ میرے تو فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہونی تھی۔"

"تو آپ اسی وجہ سے رباب سے خار کھاتی

"اماں! ایک بات تو آج مجھے سچ سچ بتا دیں؟" وہ ان کے گھٹنے کے قریب کچھ دیر کے لیے بیٹھا۔

"کون سی بات؟"

"آپ ... مجھ سے محبت نہ سہی انسیت تو ہے نا؟" شاہنواز نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"چل ہٹ۔" ثریا جہاں مسکرا دیں۔

"محبت کیوں نہیں۔۔۔ بس سلیقہ نہیں آیا مجھے محبت جتانے کا۔ ساری زندگی محبت کا مفہوم سمجھتی رہی، پر محبت کرنا نہ آیا۔ سوت کے ہاں بیٹا ہوا تو بے انتہا جلن ہوئی۔ پر اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ میں حسد کرتی۔ بس عورت کی فطرت ہی ایسی ہے۔ عمر بھر حسد، بغض اور نفرت کے بھانبڑ میں جلتی رہی۔ پر میرا بھی اتنا قصور نہیں، تمہاری ماں بڑی اداکارہ تھی۔ گھنی بنی رہتی تھی۔ سارے گھر والوں کو اپنے ساتھ کیا ہوا تھا اور میں بد مزاج، غصے کی تیز، زبان کی کڑوی، سو سب دور رہی، نہ محبت ملی، نہ بانٹنی آئی۔"

"آپ کو مجھ سے محبت کب ہوئی؟" شاہ نواز کی بھی کوئی کل سیدھی نہیں تھی۔ ایسے بے تکے سوال کرنا کہ ثریا جہاں ـــ جوتی اٹھا لیتی تھیں اور پھر اس کی خوب دھنائی ہوتی۔ مگر اب تو وہ جوتی اٹھانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ ان کے قد سے بھی اونچا تھا۔ اور وہ اس کے سامنے بونی دکھائی دیتی تھیں۔

"یہ کیا بات ہوئی؟" انہیں حسب معمول غصہ آگیا۔

"آپ اگر مجھ سے محبت کرتی ہیں تو مجھے معاف کر دیں نا۔" وہ ان کے گھٹنے تھامے التجا کر رہا تھا۔ آنکھوں میں شرارتی چمک تھی۔ لبوں کو سختی سے ایک دوسرے سے بھینچ رکھا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ مسکراہٹ کا فوارہ نہ پھوٹ پڑے۔

"کیسی معافی؟" ثریا جہاں نے حیرانی سے ناک پر انگلی رکھی۔

"وہ۔ دراصل اماں! میں نے آپ کو ستانے، جلانے اور کھپانے کی خاطر جھوٹ بولا تھا۔" وہ کان کھجاتا ان کے پاس سے اٹھ گیا۔

"کیا جھوٹ؟" وہ اب بھی نہیں سمجھ سکیں۔

"یہی کہ چوٹیلی! میری بیوی مری نہیں۔" اس نے سر جھکا کر کہہ دیا۔

"کیا زندہ ہے؟" ثریا جہاں کو دھچکا لگا۔

"کلموہی، ذلیل، بچھاڑن، اس گھر میں آنے کے خواب دیکھ رہی ہوگی۔ ہرگز اسے اپنے گھر میں قدم رکھنے نہیں دوں گی۔ اگر تو اسے ادھر لایا تو میری لاش پر سے گزرنا ہوگا۔ فوراً" اپنا بستر سمیٹو اور نکلو یہاں سے۔" وہ ایک دم آگ بگولا ہو کر رہ گئی تھیں۔ فاتحہ خوانی اور قرآن خوانی کی محفل سجانا بھول گیا۔

"اماں! اتنا بھڑکنے کی ضرورت نہیں۔ ساری انرجی ڈاؤن ہو جائے گی۔ ابھی آپ نے مزید بھی غصہ کرنا ہے، کچھ بعد کے لیے بچا رکھیے۔" وہ ہمدردی جتا کر بولا۔

"منحوس میں کیوں بکواس کر رہا ہے۔ ایک ہی دفعہ جا کر میری جان نکال دے۔ دو گھڑی خوش بھی نہیں رہنے دیا۔" ثریا جہاں بری طرح سے تپ رہی تھیں۔ ابھی شاہ نواز کی صورت پر پیار آ رہا تھا۔ مگر اس وقت انہیں وہ زہر سے بھی برا لگنے لگا۔ جی چاہ رہا تھا اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیں۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ وہ دھکے کھانے اور جوتے کھانے کی عمر سے بہت آگے جا چکا تھا۔ سو وہ دل ہی دل میں تلملاتی رہیں۔

"دراصل اماں! رباب زندہ بھی نہیں۔" وہ کان کھجانے لگا۔

"کیا مطلب؟ نہ وہ زندہ ہے، نہ وہ مردہ ہے تو کیا بدروح بنی تمہارے اردگرد گھوم رہی ہے۔" انہوں نے دہل کر پوچھا۔

"نہیں اماں! دراصل میری شادی نہیں ہوئی۔ بلکہ میں نے کسی سے شادی نہیں کی۔" اس نے سچ اگل ہی دیا۔

"کیا؟" کچھ پل تو ثریا جہاں نے سوچنے میں صرف کیے۔ جب بات سمجھ میں آئی تو انہوں نے جو

اٹھانے میں دیر نہیں کی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ شاہ نواز دو چھلانگوں میں ہی ان کی پہنچ سے دور ہو گیا۔

"چھوٹا کمینہ۔ اتنا خون جلایا ہے میرا۔ آخر کس ماں کی اولاد ہے۔ وہ جہنم جلی خود تو چلی گئی، اسے میرے سینے پر مونگ دلنے کے لیے چھوڑ گئی۔" وہ ہانپتے کانپتے صوفے پر ڈھے کر لمبے لمبے سانس لینے لگی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"تم؟" فیفا، ماہیر کو سامنے کھڑا دیکھ کر کچھ پل کے لیے تو بول ہی نہیں پائی تھی۔ بہت عرصے بعد وہ ان کے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔

"کیوں؟ میں نہیں آسکتا یہاں؟"

"اُف۔" وہ دروازے کے سامنے سے ہٹ گئی تھی۔

"پھوپھو کہاں ہیں؟" پورا لاؤنج بھاں بھاں کر رہا تھا۔ پھوپھو کی مخصوص رنگین پایوں والی چارپائی بھی خالی تھی۔ انہوں نے لاؤنج میں تخت کے بجائے بڑے سے بھاری بھرکم پایوں والی سفید پٹیوں کی چارپائی بچھا رکھی تھی۔ جس کے اوپر گلابی پھولوں کی چادر بچھی تھی۔ آرام دہ تکیہ بھی موجود تھا۔ اکثر پھوپھو رات کو اسی چارپائی پر ہی سو جاتی تھیں۔

"امی بازار گئی ہیں؟"

"اور تم آج کل گھر میں کیوں؟" وہ صوفے پر بیٹھ رہا تھا۔ امی کے گھر میں نہ ہونے کے باوجود ماہیر کا بیٹھنا فیفا کو حیرانی میں مبتلا کر گیا تھا۔ کیونکہ آج سے پہلے وہ امی کی غیر موجودگی میں گھڑی بھر کے لیے بھی نہیں رکا تھا۔

"جاب تو کب کی چھوڑ چکی ہوں۔" وہ کٹی ہوئی سبزی کی ٹوکری اٹھا کر کچن میں رکھ کر واپس آئی تو ماہیر کو ٹی وی کا ریموٹ اٹھا کر چینل سرچنگ میں مصروف پایا۔ وہ موڑھا گھسیٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ کافی دیر تک جب ماہیر اس کی طرف متوجہ نہ ہو سکا تو فیفا کو بالآخر بولنا ہی پڑا۔

"یہ چینل تو تمہارے ٹی وی پر بھی آتے ہوں گے۔"

"شاید۔" اس نے ٹی وی پر سے اپنی نظریں ہٹا لیں۔

"غم روزگار سے فرصت کہاں ملتی ہے، جو کسی اور طرف دھیان دیا جائے۔"

"اب ایسے بھی مصروف نہیں ہو کہ گھڑی بھر کے لیے ادھر نہ آسکو۔" نا چاہتے ہوئے بھی شکوہ لبوں سے پھسل پڑا۔

"تم کہاں یاد کرتی ہو، جو مقناطیس کی طرح دوڑا چلا آؤں۔" وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر فرصت سے اسے دیکھنے لگا۔

"یاد کرانے کا بھلا کیا فائدہ۔" اس نے شانے اچکا کر سامنے دیوار کی طرف دیکھنا شروع کردیا تھا۔ ماہیر کے چہرے کی طرف دیکھنا آسان کہاں تھا اور اس کی آنکھوں میں تو وہ آج تک دیکھ نہیں پائی تھی۔

"یہ بھی ٹھیک کہا؟" اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

"تم کب تک جارہی ہو سہیل کے پاس؟"

"ابھی کچھ پتا نہیں۔"

"کیوں؟ کیا ویزا نہیں لگا؟" ماہیر نے حیرانی سے پوچھا۔ کیونکہ امی نے اسے بتایا تھا کہ فیفا کا ویزا آگیا ہے۔ وہ زمیلہ کی طرف سے پریشان تھیں اور بار بار ٹھنڈی آہیں بھر کر کہتیں۔ "اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔"

"سہیل ان دنوں دبئی میں ہیں۔ وہ آئیں گے تو ان ہی کے ساتھ جاؤں گی۔" وہ انگلیاں چٹخاتے ہوئے بولی۔

"کب تک آنے کا ارادہ ہے؟" ماہیر کی دلچسپی فیفا کو حیران کررہی تھی۔

"ابھی کنفرم نہیں۔" وہ اٹھ کر کچن کی طرف جانے لگی تھی۔ پھر ایک دم رک کر بغیر پلٹے بولی۔

"چائے لاؤں یا اسکواش؟"

"پہلے ٹینگ پلا دو، پھر کھانا کھاؤں گا۔ تب تک پھوپھو بھی آجائیں گی۔"

"یاحیرت۔" فیفا سچ حیرت زدہ رہ گئی۔

"کھانا بھی کھاؤ گے؟" فیفا کو گویا اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ تب ہی تو دوبارہ پوچھنے لگی۔

"اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ میں پھوپھو سے مل کر جاؤں گا۔ تب تک لنچ ٹائم بھی اسٹارٹ ہوچکا ہوگا۔ کیا کھانا کھلانے کا تمہارا ارادہ نہیں؟"

"کیوں نہیں۔ میں ابھی ٹینگ لاتی ہوں۔" وہ کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔

"فیفا۔" ماہیر نے اسے لاؤنج میں بیٹھے بیٹھے پکارا۔

"آرہی ہوں۔" اس نے جلدی جلدی جگ میں چینی مکس کر کے ٹینگ کا جار اٹھایا تھا۔ پھر آئس کیوبز نکال کر جگ میں ڈالنے کے بعد وہ ٹرے اٹھائے باہر آگئی۔

"تم تو حریم سے بھی زیادہ پھرتیلی ہو۔" وہ جگ میں خوش نما سے پانی کو دیکھ کر بولا۔

"تمہیں آج پتا چلا ہے۔" فیفا کا انداز سادہ ہی تھا۔ تاہم نہ جانے ماہیر کو کیوں طنزیہ لگا۔

"تم خوش تو ہو؟" اس سوال کا بھلا مقصد ہی کیا تھا۔ یوں ہی بے سبب، بے وجہ پوچھ لیا گیا۔

"تمہیں کیسی دکھائی دیتی ہوں؟" وہ سادگی سے پوچھ رہی تھی۔ اس سادگی میں چھپے طنز صرف ماہیر سمجھ سکتا تھا۔

"ہمیشہ کی طرح اچھی۔" اس نے خود ہی بات گھما دی تھی۔ یہ بھی عجیب سا وقت آگیا تھا جب اسے فیفا سے بات کرنے کے لیے کسی موضوع کو ڈھونڈنے کا تردد کرنا پڑ رہا تھا۔ لفظ پکڑنے کی کوشش میں بہت سوچنا پڑ رہا تھا۔ حالانکہ چند سال پہلے ایسا نہیں تھا۔

ان دونوں میں بلا کی ذہنی ہم آہنگی، بے تکلفی اور دوستی تھی۔ سارا بچپن اکٹھے گزرا تھا۔ فیفا اکلوتی تھی۔ اپنے گھر میں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ زمیلہ کے ساتھ کھیلنے کے بہانے آجاتی تھی۔ اور پھر سارا وقت ماہیر کے کمرے میں دونوں گھسی رہتیں۔ زمیلہ جلدی بور ہو کر اٹھ جاتی تھی، جبکہ فیفا کو اسٹوریز بکس پڑھنے کا چسکا تھا۔ ماہیر کے بیگ یا کسی نہ کسی دراز میں سے فیفا کو اپنی مطلوبہ بک یا رسالہ مل ہی جاتا تھا۔

اس وقت وہ صرف سنڈریلا کی کہانیاں پڑھتی، اسنو وائٹ کے دکھوں پر چپکے چپکے آنسو بہاتی تھی۔ ماہیر اپنے دوستوں سے اسٹوریز بکس مانگ کر لاتا تھا۔ کیونکہ اسے فیفا کے چسکے کے بارے میں علم تھا۔

وقت کچھ اور آگے سرکا تو ماہیر کو کرکٹ کا جنون چڑھ گیا۔ وہ سامنے گراؤنڈ میں چلا جاتا۔ فیفا کو خبر ہوئی تو اس نے بھی ماہیر کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کرکٹ کھیلنے کا اعلان کردیا۔

کئی سال تک سامنے گراؤنڈ کی گھاس روندنے کے بعد اہل محلہ کی یہ شوقین مزاج من چلے گراؤنڈ کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ گئے، کیونکہ سامنے ایک عظیم الشان بنگلہ تعمیر ہوگیا تھا۔ بچوں کی ترجیحات بھی بدل گئی تھیں۔

کرکٹ کی شیدائی فیفا کو بہت جلد پھوپھو نے گھریلو امور میں طاق کردیا۔ چھوٹی عمر میں اس نے نا صرف اپنے کچن کو بلکہ راحت بیگم کے کچن کو بھی خوش اسلوبی سے سنبھال لیا۔

وہ دونوں ماں بیٹی اتنی خوش خوراک نہیں تھیں۔ ایک وقت کا سالن کبھی کبھی دو، دو دن تک چل جاتا تھا۔ البتہ مامی کے کچن میں اس کا زیادہ وقت گزرتا۔ مامی کو دو وقت تازہ سالن کھانے کی عادت تھی۔ ساتھ میٹھا بھی لازمی ہوتا۔ لنچ میں اکثر چاول پکتے۔ ماہیر کو ان دنوں چائنیز کھانے کا شوق چڑھ گیا تھا۔ اور فیفا پرانے رسائل، کوکنگ کی کتابوں اور ٹی وی کے پروگرام دیکھتی اور چن چن کر کتابوں میں سے بہ مشکل کھانوں کی ترکیبیں لکھتی اور وہ ناک بھوں چڑھا چڑھا کر کھایا کرتا۔

"تمہیں اچھا پکانا نہیں آتا؟" وہ جان بوجھ کر اسے چڑاتا۔

"یہ کھانے ہی بد مزا اور پھیکے میٹھے ہوتے ہیں۔" فیفا چڑتے ہوئے جتلاتی۔

سیکنڈری دور کا آغاز ہوا تو ماہیر نے اسکول بدل لیا اور یہ کیسے ممکن تھا کہ فیفا پیچھے رہتی۔ حالانکہ پہلے والا اسکول ساکھ کے لحاظ سے بہترین اسکول تھا۔ اعلا تعلیم یافتہ اسٹاف تھا۔ ماحول بھی بہترین۔ مگر ماہیر اپنے ابو کے بے تحاشا سمجھانے بجھانے پر بھی نہیں مانا تھا۔ نہ جانے کب کیسے اسے احساس ہوگیا تھا کہ اس کے ابو اس اسکول کے اخراجات پورے کرنے میں خود کو بھی تھکا ڈالتے ہیں۔ انتھک محنت کے باوجود بھی انہیں کاروبار میں خسارے کا سامنا تھا اور وہ بن کہے اپنے گھریلو مسائل کو سمجھنے کے بعد ایک دوسرے اسکول میں چلا گیا۔

تب پہلی مرتبہ ماہیر نے سستی البتہ فیفا ضرور ٹھٹک گئی تھی اور اسے ٹھٹکنا اور چونکنا بھی چاہیے تھا۔ کیونکہ زوباریہ درانی بھی شہر کا مہنگا ترین اسکول چھوڑ کر ان کے اسکول میں آگئی تھی۔ کیوں؟ کس لیے؟ اور کتنے سال بعد عفیفا مختار کو زوباریہ درانی کے اس عمل میں پوشیدہ وجہ کی خبر ہوسکی تھی۔ اور زوباریہ درانی کے سابقہ اسکول کو چھوڑنے کا ٹھوس اور بہت ہی مضبوط جواز اسے مل ہی گیا تھا۔

"ارے، میرا ماہیر کیسے راستہ بھول آیا ہے۔" خیالات کے دھارے میں بہتے ہوئے وہ دونوں ہی ماضی کی بھول بھلیوں میں گم تھے، تب ہی تو ان دونوں کو نفیسہ بیگم کے لاؤنج میں داخل ہونے کی خبر بھی نہیں ہوسکی۔

"السلام علیکم پھوپھو۔" وہ سنبھل کر تعظیماً کھڑا ہوگیا۔

"وعلیکم السلام، جیتے رہو، کب آئے ہو؟" انہوں نے بڑے ہی والہانہ انداز میں ماہیر کے سر اور ماتھے کو چوما۔

"ابھی کچھ دیر پہلے۔"

"فیفا! تو نے کچھ کھلایا، پلایا ہے میرے بیٹے کو؟ سیدھے دفتر سے آرہے ہو نا؟" وہ تھیلے میز پر رکھ کر اپنی مخصوص چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بیک وقت دونوں کو مخاطب کرکے بولیں۔

"صرف ٹینگ پلایا ہے۔" وہ فیفا کی طرف شرارتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"پھوپھو! آپ کو نہیں لگتا یہ فیفا شادی کے بعد کافی کنجوس ہوگئی ہے۔ آنکھیں ہی گویا اس نے ماتھے پر رکھ لی ہیں۔ کب سے اسے بتا چکا ہوں کہ کھانا کھا کر جاؤں گا، مگر مجال ہے جو ذرا بھی اس نے میری بات پر توجہ دی ہو۔"

"شکایتی ٹٹو! میں امی کا انتظار کررہی تھی۔" وہ تھیلے اٹھا کر کچن میں چلی گئی۔

"یہ زیادہ بہتر تھا کہ تم دیواروں سے باتیں کرتے اور میں تمہارے لیے پرتکلف لنچ کا اہتمام کرتی۔"

"ماشاء اللہ سے بڑی کمپنی دی ہے مجھے۔" اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"اور یہ پرتکلف لنچ تم رہنے ہی دو۔ مجھے چاول کی روٹی اور ٹماٹر کی چٹنی کھانا ہے۔ ساتھ اگر لسی ہو جائے تو کیا ہی بات ہے۔" دیسی قسم کا یہ لنچ کبھی اس کا فیورٹ ہوا کرتا تھا اور فیفا نے بڑی حیرانی سے ماہیر کی طرف دیکھا تھا۔

"تو کیا آج بھی وہ میرے ہاتھ کی ٹماٹر کی چٹنی اور چاول کی روٹی کو یاد رکھے ہوئے ہے؟"

"آپ کس مراقبے میں گم ہو گئی ہو عفیفا ڈیئر!" اس کی ساری توجہ فیفا کی طرف تھی۔ وہ گڑبڑا کر کچن کی طرف پلٹ گئی۔ چاول کا آٹا ٹین میں محفوظ رکھا تھا۔ امی اکثر صبح چاول کا پراٹھا کھاتی تھیں۔ اس نے پہلے آٹا گوندھ کر رکھا تھا۔ پھر ٹماٹر نکال کر چھیلنے لگی۔ ایک چولہے پر پانی ابال کرنے کے لیے رکھا تھا۔

"میٹھا بھی بنالو۔" امی اس سادہ مینو سے کچھ مطمئن نہیں تھیں۔

"میٹھا رہنے دیں پھوپھو! فیفا ہاتھ لگائے تو ہر ڈش میں ویسے ہی شیرینی گھل جاتی ہے۔" آج ماہیر کا موڈ بھی بہت خوشگوار تھا۔ پھوپھو تو سن نہیں پائی تھیں۔ ماہیر نے جسے سنانا تھا اس نے سن لیا۔

"اچھا پھر لسی میں میٹھا ڈال لو۔" وہ فیفا کو مسلسل ہدایات دے رہی تھیں۔

"چٹنی میں مرچ کم ڈالنا۔ ماہیر کو زیادہ مرچیں پسند نہیں۔"

"اچھا۔" وہ سر ہلا کر چھلے ہوئے ٹماٹر ابلے پانی میں ڈال کر روٹی بنانے لگی۔ صرف ڈیڑھ گھنٹے میں سادہ سا لنچ تیار تھا۔ ماہیر نے جس رغبت سے کھانا کھایا تھا۔ فیفا کی گویا تمام تر محنت وصول ہو گئی۔

"پھوپھو! یوں لگ رہا ہے 'وقت دس سال پیچھے چلا گیا ہے۔" فیفا نے ماہیر کو کہتے سنا۔ وہ لسی کا آخری گلاس پیتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

"چلتا ہوں پھوپھو! پھر چکر لگاؤں گا۔ ابھی آفس جانا ہے بریک ٹائم تھا سوچا آپ سے مل آؤں۔"

"شکریہ بیٹا! جاؤ اللہ کی امان میں دیا۔" نفیسہ بیگم نے اس کے شانے پر ہاتھ پھیر کر کہا تھا۔ پھر وہ اسے گیٹ تک چھوڑنے کے لیے باہر چلی گئی تھیں۔ واپس آئیں تو فیفا کو گم سم سا کچن کا کاؤنٹر تھامے دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔ وہ کسی پتھر کی مورتی کی طرح ساکت صامت کھڑی تھی اور اس کے چہرے پر گرد اور دھول کی چادر تنی تھی۔

اتنی دبیز چادر تھی کہ فیفا کے نقوش گویا چھپ کر رہ گئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ میلوں کا سفر طے کر کے کچھ دیر کے لیے سانس بحال کرنے کی غرض سے کھڑی ہے۔ کسی ایسے مسافر کی طرح جسے بیچ سفر میں گویا راستہ بھول گیا تھا۔ اور وہ چوراہے میں کھڑا اپنی منزل کی طرف جانے والے راستے کو کھوج رہا تھا۔ اور اس کے لہجے اور آواز میں سفر کی تھکن کا کوئی اثر نہیں تھا۔ اس کے لب کسی کتاب کے صفحات کی طرح پھڑپھڑا رہے تھے اور لفظوں میں بلبل اور کوئل کی آواز جیسی لطافت تھی۔

یہ چاند اور یہ ابر رواں گزرتا ہے
جمال شام ز آسمان گزرتا ہے
بھرا ہے تیری خوشبو سے تیرا صحن چمن
بس ایک موسم عنبر فشاں گزرتا ہے
سماعتیں تیرے لہجے سے پھول چنتی رہیں
دلوں کے ساز پہ تو نغمہ خواں گزرتا ہے
خدا کرے تیری آنکھیں ہمیشہ ہنستی رہیں
دیار وقت سے تو شادماں گزرتا ہے
میں خود کو دیکھ نہ پاؤں تو کچھ ملال نہیں
کہیں بھی ہو تو ستارہ نشاں گزرتا ہے
ہرا ستارہ کہیں ٹوٹ کر بکھر نہ جائے
فلک سے تیرا خط کہکشاں گزرتا ہے
میں تجھ کو دیکھ سکوں آخری بصارت تک
نظر کے سامنے بس ایک سماں گزرتا ہے
میں تیرا ساتھ نہ دے پاؤں پھر بھی تیرا سفر
گلاب و خواب کے ہی درمیاں گزرتا ہے

☆ ☆ ☆

بوا کی صبح صبح فون کال آگئی تھی۔ اس کے میکے سے فون آئے اور امی کا موڈ نہ بگڑے یہ تو ہو نہیں سکتا تھا۔

"خیریت تو ہے 'تم کس سوچ میں گم ہو گئیں؟" ان کا تجسس لہجے سے ہی ہویدا تھا۔ حریم دھیرے دھیرے چلتے ہوئے ان کے قریب آ گئی۔

"امی! کہتے ہیں نا انسان کو حیلہ کرنا چاہیے۔ وسیلہ اللہ خود بناتا ہے۔ یہاں تو کسی نے حیلہ بھی نہیں کیا۔ آپ کے ذہن میں ایک بات آئی تھی سو آپ نے کہہ دی۔ مگر خالہ کو وہ بات اتنی بھا گئی کہ اب وہ جانے سے پہلے جانی کو انگوٹھی پہنانا چاہتی ہیں۔" وہ ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھے چھلکی جانے والی خوشی کو سمیٹے کہہ رہی تھی۔

"ارے' یہ تو بڑی خوشی کی خبر ہے۔" راحت بیگم نے اس کی توقع کے مطابق خوشی کا بے ساختہ اظہار کیا۔

"ابھی چلنا ہے 'چھوٹی سی رسم کا ارادہ ہے' میں آپ کے اور مولی کے کپڑے نکال کر پریس کر دیتی ہوں۔" وہ گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے اٹھ گئی۔

"مولی کے کپڑے؟" انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔

"مولی بھی جائے گا؟"

"گھر میں اکیلے کیسے رہے گا۔ ویسے بھی کہیں آتا جاتا تو ہے نہیں۔ اسی بہانے تھوڑی آؤٹنگ ہو جائے گی۔" وہ اپنا سوچا گیا پروگرام ان سے شیئر کر رہی تھی' مگر راحت بیگم نے سختی سے منع کر دیا۔

"کوئی ضرورت نہیں' اس نے منگنی کے فنکشن میں جا کر کیا کرنا ہے۔"

"وہ گھر میں اکیلا کیسے رہے گا؟" حریم نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اکیلا کیوں۔ نیچے ثریا ہے نا' خیال رکھے گی مولی کا۔"

"اس کی طبیعت خراب ہونے کا خدشہ ہے۔"

"امی! اب تو وہ بہتر ہے۔ ان شاء اللہ کچھ نہیں ہو گا۔ باہر نکلے گا تو اس کے مزاج پر اچھا اثر پڑے گا۔" وہ مولی اور امی دونوں کے کپڑے الماری میں سے نکال لائی۔ اب استری اسٹینڈ کے پاس کھڑی تھی۔ کچھ سوچ کر اس نے فرش پر کھیس بچھالیا تھا۔ آج اس کی کمر میں ہلکی ہلکی ٹیس سی اٹھ رہی تھی۔ جو خوشخبری اسے بوا نے صبح صبح فون کر کے سنائی تھی۔ اس خبر نے اس کے وجود میں گویا بجلی بھر دی تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ خوشی کی ننھی سی خبر بھی تمام درد اور تکلیف بھلا دیتی ہے۔

"ماہیر نہیں مانے گا۔" ان کا انداز اب بھی کچھ سوچتا ہوا تھا۔

"نہیں میں منالوں گی۔" وہ ان کے تمام اعتراضات چٹکیوں میں اڑا رہی تھی۔

"سچ ہی کہا ہے۔ یہ فن صرف بیویوں کو ہی آتا ہے۔" انہوں نے خواہ مخواہ ٹھنڈی آہ بھری۔

"کون سا فن؟" حریم قطعاً "نہیں سمجھی۔

"کچھ نہیں۔" وہ جان بوجھ کر بات پلٹ گئیں۔

"تم رات تو نہیں رکو گی؟"

"نہیں۔"

"چلو' اچھا ہے' اب مجھ سے سویرے سویرے کچن میں نہیں کھڑا ہوا جاتا۔ ویسے بھی تمہاری عادت سی ہو گئی ہے۔ گھڑی بھر کے لیے اگر نظر سے اوجھل ہو جاؤ تو دل گھبرانے لگتا ہے۔" "نہیں' کبھی بھی دل کی بات کہہ دینے میں دقت کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ کبھی کبھی حریم حیرانی سے سوچتی تھی کہ وہ کیوں ایسی نڈر یا دلیر نہیں۔ اسے کبھی بھی بحث و مباحثہ یا دلائل دینا نہیں آتے تھے۔ بہت بولنا اسے کبھی پسند نہیں رہا تھا۔ وہ جس قدر خاموش طبع تھی جانی اس سے بالکل برعکس بہت شوخ' چنچل اور بے تحاشا زندہ دل۔

"ماہیر کو فون تو کر دو۔ آج جلدی دفتر سے اٹھ آئے اور میرے بال تو دیکھو' رنگنے والے تو نہیں؟" کہیں بھی جانے سے پہلے وہ خود پر خاصی توجہ دیتی تھیں۔ زمیلہ کے چلے جانے کے بعد راحت بیگم کے بال ڈائی کرنے کی ذمہ داری بھی حریم کے سر آ گئی تھی اور وہ خوش اسلوبی سے ان کی خواہش کے مطابق ہر

چند روز بعد ان کے بال سرخ مہندی سے رنگ دیتی تھی۔
"ٹھیک ہیں۔ بال ڈائی کرنے کی ضرورت نہیں۔" وہ ان کے مشورے کے مطابق ماہیر کو فون کرنے کے لیے اٹھ گئی۔
"تمہارا میرے بغیر دل نہیں لگتا۔" ماہیر نے کال ریسیو کرتے ہی پوچھا۔ کم و بیش کوئی ساتویں کال حریم نے ماہیر کو صبح سے لے کر اب تک کی تھی۔
"نہیں۔" وہ مسکراہٹ دبا کر دبی آواز میں بولی۔
"گھر آجائیں۔"
"اس سے اچھی بات بھلا کیا ہو سکتی ہے۔"
"گھر بیٹھ گیا' تو عاجز آجاؤ گی۔" وہ اسے خوف زدہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔
"کیوں بھلا؟"
"بھئی' جب کوئی کام نہیں ہو گا تو دن رات صرف رومانس بھگارا جائے گا۔ تم تنگ آجاؤ گی حریم۔" ماہیر نے اسے دھمکایا۔
"آپ کی محبت سے کبھی تنگ نہیں آسکتی۔ بس ہم سے بھاگنے کی کوشش نہ کیجیے گا۔" اس نے بھی جواباً "دھمکانا چاہا۔

"آپ سے بھاگ کر کہاں جاسکتے ہیں ہم بے چارے۔" ماہیر نے خود پر مظلومیت طاری کرلی۔
"ہر جگہ تو تمہارا چہرہ نظر آتا ہے۔ کمپیوٹر اسکرین پر فائلوں میں' باس کی سیکریٹری کے چہرے میں اور بھی جہاں جہاں نظر جاتی ہے' بس تم ہی دکھائی دیتی ہو۔"
"زیادہ ڈائیلاگز جھاڑنے کی ضرورت نہیں۔" حریم ہنستے ہوئے مطلب کی بات پر آگئی۔
"آج ذرا جلدی گھر آجائیے گا۔"
"کیوں بھئی؟"
"حانی کی منگنی ہے۔"
"اف تو پھر میں سیدھا ادھر ہی چلا جاؤں گا۔ تم امی کے ساتھ آجانا۔" ماہیر نے سوچتے ہوئے کہا۔

"مولی بھی ساتھ جائے گا۔" اس نے لگے ہاتھوں مولی کا ذکر بھی چھیڑ لیا۔
"مولی کو رہنے دو' اس کا بھلا ادھر کیا کام ہے۔" حریم کی توقع کے عین مطابق وہ فوراً" انکار کر گیا۔
"مولی ضرور جائے گا۔ میں نے اس کے کپڑے پریس کر دیے ہیں۔" پہلی مرتبہ حریم نے ماہیر سے ضدی انداز میں کوئی بات منوانی چاہی تھی۔
"میں منع کر رہا ہوں نا' اسے ساتھ لے کر مت جانا۔" ماہیر گویا جھنجلا سا گیا۔
"کوئی وجہ بتا دیں؟" حریم نے خفگی سے کہا۔ ماہیر کا نہ ماننا اسے غصہ دلا گیا۔
"اس کی طبیعت بگڑ جاتی ہے۔ وہ محفل اور شور ہنگامے سے گھبراتا ہے۔" ماہیر نے بھی کم و بیش راحت بیگم کی طرح کا جواز پیش کیا۔
"ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ کون سا بہت بڑا فنکشن ہے۔ صرف گھر کے افراد ہوں گے۔" وہ بھی اسے منوا لینے کا عہد کر کے ہی بحث کر رہی تھی۔
"حریم' اتم بھی نا۔" وہ سخت جھنجلایا۔
"آپ سمجھتے کیوں نہیں ہو؟" وہ بے بسی کے عالم میں لب بھینچ کر رہ گیا۔
"مولی میرے ساتھ جائے گا۔ ورنہ میرا بھی حانی کی خوشی میں شریک ہونا اتنا ضروری نہیں۔" اس نے تو محض دھمکی دینے والے انداز میں کہا تھا مگر ماہیر سچ مچ سنجیدہ ہو گیا۔
"اتنی محبت کرتی ہو مولی سے۔ اپنی بہن کا فنکشن اس کی خاطر چھوڑ دو گی۔"
"تو اور کیا۔ میں ایسا کر بھی سکتی ہوں۔" اس کا انداز فیصلہ کن تھا۔
"ٹھیک ہے۔ جیسے تمہاری مرضی' مولی کو دھیان سے لے کر جانا۔"
"تھینک یو ویری مچ۔ آپ نے میری بات کا مان رکھ لیا ہے ماہیر۔" وہ خوشی سے بے قابو لہجے میں بولی۔ اس کے لب و لہجے سے ہی راحت بیگم سمجھ چکی تھیں

کہ ماہیر مان گیا ہے۔ مگر وہ پھر بھی تذبذب کا شکار تھیں۔
تقریباً" ڈیڑھ گھنٹہ بعد وہ حانی لاج میں پہنچ چکی تھیں۔ زرجان نے ان کی سہولت کے لیے گاڑی بھجوا دی تھی۔
ادھر تو گویا رنگ و بو کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ پورا گھر برقی قمقموں سے سجا تھا۔ مہک اور محب چہکتے پھر رہے تھے۔ بوا نے نیا نکور چکن کا کلف زدہ سوٹ پہن رکھا تھا۔ سفید دوپٹہ اوڑھے' پان سے رنگے ہونٹوں سے مسکراتے ہوئے انہوں نے حریم کو اپنے ساتھ لپٹا کر بے ساختہ چوم لیا۔
"وقت سے آگئی ہو بہت اچھا کیا۔"
"ارے مولی بچہ بھی آیا ہے۔" بابا سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ مولی کو دیکھ کر وہ خوشی سے بھرپور لہجے میں بولے۔
"حانی کہاں ہے؟" وہ' راحت بیگم اور مولی کو سجے سجائے لاؤنج میں بٹھا کر خود اپنے اور حانی کا مشترکہ روم میں آگئی تھی مگر حانی کو دیکھ کر اسے جھٹکا لگا۔ سرخ خوبصورت جوڑے میں وہ کسی کھلتے ہوئے گلاب کی طرح دہک رہی تھی۔
"ماشاء اللہ۔ تم تو پوری دولہن بن کر بیٹھی ہو۔"
"یہ ساری مہک اور خالہ کی کارستانی ہے۔" کپڑے سمیٹتی حانی روہانسی ہو کر بولی۔ دولہن بن کر بھی اسے چین کہاں تھا۔
"بہت اچھا کیا ہے خالہ نے' تصویریں اور مووی بھی تو بنے گی۔" خالہ واش روم سے باہر نکل آئی تھیں۔
"محسن اور محب مووی میکر کو بھی لے آئے ہیں۔" خالہ اب حریم کو بتا رہی تھیں۔
"اور یہ لائٹنگ کس نے کروائی ہے۔"
"زرجان بھیا نے۔" جواب حریم کی طرف سے

"بابا نے منع نہیں کیا؟" حریم نے گویا لب بھینچ

"کیا تھا مگر وہ نہیں مانے۔" حانی الماری میں کپڑے ٹھونس ٹھانس کر اٹھ گئی۔
محسن نے اسی پل کمرے میں جھانکا۔
"چشم بد دور۔ لوگ تو آج پہچانے نہیں جارہے۔" محسن کی زبان کسی بھی حال میں رک نہیں سکتی تھی۔
"آپ نظر مت لگا دینا۔" حانی نے گویا آنکھیں دکھا کر کہا۔
"نظر لگاؤں گا تو اتاروں گا بھی تو سہی۔" محسن کے چہرے پر کھلی تحریر اور آنکھوں سے پھوٹتی خوشی کو دیکھ کر حریم نے دل ہی دل میں گویا نظر اتاری۔
"آج تو آپ بھی پہچانے نہیں جارہے جناب۔"
"آپ کی نظر کرم ہے۔ ویسے میں نے بھی سوچا تھا' کون سا روز روز منگنی ہوتا ہے سو تیاری میں ایڑھی چوٹی کا زور لگا دیا ہے۔" وہ کورنش بجالایا۔
"پھر بھی کچھ خاص فرق نہیں نظر آرہا۔" حانی اور محسن کو چونچیں لڑانے کی عادت تھی۔ دو گھڑی خاموش رہنا بھی محال تھا ان سے۔ ان کی یہ دوستی اور نکلفی نہ جانے کب محبت میں بدلی تھی اور یہ سلسلہ بھی نہ جانے کب سے چل رہا تھا۔ اور یہ تو محب نے عین موقع پر انٹری مار کے بھانڈا پھوڑا تھا۔ بقول محب کے یہ سلسلہ حریم کی شادی کے وقت کا شروع ہوا تھا۔ یعنی محسن' حانی کی محبت میں انہی دنوں میں مبتلا ہوا تھا تاہم اپنی نالائقی اور فی الحال بے روزگاری کے باعث ماں سے بات کرنے میں جھجکتا تھا۔ اور جب خالہ کسی "بابے" کے پرپوزل کو حریم سے فون پر شیئر کر رہی تھیں۔ تب سے ہی محسن نے عہد کر لیا تھا کہ وہ اس سال ہر صورت پاس ہونے کے بعد کسی نوکری کی تلاش میں نکل پڑے گا۔ اور وہ ماں سے حانی کے لیے ایسے نامناسب پرپوزل پر کتنی دیر الجھتا بھی رہا تھا۔
"کیا کمی ہے حانی میں۔
اسے ایک حادثہ پیش آیا تھا۔ اور حادثہ کسی کو بھی پیش آسکتا ہے۔ مجھے بھی' آپ کو بھی۔ کیا یہ

زیادتی نہیں کہ ایک ایسے ایسے آدمی کے ساتھ نتھی کر دیا جائے جس کا حانی کا ساتھ کوئی جوڑ نہیں بنتا۔"

"کوئی پرفیکٹ لڑکا حانی کے لیے ملنا مشکل ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو مجھے اپنی بھانجی سے محبت نہیں۔" خالہ کشمکش میں مبتلا تھیں۔ حریم سے انہوں نے بات تو کرلی تھی اپنا دل بھی حانی جیسی کانچ سی گڑیا کے لیے ایک بے جوڑ آدمی سے رشتہ جوڑنے پر مان نہیں رہا تھا۔ اور اب محسن نے بھی بے حد ناگواری کا اظہار کر دیا تھا۔ سوان کا دل احسان حسن کے پرپوزل سے خود بخود کھٹا ہو گیا۔ مگر اس وقت ان کا ذہن میں محسن اور حانی کے رشتے والی بات موجود نہیں تھی۔ اگر راحت بیگم ان کا دھیان اس طرف مبذول نہ کرواتیں تو انہیں خود سے ایسا خیال ہرگز نہیں آنا تھا۔

وہ لوگوں کی باتوں سے ہمیشہ خوف زدہ رہی تھیں اور انہیں اب بھی یہی خوف لاحق تھا کہ ان کے خلوص اور محبت کو لوگ لالچ سے تعبیر نہ کر لیں کیونکہ اکثر لوگ حانی کو حصے میں ملنے والی اس وسیع و عریض کوٹھی کے لالچ میں آجاتے تھے۔

"حریم، کہاں گم ہو؟ زرا زرجان کو فون تو کرو۔" نہ جانے اسے کھڑے کھڑے سوچنے کی بیماری کب سے لاحق ہو گئی تھی۔ شاید جب سے اس کی زندگی کی کچھ ڈوریں کسی اور کے ہاتھ میں چلی گئی تھیں۔ وہ چونک کر خالہ کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ حانی اور مہک دونوں باہر نکل گئی تھیں۔ حانی کو میز پر برتن لگانے کی فکر تھی۔

"میں اور زرجان کو فون کروں۔ کبھی نہیں۔" اس نے خالہ کی بات سنی ان سنی کر دی تھی۔ کچھ دیر بعد دولہن بنی حانی کو جو کچن میں برتنوں سے الجھ رہی تھی۔ نہ جانے کب مہک گھسیٹ گھساٹ کر باہر لے آئی تھی۔ چھوٹی سی تقریب تھی۔ گھر کے افراد کے علاوہ چار پانچ مزید اور لوگ آئے تھے۔ کچھ دیر تک ماہیر بھی آ گیا۔

"زرجان کو فون کیا ہے کسی نے۔" بابا خالہ سے پوچھ رہے تھے۔ اور خالہ حریم کو دیکھ رہی تھیں۔ حریم نے دانستہ نظر چرالی۔

اسی پل زرجان کی کال آئی تھی۔ اسے اچانک کسی میٹنگ میں جانا پڑ گیا تھا۔ اس نے بابا سے معذرت کرلی تھی۔ بابا تو اس کے معذرت قبول کر چکے تھے تاہم حانی نے "دولہا پے" کی پروا کیے بغیر زرجان سے لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا۔

نہ جانے کیسے، کس طرح سے حانی کو زرجان نے مطمئن کر ہی لیا تھا۔ اور وہ نہ جانے کون سے وعدے لے کر ریسیور رکھ کے آئی تھی۔ بلکہ محسن اس کا ہاتھ پکڑ کر لایا تھا۔ اور وہ دونوں ساتھ چلتے ہوئے بہت اچھے لگ رہے تھے۔

آج حانی بغیر اسٹک کے چل رہی تھی۔ ہمیشہ لوگوں کی موجودگی کے باعث حانی وہیل چیئر یا اسٹک کا سہارا لیتی تھی۔ محض اپنی چال کی لنگڑاہٹ چھپانے کے لیے۔ مگر آج خالہ اور محسن نے اس کی اسٹک کو اٹھا کر اسٹور میں چھپا دیا تھا۔

"لوگوں کو فیس کرنا سیکھو حانی! زندگی سہاروں کے ساتھ نہیں گزرتی۔ جب میں تمہارے ساتھ ہوں تو پھر کسی کی پروا ہے تمہیں۔" محسن نے حانی کے کان پر جھک کے اسے زندگی کا پہلا سبق پڑھایا تھا۔

"اور تم سب سے بہترین سہارا ہو۔ میں اب کسی مصنوعی سہارے کی طرف نہیں دیکھوں گی۔" حانی گویا خود سے عہد کر رہی تھی۔

"یہ اسٹک حانی کو گھن لگا دے گی اور مجھے خود کو گھن کبھی نہیں لگانا۔"

بھیگتی ہوئی گلابی شام میں حانی کو محسن کے نام کی انگوٹھی پہنا دی گئی تھی۔ ان خوبصورت ساعتوں کو کیمرے کی آنکھ نے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا تھا۔

بوا، خالہ اور بابا کے جگمگاتے چہروں میں ایک فرض کی ادائیگی کے بعد والا سکون اور سرخوشی بھی جھلک رہی تھی۔ بابا گویا بہت ہی پرسکون ہوئے تھے۔ ان کی دونوں بیٹیوں کو "قدر دان" لوگوں کا ساتھ مل گیا تھا۔ ان کا دل رب رحیم کی بارگاہ میں گویا سربسجود تھا۔

راحت بیگم نے بھی اٹھ کر حانی کے سر پر پیار کیا تھا۔ اس کی مٹھی میں چند نوٹ بھی دبا دیے۔

ہنسی، خوشی اور قہقہوں کے درمیان وقت گزرنے کا پتا بھی نہیں چلا تھا۔ محفل کے اختتام پر محسن نے بیت بازی کا شوشا چھوڑ دیا۔ پھر گیتوں کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ پوری محفل زعفران زار بنی ہوئی تھی۔ نہ جانے پھر بھی کیوں حریم کو کچھ غیر معمولی پن کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کی چھٹی حس بہت تیز تھی۔ اور یہ چھٹی حس اسے خوا مخواہ کے وہموں میں بھی مبتلا کر دیتی تھی۔ حریم سر جھٹک کر پھر سے محسن اور ماہیر کے درمیان ہونے والی بحث کو سننے کی کوشش کی مگر اس کا دھیان ایک دفعہ پھر سے بٹ گیا۔ وہ دل میں چھپی پریشانی کو سب کی نظر سے پوشیدہ رکھنے کے چکر میں اک چور نظر سے حاضرین محفل کو دیکھنے لگی۔

سب ہی خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ خالہ، راحت بیگم اور بوا نہ جانے کون سے مسئلے سلجھانے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ مہک اور محب مٹھائی کھانے میں جتے تھے۔ محسن، ماہیر اور حانی اس وقت شاید سیاست پر گفتگو کرنے لگے تھے۔ لاؤنج کے ایک کونے میں گم صم، خاموش اور کھویا کھویا سا مولی کسی اور ہی جہان میں گویا سفر کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ، اس کی آنکھیں گویا چیخ چیخ کر بتا رہی تھیں۔

"میں یہاں نہیں ہوں۔ میں کسی اور جہاں کو دیکھ رہا ہوں۔ مجھے مت پکارو، مجھے مت بلاؤ۔ مجھے اس سفر سے لطف اٹھا لینے دو۔"

حریم کی نظریں مولی کے چہرے پر گویا منجمد ہو کر رہ گئی تھیں۔ اس کا شور کرتا، کچھ کہتا، کچھ بولتا دل بھی لمحہ بھر کو خاموش ہو گیا تھا۔

"مولی!" اس کے ہونٹ محض پھڑپھڑائے تھے اسی لیے مولی تک اس کی آواز پہنچ نہیں پائی تھی۔ اور وہ سنتا بھی کیسے۔ اس کی سماعتیں تو کچھ اور سن رہی تھیں۔ دور بجتے گھنگرو، پیروں سے بندھے، چھن چھن کرتے۔ اور کسی مزار کا مجاور عالم مدہوشی میں دھمال ڈال رہا تھا۔ اور اس کے پیروں کے گھنگرو گویا مولی کے دل سے ٹکراتے ہوئے شور کرتے بار بار اسے پکار رہے تھے۔

عجب قرینہ ہے لیکن یہ ایک قرینہ عشق
کہ طے کیا سفر آسماں بہ زینہ عشق

گھنگروؤں کی جھنکار میں شدت آتی جا رہی تھی۔ تبھی تو مزار کے مکین، سفید اور سرمئی کبوتر خوف زدہ ہو کر پھڑپھڑانے لگے تھے۔

ہزار شکر کہ غرقابی سے رہا محفوظ
کنارے آن لگا آپ ہی سفینہ عشق

وہ ہوا میں گویا گردش کر رہا تھا بادلوں کے نرم بگولوں پر سوار تھا۔ اس کے باوجود اسے زمین پر گرنے کا کوئی خوف نہیں تھا۔ کوئی خوف اسے چھو بھی کیسے سکتا تھا۔ وہ ہر خوف سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

اور یہ "تصوف" یا "تصور" کا کوئی رخ نہیں تھا۔ یہ عشق حاصل کی اک نئی کتاب تھی جس کا ہر صفحہ اس عبادت سے مہک رہا تھا۔

یہ اور بات ہے کہ خود کو گنوا دیا میں نے
مگر یہ کم ہے کہ ہاتھ آ گیا خزینہ عشق

حریم کی نظر نے اک اور منظر دیکھا۔ غیب عالم اب کھڑا ہو رہا تھا۔ اس کے پیر دھیرے دھیرے زمین سے اٹھ رہے تھے۔ مگر اس کی چال میں غیر معمولی پن تھا کچھ ایسا ضرور تھا جو نظر کو بری طرح سے کھٹک رہا تھا۔ اس کا رقص کرنے کا انداز بھی بڑا عجیب تھا۔ حریم نے دیکھا، حاضرین محفل بھی گویا ٹھٹک کر مولی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اہل محفل میں کچھ لوگوں کی نظر میں حیرت اور بے یقینی صاف پڑھی جا سکتی تھی۔

مری مثال سب اہل نظر کے سامنے ہے
کہ زخم زخم رہا ہے ازل سے سینہ عشق
مگر یہ کم ہے کہ ہاتھ آ گیا خزینہ عشق

اس کے کب، پیروں کے ساتھ ہی متحرک رہے تھے۔ اک وجد کے عالم میں وہ زمین پر پیر مار کر ناچ رہا تھا۔ اس کے بازو بھی مسلسل حرکت میں تھے۔ اس کے ناچنے کے انداز نے حریم گویا منجمد کر دیا تھا۔

نہ جانے کب، کیسے ایک دم ہی منظر بدل گیا۔ ماہیر صوفے سے اٹھ کر مولی کے سر پر پہنچ گیا تھا پھر اس کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا تھا اور پوری طاقت کے ساتھ مولی

کے دیکھتے گول پر جا پڑا۔ مونی اپنے ہی دھیان گمان میں تھا اسی لیے گول گول گھومتے ہوئے وہ بہت دور فرش پر جا گرا۔ ماہیر نے کچھ بعد دیگرے کئی اور تھپڑ اس کے منہ پر دے مارے تھے۔ وہ تکلیف اور درد کی شدت سے بلبلایا نہیں تھا کیونکہ زمین پر گرتے ہی وہ ہوش و خرد سے بے گانہ ہو گیا۔

"حریم! پانی لاؤ۔" نہ جانے کس نے ساکت کھڑی حریم سے کہا تھا۔ وہ چونک کر گویا ہوش کی دنیا میں لوٹی۔

"ابھی لائی۔" وہ تقریباً بھاگتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ خوف کے مارے اسے ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔ بس ایک ہی غم کھائے جا رہا تھا کہ امی اور ماہیر کے خدشات درست ثابت ہو گئے ہیں۔ وہ اسی لیے مونی کو ساتھ لانے سے منع کر رہے تھے کہ کسی بھی وقت مونی پر دورے کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔

اسے ماہیر اور راحت بیگم کی ناراضی کا سامنا کرنا تھا۔ اسی کی ضد کی وجہ سے تو مونی ادھر آیا تھا۔ نہ وہ ضد کرتی نہ مونی یہاں آتا اور نہ ہی بھری محفل میں تماشا بنتا۔

خوف کے مارے اس کے ہاتھ سے گلاس پھسل کر فرش پر جا گرا۔ اس نے دوبارہ اسٹینڈ سے گلاس اٹھایا تھا مگر دوسرا گلاس بھی اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔

اب وہ تیسرا گلاس اٹھانے لگی تھی جب اقبال و خیراں بی خالہ کچن میں داخل ہوئیں ان کے پیچھے مہک بھی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" وہ فرش پر بکھرے کانچ دیکھ کر حیرت زدہ سی رہ گئیں۔

"گلاس ٹوٹ گیا ہے۔" نہ جانے کن وقتوں سے اس کے منہ سے چند الفاظ پھسلے۔ بس دل و دماغ پر ماہیر اور راحت بیگم کی ناراضی کا خوف سوار تھا۔ خالہ نے مہک کو گلاس میں پانی ڈال کر دیا تھا۔ وہ باہر نکل گئی تو خالہ اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"تیری طبیعت تو ٹھیک ہے حریم۔"

"جی ٹھیک ہوں خالہ۔" وہ مصنوعی بشاشت سے کہہ رہی تھی۔

"ایک بات تو بتاؤ۔" خالہ کی آواز سرگوشی نما تھی۔

"جی پوچھیے۔" حریم کی نظریں ابھی تک لاؤنج کے منظر کو دیکھ رہی تھیں۔

"کیا تم جانتی ہو؟" خالہ اس کے قریب آچکی تھیں۔ اور ان کی آواز اب بھی سرگوشی نما تھی۔

"کیا؟" حریم کو خالہ کے انداز سے سخت الجھن محسوس ہونے لگی۔

"یہی کہ تمہارا دیور تو ہیجڑا ہے۔ ہیجڑا۔" خالہ نے گویا اس کے سر پر بم بلاسٹ کر دیا تھا۔

"جی۔" حریم کو لمحہ بھر کے لیے سانس لینا بھول گیا۔ پردے کے پیچھے ننھے بگڑتے عکس اور مونی کی حرکات سکنات گویا کسی فلم کی طرح سے چلنے لگیں۔

مشرق کی طرف سے زرد آگ کا گولا طلوع ہوا تھا۔ اس چھوٹے سے گول تھال کے جھلک دکھاتے ہی اہل زمین — گویا خود کو مٹی کے تندور میں مقید سمجھنے لگے تھے۔ ایک ہی موسم نے کروٹ بدل لی تھی۔ دن بے تحاشا تپنے لگے تھے اور راتیں ٹھنڈی اور خنکی میں بھیگی تھیں۔ دن کے برعکس رات کو ابھی حبس اور گھٹن محسوس نہیں ہوتی تھی۔ نیلا آکاش رات کو سیاہی میں بدل جاتا تو گویا آسمان سے شبنم اترنے لگتی اوس میں بھیگی نرم نرم پگھلتی رات میں چاند اپنی چاندنی سے ہر شے کو منور کر دیتا تھا۔ بھیگی چاندنی اپنے اندر ہزاروں بھید چھپائے دور دور تک اپنی روشنی کو خوب خوب لٹاتی تھی۔

اوائل گرمی کے دن تھے۔ رات بھر برسنے والی بارش نے فضا میں خنکی بھر دی تھی۔ مگر طلوع ہوتے آفتاب نے پورے جلال کے ساتھ زمین کی طرف دیکھا تھا۔ صرف چند پل میں ہی بھیگی بھیگی نرم زمین دھیرے دھیرے سورج کی مہربانی کے طفیل خشک ہوتی جا رہی تھی۔

گرمی کا زور ابھی کم تھا مگر پنجاب کے کئی علاقے شدید گرمی کی لپیٹ میں آچکے تھے۔ منڈیروں سے لپٹی اور آنگن میں اتری دھوپ بہت دیر تک صحن میں منڈلاتی تھی۔

صبح صبح نغمے گاتے پرندے دن کا دوسرا پہر شروع ہونے سے پہلے ہی گھونسلوں میں منہ چھپا لیتے تھے۔ آسمان کی وسعتوں میں رقص کرتی کونجیں اور درختوں کی شاخوں پر جھولتی رنگ برنگی چڑیاں بھی غائب ہونے لگی تھیں۔ شاید انہیں خبر ہو چکی تھی کہ بہار کے دن اب خواب ہوئے ہیں۔

ان کی ننھی منی آنکھوں میں اگلے برس کی بہار کا انتظار کروٹیں بدل رہا تھا اور وہ کونپلوں کو نرماہٹ اور پھولوں کی شگفتگی کی آس سمیٹے سر نیہوڑائے تپتی دوپہر میں اونگھتی رہتی تھیں۔

اداس شام کے طاقچے میں جلنے والا پہلا دیا تیز ہوا کی سفاکی کی نذر ہو کر بجھ گیا تھا۔ سو کالی رات کی چادر کو چیرنے کے لیے کسی اسم کی ضرورت تھی۔ مگر اس اسم کا سحر طاری کرنے والے ہر لفظ کو حریم ماہیر عالم گویا بھول چکی تھی۔

سورج اور اس کی چھن چھن کر اندر گھسنے کی کوشش میں ہلکان ہوتی کرنیں بالآخر پوری دیدہ دلیری سے کمرے میں گھس آئیں۔ حالی پردے سمیٹ رہی تھی۔ حریم نے آنکھوں پر بازو رکھ لیے۔

"اٹھ جاؤ نا حریم۔" حالی اب پائنتی پر بے ترتیب پڑی چادر کو تہہ کر رہی تھی۔

"تم کو کیا ہوا ہے؟" وہ کسلمندی سے پڑی رہی۔

"کیا دس بجنے والے ہیں۔" اب وہ چائے کی پیالیاں اٹھا رہی تھی۔

"ناشتا لاؤں؟" جانے سے پہلے اس نے رک کر حریم سے پوچھا۔

"دل نہیں چاہ رہا۔" اس کے پورے وجود پر کسلمندی طاری تھی۔ وہ ابھی کچھ دیر اور سونا چاہتی تھی۔ حالانکہ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بس وہ فی الحال کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی اور باہر نکلنے کا مطلب یہ تھا۔ سب کی سوال کرتی نظروں کا سامنا کرنا اور وہ خود میں کسی سے نظر ملانے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے یہ محسوس ہوتا تھا کہ باہر نکلتے ہی ہر نظر اس کا طواف کرنے لگے گی اور وہ ان گہری کھوجتی سوال کرتی آنکھوں سے بے حد خوف زدہ ہو رہی تھی۔ وہ تو ابھی تک خالہ کے ان الفاظ کو رات بھر سے سوچ سوچ کر وسوسوں کا شکار ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ ہر فرد اسے دیکھتے ہی پوچھنے لگے گا۔

"اے حریم! تیرا دیور تو ایسی جیسی کیا بے خبری۔"

"تم رات سے کیوں اس قدر خاموش ہو؟ اگر تم ماہیر بھائی کے ساتھ جانا چاہتی تھیں تو چلی جاتیں۔ میں نے تو اس لیے آنٹی راحت سے ادھر تمہارے رکنے کی اجازت لی تھی۔ میرا خیال تھا کہ تم ادھر رہنا چاہتی ہو اور دیکھو" آنٹی جیسی تنگ مزاج خاتون نے میرا مان رکھ لیا۔" حالی اپنی سادگی میں اس کے غم کو سمجھ نہیں پائی۔

"تم نے کب امی سے میرے رکنے کے لیے بات

کی تھی؟" حریم چونک سی گئی۔

"حریم سے پہلے۔" حانی نے سوچتے ہوئے بتایا۔

"انہوں نے خاموشی اختیار کرلی تھی اور خاموشی کا مطلب ہاں ہی ہوتا ہے نا۔" وہ حریم کی الجھن کو سمجھے بغیر کہہ رہی تھی۔

"یعنی اس وقت انہوں نے خاموشی کی آڑ میں انکار کردیا تھا کیونکہ وہ گھر میں ہی مجھ سے نہ رکنے کی بات کر چکی تھیں پھر یوں اس طرح سے بغیر مجھے ساتھ چلنے کا کہے 'ماہیر اور امی کا چلے جانا مجھے سخت پریشانی میں مبتلا کررہا ہے حانی! اس کا مطلب ہے امی اور ماہیر مجھ سے ناراض ہیں۔"

"کیا مطلب؟" حانی قطعاً" سمجھ نہیں سکی۔

"کیونکہ میں زبردستی معبی کو ساتھ لائی تھی جبکہ امی اور ماہیر ہرگز مان نہیں رہے تھے۔ انہیں یہی خدشہ لاحق تھا کہ معبی کی طبیعت بگڑ جائے گی اور پھر ہوا بھی ایسے ہی۔" وہ بے خیالی میں سب کچھ کہتی چلی گئی۔

"اس میں تمہارا کیا قصور ہے؟" حانی نے رسان سے کہا۔ حیرت کی بات یہ تھی۔ حانی نے معبی پر مزید بات کرنے سے گریز کیا تھا۔

"حانی! جو کچھ رات کو خالہ نے محسوس کیا تھا معبی کے متعلق 'کیا وہ سچ ہے؟" حالانکہ کوئی بات اب پردے کے پیچھے نہیں رہی تھی پھر بھی حریم نے اک آس کے عالم میں پوچھا۔

"مجھے تو لگتا ہے کہ یہ سچ رات کو ہی تم پر منکشف ہوا ہے۔" حانی کا انداز اب بھی لاپروا قسم کا تھا۔ یعنی اسے ہرگز بھی اس معاملے میں دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو شاید کرید کرید کر حریم کو زچ کرکے ہی اٹھتا۔ مگر وہ اس کی بہن تھی۔ اس کی مزاج آشنا۔

"نہیں حانی! بہت دفعہ میں نے بھی معبی کی حرکات وسکنات پر غور کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہت دفعہ مجھے لگتا تھا۔ معبی کا انداز نارمل نہیں ہے۔ اس کی چال 'اس کی گفتگو سے کبھی بھی مجھے اندازہ نہیں ہو سکا۔ ہاں کبھی کبھار وہ کچھ نہ کچھ غیر معمولی ری ایکٹ

کرجاتا تھا جو مجھے وسوسوں میں مبتلا کردیتا۔ مگر پھر بھی میری سوچ اس حد کو کبھی بھی کراس نہیں کرسکی۔"

"جو کچھ رات کو ہوا تھا۔ کیا پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے؟" حانی نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ یہ دھمال قسم کا رقص اور یہ مخصوص ناچنے کا اسٹائل پہلی مرتبہ رات کو ہی دیکھا ہے۔"

"ڈیڑھ سال سے اس گھر میں رہ رہی ہو اور تمہیں قطعاً" خبر نہیں ہو سکی۔" حانی نے لاپروائی سے کہا۔

"تو کیا تم جانتی ہو؟" حریم حیران ہی تو رہ گئی۔

"ہمارا اور عالم انکل کی فیملی کا برسوں سے ساتھ ہے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ دونوں گھروں کی کوئی بات ایک دوسرے سے چھپی رہ سکے۔ مگر راحت آنٹی معبی کی پیدائش کے بعد بہت ریزرو ہو گئی تھیں۔ کہیں بھی آتی جاتی نہیں تھیں۔ انہوں نے گھر سے نکلنا اور لوگوں سے ملنا ترک کردیا تھا۔ جس آزمائش کا قدرت کی طرف سے نزول ہوا تھا اس پر بھلا کیا شکوہ کرنا۔ مگر لوگوں کی زبانوں کی تلوار سے بچنے کے لیے وہ بہت تنہا ہو کر رہ گئی تھیں اور انہوں نے معبی کو ساری دنیا سے چھپا رکھا تھا۔ آج بھی معبی کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ کس صنف سے ہے۔" حانی جو کچھ بتا رہی تھی اگرچہ سو فیصد سچ تھا مگر اسے یہ سب بتایا کس نے تھا اور پھر سب جانتے ہوئے حانی نے اس سے کیوں چھپایا؟

"اور ان کم لوگوں میں کون کون شامل ہیں؟" حریم کا انداز چبھتا ہوا تھا۔

"بابا 'ماہیر بھائی کی پھوپھو یا پھر وہ ڈاکٹر جس نے راحت آنٹی کا کیس لیا تھا۔" حانی اپنے کیوٹکس سے سجے ناخنوں کو دیکھ رہی تھی۔

"اور تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟" ایک اور چبھتا ہوا سوال۔

"رات کو بوا بتا رہی تھیں۔ شاید وہ کبھی بھی نہ بتاتیں مگر رات کو معبی کے انداز واطوار سب راز افشا کرگئے۔ پھر خالہ کے مجبور کرنے پر بوا نے بتایا۔ ویسے بھی کسی مخنث کو اس کی چال سے پہچاننا مشکل

نہیں ہوتا مگر یہ راحت آنٹی کی محنت اور ان کی انتھک کوشش ہے کبھی تو معبی کی چال کو دیکھ کر انسان سوچ میں ضرور پڑ سکتا ہے مگر نتیجے پر پہنچنا آسان نہیں۔" حانی اب سہولت سے اٹھ رہی تھی۔ پھر کچھ پل ٹھہرے رہنے کے بعد بولی۔

"کوئی بھی انسان مکمل نہیں ہوتا۔ کمی کہیں نہ کہیں بہرحال ضرور ہوتی ہے۔ کسی کے پاس صورت ہوتی ہے سیرت نہیں ہوتی۔ کسی کے پاس سیرت ہوتی ہے مگر صورت نہیں ہوتی اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو صورت 'سیرت دونوں سے محروم ہوتے ہیں۔ اگر کوئی انسان ہر طرح سے مکمل ہو تو اس انسان کو رب رحیم کا شکر ادا کرنا چاہیے اور اگر کوئی ان ساری چیزوں میں سے ایک آدھ اعضا سے محروم ہو تو اسے بھی اپنے رب کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اگر کوئی شخص دو صنفوں کے درمیان معلق ہو تو وہ صبر 'شکر اور شکوے کے درمیان گردش کرتا ہے۔ وہ اگر شکوہ کرتا ہے تو اسے کرنے دو 'اس کا شکوہ کسی انسان سے نہیں اپنے رب سے ہوتا ہے اور یہ خالصتاً" اس کا اور اس کے پیدا کرنے والے کا معاملہ ہے۔

کوئی انسان رب کی بنائی ہوئی چیز کی طرف انگلی اٹھا کر یہ کہنے کی جرات نہیں کر سکتا کہ اسے کیوں اور کس لیے بنایا گیا ہے؟ جو سرتابی اور سرکشی کی طرف مائل ہوتا ہے اسے شیطان کہتے ہیں منکر کہتے ہیں۔ اللہ نے اس دنیا میں کوئی چیز بے کار اور بے مقصد نہیں بنائی۔

میں صرف اتنا کہنا چاہوں گی حریم! تم ہمیشہ معبی کو ویسا ہی سمجھنا 'جس طرح سے تم کل رات سے پہلے اسے سمجھتی رہی ہو۔ اسے خواجاؤں کی طرح کبھی ٹریٹ نہ کرنا۔ وہ بہت سے اپنے جیسے لوگوں سے مماثلت رکھنے کے باوجود ان جیسا نہیں ہے۔ وہ ان جیسا ہو بھی نہیں سکتا۔ وہ مختلف ہی نہیں منفرد بھی ہے۔ میرا وجدان کہتا ہے۔ غیب عالم کے سینے میں دھڑکنے والا دل اور اس کی زبان عشق کے پانی سے وضو کے 'اس چیز کا ورد کیا کرتے ہیں۔ جس تک پہنچنے سے

پہلے عقل دنگ اور سوچ زنجیر پا ہو جاتی ہے۔ تم اس سے کبھی نفرت اور کراہیت محسوس نہ کرنا کہ دنیا میں کوئی انسان مکمل نہیں ہے۔ غیب عالم دنیا میں نفرت جھیلنے یا دھتکارے جانے کے لیے نہیں بلکہ کسی خاص مقصد کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔ کبھی بے کار سے بے کار وجود بھی ہماری زندگی کی ناؤ بچانے میں خود کو لٹا دیتا ہے۔ بات تو صرف خلوص اور ایثار کی ہے۔ آج ایثار لٹاؤ گی۔ کل ایثار پاؤ گی۔ اس دنیا کا نظام اسی طرح سے چلتا ہے اب اٹھ کر باہر آجاؤ۔۔۔ میں ناشتا لگاتی ہوں۔۔۔ خالہ کا بھی واپسی کا پروگرام بن رہا ہے اور تم مزید خود کو پریشان مت کرو۔ ماہیر بھائی تم سے ناراض ہو ہی نہیں سکتے۔ اگر وہ نہ آئیں تو تم خود چلی جانا۔ رشتوں میں توازن ہونا چاہیے انا نہیں یہ انا بڑی بری چیز ہے توڑ کر رکھ دیتی ہے کمبخت۔" حانی بولتے ہوئے باہر نکل گئی تھی جب کہ حریم کی آنکھیں گویا کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"یہ حانی کیا کچھ بول گئی ہے؟" اسے ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ حیران تھی 'سوچوں کے بھنور میں ڈوب 'ابھر رہی تھی۔ اس کے ذہن میں معبی کے حوالے سے ایک گرہ خود بخود کھلتی چلی گئی۔ جبھی تو وہ کچھ دیر بعد فریش ہو کر باہر چلی آئی۔ لاؤنج میں محفل گرم تھی۔ محسن نہ جانے کون سی فلم کے مکالمے بول رہا تھا اور حانی لال ٹماٹر سی شکل بنائے ہنسی ضبط کیے بیٹھی تھی۔ محب اور مہک بھی خوب چہک رہے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر خالہ اور بوا بھی نہ جانے کون سے گمبھیر مسئلے پر گفتگو کر رہی تھیں۔ حریم 'حانی کے برابر بیٹھ گئی تھی۔

"ناشتا لاؤں؟" حانی فوراً" ہی اٹھنے لگی۔

"اجی 'آپ کہاں بھاگی جارہی ہیں خاتون! ذرا ہمارے دل کا حال تو سن لیجیے۔" محسن نے بہت پھرتی کے ساتھ حانی کا ہاتھ پکڑ کر واپس صوفے پر بٹھایا تھا اور وہ لڑکھڑاتے ہوئے بیٹھ گئی تھی تاہم خوب گھور کر دیکھا گیا۔

"بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔" حانی نے انگلی

اٹھا کر تنبیہہ کرنے کی کوشش کی۔

"ہم بکواس کریں گے مگر شاعر کی زبان میں پھر تو ناراضی نہیں بنتی نا۔" محسن بھی کہاں کسی تنبیہہ کو خاطر میں لاتا تھا۔ اب جو اس کی زبان شعر الگنے لگی تھی پھر چلی تو رکی نہیں۔

وصل کو کیسے معتبر سمجھیں
ہجر کا خوف دل پر طاری ہے
آج تو دل کی بات کہنے دو
آج کی شام تو ہماری ہے

وہ لہک لہک کر گنگنا رہا تھا۔ مہک اور محب اس کا مسلسل ساتھ دے رہے تھے۔ حالی تو مہک کی اس غداری پر اسے گھور بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ مہک صاحبہ فوراً "طعنہ دینے لگیں کہ "بن گئی ہو نا" وہ گھڑی میں بجا بھی۔"

محسن کی شوخ نظریں حالی کے آر پار ہو رہی تھیں۔ حالی نے یہاں سے اٹھ جانا ہی مناسب سمجھا۔

"کہاں جا رہی ہو۔ ابھی محفل مشاعرہ اختتام پذیر نہیں ہوئی۔" محسن ایک ہی جست میں دوبارہ حالی تک پہنچ چکا تھا اور اس کے ہونٹوں سے شگوفے پھوٹ رہے تھے۔

شکستہ تحریروں کے میرے خط تم جلا دینا
جو ہو سکے زندگی میری مجھے تم بھلا دینا
تخیلاں پی پی کر زہر آلودہ ہو جائیں کہیں
سکون دل کے خاطر میری جان حالی! ذرا سا مسکرا دینا۔

"تم نے کب سے خط و کتابت شروع کر رکھی ہے؟" حریم نے مصنوعی خفگی سے محسن کو گھورا تھا۔ محسن ڈرنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کان کھجانے لگا۔ مہک نے فوراً "راز افشا کرنے کی کوشش کی تھی۔

"خط حالی کو ملے نہیں تو وہ جلائے گی کیسے؟"

"یعنی اسے چھپے رستم نے خط لکھے ضرور ہیں۔" حریم نے معنی خیزی سے کہا۔

"مگر بے چارا پوسٹ نہیں کر سکا۔" محب نے تاسف کا اظہار کیا۔

"کیوں؟"

"آپ کے خوف سے آپی۔" مہک اس کے کان میں گھسی۔

"کیا مطلب؟" حریم سمجھ نہیں پائی تھی۔

"آپ کی بہن پر ڈورے ڈالنے کی کوشش میں مصروف تھا مگر ساتھ آپ سے جوتے کھانے کا خوف بھی لاحق تھا جناب کو۔" محب نے وضاحت کی۔ شاعر صاحب منہ لٹکائے صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔ ان دونوں غداروں کو کچا چبا کر دیکھنے کا شغل ترک کر دیا گیا تھا۔

"تم دونوں سے مجھے یہ امید نہیں تھی۔ میرے اعتبار، میرے خلوص کا بھرکس نکال دیا ہے ظالمو۔" محسن نے دہائی دی۔

"اس کی بکواس پر دھیان مت دیں، حاضرین محفل اسے تو بے تکی ہانکنے کی عادت ہے۔" حالی نے کلس کر کہا۔

"میں تمہارے لیے ناشتا لاتی ہوں۔" اب وہ حریم سے مخاطب تھی۔ حالی اٹھ کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔ باقی سب تیاریوں میں لگ گئے۔

شام کو ان لوگوں نے واپس چلے جانا تھا۔ سو اسی لیے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مہک کپڑے استری کر رہی تھی۔ خالہ اور بوا ابھی تک نہ جانے کس بحث میں الجھی ہوئی تھیں۔ حریم کچھ سوچ کر ان کے پاس چلی آئی۔ دونوں خواتین اسے دیکھ کر چپ سی ہو گئیں۔

"آج رک جائیں نا خالہ۔" حریم نے لاڈ سے خالہ کے کندھے پر بازو پھیلا لیا۔

"کبھی کبھار تو آتی ہیں آپ۔"

"اب تو وقتاً "فوقتاً" چکر لگاتی رہوں گی۔ تم بتاؤ کیا رکو گی یا شام کو چلی جاؤ گی؟" خالہ نے اس کے نرم بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"ماہیر خیر سے شام کو آئے گا تو چلی جائے گی۔" بوا پودینے کی پتیاں نوچ رہی تھیں۔ شاید چٹنی بنانے کا ارادہ تھا۔

"میں تو کہتی ہوں۔ ادھر ہی رہ لے۔ وہاں تو آرام بھی نہیں کر سکتی۔" خالہ نے کچھ سوچتے ہوئے دبی

آواز میں کہا۔

"ابھی تو بڑا وقت پڑا ہے۔ ماہیر کہاں مانے گا؟" بوا نے حریم کی مشکل آسان کر دی تھی۔

"ویسے بھی اس کی ساس یہاں نہیں آنے دے گی۔"

"تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟" خالہ نے حیرانی سے کہا۔

"آپ سمجھیں نا بوا! حریم کا ان دنوں ادھر رہنا نیک شگون نہیں خدانخواستہ بچے پر اثر نہ پڑ جائے۔" خالہ کے لہجے میں خدشات بول رہے تھے۔

"کیسا اثر؟" حریم ٹھٹکی۔

"وہ مولی بھی تو ہے نا بس وہم سا ستا رہا تھا۔"

"مولی کو کوئی چھوت کی بیماری تو نہیں۔" حریم نے دبے لہجے میں کہا۔

"یہاں رہوں یا وہاں رہوں کیا فرق ہے۔"

"پر یہ موروثی تو ہو سکتی ہے۔" خالہ کا انداز پرسوچ تھا۔

"یہ بھی ضروری تو نہیں۔"

"اکثر کیسز میں ایسا ہو جاتا ہے حریم۔" خالہ کا انداز ناصحانہ تھا۔

"مجھے تو حیرت بھائی صاحب پر ہو رہی ہے بھلا کیا ضرورت تھی، جانتے بوجھتے اپنے خاندان میں رشتہ جوڑنے کی۔"

"یہ تو سراسر خدائی امر ہے۔ مولی جیسے لوگوں اور ہر انسان کی تخلیق میں کسی کی ذاتی کوشش کا کوئی عمل دخل نہیں۔" حریم نے آہستگی سے کہا۔

"تم نے ٹھیک کہا بیٹی! مگر آنکھوں دیکھی مکھی بھی کوئی نہیں نگلتا۔ لوگ رشتہ داری کرتے ہوئے ہر پہلو پر غور کرتے ہیں مگر ہمارے بھائی صاحب پر تو دوستی کی محبت کا بھوت سوار تھا۔ تم میں بھلا کون سی کمی تھی؟" خالہ نے رسانیت سے وضاحت کی تھی۔

"اور کمی تو ماہیر میں بھی کوئی نہیں۔ اگر گھر کا ایک فرد کسی کمی کا شکار ہو، جو فطرت پر پیدا نہ ہوا ہو تو کیا سارے گھرانے سے تعلق کو ختم کر لیا جاتا ہے؟ اچھے

اردگرد نظر دوڑائیں۔ بہت سے ایسے خاندان موجود ہیں۔ جو کسی نہ کسی شرمناک بیماری میں مبتلا فرد کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ کئی پیدائشی ایب نارمل ہوتے ہیں۔ کئی لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے اعضاء سرے سے ہوتے نہیں۔ یہ معاشرہ کسی پاگل، مجنون، دیوانے اور لولے لنگڑے کوڑھ زدہ مریض کو تو قبول کر لیتا ہے مگر کسی خواجہ سرا کو قبول کیوں نہیں کرتا۔ جبکہ وہ ایک بہترین دماغ اور سوچ رکھنے والا انسان ہوتا ہے۔ حالانکہ دیکھا جائے تو انسانیت کے ناتے بھی ایسے لوگ بہت زیادہ توجہ، محبت اور ہمدردی کے حق دار ہوتے ہیں۔" حریم نے بہت شائستگی کے ساتھ اپنا نقطہ نظر واضح کیا۔

"بیٹا! یہ کتابی باتیں ہیں۔ ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں اس کے مروجہ قوانین سے بغاوت نہیں کر سکتے۔" بحث خود بخود کوئی اور رخ اختیار کر رہی تھی۔ بوا ابھی خاموش تھیں۔ گویا وہ خالہ کی ہر بات سے متفق خود کو ظاہر کر رہی تھیں۔ اسی پل حالی چائے کی ٹرے اٹھائے چلی آئی۔ موضوع گفتگو بدل گیا تھا۔

"ماہیر کا کوئی فون آیا ہے؟" بوا پودینے کے پتوں سے بھری ٹوکری اٹھا کر کھڑی ہو گئیں۔

"نہیں۔" حریم نے بے مروتی سے جواب دیا۔ دھیان ایک دفعہ پھر کسی اور سمت پرواز کر گیا تھا۔ سوچیں گویا پلٹا کھا کر رہ گئیں۔

"تم خود کر لیتیں۔" خالہ نے مشورہ دیا تھا۔

"ابھی کرتی ہوں۔" اس نے مزید سوالوں سے بچنے کے لیے کہہ دیا تھا۔ وہ خود سے ماہیر کو فون کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ اسے ابھی تک اس بات پر شدید غصے کے ساتھ افسوس بھی تھا کہ ماہیر نے اسے گھر جانے کے لیے ایک دفعہ بھی نہیں کہا۔

مولی کی طبیعت بگڑ گئی تھی تو اس میں بھلا حریم کا کیا قصور تھا؟ وہ ابھی تک سوچوں کے تانوں بانوں میں الجھی بیٹھی تھی جب مہک نے آ کے بتایا۔

"حریم آپی! آپ کی ساس کا فون ہے۔"

☆ ☆ ☆

یہ دن ہی بے ترتیبی لیے طلوع ہوا تھا۔ رات کو اسے الارم لگانا یاد نہیں رہا۔ ویسے بھی الارم لگانے کی نہ تو اسے ضرورت محسوس ہوتی تھی اور نہ ہی اب عادت رہی تھی۔ صبح آنکھ جب کھلی تو گھڑی ساڑھے آٹھ بجا رہی تھی۔ وہ بستر چھوڑ کر واش روم کی طرف بھاگا۔

بمشکل تیاری مکمل کر کے جب وہ کچن میں آیا تو چولہا ابھی تک ٹھنڈا پڑا تھا۔ راحت بیگم سو رہی تھیں۔ وہ ان کے کمرے پر آخری الوداعی نظر ڈالتا باہر نکل آیا۔

رات کو دیر سے سونے اور صبح لیٹ اٹھنے کی وجہ سے وہ آفس سے پہلے ہی لیٹ ہو چکا تھا۔ رات کو مولی کی طبیعت کے ساتھ راحت بیگم کی طبیعت بھی بگڑ گئی تھی۔ بلڈ پریشر خطرناک حد تک شوٹ کر گیا تھا۔ انہیں ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔ شرمندگی اور خفت کے مارے سر نہیں اٹھ رہا تھا۔ مولی کے ساتھ ساتھ انہیں حریم پر بھی جی بھر کے تاؤ آیا۔ نہ وہ مولی کو ساتھ لے جانے پر انہیں مجبور کرتی ' نہ مولی اپنی اوقات دکھاتا اور نہ ہی انہیں سب کی سوال کرتی نظروں کا سامنا کرنا پڑتا۔

مولی کو جس حالت میں گھر واپس لایا گیا تھا۔ جس ذہنی اور جذباتی دباؤ کا شکار ماہیر اور راحت بیگم تھیں۔ اسے حریم شاید سمجھ نہیں سکتی تھی۔

ماہیر کے ایک دم سے اُڈ آنے والے غصے کے پیش نظر راحت بیگم کو زمان و مکاں بھول گئے تھے۔ انہیں لمحہ بھر کے لیے اس خوف نے اپنی لپیٹ میں لے لیا کہ ماہیر کہیں مولی کا گلا ہی نہ دبا دے۔ کچھ ایسی ہی جنونی کیفیت سے ماہیر گزر رہا تھا۔ شرمندگی اور اہانت کے باعث وہ دو گھڑی بھی سسرال میں ٹھہر نہیں پایا تھا۔ اگرچہ اس نے محسوس کیا تھا کہ حریم اسے پکارتی ہوئی باہر تک آئی ہے مگر پلٹنے کافی الحال اس میں حوصلہ نہیں تھا۔

راحت بیگم نے جو خفیف سا پردہ مولی اور حریم کے درمیان رکھا تھا وہ اچانک ہی تیز ہوا کے زور سے ہٹ گیا۔ مولی کے بارے میں جن گنے چنے لوگوں کو علم تھا ان میں جمال صاحب بھی شامل تھے۔ مگر راحت بیگم کو کامل یقین تھا کہ حریم اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ اس کا لاعلم رہنا ہی ان کے خاندانی وقار کے لیے کافی تھا۔ مگر اب یوں لگتا تھا کہ ساری دھجیاں بکھر گئی ہیں۔ ان کی ساری ریاضت بے کار چلی گئی۔ انہیں لگتا تھا کہ کبھی بھی ان کا سر حریم کے سامنے اٹھ نہ پائے گا۔ عجیب شرمندگی اور خفت نے لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

اور کچھ ایسی ہی کیفیات ماہیر پر بھی طاری تھیں۔ دل و دماغ میں ایک جنگ سی چھڑی تھی اور نہ جانے کیوں بلاوجہ ہی وہ حریم سے سامنا کرنے سے کترا رہا تھا۔

ایسی ہی الجھی سوچوں کے ساتھ وہ اپنے آفس پہنچا تھا۔ ابھی اس نے اپنا موبائل اور فائلز میز پر رکھی ہی تھیں جب کمپیوٹر سیکشن کے باقر نے اس کے کیبن میں جھانکا۔

"خواجہ صاحب یاد فرما رہے ہیں۔"

"کیا پیشی بھگتنی ہو گی؟" ماہیر نے ٹھنڈی آہ بھری۔ نظر سنہری ڈائل والی رسٹ واچ پر جا رکی تھی۔ وہ صرف بیس منٹ لیٹ تھا۔

"شاید ہاں 'شاید نہیں۔" باقر نے ہمیشہ کی طرح تجسس کری ایٹ کرنا چاہا۔

"کیا مطلب؟" وہ اپنی فائلیں ترتیب دے رہا تھا۔

"صرف بیس منٹ لیٹ ہوں اور آج یہ پہلی مرتبہ ہوا ہے۔"

"ماہیر صاحب! ایک بات کہوں۔" باقر موجود ہو اور خاموش رہ کر کوئی کام کرے 'یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

"کیا؟" ماہیر نے بے دھیانی میں پوچھا۔

"مجھے لگتا ہے 'بس آپ یہاں چند دن کے مہمان ہیں۔" باقر نے معنی خیزیت سے آنکھیں پھیلانے کی کوشش کی تھی ماہیر ایک دم چونک گیا۔

"کیا میرا ٹرمینیٹ لیٹر تیار ہو رہا ہے؟" ماہیر کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں سی ابھر آئیں۔

"ایسا بھی ہو سکتا ہے۔"

"مگر کیوں؟" اس کی آنکھوں میں سوال ابھر رہے تھے۔

"ظاہر ہے 'جب آپ کمپنی کی ڈیمانڈز یا مطالبے وغیرہ نہیں پورا کریں گے۔ آفس کے رولز کو فالو نہیں کریں گے یا پھر آفس کی طرف سے ملنے والے کسی آرڈر کو نظر انداز کریں گے تو ایسا ہو بھی سکتا ہے کہ آپ کو ٹرمینیٹ کر دیا جائے۔" باقر نے پرسوچ انداز میں پہلی مرتبہ سنجیدگی سے کہا۔

"اور میں نے کون سے رولز فالو نہیں کیے؟" ماہیر نے ناگواری چھپا کر پوچھا۔

"اب دیکھیے نا۔ کمپنی کا فیصلہ تھا کہ آپ کو جاتا بھیجا جائے۔ سلیکشن بورڈ نے ضروری کارروائی بھی کر لی تھی۔ مگر آپ سفارش لے آئے۔ میں تو ابھی تک حیران ہوں کہ آپ نے ایسا گولڈن چانس مس کیوں کیا ہے۔ لوگ تو ایسے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔" باقر کو ابھی تک ماہیر کے اس فیصلے پر شدید قلق تھا۔

"ویسے کیا ذرجان صاحب سے آپ کی کوئی رشتہ داری بنتی ہے۔" باقر کچ رپورٹر ہی نہیں بلکہ پورا جاسوس بھی تھا۔

"تمہارا کالم کب مکمل ہو گا۔" ماہیر نے بے زاری ظاہر کرتے ہوئے موضوع ہی بدل دیا۔

"صرف دس منٹ اور لوں گا آپ کے۔" باقر نے معنی خیزی سے مسکان اچھالی۔ پھر کمپیوٹر کی اسکرین پر نگاہیں جمائے بولا۔

"میں نے ایک اور بات بھی سنی ہے۔"

"کون سی بات؟" ماہیر نے پھر اس کیچڑ کو منہ لگا لیا۔ حالانکہ ابھی وہ سوچ رہا تھا کہ باقر کی کسی بات پر توجہ نہیں دے گا۔ مگر وہ بھی ایک کائیاں آدمی تھا۔ بات سے بات ایسی نکالتا کہ سوال خود بخود اٹھنے لگتے۔

"آپ کے ٹرانسفر کی پلاننگ ہو رہی ہے۔"

"پھر سے ٹرانسفر۔؟" ماہیر اب کے سچ مچ فکر مند ہو گیا۔

"مجھے تو لگتا ہے آپ کے ستارے گردش میں ہیں۔" باقر اب اپنے کاغذات سمیٹ رہا تھا۔ اس پل انٹرکام کا مخصوص بزر بجا۔ ماہیر انٹرکام کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

"سر! آپ کو خواجہ صاحب بلا رہے ہیں۔" مس نورین نے شائستگی سے کہا۔ مس نورین 'ماہیر کی ہیلپر بھی تھیں اور خواجہ صاحب کی پی اے بھی۔

ماہیر سر ہلا کر باہر نکل گیا تھا۔ اس کی پیشانی پر تفکر کی ایک گہری لکیر صاف دکھائی دے رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ اگر خواجہ اسجد نے اس کے ٹرانسفر کی بات کی تو اسے کون سے دلائل پیش کیے ہوں گے۔ ایک بات تو طے تھی۔ اسے کم از کم ان حالات میں شہر چھوڑ کر جانا بہت مشکل ہی نہیں ناممکن بھی لگ رہا تھا۔ محلہ چھوڑ دینا آسان تھا مگر ملک اور شہر کو الوداع کہنا آسان نہیں تھا۔ اپنے گھر کے ماحول کے پیش نظر وہ کسی دوسرے شہر میں جانا افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔

وہ اپنی سوچوں میں گم خواجہ کے آفس کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

"تشریف رکھیے ماہیر صاحب۔" خواجہ بولا۔

"اپنی جاب سے مطمئن ہیں؟" خواجہ کی تمہید سے ہی ماہیر کو گفتگو کا اندازہ ہو گیا۔ تاہم کسی حتمی نتیجے پر وہ ابھی پہنچ نہیں پا رہا تھا۔

"یس سر۔" ماہیر نے انحصار سے کام لیا۔

"تو کیا خیال ہے۔ آپ کو کراچی برانچ میں ٹرانسفر نہ کر دیا جائے۔" پیپر ویٹ گھماتے ہوئے خواجہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"سر! میری مرضی جان رہے ہیں یا بتا رہے ہیں۔" وہ بھی ماہیر تھا۔ سوچ بچار کے بعد اس نے بھی کہہ ہی دیا۔

"دونوں ہی سمجھ لو۔" اپنے بہت ہی ذہین اور دمدار ورکر سے بات کرتے ہوئے خواجہ کا انداز بھی خاصا محتاط ہو گیا۔

"ویسے اپنے کیریئر میں بریک دینا 'عقلمندی نہیں۔" خواجہ کا اشارہ وہ اچھی طرح سے سمجھ رہا تھا۔

"سر! کچھ مجبوریاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو کامیابی کی راہیں بلاک کردیتی ہیں۔ اس وقت میری فیملی کرائسز کا شکار ہے میں انہیں فی الحال تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔" ماہیر نے رسان سے وجہ بتائی۔

"تو اپنی فیملی کو بھی ساتھ لے جائیں۔ آپ کو کمپنی کی طرف سے فرنشڈ فلیٹ ملے گا۔" وہ ایک بہت پرکشش سہولیات سے مزین آفر دے رہا تھا۔ مگر کیوں؟ کیا وجہ تھی؟ یہ مہربانی ماہیر عالم کے لیے کیوں؟ پہلے جانا بیجنگ کی آفر اور اب کراچی میں ٹرانسفر۔

"آپ کی سیلری میں بھی اضافہ کردیا جائے گا اور گاڑی کی سہولت بھی میسر ہوگی۔" خواجہ اس کے چہرے پر لکھی تحریر اور تاثرات جانچنے کی کوشش کررہا تھا تاہم وہ اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوا تھا یہ تو اس کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا۔ ماہیر کے چہرے کے تاثرات بالکل سپاٹ تھے۔

"اگر میں اس آفر کی بجائے اسی جگہ اپنی خدمات سر انجام دوں تو پھر؟" بہت دیر سوچ و بچار کے بعد وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔ ایک بات تو واضح ہو رہی تھی کہ اس معاملے میں کوئی اور ہی راز پنہاں تھا۔ وہ کمپنی کے رولز اچھی طرح سے جانتا تھا اور اسے یہ بھی پتا تھا کہ کسی بھی ورکر کو کہیں بھی ٹرانسفر کرنا ہو تو ورکر کی رائے جاننے کے بارے میں مالکان ہرگز بھی اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کرتے اور پھر خواجہ امجد جیسے لوگ، جو بغیر فائدے کے کسی سے کلام بھی نہیں کرتے۔ وہ بات کی تہہ میں اترنا چاہتا تھا مگر فی الحال کچھ بھی اندازہ لگانا نری حماقت تھی۔

"تو پھر آپ کو ٹرمینیٹ کردیا جائے گا۔" خواجہ نے دو ٹوک انداز میں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"سر! یاور اس آفر کے لیے مناسب رہے گا۔ اس پر کسی کوئی خاص ذمہ داریاں بھی نہیں جبکہ میں بہت مجبور ہوں سر! یہاں دو ڈاکٹر ایسے ہیں جو میرے چھوٹے بھائی کا علاج کر رہے ہیں۔ مجھے ہر ہفتے اس کا چیک اپ کروانا ہوتا ہے۔ میری والدہ بھی ذہنی امراض کے ڈاکٹر سے ٹریٹمنٹ لے رہی ہیں۔"

"ماہیر صاحب! ایک بات تو بتائیے؟" خواجہ پرسوچ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"جی سر!" ماہیر گویا خود بخود سمجھ رہا تھا کہ اس کے لیے کچھ بڑی مشکلات کا ایک پہاڑ کھڑا ہو رہا ہے۔ اسے اس پہاڑ کو کیسے سر کرنا تھا۔ ابھی یہ سوچنا محال تھا۔

"محترمہ فلک ناز سے آپ کی کچھ عداوت چل رہی ہے؟" خواجہ کا انداز معنی خیز قسم کا تھا۔

"محترمہ فلک ناز۔" ماہیر حیران سا رہ گیا۔ وہ تو اس نام کی کسی خاتون کو جانتا تک نہیں تھا۔

"اوکے ماہیر صاحب! آپ کے پاس ڈیڑھ ماہ تک کا وقت ہے۔ اچھی طرح سے سوچ لیجیے۔ ہماری آفر برقرار ہے۔ آپ کا ساتھ بہت پرانا ہے ہماری کمپنی سے سوا ہی حساب سے ہماری خواہش ہے کہ آپ کے لیے کچھ بھی مشکلات کریئیٹ نہ ہوں۔ ہم آپ کو مزید اس برانچ سے منسلک نہیں رکھ سکتے اسے ہماری مجبوری سمجھے گا۔" خواجہ نے دو ٹوک بات کے اختتام پر ماہیر کی طرف دیکھا۔ وہ اس کا اشارہ سمجھ کر باہر نکل آیا۔ اس کی پیشانی پر تفکر کی ایک گہری لکیر تھی۔

"یہ فلک ناز کون ہے؟ میری دربدری سے بھلا اس عورت کو کیا فائدہ ہوگا؟ کون سی عداوت؟ تو کیا اس ساری گنجلک کہانی کا کوئی سرا فلک ناز سے جا ملتا ہے؟"

"ہم آپ کو مزید اس برانچ سے منسلک نہیں رکھ سکتے۔" خواجہ کی آواز گویا اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔

"بھلا کیوں؟ کس لیے؟" اس کا ذہن سوال اگل رہا تھا۔

"اس لیے کہ فلک ناز نہیں چاہتی۔" جواب بھی کہیں آس پاس موجود تھا۔

"مگر خواجہ انڈسٹریز میں فلک ناز کا کیا عمل دخل۔" دماغ نے ایک اور نقطہ اٹھایا۔

"لگتا ہے کہ خواجہ کے ساتھ کوئی بڑی ڈیل طے کی گئی ہے۔"

"کیسی ڈیل؟" وہ چونکا۔

"یہ تو وقت بتائے گا۔"

"مگر وقت بھلا بتائے گا کب؟ جب ہاتھ خالی ہوں گے۔" ماہیر کو اچانک ہاتھ سے نکل جانے والی اس جاب کا خیال آیا تھا جس نے آڑے وقتوں میں بھی اسے لحظہ بھر کے لیے بھی ڈگمگانے نہیں دیا۔ مگر اس وقت خواجہ امجد کی بجائے خواجہ خالق اس کمپنی کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے تھے اور وہ بہت ہی ذہین اور درد مند دل رکھنے والے انسان کے ساتھ ساتھ جوہر شناس بھی تھے اور ان کی نظر نے سیپ میں بند موتی کو پرکھ لیا تھا۔ ایسی نظر ہر کوئی نہیں رکھتا تھا۔ ہر کسی کے پاس پرکھنے والی آنکھ نہیں ہوتی۔ اس فن سے بھی کسی کسی کو نوازا جاتا ہے۔

خواجہ خالق کی وفات کے بعد ان کے اکلوتے بیٹے خواجہ امجد نے باپ کی سیٹ سنبھال لی تھی۔ مسلسل کئی سالوں سے وہ پرافٹ ایبل بزنس کر رہا تھا۔ اس کی ایک وجہ اس کا ایماندار اور محنتی اسٹاف بھی تھا۔ وہ ایک ذہین سرمایہ کار تھا تاہم اس کے پاس "ہیرے" کی پہچان کرنے والی کوئی آنکھ نہیں تھی۔

ابھی تو وہ چند کروڑ کی خاطر ایک بہترین دماغ کا سودا کر رہا تھا۔ اس سوداگری میں وہ ایک بہترین سوچ رکھنے والے ایک بے تحاشا ذہین آدمی کو کھونے والا تھا۔

یہ تب کی بات ہے جب خواجہ انڈسٹریز کا نام ڈوب رہا تھا اور بزنس کی دنیا میں ایک اور درخشاں ستارہ ابھرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور یہ بہت پرانی بات تھی۔ اگر کہیں بھی کون سا زمانے بیت گئے تھے۔

ماہیر عالم جس کمپنی میں انٹرویو دے کر آیا تھا۔ وہ کمپنی دیوالیہ ہونے کے قریب قریب تھی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ ایک معمولی سا طالب علم تھا۔ جو باپ سے چوری چھپے نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھرتا تھا۔ تب اس کی نظر اخبار کے ایک اشتہار پر پڑی اور وہ دوسرے ہی روز خواجہ انڈسٹریز کے اونر کے سامنے جا بیٹھا۔

اس کا انٹرویو ہوا اور وہ سلیکٹ ہونے کی امید نہ رکھتے ہوئے بھی سلیکٹ ہو گیا۔ وہ آج بھی حیران ہو کر سوچتا تھا کہ اسے کس بنیاد پر منتخب کیا گیا ہے۔ البتہ جاب کے دوسرے روز ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے ایک چیلنج دیا جانے والا ہے۔

خواجہ صاحب نے اسے بتایا تھا کہ ایک بہت بڑی بہت ہی گرینڈ پارٹی میں اسے شرکت کرنا ہے۔ اس پارٹی میں ملک کے نامور سرمایہ دار آئیں گے۔ یہ پارٹی کاروبار کو وسعت دینے کی ایک کڑی ہوگی۔ یہاں جس کا سکہ چل گیا۔ وہی کامیاب ہوگا۔

ماہیر کے ذمے جو کام لگایا گیا تھا۔ وہ اچھی طرح سے سمجھ چکا تھا۔ مگر وہ فکر مند اس لیے بھی تھا کہ بھلا کون ایک دیوالیہ ہوتی کمپنی کے ساتھ کسی نئے ایگریمنٹ پر سائن کرے گا۔

اسے جس ابھرتے ستارے سے ملاقات کے متعلق بریفنگ دی گئی تھیں۔ اس سے مل کر ماہیر حیران رہ گیا۔ وہ اسی کا ہم عمر نوجوان تھا۔ بے حد ذہین اور روشن آنکھوں والا۔ وہ بھی ماہیر کی طرح کتابوں کی دنیا کا باسی تھا اور وہ بزنس کی کتاب پڑھتے پڑھتے عملی زندگی میں نہ جانے کیوں داخل ہو گیا تھا۔ یہ پہلی ملاقات تھی ماہیر عالم کی زرجان عباس سے اور یہ پہلی کامیابی تھی ماہیر عالم کی جو اسے زرجان عباس کے توسط سے ملی۔

زرجان عباس نے ایک دیوالیہ ہوتی کمپنی کے ساتھ ڈیل کرلی۔ سو خواجہ انڈسٹری کو ایک طوفان کے عالم میں سہارا مل گیا۔ اس کامیابی کا سہرا خواجہ خالق نے ماہیر عالم کے سر پر سجا دیا سو اس کمپنی نے پھر کبھی خسارے کا کوئی سودا نہیں کیا تھا۔

ماہیر کے اس ایگریمنٹ کے بعد زرجان سے کبھی کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ سننے میں آیا تھا۔ وہ اسٹڈیز کے لیے ابراڈ چلا گیا ہے۔

بہت سالوں بعد جب زرجان عباس کے نقوش تک ماہیر عالم کی یادداشت سے مٹ چکے تھے۔ اسے قطعاً بھول چکا تھا کہ وہ کسی زرجان عباس سے کبھی ملا بھی ہے۔ تب شاید دوسری مرتبہ ماہیر نے اسے اپنی

شادی کے موقع پر دیکھا تھا۔ مگر وہ اسے قطعاً "پہچان" نہیں پایا۔

تب وہ حیران رہ گیا تھا کہ بھلا اس کا حریم جمال سے کیا تعلق ہے اور حریم کی چھوٹی بہن حالی اس کے کان میں گھسی بتا رہی تھی۔

"یہ میرے زرجان بھیا ہیں۔ ہمارے چچا جمشید عباس کے سب سے چھوٹے بیٹے۔ آپ انہیں جانتے ہیں ماہیر بھائی۔"

"ہاں۔۔۔ شاید۔" وہ ماہیر عالم کو کامیابی کے زینے کی طرف لے جانے والا راہنما تھا۔ اگرچہ ماہیر عالم اس کا چہرہ بھول سکتا تھا مگر وہ احسان ہرگز نہیں، جو زرجان عباس نے اس کی ذات پر کیا تھا۔

"تمہارے یہ زرجان بھیا بھلا کہاں سے دریافت ہوئے؟" ماہیر نے مذاقاً حالی کو چھیڑا۔ ظاہر ہے، بہت سالوں سے ان کا جمال انکل کے گھر آنا جانا تھا۔ اس سے پہلے ماہیر نے کبھی زرجان کا نام بھی نہیں سنا تھا۔

"جمشید چچا کی بیماری اور ڈیتھ کے دوران، زرجان بھیا نے خود ہم سے رابطہ کیا تھا۔" حالی نے مصنوعی خفگی سے بتایا۔

"اس سے پہلے زرجان بھیا کہاں تھے؟" ماہیر نے اسے پھر سے چھیڑا۔

"تب وہ پڑھنے کے لیے یورپ میں مقیم تھے۔ اور رہے جمشید چچا تو وہ اپنے بچپن کی منگ کو ٹھکرانے کے بعد باس کی بیٹی سے شادی کے جرم میں گھر بدر کر دیے گئے تھے۔ مگر سننے میں آیا تھا۔ ان کی چاچی سے بھی نبھ نہیں سکی۔" حالی نے تفصیل سے جواب دیا۔

"اور اب ادھر کے چکر کیوں لگ رہے ہیں زرجان بھیا کے۔" ماہیر نے زرجان بھیا کو گویا حالی کی چڑ ہی بنا لیا۔

"ان کے تایا کا گھر ہے، جب مرضی آئیں۔ آپ کیوں جیلس ہو رہے ہیں۔" حالی نے بھنویں اچکا کر کہا۔

"مجھے تو جیلسی فیل ہو رہی ہے کیونکہ حالی، زرجان بھیا کا ورد جو کرتی رہتی ہے۔" ماہیر نے بے چارگی کے عالم میں وجہ بتائی۔

"آپ کے نام کا ورد بھی اسی طرح سے کرتی ہوں۔" حالی نے اپنے تئیں اس کی غلط فہمی دور کرنا چاہی۔

"کیا محسن کو بھی کبھی یاد کیا ہے؟" ماہیر کی آنکھوں میں ڈھیروں شرارت بھر گئی۔

"محسن۔" حالی کا دل گویا دھک سے رہ گیا۔

"انہیں محسن کے بارے میں کیسے پتا چلا؟"

"حیران کیوں ہو رہی ہو حالی۔"

"یہ محسن بیچ میں کہاں سے آ گیا ہے؟" حالی نے تپ کر پوچھا۔

"میں نہیں جانتی کسی بھی محسن کو۔"

"میں تو جانتا ہوں۔"

"مگر کیسے؟" حالی نے بے تابی سے پوچھتے ہوئے گویا خود ہی راز بھی اگل دیا۔

"آپ کو حریم نے بتایا ہو گا۔"

"وہ مجھے کیا بتائے گی۔ اسے تو اپنا بھی پتا نہیں ہوتا۔" ماہیر نے مسکراتے ہوئے وضاحت کی۔

"تو پھر آپ کو محسن کے بارے میں کیسے پتا چلا۔" حالی نے سرگوشی نما آواز میں پوچھا۔

"بھئی وہ ہماری حالی کو اپنی میٹھی نظروں سے دیکھتا ہے بھلا پتا کیسے نہیں چلے گا۔"

"ہائے ماہیر بھائی! کتنے چالاک ہیں آپ۔" حالی نے دہائی دی۔

"آپ اپنی شادی کی رسموں کو انجوائے کر رہے تھے یا پھر جاسوسی؟"

"دونوں کام کر رہا تھا۔ فارغ بیٹھ کر کرتا بھی کیا تھا۔"

"اچھا آپ حریم کو مت بتائیے گا۔" حالی نے فوراً عہد لینا چاہا۔

"بھلا کیا؟"

"یہ محسن کا بچہ آپ کی شادی میں مجھے گھور رہا ہے۔" وہ معصومیت سے بولی۔

"محسن کے بچے نے حالی سے کوئی بات نہیں کی؟" ماہیر اس کے معصومانہ انداز سے محظوظ ہو رہا تھا۔

"بھلا کر کے تو دیکھتا، جان نہ نکال لیتی۔ اب بھی

تو بندی نہیں اٹکائی جا سکتی نا۔" حالی نے بے چارگی سے بتایا۔

"سو تو ہے۔" ماہیر نے فوراً اتفاق کیا۔

"ویسے زرجان بھیا نے بھی یہ بات نوٹ کی ہے۔ بس ایک خبر نہیں ہوئی تو ہماری بہن کو۔" حالی نے داری سے کہا۔ گیٹ پر کسی کی گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ حالی کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔

"بھلا کون سی بات؟" ماہیر نے جان بوجھ کر شرارتاً پوچھا۔

"جانے اپنا راستہ ناپیے۔ سب جان کر بھی بھولے بنتے ہیں۔" وہ معصومیت سے بولتی ہوئی لنگڑاتے ہوئے اٹھ گئی تھی اور ماہیر تاسف سے اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اسے حالی کی خوشی سے بھرپور آواز سنائی دی۔

"زرجان بھیا۔" وہ چلا رہی تھی۔

"زرجان!" ماہیر عالم کی سوچوں کو بھی یکدم بریک لگ گئے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی تمام تر پریشانی کو کنارا مل گیا ہے۔ اپنے کیبن میں جاتے ہوئے وہ زرجان عباس سے ملاقات کا پروگرام ترتیب دے رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم امی۔" نہ جانے کن وقتوں سے حریم نے فون اسٹینڈ تک کا سفر طے کیا۔ ایک دم ہی پھر سے رات کا منظر پوری جزئیات کے ساتھ زندہ ہو گیا تھا۔ حالی کے تھرکتے قدم، لہراتے ہاتھ۔۔۔ یوں لگ رہا تھا کہ زمین بھی مبلی کے قدموں کا ساتھ دیتے ہوئے گول گول گھوم رہی ہے۔

"حریم! کہاں ہو تم؟ آئی کیوں نہیں۔" دوسری طرف سے راحت بیگم کی بھرائی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"جی امی! گھر میں ہی ہوں۔ آپ خیریت سے ہیں؟" حریم نے سنبھل کر پوچھا۔

"آپ آؤ گی؟" ان کے لہجے سے بے تابی ہویدا تھی۔ آواز سے بھی محسوس ہو رہا تھا گویا وہ روتی رہی ہیں۔

"شام تک آجاؤں گی۔" حریم کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی روکھا سا ہو گیا۔

"ابھی آجاؤ۔" انہوں نے بچوں جیسے ضدی انداز میں کہا۔

"ابھی فی الحال نہیں آسکتی۔۔۔ شام تک خالہ بھی چلی جائیں گی۔ آپ سنائیں مبلی تو ٹھیک ہے؟" اس نے سرسری سا لہجہ بنا کر پوچھا۔

"اس کمبخت نے کہاں ٹھیک ہونا ہے۔" ان کا انداز جان چھڑوانے والا تھا۔ گویا وہ مبلی کے ذکر کو نہیں چھیڑنا چاہتی تھیں۔

"تم آتو جاؤ گی؟" ان کے لہجے میں خدشات بول رہے تھے۔

"جی۔۔۔"

"ضرور آجانا۔ ماہیر کے انتظار میں بیٹھی نہ رہنا۔ میرا دل بری طرح سے گھبراہٹ کا شکار ہے۔"

"میں ابھی کچھ دیر تک آجاتی ہوں۔ دوپہر کے لیے کھانے کا تردد نہ کیجیے گا۔ میں ساتھ لیتی آؤں گی۔" حریم نے کچھ سوچتے ہوئے کہہ دیا۔ راحت بیگم کا ابھی مزید گفتگو کرنے کا ارادہ تھا مگر شاید مبلی اٹھ چکا تھا اور انہیں آوازیں دے رہا تھا۔ سو فون رکھ کر وہ مبلی کی پکار پر اٹھ گئی تھیں۔ حریم بھی فون رکھ کر ابھی پلٹی ہی تھی جب لاؤنج سے آتی شور کی آواز سن کر ٹھٹک گئی۔

"کون آیا ہے؟" وہ ابھی اسی سوچ و بچار میں گم کھڑی تھی جب مہک نے کچن کی طرف جاتے ہوئے بتایا۔

"زرجان بھیا آئے ہیں۔"

"زرجان آیا ہے؟" حریم سن سی ہو کر رہ گئی۔ یوں لگتا تھا گویا جسم میں گردش کرتا لہو تک منجمد ہو کر رہ گیا ہے۔

"کیوں آیا ہے؟" وہ گویا خود سے سوال کر رہی تھی۔

"کیا تم نہیں جانتیں؟" کسی نے استہزائیہ انداز

میں پوچھا۔
"ہرگز نہیں۔" وہ بڑے مضبوط لہجے میں کہہ رہی تھی۔
"کیسی سنگدل ہو حریم!" کسی نے تاسف سے اس کے دل میں چٹکی بھری۔
"میں نے کیا کیا ہے؟" وہ خفگی جتانے لگی۔
"اب ایسی بھی لاپرواہ نہ ہو۔ وہ یہاں تمہارے لیے تو آتا ہے۔"
"تو نہ آیا کرے۔" حریم نے رکھائی سے جواب دیا۔
"میں نے کون سا اس کے ساتھ پیمان باندھے ہیں۔ کیوں خود کو برباد کر رہا ہے؟"
"تمہیں کس نے کہہ دیا ہے کہ وہ خود کو برباد کر رہا ہے۔" بڑا تیکھا سا سوال ابھرا۔
"تو پھر اپنی نیا پار کیوں نہیں لگاتا۔" وہ زچ ہو کر بولی۔
"اسے انتظار ہے؟"
"کس کا۔" حریم کا دل گویا دھک سے رہ گیا۔
"اس لڑکی کا جو حریم دل میں اجالا بھر دے گی۔" بڑا مبہم سا جواب تھا۔
"زرجان عباس کے حریم دل (دل کی چار دیواری) میں اجالا کون بھرے گی؟"
"اسی کا تو انتظار ہے؟" پھر سے وہی آواز سنائی دی۔
"اور وہ کون ہے۔" حریم نے چپکے سے پوچھ ہی لیا۔
"تمہیں اس سے کیا لینا دینا حریم۔" یہ ناراض ناراض سی آواز اس کے دل سے ابھری تھی۔ وہ خود کو ڈپٹتے ہوئے اپنے کمرے میں جانے لگی تو حانی نہ جانے کہاں سے ٹپک پڑی حالانکہ وہ اچھی بھلی کچن میں جا رہی تھی مگر اسے دیکھ کر رک گئی۔
"حریم۔۔۔!"
"کیا ہے؟" وہ بغیر پلٹے بولی۔
"کہاں جا رہی ہو؟" حانی نے آنکھیں میچ کر پوچھا یہ اس کا مخصوص اسٹائل تھا۔

"اپنے کمرے میں دیکھ تو رہی ہو۔" حریم نے بغیر ما نے جتایا۔
"لاؤنج میں آجاؤ۔" حانی کے لہجے میں تحکم تھا۔
"کیوں؟" وہ جانتے بوجھتے انجان بنی۔
"دراصل زرجان بھیا آئے ہیں نا۔"
"تو میں کیا کروں؟" حریم کے لہجے میں ناگواری بھر آئی۔
"وہ تمہارا پوچھ رہے ہیں۔" حانی نے ناراضی سے جتایا۔
"کیوں؟" حریم کے آگے بڑھتے قدم زنجیر پا ہو گئے۔
"شاید کوئی کام ہو گا۔" حانی نے معنی خیزی سے کہا۔
"مجھ سے بھلا کیا کام ہو سکتا ہے؟" وہ پرسوچ انداز میں حانی کو دیکھنے لگی۔
"اب یہ تو مجھے نہیں پتا۔" حانی نے شانے اچکائے۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ حانی جھوٹ بول رہی ہے اس کی آنکھوں میں شرارت بھری تھی۔
"ویسے راحت آنٹی کیا کہہ رہی تھیں؟" معاً حانی کو خیال آیا تو پوچھنے لگی۔
"گھر آنے کا کہہ رہی تھیں۔ مگر اس وقت میں جاؤں بھلا کیسے۔" حریم نے بے زاری سے کہا۔
"زرجان بھیا ہیں نا۔۔۔ میں ان سے کہتی ہوں جاتے ہوئے تمہیں ڈراپ کر جائیں گے۔" حانی نے چٹکی بجاتے ہوئے اس کا مسئلہ حل کر دیا۔
"ویسے میں نے زرجان بھیا سے بہت لڑائی کی ہے۔" اب وہ مسکراتے ہوئے اسے بتا رہی تھی۔
"کیوں؟" حریم نے بے خیالی میں پوچھ لیا۔
"رات کو وہ آئے جو نہیں اس لیے۔"
"تو کیوں نہیں آیا؟" اس کا دھیان اب بھی کہیں اور تھا۔
"کسی نے بلایا جو نہیں۔" ایک ٹھہری ہوئی سی دھیمی آواز حریم کی پشت سے ابھری۔ وہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر نہ جانے کب چپکے سے آ

ہوا۔
"بلایا تو تھا۔" حریم سنبھل کر بولی۔
"کیوں حانی؟" اب وہ حانی کی طرف متوجہ تھی۔
"آپ بہانے بازی سے کام نہ لیں۔ بابا نے فون تو کیا تھا اور جو رات کو میں نے اتنی لمبی بات کی تھی اور آپ جناب میٹنگ کے رونے رو رہے تھے۔" حانی بھی گویا ادھار کھائے بیٹھی تھی۔
"سوری گڑیا!" زرجان نے کان کھجاتے ہوئے اپنی غلطی تسلیم کر لی۔ یہ اس کی بہت ہی اچھی عادت تھی کہ وہ بلاوجہ بات کو طول نہیں دیتا تھا۔
"نیکسٹ ٹائم ایسا نہیں ہو گا۔"
"زرجان بھیا۔" حانی گویا چلا اٹھی۔
"میرا نیکسٹ ٹائم ایک اور منگنی ارینج کرنے کا ارادہ نہیں۔"
"پگلی! زرجان شادی کی بات کر رہے ہیں۔" حریم نے ہنس کر وضاحت کی۔ زرجان کے لبوں پر بھی ہلکی سی مسکان پھیل گئی۔
"جب آپ نے ڈنڈی مارنے کی کوشش کی تو پھر دیکھیے گا۔" حانی کا انداز وارننگ دینے والا تھا۔ تبھی محسن بھی نہ جانے کسی کونے سے برآمد ہو گیا۔
"محترمہ! یہ ڈنڈی کی وضاحت تو کر دیں۔"
"تم میرے منہ نہ ہی لگو تو بہتر ہے۔" حانی اسے دیکھتے ہی بری طرح سے چڑ گئی۔
"اتنے سنجیدہ موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ بیچ میں تم ٹپک پڑے۔"
"کیوں میں ایسی عالمانہ گفتگو سے فیض یاب نہیں ہو سکتا۔" محسن چڑنے والوں میں سے تو ہرگز نہیں تھا۔
"تم میں عالمانہ گفتگو سننے کی اہلیت ہی نہیں۔" حانی کی زبان بھی منہ کے اندر نہیں رک سکتی تھی۔
"کچھ شرم کرو تم دونوں۔" زرجان کی موجودگی میں ان دونوں کو چونچیں لڑاتے دیکھ کر حریم نے خفگی سے کہا۔
"میں تو شرم کر لیتا ہوں آپی! کچھ اسے بھی شرم و حیا کا سبق پڑھا دیجیے۔" محسن نے مچل کر منہ بنایا۔
"حریم نے کیا شرم و حیا کا ٹیوشن سینٹر کھول رکھا ہے۔" حانی کو بھی بغیر سوچے سمجھے بولنے کی بیماری تھی۔ حریم گویا خفت زدہ سی رہ گئی۔
"حانی! تم غالباً کچن میں جا رہی تھیں۔" وہ اسے موضوع سے ہٹانا چاہ رہی تھی۔
"جانا تو تھا مگر مہک نے چائے بنالی ہے۔" حانی کے پاس ہر جواز پہلے سے تیار شدہ مل سکتا تھا۔
"مہک کے ہاتھ سے بنی چائے کون پیے گا۔" محسن گویا صدمے کے زیر اثر ڈگمگا گیا۔
"کوؤں کے آنسوؤں سے مشابہ چائے بھلا پی بھی کون سکتا ہے۔"
"تم نہ پینا۔ کس نے مجبور کیا ہے۔ ویسے ابھی زرجان بھیا کے آنے سے پہلے بھی تو تم دو کپ چائے چڑھا چکے تھے۔" حانی نے جتا کر کہا۔
"اب مہمانوں کا تم کھایا پیا گنو گی۔" محسن کو صدمے کے مارے چکر سا آ گیا۔
"ویسے زبان سے ہی کہہ دو کہ ہم لوگ اپنا راستہ ناپ لیں۔"
"میرے کہنے کی ضرورت کہاں بچی ہے۔ مہمانوں کو خود سے ہی شرم آ گئی ہے اب جتانے کا بھلا کیا فائدہ۔"
"بڑے افسوس کی بات ہے۔" محسن نے تاسف کا برملا اظہار کیا۔
"زرجان بھائی! یہ سب کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرتی ہے۔ ابھی کچھ کھلا پلا دے گی۔ دوسرے لمحے گنتی شروع کر دے گی۔ آپ بھی ذرا خود پر آیت الکرسی پڑھ کے چائے کو ہاتھ لگائیے گا۔ محترمہ کی نظریں خاصی خطرناک ہیں۔ کہیں پیٹ میں انفیکشن نہ ہو جائے۔"
"یہ چائے ہے۔ ماش کی دال نہیں۔" مہک کے ہاتھ سے ٹرے پکڑ کر حانی نے ناگواری سے کہا۔
"تمہاری نظر پتھر پھاڑ سکتی ہے۔ یہ تو پھر ہمارے نازک نازک سے معدے ہیں۔" وہ چائے کا کپ

اچک کر بھاگ نکلا۔ زرجان ان کی شرارت سے محظوظ ہوتا چائے کے سپ لے رہا تھا۔ اس کی نظریں اپنے کمرے کی طرف جاتی حریم کی پشت پر تھیں۔

"حانی! انہیں کہو تیار ہو جائیں۔"

"کس کو۔" حانی کا دھیان ابھی تک محسن میں اٹکا تھا۔

"حریم سے کہو تیار ہو جائیں۔" زرجان نے وضاحت کی تھی۔ حریم کا نام لبوں سے ادا کیا ہوا تھا۔ زرجان کی نظر خود بخود جھک گئی۔ کیسا قابل احترام نام تھا یہ اس کی جھکی نظر اٹھ ہی نہیں پائی۔ حانی کا دل گویا مٹھی میں بھینچ گیا۔

"بھیا! ایک بات کہوں۔" وہ زرجان کے پیچھے چلتی ہوئی سٹنگ روم میں آگئی۔

"بولو۔" اس کی نظریں اب بھی اپنے چائے کے کپ پر مرکوز تھیں۔

"زرجان بھیا! آپ شادی کر لیں نا۔"

"اچھا۔" زرجان مسکرا دیا۔

"یہ خیال آپ کو کیسے آیا؟"

"آپ کو شادی کر لینی چاہیے۔ باتوں میں مجھے مت الجھائیں۔" حانی خلوص دل سے بولی۔

"کس سے کر لینی چاہیے۔" اس نے ایسے ہی بات بڑھانے کی غرض سے پوچھ لیا۔ حالانکہ اس کا دھیان کہیں اور تھا۔

"آپ ہاں تو بھریں۔ لڑکیوں کی لائن لگا دوں گی۔" حانی جوش سے بولی۔

"اچھا۔" زرجان پھر سے مسکرا دیا۔

"کوئی اچھی سی ڈھونڈنا۔"

"حریم جیسی ہو گی۔" حانی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ساتھ ہی اس نے زبان دانتوں تلے دبالی۔

"ایسی تو کوئی نہیں ہو گی۔" زرجان کے لبوں پر زخمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ سامنے سے آتی حریم کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"بابا تو سو چکے ہیں۔ انہیں میرے جانے کے متعلق بتا دینا۔" حریم جوتے کے اسٹیپ بند کرنے کے لیے قدرے جھک گئی۔ تبھی خالہ اور بوا بھی آگئی تھیں۔ وہ سب حریم کو گیٹ تک چھوڑنے کے لیے باہر آگئے۔

محسن گاڑی کا فرنٹ ڈور کھولے کھڑا تھا۔ حریم کے قدم گویا لڑکھڑا گئے۔ اس کے ہاتھ نے بیک ڈور کو چھوا تھا۔

"زرجان بھائی آپ کے ڈرائیور نہیں ہیں محترمہ۔" محسن کی زبان کس قدر چلتی تھی۔ پل بھر میں پھسلنے لگتی۔

"تشریف رکھیے۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر فرنٹ سیٹ پر اسے دھکیلنے کے بعد چھوٹا سا سوٹ کیس بھی اٹھا لایا۔

"جائیے" آپ کو اللہ کی امان میں دیا۔ بس آپ کے نکلتے ہی ہم بھی رخت سفر باندھنے والے ہیں۔" سب نے الوداعی نظروں سے لحہ بہ لحہ او جھل ہوتی گاڑی کو دیکھا تھا۔ خالہ کی نظر میں ایک حسرت نے کروٹ لی تھی۔ ان کی پرسوچ سی نظر بوا کے چہرے پر آگئی۔

"بوا! یہ اپنا زرجان کس قدر جچتا ہے بالکل جمشید جیسا۔"

"ہاں۔" بوا بھی گویا کسی خوشنما منظر کے سحر میں تھیں۔

"ایک بات پوچھوں؟" بچوں کے منظر سے ہٹتے ہی انہوں نے راز داری سے بوا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"پوچھو۔" بوا تخت پر ٹک گئیں۔ ساتھ ہاتھ بڑھا کر پاندان کو بھی کھسکا کر اپنے قریب کیا۔

"زرجان کیا حریم سے شادی کا خواہش مند تھا؟" ان کے لہجے میں واضح جھجک تھی۔

"ہوں۔" بوا نے ہنکارا بھرا۔

"تو پھر کیا؟ بھائی صاحب نہیں مانے؟ کیا اس لیے کہ وہ جمشید کی اولاد ہے ایک نافرمان باغی کی اولاد۔" ان کے لہجے میں ٹوٹے کانچ چبھ رہے تھے۔ بوا نے ایک طویل سانس خارج کیا۔ ان کے چہرے پر بنے جھریوں کے جال میں بہت سی کہانیاں سر پیچ رہی تھیں۔

"بس یہی سمجھ لو نور بنت۔" بوا گویا تھک سی گئیں۔ "زرجان میں اگرچہ کوئی کمی نہیں ہے۔ سب سے بڑھ کر اپنا خون۔ اپنے جگر کا ٹکڑا۔ مگر حریم بھی تو ماہیر کی بچپن کی منگ تھی اور تم سے بہتر بھلا کون جانتا ہے کہ ہمارے ہاں بچپن کے رشتوں کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ اور پھر حریم بھی تو ماہیر کی طرف ملتفت تھی۔ ظاہر ہے ایک نام جو ذہن اور دل پر اوائل عمری میں نقش ہو گیا تھا بھلا کیسے اسے کھرچ ڈالتی۔ پھر یہ زرجان کیوں ایک لاحاصل سفر کا انتخاب کر بیٹھا ہے۔" وہ گویا خود کلامی کے سے انداز میں بول رہی تھیں۔

"جمشید کی بیوی کے نخرے کا تو تمہیں پتا ہی ہے۔ زرجان کے کہنے پر آتو گئی تھی مگر پھر سیدھے منہ کسی سے بات نہ کی۔ جمال کو پہلے سے ہی غصہ بہت تھا۔ پھر بات حریم کی ہوئی تو اسے اور بھی غصہ آگیا۔ ظاہر ہے حریم کا رشتہ تو طے تھا اور اس عورت کی عقل بھی تو دیکھو۔ رشتوں کی نزاکتوں کو سمجھے بغیر حریم پر اپنا حق جتانے لگی۔ ایسے تکبر سے بول رہی تھی۔ گویا بچی کا ہاتھ پکڑ کر اس کے ساتھ چلتا کر دیں گے۔ کہنے لگی 'منگنی ہے۔ کون سا نکاح کر دیا ہے۔ اگر نکاح بھی ہوا ہو تا تو مسئلہ نہیں تھا۔ نکاح بھی تو توڑے جا سکتے ہیں۔' بس میں نے اور جمال نے خوب کھری کھری سنا دیں۔ بھلا اس کی دولت سے ہمیں کیا لینا دینا۔ بس اسی دولت کے ناتے اکڑتی پھر رہی تھی۔ ورنہ جمشید کی تو جوتی کے برابر بھی نہیں تھی۔ نہ صورت نہ سیرت ہونہہ۔" بوا نے گویا جلے دل کے پھپھولے پھوڑے تھے۔

"اور اس قصے میں نقصان کس کا ہوا۔" خالہ کی آواز بھرائی سی تھی۔

"نقصان تو زرجان بچے کا ہوا۔ پر بیٹی! یہ تو نصیب کی بات ہے۔ تقدیر کے فیصلے ہیں۔ اللہ حریم کو ہر سکھ سے نوازے۔ ماہیر کسی سے کم تو نہیں ہے۔ اللہ آباد شاد رکھے دونوں کو۔"

"بات تو ساری دل کی خوشی اور رضامندی کی ہوتی ہے۔ حریم کا دل تو ماہیر کی طرف مائل تھا۔ زرجان کو بھلا اس رشتے سے کون سی خوشی ملنی تھی۔ اللہ کے ہر کام میں بہتری پوشیدہ ہوتی ہے۔"

"اسی لیے تو زرجان کی ماں کو ٹکا سا جواب دے دیا تھا۔ اپنے بچوں کے دل کی خوشی بھی تو دیکھنا ہوتی ہے۔" بوا نے مزید بتایا۔

"تو کیا زرجان کی ماں نے اس بات کو انا کا مسئلہ نہ بنایا؟" جتنا وہ جمشید کی بیوی کے متعلق جانتی تھیں اور جو کچھ انہوں نے دوسروں سے سن رکھا تھا اس لحاظ سے تو جمشید کی بیوی فلک ناز بہت ہی ضدی انا پرست اور مغرور عورت تھی اور ایسے لوگ اپنی توہین کسی صورت بھی گوارا نہیں کرتے۔

"ہمارا اس سے پھر سامنا نہیں ہوا۔"

"اور اس نے کبھی زرجان کو ادھر آنے سے روکا نہیں۔" انہوں نے سوالیہ نظروں سے بوا کی طرف دیکھا تھا۔

"روکتی تو ضرور ہو گی۔ مگر بچہ کون سا ماں کی انگلی پکڑ کر چلتا ہے۔ ویسے ایک بات تو ماننے والی ہے۔" بوا نے ایک ننھے پان کی گلوری بنا کر منہ میں رکھی۔

"کیا؟" انہوں نے بیگ اٹھا کر باہر کی طرف نکلتے محب کو بے خیالی میں دیکھا۔ بچے سامان سمیٹ رہے تھے۔ تین بجے تک انہوں نے بھی اسلام آباد کے لیے نکلنا تھا۔ محسن شاید ٹیکسی لینے چلا گیا تھا۔

"فلک ناز اپنے بچوں کے معاملے میں بہت دیوانی ہے۔ اپنے جیسی عورتوں سے مختلف۔ بہت محبت کرتی ہے بچوں سے ورنہ یہ امیر زادیاں کہاں بچوں کو دھیان سے پالتی ہیں۔ آیاؤں کے ہتھے چڑھا کر خود لور لور پھرتی ہیں۔"

"امی! ٹیکسی آگئی ہے۔" اسی پل محسن کمرے میں داخل ہوا۔

"گھر کو ایک دم ہی خالی کرنے لگے ہو۔ آج کا دن رہ جاتی نور بنت۔" بوا کو پھر سے بھاں بھاں کرتے گھر کے سناٹوں کا خیال آیا تو کہہ اٹھیں۔

"پہلے حریم چلی گئی ہے۔ اب تم بھی بچوں کو لے کر جانے لگی ہو۔ گھر میں کیسی بے رونقی اتر آئے گی۔"

"بوا! پیاری بوا! غم نہ کھائیں میں پھر اگلے مہینے آپ سے ملنے اور قدم بوسی کی غرض سے آجاؤں گا۔" محسن جذباتی سا ہو کر بوا سے لپٹ گیا۔ بوا گویا نہال ہو گئیں۔

نورینہ اٹھ کر بڑے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد یہ قافلہ بھی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ حالی برآمدے کی سیڑھی پر بیٹھی ڈوبتے سورج کی زردیوں میں نہ جانے کیا کھوج رہی تھی۔

"جاتے جاتے کس قدر اداس کر دیتے ہو۔" وہ گویا ڈوبتے سورج کی الوداعی کرنوں سے مخاطب تھی اور نہ جانے کیوں اس کی آنکھ سے ایک قطرہ پھسل کر نیچے گر پڑا۔ شاید ان مسافروں کے لیے جن کا قیام اس دل میں ہمیشہ کے لیے تھا مگر سفر نے ان کے قدموں میں گھنگھرو باندھ رکھے تھے اور انہوں نے اپنی منزل کی طرف جانا ہی تھا اور جانے والوں کو روکا تو نہیں جا سکتا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کی منزل انہیں پکار رہی ہے۔ اب وہ اپنی پیاری بلبل بہن حریم کے بارے میں سوچ رہی تھی جس کی زندگی نہ جانے کس کس آزمائش کی بھٹی میں تپنے کے بعد کندن بنی تھی۔

اور وہ زرجان عباس کے متعلق سوچ رہی تھی۔ جس کی اداس آنکھوں میں حالی کا بس نہیں چلتا تھا کہ مسکراہٹیں ـــ بھر دیتی۔

اور وہ غیب عالم کے بارے میں سوچ رہی تھی جسے اللہ نے ایک نامکمل وجود میں تخلیق کیا تھا مگر وہ اپنی ذات میں کس قدر مکمل تھا۔ یہ بات کوئی جان ہی نہیں سکتا تھا۔

اس کی سوچیں اسلام آباد کے ایک باسی کی سمت پرواز کرنے لگی تھیں جس نے ایک ادھوری عورت کو اپنے نام کا مان بخش کر مکمل کر دیا تھا۔ تو پھر زندگی سے کوئی گلہ بنتا تھا؟ نہیں نا اداس کرنوں کو سمیٹے سورج چپکے چپکے آسمان کی وسعتوں میں کھو رہا تھا اور حالی جمال زیر لب "بوا" دھیرے دھیرے کہہ رہی تھی۔

"عمر رواں! تجھ سے کوئی گلہ نہیں۔ کوئی گلہ نہیں۔"

☼ ☼ ☼
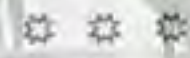
فضا نے خوشبو کے ہار پرو کر منہ بند کلیوں کی ننھی ننھی شاخوں کے گریبان میں سجا دیے تھے۔ سنہری تتلیاں گلابی پھولوں کے عشق میں پاگل ہر کنج پر منڈلا رہی تھیں۔ کوئل چپکے سے کسی ڈال پر قدم جما کر دھیرے دھیرے نغمے گنگنانے لگی تھی۔ مگر آج اس کی سریلی آواز میں درد تھا۔ اس کی آنکھ رو رہی تھی۔ اس کا دل بھی رو رہا تھا۔ کوئل آج سے پہلے اس قدر اداس نہیں ہوئی تھی۔ مگر آج اس کے اداس گیت نے گلستان دل کو زار زار رلا دیا تھا۔

آج پھر سے دو اجنبی ایک ساتھ بہت جلد اختتام پذیر ہونے والے سفر میں ایک دوسرے کے ہمراہ تھے۔ محض تھوڑی سی دیر کے لیے۔ محض گھڑی بھر کے لیے۔

اور دور بہت دور گلستان دل کی ایک شاخ پر جھولتی کوئل کے لبوں سے نوحہ پھوٹ رہا تھا۔

سنا ہے اس محبت میں
بہت نقصان ہوتا ہے
مسلسل جھومتا جیون
غموں کے نام ہوتا ہے
سنا ہے چین کھو کر وہ
صبح و شام روتا ہے
محبت جو بھی کرتا ہے
بہت بدنام ہوتا ہے
سنا ہے اس محبت میں
کہیں بھی دل نہیں لگتا
بنا اس کے نگاہوں میں کوئی موسم نہیں جچتا
خفا جس سے محبت ہو وہ جیون بھر نہیں ہنستا
بہت انمول ہے وہ دل
اجڑ کے پھر نہیں بستا
سنا ہے اس محبت میں بہت نقصان ہوتا ہے۔

کوئل کی کوک نے اہل دل کی محفل میں آنسوؤں کی برسات اتار دی تھی۔ قطرہ قطرہ پگھلتا دل نفع و نقصان

سے بے نیاز کوسوں دور رہا تھا۔ وہ شام کی چادر اوڑھے طلوع ہوتی شبنمی صبح کا منتظر تھا۔ ہاں "انتظار" اس کے نصیب میں لکھا جا چکا تھا۔ مگر اس انتظار نے اپنے رنگ بدل لیے تھے۔

بڑی عجیب سی محبت کی تھی زرجان عباس نے حریم جمال سے۔ اس نے کبھی اس کے پلٹ آنے یا لوٹ آنے کی دعا نہیں کی تھی۔ اس نے کبھی یہ خواہش نہیں کی تھی کہ وہ کسی بھی راستے سے ہو کر زرجان عباس تک چلی آئے۔ گاڑی کی پرسکون فضا میں ایک معنی خیز ـــ خاموشی دو اجنبیوں سے ہم کلام تھی۔

"کب تک اجنبی راستوں پر سفر کرو گے زرجان۔"

"جب تک کوئی اس سفر میں ہمراہ نہ ہوا تب تک۔" زرجان نے زیر لب مسکرا کر خاموشی کو گویا چڑایا۔

"اوہ... تو تمہیں انتظار ہے کسی کا؟" خاموشی شاید جل بھن گئی۔

"یہی سمجھ لو۔" جواب مبہم سا تھا۔

"تو پھر کون ہے وہ؟" خاموشی کو سخت بے چینی لاحق ہوئی۔

"تمہیں کیوں بتاؤں۔" وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔ بڑی کھلی کھلی سی مسکان اس کے شنگرفی لبوں پر تھی۔

"اوہ ـــ تو آج تمہارا مزاج بہت اچھا ہے زرجان۔" خاموشی گویا اب سمجھ گئی تھی۔

"میں جان گئی۔ آج تم میری طرف بھلا کیوں دیکھو گے۔ آج تمہارا پہلو آباد جو ہے۔" خاموشی نے طنزیہ لہجہ اپنایا۔

"میرا پہلو تو ہمیشہ آباد ہی رہتا ہے۔" زرجان گویا آج خاموشی کو لاجواب کرنا چاہتا تھا۔

"تم بھی نا زرجان۔" خاموشی تنگ تھی۔

"زرجان ـــ!" اس کے قریب سے بڑی رواں گھنٹیاں بجاتی بے حد سریلی آواز ابھری تھی۔ خاموشی نے گویا دانت کچکچائے تھے اور پاؤں پٹختی دور بہت دور نکل گئی تھی۔ زرجان اپنے ہی دھیان و گیان میں تھا۔ ایک دم اس کا پیر بریک پر جا پڑا۔ گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی تھی۔

"مجھ سے کچھ کہا ہے؟" زرجان کو گویا یقین نہیں آیا تھا۔ حریم جمال بھلا اسے مخاطب کر سکتی تھی۔ اس کے دل کی رفتار معمول سے ہٹ گئی تھی۔ ایک مرد ہو کر اس کی پیشانی پر دو تین شفاف پانی کے قطرے ابھر آئے۔ نہ جانے کیوں لمحہ بھر کے لیے زرجان عباس کو اپنی خوش بختی پر ناز سا ہوا۔ اس کے قناعت پسند دل کے لیے حریم جمال کی اتنی سی توجہ بھی بھاری تھی۔

"وہ حالی کہہ رہی تھی کہ آپ مجھ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔" حریم نے نظر جھکا کر دھیرے سے وضاحت کی۔

"باتیں تو بہت سی کرنی ہیں۔ آپ نے کبھی سننے کی کوشش نہیں کی۔" زرجان نے سنبھل کر پھر سے گاڑی اسٹارٹ کی۔

"وہ تمہاری باتیں کیوں سنے۔ وہ کوئی بددیانت ہے۔" خاموشی نے بہت دور سے ہی تمسخرانہ انداز میں کہتے ہوئے ہانک لگائی۔

"اس کی دیانت اور وفا ہی تو پسند ہے۔" وہ زیر لب بڑبڑایا۔

"زرجان!" حریم نے بے چینی سے انگلیاں موڑیں۔

"پلیز! ذرا گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دیں۔ مجھے جلدی گھر پہنچنا ہے۔"

"آئی ایم سوری۔" زرجان نے خفیف سے انداز میں سر کو ذرا سی جنبش دی تھی پھر گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی۔

"ماہیر کو کمپنی چاچا بھجوا رہی تھی۔ مگر وہ جانا نہیں چاہتا تھا۔" ایسے ہی بات بڑھانے کی غرض سے زرجان نے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔

"جی ـــ" حریم نے نچلے لب کو دانتوں سے کچلتے ہوئے کہا۔

"آپ نے ہماری پریشانی کو سمجھا۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ ان حالات میں ماہیر گھر سے

دور نہیں جا سکتے۔ ہمارے گھریلو مسائل ہی ایسے ہیں۔"

"آپ کو بھی فنانشلی پرابلم ہو تو بلا جھجک مجھ سے کہیے گا۔ ویسے شکریہ کہہ کر مجھے شرمندہ مت کیا کریں۔ اور کزنز ہونے کے ناتے بھی آپ اپنی کوئی بھی پریشانی مجھ سے شیئر کر سکتی ہیں۔ میرے دل میں آپ کے لیے بہت عزت بہت احترام ہے حریم۔" محبت کہنے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ اس کے گمبھیر لہجے میں چھپی سچائی حریم تک پہنچ گئی تھی اور اس کا سر کچھ اور جھک گیا۔ پھر نہ جانے کتنا ہی وقت بیت گیا تھا جب زرجان کی آواز سنائی دی۔

"آپ کی منزل آ گئی ہے حریم۔"

"جی۔۔" حریم گویا نیند سے جاگی۔ زرجان گاڑی سے باہر نکل آیا تھا اور پھر دوسری طرف سے گھوم کر آتے ہوئے اس نے فرنٹ ڈور کھول دیا۔

"آپ اندر چلیے زرجان! امی سے بھی مل لیجیے۔" حریم کو موتا" کہنا پڑا۔

"پھر کبھی سہی۔ ابھی مجھے بھی کسی سے ملنا ہے۔" زرجان نے شائستگی سے انکار کر دیا تھا۔ اب وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ رہا تھا۔

"پوچھیں گی نہیں بھلا کس سے ملنا ہے؟"

"کس سے؟" حریم نے غائب دماغی سے پوچھا۔

"ماہیر عالم سے۔ کچھ دیر پہلے ماہیر کا میسج ملا ہے کہ اسے مجھ سے کچھ کام ہے۔ بخدا حریم! آپ کا اور ماہیر کا کوئی بھی کام میرے لیے بہت اہم ہوتا ہے اور اگر میرے ہی ہاتھوں پایہ تکمیل تک پہنچے تو میرے لیے اس سے بڑی کوئی خوشی نہیں۔" وہ گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔ مگر اس وقت تک گیا نہیں جب تک حریم گیٹ سے اندر نہیں چلی گئی۔ ابھی اس نے پہلے زینے پر قدم رکھا ہی تھا جب دھڑ دھڑ سیڑھیاں اترتا شاہنواز اس کے بالکل مقابل آ کھڑا ہوا۔

"جناب! آپ رات سے کہاں تھیں؟" بے تکلف تو وہ بلا کا تھا۔ خوش مزاجی کی بھی اسی پر انتہا ہو چکی تھی مگر حریم کو اس کی بے تکلفی ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ حریم کترا کر اس کے قریب سے گزر جانا چاہتی تھی مگر وہ بھی بلا کا ڈھیٹ تھا۔ اچھل کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ یوں کہ حریم محض دانت کچکچا کر رہ گئی۔

"میں نے رات کو اوپر ہی کھانا کھایا تھا۔ آپ نظر نہیں آئیں۔ خالہ جان کی طبیعت خراب تھی نا۔ میں اور ماہیر انہیں ہسپتال لے گئے تھے۔ بی پی شوٹ کر گیا تھا۔ عجیب بہکی بہکی باتیں کرنے لگی تھیں۔ تاہم آپ کو بھی خاصا "مس" کر رہی تھیں۔ لگتا ہے آپ ساس بہو کے روایتی تعلقات نہیں یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ کون ساس ہے جو اپنی بہو کو اتنی محبت سے یاد فرماتی ہے۔ آپ کی قسمت پر بے تحاشا رشک آیا تھا مجھے۔ خوب صورت ہم سفر' نازک مزاج گوری چٹی ساس اور ایک معصوم سا بھولا بھالا دیور۔ ایسی نیلی نیلی آنکھیں میں نے آج تک کسی کی نہیں دیکھیں۔" وہ نان اسٹاپ شروع ہو چکا تھا۔

"آئیے' میں آپ کو اوپر چھوڑ آتا ہوں۔" وہ اس کے کسی بھی جواب کا انتظار کیے بغیر بولتا ہوا اوپر چلا گیا تھا۔

وہ اوپر آئی تو شاہنواز بیگ صوفے پر رکھے اور شاپر اٹھائے کچن کی طرف جاتا ہوا نظر آیا۔ یقیناً" وہ جان چکا تھا کہ شاپر میں کھانے پینے کا سامان ہے۔ ویسے بھی اس کی سونگھنے کی حس خاصی تیز تھی۔ راحت بیگم تخت پر لیٹی تھیں۔ اسے آتا دیکھ کر بے تابی سے اٹھ بیٹھیں۔

"حریم! تم آ گئیں۔" انہیں گویا اسے سامنے دیکھ کر بھی یقین نہ آیا۔

"جی خالہ جان! حریم آ چکی ہے۔ آپ کے سامنے ہے۔ آپ خواب نہیں دیکھ رہیں۔" وہ بولتا ہوا کچن سے برآمد ہوا۔

"ارے' آپ کیوں رو رہی ہیں۔" شاہنواز' خالہ جان کو حریم کا ہاتھ پکڑے دیکھ کر بری طرح سے چونکا۔

"کیا ہوا ہے؟"

"تم تو چپ کرو۔" حریم خود بھی رو پڑی تھی۔ سن کے ہی وہ سمجھ چکی تھی کہ یہ آنسو راحت بیگم کی آنکھوں سے کیوں گر رہے ہیں۔ شاید بھرم ٹوٹ

جانے کی وجہ سے یا اس راز سے پردہ اٹھ جانے کی وجہ سے جو کبھی بھی راز نہیں رہ سکتا تھا یا پھر حریم کی آنکھوں میں معاذ کے لیے نفرت کی تحریر کے خوف کی وجہ سے۔

نہ جانے کیوں انہیں وہم سا ہو گیا تھا کہ اب حریم کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی۔ کسی ایسے خاندان میں جس کی ہر نسل میں کوئی نہ کوئی معذور ضرور ہوتا ہے اور لوگ ایسے خاندان میں رشتہ کرنے سے گھبراتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی ماہیر عالم کے لیے رشتوں کی ایک لائن لگ گئی تھی۔ پھر بھی راحت بیگم کے دل کو ایک دھڑکا سا لگا رہتا تھا کہ معاذ پر کوئی بھی انگلی نہ اٹھا لے۔

"میں کیسے چپ رہ سکتا ہوں۔۔۔ وہ خواتین میرے سامنے آنسو بہا رہی ہیں۔" شاہنواز جھنجلا کر آگے بڑھا۔

"خالہ جان! پلیز' نہ روئیے' ورنہ میں بھی رو دوں گا۔" اس نے جس مسخرے انداز میں کہا تھا۔ راحت بیگم روتے روتے ہنس پڑیں۔

"شاہنواز تم بھی نا۔۔۔ یہاں بیٹھو۔" انہوں نے اپنے پاس شاہنواز کے لیے جگہ بنائی۔ حریم حیران حیران سی اٹھ گئی تھی۔

"کمال ہے' ایک ہی رات میں ایسی بے تکلفی۔" وہ جتنا بھی حیران ہوتی کم تھا۔

"ان محترمہ کو حیرت کے سمندر میں سے نکالیے خالہ جان! انہیں بتائیں کہ ہمارا بچپن کا ساتھ ہے۔" وہ پکی سہیلیوں کی طرح ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھے کہہ رہا تھا۔

"انہیں یہ بھی بتائیے کہ ماہیر اور میں ایک زمانے میں دوست ہوا کرتے تھے مگر میرے جھوٹ بولنے سے بے زار ہو کر ماہیر نے مجھ سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ کیونکہ میرے جتنے جھوٹ کبھی کوئی بول نہیں سکتا۔" اس نے بڑے تفاخر کے عالم میں بتایا۔ حریم اس کی بونگیاں سنے بغیر کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اس وقت چائے کی شدید طلب محسوس ہو رہی تھی۔ سر میں بھی درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ سو وہ چائے بنانے کے لیے کچن میں آ گئی۔ مگر کچن کو دیکھ کر اسے چکر آ گیا۔ وہ اس کے پیچھے ہی کچن میں آ گیا۔ راحت بیگم شاید نماز پڑھنے کے لیے اٹھ گئی تھیں۔

"تم سناؤ' تمہیے امن و امان قائم و دائم ہے؟" حریم نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔

"کچھ نہ پوچھیے۔" شاہنواز نے آہ بھری۔

"کیوں؟ ثریا خالہ نے گھر سے نکالنے کی دھمکی تو نہیں دی؟" حریم کی حیرت بجا تھی۔

"ارے نہیں۔۔۔" شاہنواز موڑھا گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"تمہاری بیوی کی ڈیتھ کو کتنا عرصہ ہو چکا ہے؟" وہ جوش کھاتے پانی میں پتی ڈال کر فریج میں سے دودھ نکالنے لگی۔

"یہی کوئی بیس تیس سال۔" وہ بڑے اطمینان سے بولا۔

"اللہ' تمہارا گھر پھر سے آباد کرے۔" حریم نے تہہ دل سے دعا مانگی تھی۔ اس کی آنکھوں میں تشکر کی نمی جھلکنے لگی تھی۔ اس وقت اس کے اعصاب اس قدر تھکے ہوئے تھے کہ دل بالکل بھی کسی کام کی طرف نہیں لگ رہا تھا۔ کچن کے پھیلاوے سے سخت الجھن بھی ہو رہی تھی۔

"ایک دفعہ تو بسا نہیں' دوسری کی دعا دی جا رہی ہے۔" وہ معنی خیزی سے کہتا ہوا مہارت سے برتن دھوتا رہا۔

"کیا ابراڈ میں ڈش واشنگ پر مامور تھے؟" حریم نے جان بوجھ کر "شرارتا" پوچھا۔

"جناب! آپ کیا جانیں ہم کس حساس ادارے سے منسلک ہیں۔ بہرحال آپ جو بھی سمجھ لیں۔" اس کا انداز مبہم سا تھا۔

"کیا مطلب؟" حریم کچھ بھی نہیں۔

"اب آپ سے کیا چھپانا۔ خاکسار سفارت خانے سے منسلک رہا ہے۔۔۔ اب پاکستان میں پوسٹنگ کروائی ہے۔" شاہنواز کے انکشاف نے حریم کو چونکا دیا۔

"مگر میں نے تو سنا ہے۔ تم سرحد یا بلوچستان کے کسی علاقے میں پوسٹڈ تھے اور رباب سے بھی تمہاری وہیں ملاقات ہوئی تھی۔"

"آپ نے غلط سنا۔" اب وہ برتن اسٹینڈ پر ترتیب سے رکھ رہا تھا۔

"بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ میں نے شوشا چھوڑا تھا۔ حالانکہ پچھلے دو تین سال سے میں پاکستان میں رہا ہی نہیں ہوں۔ بلوچستان یا سرحد سے میرا کوئی تعلق نہیں۔"

"تو پھر وہ رباب والا قصہ۔"

"نرا جھوٹ تھا۔" اس کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا۔

"مگر تم نے جھوٹ بولا کیوں؟" حریم اب بھی حیران تھی بلکہ وہ اسے سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی۔ مگر جو بھی تھا وہ ایک دلچسپ شخصیت رکھنے والا انسان تھا۔

"اماں کو تپانے کے لیے۔" اب وہ اپنے ہاتھ شرٹ سے پونچھ رہا تھا۔ حریم کو بے تحاشا ہنسی آنے لگی۔

"تم بھی شاہنواز! کمال کے بندے ہو۔"

"کمال' جمال' دھمال۔۔۔ سارا کچھ میں ہی تو ہوں۔ اب آپ آرام کیجیے میں چلتا ہوں۔ رات کو آؤں گا' جب ماہیر گھر آ گیا۔ کھانا نیچے بھجوا دیجیے گا۔ لگتا ہے' آپ کے میکے والوں کے ہاتھ میں بھی بہت ذائقہ ہے۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔ ویسے ایک محاورہ یاد آ رہا ہے۔ جاتے جاتے سنا ہی دیتا ہوں۔" وہ دروازے تک جا چکا تھا۔ پھر پلٹ کر واپس آ گیا۔ حریم جو ابھی تک سر جھٹکتے ہوئے ہنس رہی تھی۔ اسے واپس آتا دیکھ کر اس کا قہقہہ چھوٹ گیا۔ وہ بھی مزاجاً ماہیر جیسی تھی۔ بہت کم کسی سے بے تکلف ہوتی تھی اور بہت کم کسی کے سامنے ہنستی تھی مگر شاہنواز میں کچھ تو خاص تھا۔ سب سے الگ وہ ایک ہمدرد' مخلص اور دوستانہ مزاج رکھنے والا آدمی تھا اور اس کی کمپنی میں کوئی بندہ بور ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

"کون سا محاورہ۔" حریم نے ہنسی روک کر پوچھا۔

"وہ مرد ہی کیا جو کمائے نا۔۔۔ اور وہ عورت ہی کیا جو پکائے نا۔۔۔ یہ خالصتاً میرا ذاتی محاورہ ہے اور ایک راز کی بات بتاؤں۔ میرے گھر کے دونوں افراد پر فٹ ہوتا ہے۔ یعنی بیگ صاحب' والد محترم اور ثریا جہاں' والدہ محترمہ پر۔" وہ مسکراتا گنگناتا پلٹ گیا تھا اور حریم نے ہنستے ہوئے اپنا سر تھام لیا۔

"اے حریم! تمہیں کیا ہوا۔ اکیلے ہنسے جا رہی ہو۔" راحت بیگم نماز پڑھ کر واپس آئیں تو حریم کو تنہا بیٹھے ہنستا دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔ ان کا ٹھٹکنا بھی بجا تھا۔ کمال تو حریم کے لبوں پر مسکان کا شگوفہ بھی جمعے کے جمعے پھوٹتا تھا اور اس وقت وہ بغیر وجہ کے ہنسے جا رہی تھی۔ حریم کی ہنسی کو انہیں دیکھ کر بریک لگ گئے۔

"کچھ بھی تو نہیں۔" وہ گڑبڑا کر چائے کے کپ پر جھک گئی۔ مسکان خودبخود سمٹ کر رہ گئی تھی۔

"لو جی میں نے یہ تو نہیں کہا۔ تم ہنسنا ہی چھوڑ دو۔ رج رج کے ہنسو اس گھر میں تو ویسے ہی رونے پڑے ہوئے ہیں۔ تم تو ہر روز مسکرایا کرو۔ ہمارے دل کو بھی خوشی ہو۔" وہ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے اپنے مخصوص تخت پر بیٹھ گئیں۔ ان کا لہجہ گہرا طنزیہ کاٹ دار قسم کا تھا۔ حریم سن سی ہو کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

پی سی کا طلسماتی ماحول اور بیک گراؤنڈ میں بجتے میوزک نے اک طلسم سا طاری کر دیا تھا۔ کینڈلز کی مدھم مدھم روشنی میں کپلز کے لیے بڑا رومینٹک ماحول بنایا گیا تھا۔ کانچ کی دیواریں اور چکنا فرش جس پر ویٹر سج سج قدموں سے چل رہے تھے۔ گلاس ونڈو کے پار بھی زندگی رواں دواں تھی۔

ماہیر نے تیسری مرتبہ رسٹ واچ پر چپکے سے نظر ڈالی۔ اسے گھر جانے کی جلدی تھی۔ بلکہ اسے حریم کو گھر لانے کی جلدی تھی۔ اسے یقین تھا کہ حریم اس کا انتظار کر رہی ہو گی۔ اسے اپنے رات کے رویے پر بھی پشیمانی تھی۔ سو وہ گھر کی طرف دوڑ لگا دینا چاہتا تھا مگر مجبوری نے گویا قدم تھام رکھے تھے۔ اس نے زرجان سے وقت لے رکھا تھا اور ابھی وہ زرجان کے

انتظار میں بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے ہر صورت آج زرجان سے بیچ والے معاملے پر بات کرنا تھی۔

"سوری ماہیر! تمہیں بلاوجہ انتظار کرنا پڑا۔" وہ اپنے دھیان گم تھا جب اسے زرجان کی فریش فریش آواز سنائی دی۔ وہ اپنی گاڑی کی چابی اور موبائل گلاس ٹیبل پر رکھ رہا تھا۔ ماہیر سے پرجوش انداز میں مصافحہ کرنے کے بعد وہ اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

"دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔" ماہیر نے شائستگی کے ساتھ اس کی معذرت قبول کرلی۔

"ایکچولی! دوسرے روٹ سے آ رہا ہوں۔ اسی لیے کچھ لیٹ ہو گیا اور ٹریفک کا حال تو تم بھی روز ہی دیکھتے ہو۔" زرجان کا انداز بہت دوستانہ تھا۔

"ویسے میں تایا جی کی طرف سے آ رہا ہوں۔"

"اچھا۔" ماہیر اب کے کچھ چونک گیا۔

"تمہیں تو پتا ہے۔ تائی بغیر چائے کے آنے نہیں دیتی۔ بس وہیں کچھ لیٹ ہو گیا تھا۔ واپسی پر حریم کو بھی ڈراپ کرنا تھا۔" اب وہ ویٹر کو اشارے سے بلاتا ہوا کہہ رہا تھا۔

"حریم گھر آ گئی ہے؟" ماہیر پھر سے چونکا۔

"ہاں تائی نے کہا تھا۔ حریم کو تمہارے گھر چھوڑ دوں۔" ویٹر قریب آیا تو زرجان اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"کیا خیال کھانا منگوا لوں۔"

"نہیں کھانا تو بالکل نہیں۔۔۔ ویسے میں کافی پی چکا ہوں۔" ماہیر کو اب گھر جانے کی بے چینی نے گھیر لیا۔

"اوکے بھوک تو مجھے بھی نہیں۔ ایک کپ چائے لیتے ہیں۔" زرجان نے تائیدی انداز میں سر ہلا کر ویٹر کو آرڈر نوٹ کروا دیا۔

"اب بتاؤ۔" زرجان' ماہیر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ماہیر نے مختصراً الفاظ میں اپنا مسئلہ بمعہ گھریلو مسائل اس کے گوش گزار کر دیا تھا۔ وہ اپنی پریشانیاں کبھی کسی سے شیئر نہیں کرتا تھا مگر زرجان میں خلوص کی خوشبو اسے نظر آنے لگی تھی۔ اسی خلوص کے پیش نظر وہ اپنے مسائل کا حل اس سے چاہ رہا تھا۔

"خواجہ کے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے؟" زرجان کچھ الجھ گیا۔

"میرا خیال ہے کہ کمپنی مجھے ٹرمینیٹ کر دے گی۔ اس سے پہلے میں استعفیٰ دے دوں؟ کیا یہ بہتر نہیں۔" وہ ایک پرخلوص دوست سے مشورہ مانگ رہا تھا۔ زرجان کی پیشانی پر سلوٹ نمودار ہوئی۔

"کیا تم کراچی نہیں جا سکتے؟ پروموشن کے ساتھ ساتھ فسیلٹیز بھی بے شمار ملیں گی۔ کیا یہ ممکن نہیں؟"

"نہیں۔۔۔ کبھی نہیں۔" ماہیر نے نفی میں سر ہلایا۔

"اوکے میں کچھ کرتا ہوں یو ڈونٹ وری۔" وہ اس کا شانہ تھپک کر بولا۔

"اور آپ سنائیں کب ولیمہ کا فنکشن کر رہے ہیں۔" ماہیر ایک دم ہلکا پھلکا ہو گیا۔

"پہلے تو آپ' جناب کو گولی مارو۔ مجھے یہ فارمل گفتگو ہضم نہیں ہوگی اور رہی بات ولیمہ کی تو کبھی نہ کبھی اس کی باری بھی آ ہی جائے گی۔" زرجان دھیرے سے مسکرا دیا۔ گفتگو خودبخود بے تکلفی میں ڈھل گئی تھی۔

"یعنی شادی' ترجیحات میں سب سے آخری نمبر پر ہے۔" ویٹر چائے کے ساتھ اسنیکس وغیرہ سرو کر گیا تھا۔ ماہیر نے چائے کے سپ لیتے ہوئے دلچسپی سے پوچھا۔

"بس یہی سمجھ لو۔" زرجان کا انداز مبہم سا تھا۔

"تمہیں یاد ہے زرجان! ہماری پہلی ملاقات۔" ماہیر نے ماضی کی کسی یاد کو لفظوں کا پیراہن پہنایا۔

"وہ ملاقات بھولنے والی بھی نہیں۔" زرجان کو بھی نہ جانے کیا کچھ یاد آ گیا۔

"تب سے خواجہ انڈسٹریز سے منسلک ہوں۔"

"مجھے پتا ہے۔ امجد کی کمپنی کس کس ستون پر کھڑی ہے۔" زرجان کا لہجہ امجد کے نام پر کچھ روکھا سا ہو گیا۔

"میرے پاس اس کے علاوہ بھی آپشن موجود ہے۔" ماہیر' زرجان کو اس آپشن کی تفصیلات بتا رہا تھا۔

"ہوں۔۔۔ ابھی مجھے اسجد کی نیت کو سمجھ لینے دو۔ پھر اس آپشن پر بھی غور کرلیں گے۔ اگر تم پارٹ ٹائم جاب کرنا چاہتے ہو تو یہ بہترین آئیڈیا ہے۔ ویسے ایک آفر تو میں بھی تمہیں دیتا ہوں۔" زرجان اسے اپنی آفر کے متعلق بتانے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ ماہیر اس کی کمپنی کو جوائن کرلے۔

"خواجہ اسجد ایک مطلب پرست آدمی ہے۔ بغیر کسی بڑے فائدے کے وہ کچھ بھی ایسا ویسا نہیں کر سکتا۔ جس کی وجہ سے اسے نقصان اٹھانا پڑے۔ مگر میں حیران اس بات پر ہوں کہ بھلا میری ذات سے خواجہ کو کیا فائدہ حاصل ہوگا۔" ماہیر کا انداز پرسوچ تھا۔

"اس گتھی کو سلجھانا ناگزیر ہو گیا ہے۔" زرجان نے چائے کا ایک اور کپ منگوا لیا۔

"تم لو گے ماہیر؟"

"نہیں میں چائے کا ایسا بھی شوقین نہیں ہوں۔" ماہیر نے دونوں ہاتھ اٹھا کر زرجان کو منع کیا تھا۔ اور وہ اس کے منع کرنے کے باوجود آرڈر نوٹ کروا چکا تھا۔

"حریم اور حانی لیٹر کے حساب سے چائے پیتی ہیں۔" ماہیر نے چائے کے ایک اور فل سائز مگ کو دیکھ کر کہا۔

"میں جانتا ہوں۔ اگر تایا جی کے گھر ایک گھنٹے کے لیے جاؤں تو کم از کم چار دفعہ تو چائے میں حانی کا ساتھ دینا پڑتا ہے۔" زرجان نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

"یاد آیا۔ حانی کی انگیجمنٹ کے فنکشن میں تم نہیں آئے؟" ماہیر نے ایسے ہی بات بڑھانے کی غرض سے پوچھ لیا۔

"کچھ پرسنل کام تھا' سو اس لیے۔" زرجان کے موبائل کی بپ بج اٹھی تھی۔ وہ چند منٹ کے لیے موبائل پر مصروف ہو گیا۔

"ہنی! مسئلہ کیا ہے؟" زرجان کی آواز میں تفکر نمایاں تھا۔ دوسری طرف شاید کوئی رو رہا تھا۔

"میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گی۔ آپ چاہتے ہیں میں مر جاؤں۔ تو پھر ایک ہی دفعہ مجھے زہر لا دیں۔" موبائل میں سے کسی کی چنگھاڑتی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"ہنی! کول ڈاؤن' میری گڑیا۔" زرجان نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر اس کی بات کاٹ دی گئی تھی۔

"میں کچھ نہیں سمجھ سکتی۔ یہ کالے پانی کی سزا کب ختم ہوگی۔ ممی سے کہہ دیں مجھے ہر صورت پاکستان آنا ہے۔" وہ ضدی لہجے میں چلا رہی تھی۔

"اوکے' آئی ڈو سم تھنکنگ' یو ڈونٹ وری۔" زرجان کا انداز صاف تسلی دینے والا تھا۔

"آپ کچھ نہیں کر سکتے زرجان! آپ میں سے کسی کو میرا خیال نہیں۔ مجھ سے محبت نہیں۔" وہ سخت مشتعل ہی نہیں متنفر بھی تھی۔

"ہنی! تم ریلیکس کرو۔ پلیز! خود کو سنبھالو۔ میں کچھ کرتا ہوں۔" زرجان نے بمشکل اسے سمجھا کر کال ڈسکنیکٹ کی تھی۔ اس کے چہرے پر تفکر کے سائے لہرا رہے تھے۔

"کچھ مسئلہ ہے زرجان۔" ماہیر سامنے سے آتے ویٹر کو پے منٹ کی رقم دیتے ہوئے بولا۔ اگرچہ زرجان نے منع کرنا چاہا تھا مگر ماہیر نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

اب وہ دونوں ایک ساتھ انٹر ڈور سے باہر نکل رہے تھے۔ سیکنڈ فلور کی سیڑھیاں اترتی محترمہ فلک ناز کے قدم گویا زمین نے جکڑ لیے۔ وہ آج ایک فنکشن میں شرکت کی غرض سے آئی تھیں اور انہوں نے زرجان کو بھی اس فنکشن کے بارے میں بتایا تھا اور زرجان نے حسب معمول انکار کر دیا۔ مگر اس وقت زرجان کو کسی خوش پوش نوجوان کے ساتھ دیکھ کر وہ بری طرح سے ٹھٹک گئیں۔

"زرجان کے ساتھ کون ہے؟" ان کا ذہن تیزی سے سوچ و بچار کے عمل سے گزر رہا تھا۔ مگر یادداشت کے کسی خانے میں یہ یونانی نقوش والا چہرہ نہیں تھا۔

"یہ نوجوان کون ہے؟ جسے میں نہیں جانتی۔" اب وہ زرجان کے سرکل اور فرینڈز کی لسٹ کو کھنگال رہی تھیں۔ جواب اب بھی ندارد۔

"وضع قطع سے ویل مینرڈ لگتا ہے۔ زرجان کی چوائس ہمیشہ سے اعلا رہی ہے۔" اب وہ آخری اسٹیپ پر کھڑی زرجان کے اعلا معیار کو سراہ رہی تھیں۔ وہ ہر معاملے میں چوزی رہا تھا۔ چاہے وہ فیلڈ کا انتخاب تھا یا دوستوں کا اور چاہے لائف پارٹنر کا۔ وہ اپنے معیار سے ایک انچ بھی نیچے نہیں آسکتا تھا۔

"بہرحال مجھے اس کے بارے میں معلومات تو لینا ہوں گی۔" وہ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے آخری اسٹیپ اتر گئی تھیں۔

☆☆☆
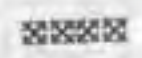
"حریم!" کسی نے بہت پیار سے اسے پکارا تھا۔

وہ اتنی گہری نیند میں تھی کہ اس کی سماعتوں نے اس پکار کو سنا ہی نہیں۔ ویسے بھی گیارہ بجے تک ماہیر کا انتظار کرنے کے بعد وہ اس حد تک تھک چکی تھی کہ مزید انتظار کی سکت تک نہیں تھی۔ وہ ٹیبل پر کھانا لگائے خود جلے پیر کی بلی کی طرح لاؤنج میں چکر کاٹتے اور گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے شل ٹانگوں کے ساتھ تخت پر ڈھے گئی تھی اور پھر نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ نیند کا ایسا غلبہ تھا کہ اپنے گالوں اور شانے پر کسی کا لمس محسوس کرنے کے باوجود اس کے وجود میں ذرہ بھر جنبش نہیں ہوئی تھی۔ اسے نیند کی حالت میں یوں محسوس ہو رہا تھا گویا کوئی اسے بہت دور سے پکار رہا ہے۔ یہ آواز کس کی تھی؟ یہ پہچاننا بہت مشکل امر لگ رہا تھا۔ وقفے وقفے سے آتی اس آواز نے بالآخر اس کی گہری نیند میں پہلی دراڑ ڈال دی تھی۔ اس نے بمشکل بند پلکوں کو کھول کر دیکھنے کی کوشش کی تھی مگر نیند تھی کہ آج ہی گویا ٹوٹ کر آئی تھی۔ اس نے پھر سے کوشش کر کے آنکھ کو کھولنا چاہا۔ اب کے واضح طور پر اس نے محسوس کیا تھا کہ کوئی وجود اس کے اوپر تھوڑا سا جھکا ہوا ہے اور اسے جگانے کی کوشش بھی کر رہا ہے۔ اس نے اپنی پیشانی پر کسی کی زندہ گرم سانسیں بھی محسوس کی تھیں' تبھی تو جھٹ سے اس کی دونوں آنکھیں کھل گئیں۔

"ماہیر۔" اس کی گھٹی گھٹی چیخ حلق سے برآمد ہوئی۔

"آپ کب آئے ہیں؟"

"ابھی' کچھ دیر پہلے۔ تم یہاں کیوں سو رہی ہو؟" ماہیر اس کے قریب ہی تخت پر بیٹھ گیا۔

"کیا ڈر گئی تھیں؟"

"آپ نے ڈرانے میں کوئی کسر چھوڑی ہے۔" وہ دھک دھک کرتے دل کو سنبھالتے ہوئے خفگی سے بولی۔

"میں تو اتنے پیار سے جگا رہا تھا۔" ماہیر نے جھک کر جوتوں کے تسمے کھولے۔ جرابیں اتار کر صوفے پر پھینکیں۔ ٹائی کی ناٹ کھول کر اپنے گریبان سے کھینچ کر حریم کے گلے کے گرد لپیٹ دی۔

"میری تو جان نکال کر رکھ دی ہے۔ دل ابھی تک دھڑک رہا ہے۔" حریم نے بکھرے بال سمیٹ کر دائیں کندھے پر ڈال لیے۔

"دکھاؤ ذرا۔" وہ ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا۔

"کیا دکھاؤں۔" اس نے جماہی روک کر پانی سے بھری آنکھوں کو مسلا۔

"اپنے دل کو۔"

"وہ تو آپ کے پاس ہے۔" حریم برجستہ بولی۔

"تو پھر ڈرنا چھوڑ دو۔" وہ محبت پاش نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ سوئی سوئی آنکھوں میں نیند کی گلابیاں لیے وہ سیدھا ماہیر کے دل میں اتر گئی۔ اس کا نازک سا ہاتھ ماہیر کے ہاتھ کے نیچے دبا تھا۔ وہ دائیں بائیں دیکھتے ہوئے ڈوپٹہ تلاش رہی تھی اور ڈوپٹہ پھیلاتے ہوئے اٹھ گئی۔ وہ اسے اٹھتا دیکھ کر خود بھی اٹھ گیا۔

"آپ ذرا بتائیے مجھے۔ کہاں آوارہ گردی کر رہے تھے۔" حریم سیدھی کچن میں چلی آئی۔ ماہیر بھی اس کے پیچھے تھا۔

"کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

"نہیں؟" حریم حیران ہوئی۔

"کیا تم نے بھی نہیں کھایا۔" ماہیر نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے ایسی کوئی مجبوری بھی نہیں تھی کہ گیارہ بجے تک بھوکی رہتی۔" وہ ناراضی سے گویا ہوئی۔

"تو ٹھیک کیا ہے نا۔ تمہیں وقت پر خوراک لینی چاہیے۔ اب ایسا کرو، میرے لیے ایک گلاس دودھ لے آؤ۔"

وہ کھٹا کھٹ لاؤنج کی لائٹس آف کر رہا تھا۔

"آج آفس کا کام بھی ساتھ اٹھا لائے ہیں۔" وہ سالن فریج میں محفوظ کر رہی تھی۔ پھر دودھ کا جگ اٹھا کر باہر نکل آئی۔

"میری مجال ہے۔ جو فائلیں اٹھا کر گھر لے آؤں۔" ماہیر نے ڈرنے کی بھرپور ایکٹنگ کی۔ وہ آگے پیچھے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ ماہیر نے کمرے کی لائٹ آن کی۔

"امی سو گئی ہیں؟" ماہیر نائٹ سوٹ اٹھاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ مولی کا ذکر اس نے دانستہ نظر انداز کر دیا۔ وہ کپڑے چینج کر کے باہر آیا تو حریم نے خود ہی مولی کا ذکر چھیڑ دیا۔

"مولی آپ کا پوچھ رہا تھا۔"

"اچھا۔" ماہیر نے گریبان کے بٹن بند کرتے ہوئے نظر چرا لی تھی۔ وہ دانستہ مولی کے موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ شاید یہ ان کی زندگیوں کا سب سے کمزور ترین پہلو تھا۔

"میں آپ سے ناراض ہوں ماہیر۔" وہ اس کی دلی کیفیات سے پوری طرح سے آگاہ تھی اور وہ ماہیر کو شرمندہ کرنا یا اس کا سر جھکانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ مولی پر کسی بھی قسم کی چوٹ کر کے ماہیر کی دل آزاری کا بھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

"میں جانتا ہوں۔" وہ بغیر اس کی طرف دیکھے بولا۔

"بھلا کیسے؟" حریم بری طرح سے حیران ہوئی۔

"ہم کسی اور موضوع پر بات نہیں کر سکتے۔" ماہیر کا لہجہ التجائیہ قسم کا تھا۔

"میں مولی کا ٹاپک ڈسکس نہیں کرنا چاہتا حریم مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمہاری ناراضی کا تعلق بھی کل رات کے اس منظر سے جڑا ہے اور میں اس منظر کو اپنے ذہن کی سلیٹ سے کھرچ دینا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کل رات تمہیں نظر انداز کر کے میں واپس چلا آیا تھا مگر تم میری اس وقت کی کیفیت کو سمجھ نہیں سکتیں حریم! اگر میں کچھ دیر مزید وہاں رکتا تو میرے دل کی شریان پھٹ جاتی۔"

"میں سب سمجھتی ہوں ماہیر! مگر اس میں آپ کا، ہم میں سے کسی بھی فرد کا بھلا کیا قصور ہے۔ یہ خالصتاً اللہ کا معاملہ ہے اور ہم اس کے کسی بھی معاملے میں بولنے والے کون ہوتے ہیں۔ وہ جس طرح سے چاہے اپنے بندوں میں سے اپنی مرضی کے مطابق جس فطرت پر بھی تخلیق کرے۔ چاہے کسی کو مرد بنائے، چاہے عورت بنائے اور چاہے تو ان دونوں کے درمیان معلق کر دے۔ یہ سب اس کی قدرت کے کرشمے ہیں۔ وہ اپنی وحدانیت کے جلوے ہر طریقے سے دکھاتا ہے۔ جہاں دنیا کا ہر علم اور میڈیکل سائنس تک بے بس ہو جاتی ہے وہاں سے اس کی کاریگری کا آغاز ہوتا ہے۔ انسان زمین کے اندر اتر گیا ہے۔ سمندروں تک رسائی کر لی ہے۔ چاند پر پہنچ گیا ہے۔ پہاڑوں کے سینے تک شق کر دیے ہیں۔ دنیائے طب میں اپنے ہر کمال کو آزما چکا ہے۔ حتیٰ کہ ماں کے پیٹ میں موجود اس راز تک کو پا چکا ہے جسے سات پردوں میں چھپا کر رکھا گیا ہے۔ مگر کوئی بھی شخص اس کی بنائی گئی کسی چیز کی تخلیق میں ذرہ بھر رد و بدل نہیں کر سکتا۔ تو پھر اللہ کی بنائی کسی نعمت پر شرمندگی کیسی؟ آپ کو تو فخر ہونا چاہیے کہ آزمائش کے لیے اللہ نے آپ کے گھر کا انتخاب کیا تھا۔ آپ کی ماں کا انتخاب کیا۔" وہ اس کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھے بڑے ہی ٹھہرے رواں لہجے میں کہہ رہی تھی۔ یوں کہ اس کا لفظ لفظ ماہیر کے دل میں اتر رہا تھا۔ اس کے جلتے بلتے دل پر گویا ٹھنڈی پھوار گرنے لگی۔

"مگر حریم اس دنیا کا مقابلہ کرنا بہت مشکل ہے۔"

ماہیر کے لہجے میں پہلے جیسی آزردگی نہیں تھی۔ یہ میٹھے نرم اور رسیلے بول بھی کیسا اثر رکھتے تھے۔ ماہیر کے چہرے پر شگفتگی سی پھیل گئی۔

"دنیا کی پروا کریں گے تو پھر ہو چکا گزارا۔" وہ ہلکے پھلکے لہجے میں گویا ہوئی۔

"دنیا کی نہیں، مجھے تمہاری طرف سے کسی شدید رد عمل کی توقع تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ شاید تم ___" وہ بات ادھوری چھوڑ کر حریم کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا یہ چہرہ آج بھی بہت معصوم اور سادہ تھا۔

"آپ نے میرے بارے میں ایسا سوچا بھی کیسے؟" وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔

"گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔" ماہیر نے اس کے دونوں کان پکڑ لیے۔

"کیا یاد کریں گے جائیں معاف کیا۔" وہ شان بے نیازی سے بولی۔

"جائیں کہاں ___ آپ کو چھوڑ کر بھلا کہاں جا سکتا ہوں۔" ماہیر کی آنکھوں میں جذبوں کا خمار چھلکنے لگا۔

"تم نے پوچھا نہیں کل کی رات میری تمہارے بغیر کیسی گزری؟"

"ٹوٹ کر سوئے ہوں گے۔" اس نے آنکھوں میں شرارت بھر کے کہا۔

"جناب! رات بھر میں جاگتا رہا تھا۔ صبح کے قریب آنکھ لگی تھی۔ اسی لیے دفتر سے بھی لیٹ ہو گیا۔" ماہیر نے اسے بازوؤں کے حلقے میں لے کر بھینچ لیا۔

"اور پھر آپ بغیر ناشتے کے آفس سدھارے۔" حریم نے ایک سرور آمیز کیفیت کے زیر اثر آنکھیں موند لی تھیں۔ اک تحفظ کا گہرا احساس اس کے ارد گرد پھیل گیا۔

"تمہیں کیسے خبر ہوئی۔" ماہیر چونکا۔

"آپ کے دل کی طرح معدے کا کنکشن بھی میرے معدے سے جڑا ہوا ہے۔" حریم نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔

"یہ بات تو ماننے والی ہے۔" ماہیر اس کے چہرے پر جھک گیا۔

"کیا خیال ہے کچھ دیر سو نہ لیا جائے۔" وہ بھرپور شریر نظروں سے دیکھتا ہوا اسے چھیڑنے لگا۔

"منہ دھو رکھیے مجھے نیند آ رہی ہے۔" حریم نے چادر اٹھا کر اپنے اوپر تان لی۔

"اور مجھے بھی ___" وہ اس کی چادر میں برابر کا حصہ دار بن کر اس کے کان میں گنگنایا تھا اور حریم کی زعفرانی ہنسی نے ارد گرد کے ماحول کو بھی زعفران زار کر دیا۔

☼ ☼ ☼

عمارت کا بیرونی حصہ جس قدر شاندار تھا اندرونی حصہ اس سے بھی زیادہ خوب صورت اور ویل ڈیکوریٹڈ۔ آج سے دو دن پہلے اس نے ایک معروف اخبار میں اشتہار پڑھا تھا۔ ایک بہت اچھی ساکھ رکھنے والی کمپنی کی طرف سے ایڈ دیا گیا تھا۔ اگرچہ ایڈ تو پرسنل اسسٹنٹ کا دیا گیا تھا اور ڈیمانڈز بھی ایسی نہیں تھیں جس کا شیڈول کچھ ٹف ہوتا۔ اور کوالیفکیشن کی جو ڈیمانڈ تھی۔ اس پر بھی وہ پورا اترتی تھی۔ سو بے کار رہنے سے بہتر تھا وہ خود کو مصروف رکھتی۔ کم از کم سیل کے آنے تک تو وہ ان تکلیف دہ بے معنی سوچوں سے محفوظ رہ سکتی تھی۔ اسی کے ساتھ طویل بحث و مباحثہ کے بعد اسے انٹرویو دینے کی اجازت ملی تھی۔ جس کے نتیجے میں آج وہ اس شاندار کمپنی کے ویٹنگ روم میں بیٹھی اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔

انٹرویو کا سلسلہ تو شروع ہو چکا تھا۔ مگر عفیفا کا نمبر ابھی تک دور تھا۔

جب تک اس کی باری آئی تھی۔ تب تک اس کے اپنے بھی بارہ بج چکے تھے۔ وہ اکتا کر اب واپس جانے والی تھی جب اس کے نام کو بھی پکارا گیا۔ ویسے بھی اس کی سی وی اندر بھجوائی جا چکی تھی۔ اب اسے ہر صورت انٹرویو دینا تھا۔

باقی آئندہ شمارے میں

رمشا خالد

"کون پاگل کہتا ہے لڑکا اکلوتا ہونا چاہیے چھوٹی فیملی لڑکی کو بیاہنے کے لیے مثالی ہوتی ہے ہونہہ اگر میری حالت دیکھ لیں وہ سب کزنز جو میری شادی پر جل کر کوئلہ ہوئی جارہی تھیں تو ان کے کلیجوں میں ٹھنڈ پڑ جائے اور ہر لڑکی اکلوتے لڑکے پر کسی رنڈوے کو ترجیح دے۔" جل کر یہ سب سوچتے ہوئے وہ اپنی بے بسی اور جھنجلاہٹ آٹے پر مکوں کی برسات کرکے نکال رہی تھی۔ ابھی ابھی اس کی ساس اسے کیا کچھ سنا کے گئی تھیں۔ اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ بے وقت نہانے کیوں چلی گئی کیونکہ اس کی غیر موجودگی میں سبزی والے سے سبزی مجبوراً انہیں لینی پڑی تھی۔

آٹا گوندھنے کے بعد وہ سبزی بنانے لگی' سبزی کی خوشبو اور مسلسل گرمی میں چولہے کے پاس کھڑے رہنے سے طبیعت الگ خراب ہو رہی تھی دل جیسے ڈوبا جارہا تھا ابھی کچن کی صفائی بھی کرنی تھی رائتہ اور سلاد بنانا باقی تھا مگر قدموں نے مزید اس کا بوجھ اٹھانے سے انکار کردیا تھا وہ بمشکل چکراتے سر کو سنبھال کر لڑکھڑاتی ہوئی اپنے کمرے تک آئی اور بیڈ پر گرتے ہی غافل ہوگئی کتنی ہی دیر نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑی رہی تب کہیں جاکر طبیعت سنبھلی۔

"کیا ہوا تمہاری طبیعت تو تم ٹھیک تو ہونا۔" وہ تکیے میں منہ دیے کب کے رکے آنسو بہارہی تھی جب پُرتشویش آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی وہ جلدی سے اٹھ کر آنسو صاف کرنے لگی وہ سامنے ہی کھڑا تھا۔ وہ بغیر کچھ کہے اک زخمی سی نظر اس پر ڈال کر باہر چلی گئی۔ جہاں ڈھیروں کام اس کے منتظر تھے اس کے جانے کے بعد وہ کتنی دیر اس کی نظر کے زیر اثر پشیمان کھڑا رہا گھر میں جیسا سلوک اس سے ہوتا تھا وہ کوئی ڈھکا چھپا نہیں تھا مگر وہ بے بس تھا ماں کے سامنے آواز بلند کرنے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

نیلے آسمان پر براق بادلوں کی ٹکڑیاں تیر رہی تھیں کچھ دیر پہلے ہونے والی بارش نے کئی دنوں کا حبس اور گرمی کو سمیٹ لیا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے پھولوں اور درختوں سے اٹھکیلیاں کررہے تھے۔

سنجیدہ خاتون عصر پڑھ کر باہر آئیں کیاریوں میں سے اٹھتی مٹی اور پھولوں کی ملی جلی باس کو طویل سانس لے کر اپنے اندر اتارتے ہوئے چارپائی پر بیٹھ کر تسبیح کرنے لگیں۔ ہارون مرتضیٰ ابھی تک گھر نہیں آیا تھا۔ چائے کی طلب کے باوجود کچن میں جانے کو دل نہیں مان رہا تھا اس لیے بیٹھی رہیں۔

"آؤ فہمیدہ آؤ۔ بڑے دنوں بعد آئیں۔" پڑوسن کو آتا دیکھ کر وہ کھل اٹھیں۔

ہارون صبح کا گیا شام کو واپس آتا تھا ایسے میں سارا دن خاموش در و دیوار کو تکتے وہ تنگ آجاتیں ملنے والوں کی آمد انہیں یونہی خوش کردیتی تھی۔

"گھر کے بکھیڑے کہیں آنے کی فرصت دیں تب نا' آج بھی بڑی مشکلوں سے وقت نکال کر آئی ہوں۔" سلام دعا کے بعد وہ ان کے قریب بیٹھ گئیں سنجیدہ خاتون ان کے منع کرنے کے باوجود چائے بنالائیں۔

"پچھلے دنوں رخسانہ کا بہت اچھا رشتہ آیا تھا خرم نے چھان بین بھی مکمل کرلی ہے سب ٹھیک ہے سوچتی ہوں ہاں کردوں خیر سے تیئیس کی ہوگئی ہے

میری بچی۔" چائے کی چسکیوں کے ساتھ وہ احوال دینے لگیں۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ اللہ نصیب اچھا کرے، پھر خرم کے متعلق کیا سوچا ہے۔"

"سوچتی ہوں رخسانہ کے ساتھ ہی اس کی بھی کروں، بیٹی جائے گی تو بہو آجائے گی گھر کی رونق بنی رہے گی۔

خرم نے تو سب کچھ مجھ پر چھوڑ رکھا ہے کوئی شرط مطالبہ نہیں کہتا ہے اماں جو آپ کی پسند وہی میری پسند۔" وہ بہت فخر سے بتانے لگیں۔

"پھر کوئی لڑکی دیکھی۔" وہ ان کی بات میں چھپے طنز کو دانستہ نظر انداز کر گئیں۔

"چند دنوں تک میرا گاؤں جانے کا ارادہ ہے میرے رشتے کے بھائی ادھر رہتے ہیں ان کی بچیاں بہت سادہ اور سلیقہ مند ہیں۔ اسکول کالج کا تو منہ تک نہیں دیکھا انہی میں سے کسی کو اپنی بہو بنانے کا ارادہ ہے۔ آج کل کی پڑھی لکھی لڑکیوں سے تو اللہ بچائے تعلیم کے نام جانے کون سی چالاکی ہوگی جو نہیں سیکھتیں، محلے میں ہی دیکھ لو جو تعلیم یافتہ لڑکی بہو بن کر آئی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے نہیں کہ شوہر کو لے کر ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا بیٹھی بھئی میرا تو ایک ہی بیٹا ہے میں تو باز آئی تعلیم یافتہ بہو لانے سے۔" وہ توبہ توبہ کرنے لگیں سنجیدہ خاتون پہلو بدل کر رہ گئیں۔

ہارون مرتضیٰ ان کا اکلوتا بیٹا تھا انتہائی لائق و فرماں بردار، اپنی شادی کا معاملہ بھی ان پر چھوڑ رکھا تھا بس اس کی صرف اتنی شرط تھی کہ لڑکی جیسی بھی ہو بس تعلیم یافتہ ہو، سنجیدہ خاتون نے انتہائی کوشش کرکے دیکھ لی تھی مگر انتہائی فرماں برداری کے باوجود وہ اس شرط سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ نہ جانے کیسی گھڑی تھی جب وہ اصغری سے اس بات کا ذکر کر بیٹھی تھیں، جو بات اس کے کانوں میں پڑی مانو سارے محلے نے سنی ضرور فہمیدہ کو بھی اس نے بتایا ہو گا وہ تب تک بیٹھی تعلیم یافتہ لڑکیوں کی برائیاں کرتی رہیں اور وہ پہلو بدل بدل کر سنتی رہیں، بہر حال، جو بھی تھا دل ہی دل میں سنجیدہ خاتون ان کی باتوں سے سو فیصد متفق تھیں۔

☼ ☼ ☼

سنجیدہ خاتون بہو تلاش کرنے کے سلسلے میں بہت پریشان تھیں رشتہ کروانے والیوں پر انہیں قطعاً" بھروسہ نہیں تھا۔ محلے اور خاندان کی سب لڑکیاں بھی دیکھی بھالی تھیں مگر وہ کسی سے مطمئن نہیں ہو پا رہی تھیں کوئی تعلیم کے معیار پر پوری نہیں اترتی تھی کوئی پڑھی لکھی ہوتی تو اس کی عادات و اطوار پسند نہیں آتے تھے۔ کوئی بہت زیادہ خوبصورت ہوتی تو کوئی کم روئی کی وجہ سے مسترد کر دی جاتی تھی۔ وہ ایسی بہو چاہتی تھیں جو خاندانی و اعلا تعلیم یافتہ ہو، کم گو ہو، نہ بہت زیادہ خوب صورت ہو، سیرت و کردار میں یکتا ہو، ایسی لڑکی تلاش کرنا مشکل ضرور تھا مگر ناممکن نہیں اور وہ جس کام کو کرنے کا ٹھان لیں اسے پایہ تکمیل تک نہ پہنچائیں ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا، بہت تلاش بسیار کے بعد ام ثمینہ کی صورت میں انہیں ان کا مطلوبہ گوہر نایاب مل ہی گیا۔ صاف گندمی رنگت اور موٹی موٹی آنکھوں والی ام ثمینہ انہیں پہلی نظر میں ہی پسند آگئی تھی۔

اس نے ایم اے اسلامیات کیا تھا۔ گویا ہارون کے معیار پر بھی پوری اترتی تھی سنجیدہ خاتون کی نظر میں اس میں سوائے اعلا تعلیم یافتہ ہونے کے کوئی خامی نہیں تھی۔ مگر چونکہ یہی خامی ہارون کی شرط تھی، اس لیے اسے برداشت کرنا ان کی مجبوری تھی۔ ام ثمینہ کے والد رضا صاحب ان کے مرحوم شوہر کے دور کے عزیزوں میں سے تھے۔ اس لیے ان کی خاندانی شرافت میں کوئی شبہ نہ تھا۔ انہوں نے رشتہ ڈالنے میں دیر نہ کی اور شادی کی تیاریاں شروع کر دیں، انہیں پورا یقین تھا رشتہ منظور ہونے میں بھی دیر نہیں لگے گی۔ آخر کو ہارون مرتضیٰ کی شرافت و قابلیت کا ایک زمانہ گواہ تھا، سو ان کا یقین کچھ بے جا بھی نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

"تو پھر کیا سوچا آپ نے سنجیدہ خاتون کا فون آیا تھا، وہ جواب لینے آنا چاہ رہی ہیں۔" ممتاز بیگم، رضا صاحب کو دودھ کا گلاس تھما کر ان کے پاس بیٹھ گئیں۔"

"تم نے ام ثمینہ سے پوچھا؟" وہ کوئی جواب دینے کی بجائے ان سے پوچھنے لگے۔

"ارے اس نے تو تصویر تک دیکھے بغیر مجھے واپس تھما دی، بولی اولاد کے لیے والدین سے بہتر بھی کوئی سوچ سکتا ہے، جو آپ کی مرضی وہ ہی میری خوشی ہم بہت خوش قسمت ہیں، جو ہمیں ایسی سعادت مند بیٹی ملی۔" ممتا کا مان ان کے لہجے میں رچا تھا۔

"واقعی۔" اس کا جواب جان کر رضا صاحب کا سر بھی فخر سے بلند ہو گیا۔

"ویسے اس کینیڈا والے رشتے کے لیے تو آپ انکار ہی سمجھیں، میرا دل اتنا بڑا نہیں کہ اکلوتی بیٹی کو سات سمندر پار بھیج دوں۔" رضا صاحب کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ ہاتھ اٹھا کر قطعیت سے بولیں۔

"ہوں۔" انہوں نے ہنکارا بھر کر گویا ان سے اتفاق کیا۔

"اور باقی دونوں رشتوں کے بارے میں کیا خیال ہے۔" ان کی چپ سے تنگ آکر انہوں نے پھر پوچھا۔ ام ثمینہ ان کی اکلوتی اولاد تھی، خوش شکل، تعلیم یافتہ اور اعلا سیرت۔ انہوں نے اپنی طرف سے اس کی تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ لاڈ پیار کے ساتھ ساتھ کڑی نگرانی بھی رکھی تھی، یہ ہی وجہ تھی کہ والدین کے پیار نے اسے بگاڑنے کی بجائے سنوارنے کا کام کیا تھا۔ جب سے اس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا بیسیوں رشتے آچکے تھے، پہلے تو اس کی کم عمری اور پڑھائی کا عذر تھا اب جبکہ وہ تعلیم مکمل کر چکی تھی وہ بے دلی سے اس کی شادی کا سوچ رہے تھے۔ وہ چونکہ اکلوتی تھی اس لیے اسے ملک یا شہر سے باہر بیاہنا نہیں چاہتے تھے، کئی اچھے رشتے صرف اسی وجہ سے مسترد کیے جا چکے تھے۔ دونوں میاں، بیوی رات گئے تک سوچ بچار کرتے رہے۔ قرعہ فال ہارون مرتضیٰ کے نام نکلا۔ اگرچہ انہوں نے سنجیدہ خاتون کی سخت مزاجی کے بارے میں سن رکھا تھا۔ مگر ہارون کی نیک سیرتی، اعلا نوکری اور اکلوتے پن کے آگے باقی سب انہیں بے معنی لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

ہارون مرتضیٰ آفس سے تھکا ہارا گھر لوٹا تو گھر مہمانوں سے بھرا تھا۔ سنجیدہ خاتون کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا، جب سے شادی کی تاریخ طے ہوئی تھی گہما گہمی کا یہ ہی عالم تھا کوئی آرہا ہے، تو کوئی جا رہا ہے، ان سب کی خاطر داری اکیلی سنجیدہ خاتون کے بس کی بات کہاں تھی، اس لیے اس نے انہیں تین فل ٹائم ملازماؤں کا بندوبست کر دیا تھا۔ اب وہ ہر فکر سے

بے نیاز تندہی سے بری کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ محلے والے بھی بہت تعاون کر رہے تھے۔ فہمیدہ کی بہو تاباں تو سب میں پیش پیش تھی۔ سیدھی سادی سی پڑھی تاباں کو دیکھ کر انہیں بار بار اپنی بہو کے تعلیم یافتہ ہونے کا قلق ہوتا تھا۔

"ہارون بیٹا! دیکھو تو یہ رنگ تمہاری دلہن پر کیسا لگے گا؟" وہ سب کو سلام کر کے کمرے میں جانے کے پر تول رہا تھا جب زرینہ آنٹی نے قرمزی رنگ کا خوب صورت جھلملاتا دوپٹہ اس کے سامنے لہرایا۔

"جی میں کیا کہہ سکتا ہوں؟" اتنی ساری خواتین کے درمیان وہ قدرے کنفیوز ہو گیا۔

"ارے بیٹا جی یوں کہو اسے یہ سوٹ پہن کر دیکھے بنا کیا کہہ سکتا ہوں' ورنہ جب وہ یہ پہنے گی تب تو تمہی قصیدے اس کی مدح میں کہو گے۔" کسی طرف سے شوخ سی آواز آئی تو تمام خواتین کا مشترکہ قہقہہ بلند ہوا۔ وہ جھینپ گیا۔

"کیوں تم سب میرے بچے کو تنگ کر رہی ہو' دیکھ نہیں رہیں ابھی ابھی آفس سے تھکا آیا ہے۔" سنجیدہ خاتون نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"تمہاری ماں تم سے بہت پیار کرتی ہے بیٹا' بھری جوانی میں بیوگی کے باوجود اس نے صرف تمہاری خاطر دوسری شادی نہیں کی اور تو اور صرف تمہاری خواہش پر تعلیم یافتہ بہو لانے پر راضی ہوئی ہے۔ اب یہ تمہارا فرض ہے کہ تم اپنی بیوی سے اپنی ماں کی عزت کرواؤ' اس گھر میں جو اس کا مقام ہے وہ پہلے دن ہی اپنی بیوی پر واضح کر دینا' یہ پڑھی لکھی لڑکیاں بڑی چالاک ہوتی ہیں۔ دیکھنا تمہیں تمہاری ماں سے متنفر کرنے کی پوری کوشش کرے گی' مگر تم خرد کا دامن کبھی ہاتھ سے مت چھوڑنا' ہمیشہ ماں کے فرماں بردار رہنا۔" کوئی آنٹی اس کے پاس بیٹھی اسے سمجھا رہی تھیں۔ نہ جانے کیوں سب کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ چکی تھی' تعلیم یافتہ لڑکیاں اچھی بہوئیں ثابت نہیں ہوتیں۔ ہارون جانتا تھا اس بارے میں بحث کرنا بے کار ہے' سب کی صورت اپنا نقطہ نظر نہیں بدلیں گی' اس لیے

ان کی ہربات پر جی جی کرتا رہا' ویسے بھی وہ ماں سے متعلق اپنے فرائض سے بخوبی آگاہ تھا' ان میں کوتاہی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ نہانے کے بعد چائے کا کپ لے کر بیڈ پر آ بیٹھا۔ ہاتھ بے اختیار ہی تکیے کے نیچے رینگ گیا' جہاں ام ثمینہ کی تصویر تھی جو کل ہی اماں نے اسے دی تھی۔

سفید دوپٹے کے ہالے میں صاف گندمی رنگت اور موٹی موٹی آنکھوں والی ثمینہ کو پہلی نظر میں ہی دل نے قبولیت کی سند بخش دی تھی۔ چائے کا مگ خالی کرنے کے بعد وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے تصویر کو دیکھتا رہا' یہاں تک کہ نیند نے پلکوں کو بوجھل کر کے باہم پیوست کر دیا۔

☼ ☼ ☼
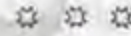
وائٹ اور پنک خوب صورت ڈیکو فرنیچر اور نفیس کرسٹل پیسز سے سجے کمرے کی فضا ایئر فریشنر اور تازہ گلابوں کی ملی جلی مہک سے بوجھل تھی۔ جہازی سائز بیڈ پر گلابوں کی گول چادر کے عین درمیان سرخ لہنگے میں ملبوس حسین وجود کمرے کی خوب صورتی میں اضافہ کر رہا تھا۔ چھت سے آتی مدھم روشنی نے اسے حصار میں لے کر ماحول کو مزید سحر انگیز بنا دیا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس کے گھٹنوں پر جمے حنائی ہاتھوں میں ذرا سی لرزش ہوئی۔ دبیز کارپٹ پر آگے بڑھتا ہر قدم اس کے دل کی دھڑکن کو منتشر کر رہا تھا۔

"السلام علیکم۔" سلام کی گمبھیر آواز پر اس کی لرزیدہ پلکیں ایک پل کو اٹھیں اور بار حیا سے بوجھل ہو کر جھکتی چلی گئیں۔ ہارون مرتضیٰ نے اس کے مقابل بیٹھ کر دائیں ہاتھ سے اس کی گردن کو چھوتی ٹھوڑی کو ذرا سا اوپر اٹھایا تو پلک جھپکنا بھول گیا۔ یہ تو کوئی اپسرا تھی' اپنی تصویر سے بالکل مختلف' ام ثمینہ جو کمرے کی دھار سے بھی بمشکل آنکھوں کو آشنا کرتی تھی' آج ہارون مرتضیٰ کے نام کا سولہ سنگھار کیے روایتی دلہنوں کے تمام لوازمات سے آراستہ بلاشبہ اتنی خوب صورت لگ رہی تھی کہ چاند زمین پر اتر آنے

والی مثال صادق آرہی تھی۔ ہارون نہ جانے کب تک اس ہوشربا حسن کو آنکھوں سے پیتا رہتا کہ دروازے پر ہونے والی زوردار دستک نے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے قدرے جھنجلا کر دروازہ کھولا۔

"ہارون بھائی! سنجیدہ آنٹی کی طبیعت بہت خراب ہو گئی ہے۔" وہ جو کوئی بھی تھی پھولی سانسوں سے اطلاع دے کر چلی گئی' یہ سنتے ہی وہ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر تیزی سے باہر نکل گیا۔ ام ثمینہ مضطرب سی اس کی پشت کو دیکھتی رہ گئی۔ رات گئے جب اس کی پلکوں نے مزید کھلا رہنے سے انکار کر دیا تب کہیں ہارون کی واپسی ہوئی۔

"سوری مجھے بہت دیر ہو گئی۔" اس کے چہرے پر بجی تھکن دیکھ کر اس نے معذرت کی۔

"دراصل میں اپنی اماں کی امیدوں کا واحد مرکز محور ہوں۔ توقعات و خدشات کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بس اماں نے ان ہی خدشات کو خود پر سوار کر لیا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کا بی پی خطرناک حد تک ہائی ہو گیا تھا۔" اس کی باتیں بغور سنتی ام ثمینہ کی آنکھوں میں ناسمجھی کی تحریر ابھری' جسے پڑھ کر وہ اپنی بات کی وضاحت کرنے لگا۔

"دراصل ہر ماں کی طرح جہاں اماں کو بھی اپنے اکلوتے بیٹے کا گھر بسنے کی خوشی ہے وہیں میرے بدل جانے کا دھڑکا بھی ہے' بقول ان کے تعلیم یافتہ لڑکیاں کبھی اچھی بہوئیں ثابت نہیں ہوتیں' میں نے اپنی طرف سے ان کے خدشات دور کرنے کی پوری کوشش کی ہے' مجھے یقین ہے تم بھی اپنے عمل سے ان کے سارے مفروضے غلط ثابت کر دو گی۔ وہ مزاج کی تھوڑی سخت ضرور ہیں' مگر دل کی بہت اچھی ہیں۔" اپنی ماں کے بارے میں بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا۔ ام ثمینہ کو اس کا ماں کے لیے یوں فکر مند ہونا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ بجا طور پر وہ آج کل کی لڑکیوں سے بہت مختلف تھی۔

"اماں کو مطمئن کرنے کے لیے میں نے ان سے وعدہ کیا ہے' میں کبھی گھریلو معاملات میں مداخلت

نہیں کروں گا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ تمہارے ہوتے کبھی اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔" اس نے اس کا حنائی ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں لے کر مان سے دبایا' اس کے خود پر اس قدر یقین نے ام ثمینہ کو سرشار کردیا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں عہد کیا وہ بھی ان کا مان نہیں توڑے گی۔

"ویسے کیا خیال ہے اب کچھ اپنی باتیں بھی کرلی جائیں۔" رونمائی کی انگوٹھی اسے پہناتے ہوئے اس کی طرف جھک کر قدرے شرارت سے بولا۔ اس کے یوں اچانک پینترا بدلنے پر ام ثمینہ نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپالیا۔ ہارون اس کی اس ادا پر کھلکھلا کر ہنس پڑا' انگلیوں کی جھریوں سے اس کا مضبوط سراپا دیکھتے ہوئے ام ثمینہ کا دل نئی لے پر دھڑک رہا تھا' جبکہ ہارون تو پہلی نظر میں ہی اپنا آپ ہار بیٹھا تھا۔

☼ ☼ ☼

شادی کے بعد دعوتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔ دن رات کی دعوتوں نے دونوں کو چکرا دیا۔ سنجیدہ خاتون اس کا بہت خیال رکھ رہی تھیں۔ اس کے چاہنے کے باوجود کچن میں قدم نہیں رکھنے دیتی تھیں۔ ہارون کی ایک ہفتہ کی چھٹی باقی تھی' سنجیدہ خاتون کی رضامندی سے وہ ہنی مون کے لیے اسلام آباد روانہ ہوگئے' چار دن تک اسلام آباد گھومنے کے بعد کل شام ہی مری آئے تھے۔

صبح ام ثمینہ کی آنکھ کھلی' چند لمحے کسلمندی سے کروٹیں بدلنے کے بعد ایک ہاتھ سے بال سمیٹتی دوسرے ہاتھ کے سہارے اٹھ بیٹھی' دوسری طرف ہارون لیٹا تھا' وہ بغور اسے دیکھنے گی۔ ہلکی بڑھی ہوئی شیو' بھرے بھرے لب' کھڑی ناک' متناسب آنکھیں' کشادہ پیشانی پر بکھرے بال انہیں سمیٹنے کی خواہش میں اس نے ہاتھ بڑھایا' چوڑیاں کھنکیں' اس کے اٹھ جانے کے خیال سے جلدی سے ہاتھ پیچھے کرلیا اور مسکراتی ہوئی اٹھ گئی۔ نماز ادا کرنے کے بعد کمرے سے ملحقہ ٹیرس پر چلی آئی۔ نم ہوا کے جھونکوں نے پذیرائی کی' وہ کپکپا اٹھی۔ میدانی علاقوں میں گرمی عروج پر تھی مگر یہاں موسم انتہائی خوش گوار تھا۔ کل سے بارش ہورہی تھی۔ ٹیرس کے دائیں طرف آسمان پر گھنگھور گھٹاؤں کا قبضہ تھا۔ نیچے وادی میں بارش ہورہی تھی' جبکہ بائیں طرف مال روڈ کی جانب آسمان پر اکا دکا بادل تیر رہے تھے۔ سامنے پہاڑی کی چوٹی پر بنے گھر کی چھت سے سورج آنکھیں کھولتا ہوا اچانک ابھرا تو یوں لگا جیسے سو کر ابھی ابھی گھر کی کھڑکی سے باہر نکلا ہو۔

آدھے سورج کو بادلوں نے قید کررکھا تھا۔ باقی آدھا آزاد تھا۔ پانی سے لدے بادلوں پر سورج کی اولین کرنیں رقصاں ہوگئیں' خوب صورت قوس قزح کے رنگ فواروں کی مانند بائیں جانب صاف آسمان پر برسنے لگے۔ اتنا خوب صورت نظارہ اس نے آج سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ وہ سر اٹھائے مسحور ہوکر بنا پلک جھپکے دیکھے گئی۔ ڈھیلا جوڑا کھلا اور کالے بال آبشار کی طرح پشت پر بہنے لگے۔ بالوں سے اٹکھیلیاں کرتے سرد ہوا کے جھونکے سیدھے کانوں کے رستے اندر گھسے جارہے تھے' وہ کانپ رہی تھی' جب ہارون نے کالی شال اس کے کندھوں پر پھیلا کر اس کی سردی سمیٹ لی' اس نے چونک کر پیچھے دیکھا' دونوں کی نظریں ٹکرائیں اور بے وجہ ہی کھلکھلا دیے۔

اولین دنوں کا خمار' ہنسی کی کھنک میں پوری طرح رچا تھا' وقت کم تھا اور دیکھنے کو بہت کچھ تھا' ہارون کا بس نہیں چل رہا تھا وہ اس قلیل وقت میں یہاں کا چپا چپا اسے دکھا ڈالے۔ قدرت کے حسین نظاروں کو دیکھ کر جو سحر اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں اتر آتا تھا وہ اسے مسحور کردیتا تھا۔ وہ اردگرد سے بے نیاز بس اس کی آنکھوں میں دیکھے جاتا تھا۔ سارا دن پتراٹہ میں گزارنے کے بعد دونوں ہی بہت تھک چکے تھے۔ مگر ہارون بصد اصرار اسے شاپنگ کے لیے مال روڈ لے گیا۔

مال روڈ کی رونقیں عروج پر تھیں' نئے جوڑے

ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ فیملیز کی بھی کمی نہ تھی' جو گروپ کی صورت ایک سرے سے دوسرے تک چکراتی پھر رہی تھیں۔ ان سے کچھ فاصلے پر سڑک پر چار پانچ لڑکوں کا شریر گروپ قابض تھا۔ کپلز کو دیکھ کر ان کی زبانوں میں بے ساختہ کھجلی ہونے لگتی تھی' جبکہ اکیلی لڑکی دیکھ کر زبانیں گنگ رہ جاتیں اور لفظوں کی بجائے سیٹیاں برآمد ہوتی تھیں۔ باقی کپلز کی یوں درگت بنتے دیکھ کر وہ آگے بڑھنے سے جھجک رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" اسے رکتا دیکھ کر ہارون نے پوچھا۔ اس نے سڑک کے کنارے اشارہ کیا۔

"کچھ نہیں ہوگا۔" اس کے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ بڑھا کر اس نے یقین دلایا۔ اس شریر ٹولی کے پاس سے گزرتے ہوئے ہارون نے تنبیہی نظروں سے انہیں گھورا۔

اونچے لمبے مضبوط قامت والے ہارون کی پرسنالٹی ہی اتنی شان دار تھی کسی کو لب کھولنے کی جرأت نہ ہوئی' دونوں آرام سے گزر گئے۔ اس کی سنگت میں تحفظ کے بے پایاں یقین نے ام ثمینہ کو اندر تک سرشار کردیا۔ شاپنگ کے بعد وہ ڈنر کے لیے "ٹمسیٹ پوائنٹ" آگئے۔ ہارون کو یہاں کی فش کڑھائی بہت پسند تھی۔ کھانا کھانے کے دوران سنجیدہ خاتون کا فون آیا' سیل کان سے لگاتے ہوئے اس نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ سیزن کی وجہ سے بہت رش تھا۔ ایکسٹرا میزیں لگی ہوئی تھیں۔ جن کی وجہ سے کال ریسیو کرنے کے لیے باہر جانا بھی دشوار تھا۔ مجبوراً" وہ ادھر بیٹھ کر بات کرنے لگا۔

"السلام علیکم اماں! کیسی ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک ہوں' بیٹا تم دونوں۔۔۔" سگنل ناکافی ہونے کی وجہ سے ان کی بات ٹھیک سے سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ جب سے مری آیا تھا اسی وجہ سے ان سے کھل کر بات بھی نہیں ہوسکی تھی۔

"ہم دونوں ٹھیک ہیں اماں' میں آپ سے بعد میں بات کرتا ہوں۔" ایک تو ان کی صاف آواز نہیں آرہی تھی' دوسرا شور کی وجہ سے اونچا بولنا پڑ رہا تھا' جو کہ پبلک پلیس پر بہت برا لگتا ہے۔ ان سے بعد میں تفصیل سے بات کرنے کے خیال سے اس نے مختصر بات کی۔ وہ کھانا کھا کر باہر آئے تو ہارون نے ان سے بات کرنے کے لیے فون نکالا مگر سگنلز کے ساتھ ساتھ بیٹری بھی ڈاؤن تھی۔ اس نے تاسف سے سر ہلا کر فون واپس جیب میں ڈال دیا۔ ابھی وہ کچھ ہی آگے گئے تھے کہ بارش شروع ہوگئی۔ ہارون نے چھتری کھولی' دونوں اس میں سمٹ گئے۔ ان کی ڈھیلی گرفت کا فائدہ اٹھا کر ہوا کا شریر جھونکا مچلا اور چھتری کو سڑک کے کنارے زنجیروں سے کئی فٹ نیچے لے بھاگا۔ دونوں نے بے چارگی سے ایک دوسرے کو دیکھا اور اپنی بے بسی پر ہنس دیے۔ سڑک دور' دور تک خالی تھی' کچھ سوچ کر ام ثمینہ نے اپنے کندھوں سے لپٹی شال کا ایک سرا اپنے سر پر تانا اور دوسرا ہارون کی طرف بڑھایا' اس کی آنکھوں میں مچلتی شریر خواہش وہ بھانپ چکا تھا' اس لیے مسکراتے ہوئے چادر پکڑلی۔

☼ ☼ ☼

سنجیدہ خاتون فون ہاتھ میں لیے بے یقین سی بیٹھی تھیں' ہارون نے ابھی ابھی جس طرح دو لفظوں میں بات ختم کرکے فون بند کردیا تھا' انہیں دھچکا لگا تھا وہ جب سے مری گیا تھا' ٹھیک سے ان سے بات نہیں کررہا تھا۔ وہ اسے بیوی کی محبت کا اثر گردان رہی تھیں۔ اس نے پھر فون کرنے کا کہا تھا۔ وہ ساری رات انہوں نے سوتے جاگتے گزاری' مگر ہارون کا فون نہ آیا۔ صبح نماز کے بعد وہ حسب معمول صحن میں آبیٹھیں' اصغری کو انہوں نے اپنے پاس روک رکھا تھا' انہیں پریشان دیکھ کر وہ ان کے پاس آبیٹھی' اس کے اصرار پر انہوں نے ساری بات اسے بتادی۔

"آج کل کے بیٹے' بیوی کے آگے ماں کو تو کچھ گردانتے ہی نہیں' رہی سہی کسر تم نے تعلیم یافتہ بہو لاکر پوری کردی' مگر اتنا پریشان مت ہو' ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا' بہو کو جتا دیا کرو تھوڑی' بیٹا اتنا ہی قابو میں رہے

لگا۔ میری مانو تو بہو کو پہلے دن سے اس کی اوقات یاد دلا کر رکھو تاکہ وہ اپنی حد سے آگے بڑھنے نہ پائے۔ اگر ذرا بھی ڈھیل دی تو تمہارا انجام بھی میرے جیسا ہوگا۔"

اصغری کے دو بیٹے تھے۔ دونوں کے لیے بڑے ارمانوں سے پڑھی لکھی چاند سی بہوئیں لائی تھیں۔ ان کے خوب ناز اٹھائے۔ جواباً "ان چاند سی بہوؤں نے اپنی چاندنی سے ان کا دل ٹھنڈا کرنے کی بجائے جلا کر راکھ کر دیا اور سسر کے انتقال کے بعد ساس کا وجود ناقابل برداشت ہو گیا تو انہیں چلتا کیا۔ اب وہ اپنا بڑھاپا بیاہی بیٹی کے گھر گزارنے پر مجبور تھیں۔ ان کی سرگرمیاں دیکھ کر صاف لگتا تھا کہ انہوں نے اپنی بہوؤں کا بدلہ دنیا کی ہر بہو سے لینے کا عزم کر رکھا ہے۔ آس پڑوس کی دلہنیں انہیں اپنی ساسوں کے ساتھ بیٹھنے کا موقع انتہائی کم دیتی تھیں، ان کا کیا جاتا تھا وہ تو اپنا کام کر کے چلتی بنتیں اور بغیر کسی وجہ کے ساسوں کا خراب موڈ انہیں جھیلنا پڑتا۔

"اللہ نہ کرے۔" سنجیدہ خاتون دہل کر بولیں۔

"واقعی اللہ تعالیٰ ایسا وقت کسی کو نہ دکھائے۔" آنکھوں کے نم گوشے چادر کے پلو سے صاف کرتے ہوئے وہ انہیں بہو کو قابو میں رکھنے کے طریقے بتانے لگیں، جنہیں خدشات میں گھری سنجیدہ خاتون پوری توجہ سے سن رہی تھیں۔

✿ ✿ ✿

"اماں چائے۔" سنجیدہ خاتون نماز کے بعد حسب معمول صحن میں آکر بیٹھیں۔ ام ثمینہ فوراً چائے لے کر پہنچ گئی جو انہوں نے انتہائی رکھائی سے لی۔ وہ روز کی طرح اس امید پر چند لمحے ان کے پاس کھڑی رہی کہ شاید وہ اسے بیٹھنے کو کہیں۔ انہوں نے اسے یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں "بی بی اب سر پر کیوں سوار ہو۔" وہ شرمندہ ہو گئی۔ کچن میں بہت گھٹن تھی۔ اس نے کھڑکی کھول دی، تازہ ہوا میں بوگن ویلیا کی خوشبو رچی تھی، اس نے پل بھر میں اندر کی ساری گھٹن سمیٹ کر اس کے موڈ پر بھی خوش گوار اثر ڈالا۔ کچن کی صفائی وہ رات کو کر کے سوتی تھی۔ آٹا گوندھا ہوا تھا، آملیٹ کا آمیزہ تیار کرنے کے بعد اس نے رات کے سالن میں سے آلو نکالے اور کچل کر ان میں مسالا ملانے لگی۔ ہارون کو آلو کے پراٹھے بہت پسند تھے۔ وہ کام کرتے ہوئے مسلسل اماں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

اس کی شادی کو تین ماہ ہونے کو آئے تھے۔ سنجیدہ خاتون کا رویہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ ان سے دوستی اور بے تکلفی پیدا کرنے کی ہر کوشش میں ناکام ہو چکی تھی۔ اس کی گرم جوشی کے جواب میں ان کے پاس سرد مہری کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ہنی مون سے واپسی کے بعد انہوں نے بغیر کوئی وجہ بتائے کام والی کو فارغ کر دیا۔ وہ کوئی کام چور نہیں تھی۔ اس لیے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ انہیں اس کا جلدی جلدی میکے جانا پسند نہیں تھا۔ اس نے جانا کم کر دیا۔ انہیں اس کا ہارون کو آفس فون کرنا پسند نہیں تھا۔ اس نے انتہائی ضرورت کے سوا فون کو ہاتھ لگانا چھوڑ دیا۔ نیز اس نے خود کو ان کی پسند کے سانچے میں ڈھالنے کی ہر ممکن کوشش کر کے دیکھ لی، مگر ان کے ماتھے کی تیوریاں کم ہونے کا نام نہیں لیتی تھیں۔ انہیں تو شاید اس کا اس گھر میں رہنا ہی ناپسند تھا۔

اس نے کہاں آج تک ایسا رویہ دیکھا تھا، وہ بہت جلد اس صورت حال سے تھکنے لگی تھی۔ ہارون سے کچھ کہنا بے کار تھا، وہ گھریلو معاملات میں مداخلت نہ کرنے کا عہد کر چکا تھا۔ رات کی تنہائیوں میں اس کا درد ضرور بانٹتا تھا۔ مگر دن کے اجالے میں اس کی جائز حمایت کرنے سے بھی قاصر تھا۔ ہارون کا بیرونی تحفظ اس کی ذات کے لیے کنکریٹ سے بھی زیادہ مضبوط تھا اور اندرونی تحفظ ریشم کے پردے سے بھی ہلکا۔ یہ حقیقت خواہ جتنی بھی تلخ تھی، ان تین ماہ میں اسے اچھی طرح باور ہو چکی تھی۔

✿ ✿ ✿

آگ اگلتا سورج واپسی کے سفر پر رواں دواں تھا۔ مگر حدت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ بالٹی میں

میں موجود سارے کپڑے رسیوں پر پھیلانے کے بعد ام ثمینہ بھی پسینے میں اچھی طرح نہا چکی تھی۔ اوپر کی ساری رسیاں بھر چکی تھیں۔ مگر نیچے ابھی کپڑوں کا بنڈل باقی تھا۔ آج اس نے ہفتے بھر کی دھلائی کے لیے مشین لگائی تھی۔ اماں سارے گھر کے پردے، چادریں اور غلاف بھی دھونے کو ڈال گئیں۔ کپڑے بھی بہت زیادہ تھے۔ اس نے کہنا چاہا وہ باقی سب کے لیے کل مشین لگا لے گی۔ مگر ان کی ناراضی کے ڈر سے چپ رہی۔ کپڑے دھوتے دھوتے عصر ہونے کو آ گئی تھی۔ ساتھ میں گھر کے باقی سب کام بھی نمٹاتی رہی تھی۔ وہ نیچے اتری تو پڑوس کی فہمیدہ خالہ آئی ہوئی تھیں۔ انہیں سلام کرتے کچن میں آکر سکنجبین بنانے لگی۔ ذائقے کے لیے تھوڑی سی روح افزا بھی ڈال دی۔ اپنا گلاس نکال کر دوسری ٹرے میں ٹھنڈے ٹھنڈے آم نفاست سے کاٹے اور باہر دے آئی۔

اپنے گلاس میں آئس کیوبز کا اضافہ کر کے کھڑکی کے پاس آ بیٹھی۔ ٹھنڈا شربت جیسے جیسے حلق سے اتر رہا تھا پسینہ خشک ہوتا جا رہا تھا۔

"بیمار پڑ جاؤ گی، مت اتنا کام کیا کرو۔" کام والی کی چھٹی پر اسے سارا کام کرتا دیکھ کر امی پریشان ہو جاتی تھیں۔ گلاس کے سرد بخارات پر انگلی پھیرتے ہوئے اسے امی کی یاد آئی۔ آنکھیں نم ہونے لگیں۔

"تو انہوں نے یہ گھر اور اس کے کام بھی تو میرے اپنے ہیں۔" اس نے بیاہی ہوتے دل کو تنبیہ کی۔ تھکن روم روم میں بسی تھی۔ مگر ابھی ڈھیروں کام باقی تھے۔ صبح ہارون نے بریانی کی فرمائش کی تھی۔ وہ کُکر میں گوشت چڑھا کر اسٹور میں آگئی۔ اوپر مزید کپڑوں کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ رسی لے کر صحن میں باندھنے لگی۔ گانٹھ لگانا اسے ہمیشہ سے مشکل لگتا تھا۔ بار بار کوشش کے باوجود رسی ٹھیک سے نہیں بندھ رہی تھی۔ فہمیدہ اگرچہ باتیں تو سنجیدہ خاتون سے کر رہی تھیں مگر نظریں ام ثمینہ کے ہاتھوں پر تھیں۔

"ارے توبہ۔ سولہ جماعتیں پڑھی ہیں مگر گانٹھ لگانا نہ آئی۔" اسے تیسری بار ناکام ہوتا دیکھ کر انہوں نے طنز کا تیر پھینکا، مسرال میں قدم قدم پر اس کی تعلیم کو نشانہ بنایا جاتا تھا۔ اس کے چہرے پر سایہ سا گزر گیا۔

"ایک میری بہو ہے، اسکول کی شکل تک نہیں دیکھی پر ہر کام میں ماہر ہے۔ مگر آج کل کی تعلیم یافتہ لڑکی کو کون سمجھائے شادی کے بعد عملی زندگی میں ڈگری نہیں مہارت کام آتی ہے۔"

"ہونہہ۔" اس کی دن بھر کی محنت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے سنجیدہ خاتون نے ایک نظر اس پر ڈال کر منہ پھیر لیا۔ اس کی آنکھوں میں کب کے رکے آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر باہر نکلے اور پسینے میں مل کر اپنا وجود کھو بیٹھے۔

✿ ✿ ✿

آج وہ بہت دنوں بعد میکے آئی تھی۔ امی اسے دیکھ کر نہال ہو گئیں۔ ابا نے بھی آفس سے چھٹی کر لی۔ ابا سے گپیں لڑانے کے بعد وہ کچن کے پاس تخت پر لیٹ گئی۔ اتنی گرمی کے باوجود امی اس کے پسندیدہ کریلے گوشت بنانے کھڑی ہو گئی تھیں۔ وہ کھانا بنانے کے ساتھ ساتھ اس سے باتیں بھی کیے جا رہی تھیں۔

"ہم نے تو تمہیں یہی سوچ کر ایک ہی شہر میں بیاہا تھا کہ روز تم سے ملنا ملانا لگا رہے گا۔ مگر تم تو سسرال کو ایسی پیاری ہوئیں، ہمیں تو بھول ہی گئیں۔ میں اور تمہارے ابا روز تمہارا انتظار کرتے تھے۔" انہوں نے پیار بھرا شکوہ کیا۔ جواباً ایک پھیکی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آکر وم توڑ گئی۔ اب وہ انہیں کیا بتاتی کہ اس کی ساس کو روز روز میکے جانا پسند نہیں تھا۔ آج بھی بڑی مشکلوں سے اجازت ملی تھی۔

"میں آپ کو کیسے بھول سکتی ہوں۔ ماں، باپ بھی بھلائے جا سکتے ہیں۔" پیچھے سے جا کر ان کی گردن میں بانہیں ڈال کر وہ ان سے لاڈ کرنے لگی۔ اس کا دل تو بہت چاہتا تھا وہ ان کے گلے لگ کر اتنا روئے کہ ہر دکھ، ہر پریشانی آنسوؤں میں بہہ جائے۔ مگر والدین کو اپنی وجہ سے پریشان کرنا اسے گوارا نہیں تھا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" کھانے کے بعد دونوں ماں بیٹی

لاؤنج میں آ بیٹھیں، بغور اس کے چہرے کا مطالعہ کرتے ہوئے امی نے پوچھا۔
"وہ کچھ بھی تو نہیں۔"
"تم خوش تو ہو نا؟" وہ محسوس کر رہی تھیں کہ ام ثمینہ شادی کے بعد کھلنے کی بجائے مرجھاتی جا رہی ہے مگر چونکہ اسے ہمیشہ سب اچھا ہے کہ رپورٹ دی تھی اس لیے وہ زیادہ نہیں کریدتی تھیں۔
"امی میں بہت خوش ہوں۔" اس نے فوراً"بشاش مسکراہٹ چہرے پر سجا کر انہیں یقین دلانا چاہا۔
"ایک منٹ میں ابھی آئی۔" اس کا جی متلانے لگا وہ فوراً" واش روم کو لپکی۔ وہ اسے تھوڑی دیر بعد واش روم کا رخ کرتے صبح سے دیکھ رہی تھیں۔ اب بھی وہ نڈھال سی لوٹی انہیں تشویش ہوئی۔
"بیٹا تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا کہیں کچھ الٹا سیدھا تو نہیں کھا لیا تھا۔"
"نہیں میں نے تو کب سے بازار کا کھانا چکھا تک نہیں' نہ ہی بدپرہیزی کی ہے 'مگر نہ جانے کیوں ہفتہ بھر سے ایسا ہو رہا ہے بیٹھے بٹھائے چکر آجاتا ہے 'جی الگ متلانے لگتا ہے۔"
"تم نے اپنی ساس کو بتایا۔" انہوں نے پوچھا اس نے نفی میں سر ہلایا 'کیونکہ اماں کو تو یہ سب کام نہ کرنے کے بہانے لگتے تھے۔
"چلو ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔" کھوجتی نظروں سے اس کا سر تا پا جائزہ لیتے ہوئے وہ کچھ سوچ کر بولیں۔
"امی میں نے ہارون سے ذکر کیا تھا وہ آج واپسی پر مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں گے۔" اس کا موڈ اس وقت کہیں جانے کا نہیں تھا۔
"ارے ہارون کے آنے تک تو ہم واپس بھی آجائیں گے 'تم چلو۔" انہوں نے اس کی ایک نہ سنی اور زبردستی لے گئیں 'مگر جانے سے پہلے وہ ہارون کو میسج کرنا نہیں بھولی تھی۔

☼ ☼ ☼

ہارون اپنے آفس میں کام میں بری طرح مصروف تھا 'کبھی اس کی انگلیاں کی بورڈ پر چلنے لگتیں 'کبھی وہ فائلز کھول لیتا 'فون کی گھنٹیاں بھی مسلسل بج رہی تھیں۔ اتنی مصروفیت کے باوجود اس نے ام ثمینہ کا میسج پوری توجہ سے پڑھا تھا۔
"کہیں اس کی طبیعت زیادہ خراب تو نہیں ہو گئی۔" اسے پہلا خیال ہی آیا تھا کام کے دوران دھیان مسلسل اس کی طرف لگا ہوا تھا۔ اس کا سیل فون بجا دوسری طرف ممتاز بیگم تھیں۔
"السلام علیکم امی۔" وہ ان کے اچانک فون کرنے پر حیران ہوا۔
"وعلیکم السلام بیٹا' کیسے ہو؟"
"الحمدللہ 'میں خیریت سے ہوں' کیسے یاد کیا آپ نے 'سب ٹھیک تو ہے نا۔" اسے تشویش ہوئی۔
"ہاں سب خیریت ہے۔ اگر تم فارغ ہو تو گھر آجاؤ۔" مختصر بات کر کے انہوں نے فون بند کر دیا۔ ام ثمینہ ان کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس گئی تھی کہیں کوئی سیریس مسئلہ نہ ہو وہ پریشان ہو گیا' جلدی جلدی کام سمیٹ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ سارا راستہ خدایا خیر کا ورد کرتا آیا تھا۔
"سب خیر تو ہے نا امی 'کیا کہا ڈاکٹر نے؟' آپ کے اچانک بلانے پر میں پریشان ہو گیا تھا' ثمینہ تو ٹھیک ہے نا۔" وہ جو سارا راستہ طرح طرح کے وسوسوں سے چاہتے ہوئے بھی پیچھا نہیں چھڑا سکا تھا ان سب کو اتنا خوش دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایک ہی سانس میں اتنے سوال پوچھ ڈالے۔
"ارے بیٹا سب خیر ہی خیر ہے بلکہ بہت زیادہ خیر ہے 'لو منہ میٹھا کرو۔" ان دونوں کو بیٹی کے لیے داماد کا فکرمندانہ انداز بہت بھایا تھا منہ میٹھا کرانے کے بعد انہوں نے جب اسے باپ بننے کی خوشخبری سنائی تو وہ خوشی سے جھوم اٹھا۔ کچھ وقت ان کے ساتھ گزار کر شام کی چائے پیتے ہی ان سے اجازت چاہی ممتاز بیگم نے رات کے کھانے پر رکنے کے لیے اصرار کیا مگر دونوں پھر آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔
ہارون بے حد خوش تھا ام ثمینہ نے اسے آج سے پہلے اتنا خوش کبھی نہیں دیکھا تھا۔
"یہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔" گاڑی کو گھر کی بجائے کسی اور راستے پر گامزن دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔
"وہاں جہاں 'ہم دونوں کے سوا کوئی نہ ہو۔" وہ اس کے کان میں گنگنایا وہ شرما گئی۔ پھر ساری شام انہوں نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ساحل پر لہروں کا پیچھا کرتے گزاری کتنے ہی سپنوں کو آنکھوں میں جگہ دے ڈالی یہ سوچے بغیر کہ جب سپنے ٹوٹتے ہیں تو ان کی کرچیاں چین سے جینے نہیں دیتیں۔

☼ ☼ ☼

سنجیدہ خاتون بار بار گھڑی دیکھتے ہوئے بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہی تھیں گیارہ بج چکے تھے مگر ہارون کا ابھی تک کچھ اتا پتا نہیں تھا۔ ہارون کا موبائل بھی بند تھا۔ اور بہو کو فون کر کے اسے اہمیت دینا انہیں گوارا نہیں تھا۔ اچانک گاڑی کا ہارن سنائی دیا تو وہ سکھ کی سانس لیتے ہوئے باہر بڑھیں۔ سامنے ہی ہارون کے ہمراہ شاپنگ بیگز سے لدی پھندی ام ثمینہ خراماں خراماں چلی آرہی تھی' ہارون کی نظریں اس کے چہرے سے چپکی تھیں یہ دیکھ کر ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔
"السلام علیکم اماں!" ان کے قریب آکر دونوں نے اکٹھے سلام کیا۔
"آگئی ماں کی یاد' کچھ خبر بھی ہے کتنی دیر سے پریشان ہو رہی ہوں مگر صاحبزادے کو بیوی کی ناز برداریوں سے فرصت ملے تو بوڑھی ماں کا خیال آئے۔" وہ شروع ہو گئی تھیں۔
"میری پیاری اماں! ہم آپ کے لیے اتنی بڑی خوش خبری لائے ہیں آپ سنیں گی تو ساری خفگی بھول جائیں گی۔" ہارون نے آگے بڑھ کر ان کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے انہیں دادی بننے کی نوید سنائی تو وہ واقعی ساری ناراضی بھلا کر نہال ہو گئیں۔ شادی کے بعد پہلی مرتبہ ام ثمینہ کو گلے لگا کر پیار کیا وہ بھی کھل اٹھی۔ پھر آنے والے دن بے حد پرسکون گزرے۔
اماں اس کا ہر طرح سے بے حد خیال رکھتیں ان کی تو کایا ہی پلٹ گئی تھی ثمینہ بے حد خوش تھی کہ اس کا صبر رنگ لایا ہے۔

☼ ☼ ☼

"آؤ' آؤ اصغری بہن' بڑے دنوں بعد شکل دکھائی۔" سنجیدہ خاتون سبزی کاٹ رہی تھیں جب وہ آئی۔
"بھئی شکر کرو اتنے دنوں بعد سہی میں نے شکل تو دکھائی تم تو وہ بھی دکھانے سے گئیں۔" ان کے قریب بیٹھتے ہوئے اس نے بھی جواب شکوہ کیا۔
"دلہن نظر نہیں آرہی میکے گئی ہے کیا؟" انہیں سبزی کاٹنے کے بعد بنانے کی تیاری کرتا دیکھ کر اس نے حیرت سے پوچھا۔
"نہیں اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہے' ماشاء اللہ دوسرے جی سے ہے نا۔ تو طبیعت ہر وقت بوجھل رہتی ہے میں تو اسے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی۔" وہ بہت فخر سے بتانے لگیں جواباً" اصغری نے یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو میں چند دن میں نہ آئی تو کیا عقل پر تالے پڑ گئے۔ بہو کو شروع دن سے دبا کر رکھنے کی پٹیاں اس نے ہی تو انہیں پڑھائی تھیں۔
"اصغری جس طرح پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اس طرح لازمی نہیں کہ سب بہوئیں ایک جیسی ہوں ام ثمینہ بہت اچھی بچی ہے میں نے اسے ہر طرح سے آزما کر دیکھ لیا ہے وہ کبھی میرے بیٹے کو مجھ سے دور نہیں کرے گی۔" اس کی نظروں کا مفہوم سمجھ کر وہ وضاحت دینے لگیں مگر آواز اب بھی پست تھی جیسے تعریف کی بجائے جرم کر رہی ہوں۔ اس سے پہلے کہ اصغری کچھ کہتی اچانک گلی میں سے شور کی آواز آنے لگی' دونوں باتیں چھوڑ کر تیزی سے باہر لپکیں جہاں ایک تماشا ان کا منتظر تھا۔
"نہیں چھوڑو مجھے 'چھوڑو میں کہیں نہیں جاؤں گی' چھوڑو مجھے میرے شوہر کا گھر ہے میں اسے چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔" ہذیانی انداز میں چیختی یہ ان کی

بہو سن فہمیدہ تھی جسے اس کا بیٹا زبردستی گاڑی میں بٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔
"خرم! کان کھول کر سن لو اس گھر میں یا تو میں رہوں گی یا پھر تمہاری ماں۔" شوہر کو ماں کے آنسوؤں کے آگے نرم پڑتا دیکھ کر اس کی جاہل بیوی نمایاں دھاڑی خرم کو چاروناچار ماں کو بہن کے گھر لے جاتے ہی بنی کیونکہ اپنے بچے کی ماں کی ناراضی وہ کسی صورت مول نہیں لینا چاہتا تھا خواہ اس کے لیے اپنی ماں کی بددعا ہی کیوں نہ سہنی پڑے۔
جب سے فہمیدہ کے شوہر کی وفات ہوئی تھی اس کی بہو نے پرپرزے نکالنے شروع کر دیے تھے۔ چھوٹے موٹے جھگڑے تو روز کا معمول تھے مگر بات اتنی بڑھ جائے گی کسی کے وہم و گمان میں نہ تھا۔
"کتنا سمجھاتی تھی میں فہمیدہ کو مت سر چڑھا اس ناس پیٹی کو مگر اس کا تو بی بی کرتے منہ نہیں سوکھتا تھا جھلا جاؤ بہو بھی کبھی بیٹی بن سکتی ہے نایاں تو تھی ہی جاہل اس کے باوجود اس نے یہ سب کیا اب دیکھتے ہیں تمہاری تعلیم یافتہ بہو تمہارے ساتھ کیا کرتی ہے۔" اصغری تاسف بھری نگاہ ان پر ڈال کر چلی گئی جیسے کہہ رہی ہو بہت جلد تمہارا بھی ایسا تماشا دیکھنے کو ملے گا۔
ان کا سارا دن بے سکون گزرا رات بھی آنکھوں میں کٹی رہ رہ کر کانوں میں فہمیدہ کی چیخیں اور اصغری کے الفاظ گونجتے رہے ذرا جو آنکھ لگتی وہ خواب میں خود کو فہمیدہ کی جگہ پاتیں، بہو اور بیٹے کو خود کو دھکے مارتا دیکھ کر رہا سہا سکون بھی رخصت ہو جاتا وہ لرز اٹھتیں۔
طویل بے اطمینانی کی رات آنکھوں میں کاٹنے کے بعد وہ خود کو باور کرانے میں کامیاب ہو چکی تھیں کہ اصغری جو کہتی ہے سچ کہتی ہے اگر میرا رویہ بہو کے ساتھ اتنا نرم رہا تو وہ دن دور نہیں جب یہ ڈراؤنے خواب حقیقت کا پیرہن اوڑھ لیں گے حتمی فیصلے پر پہنچتے ہوئے طویل سانس خارج کرتے وہ نماز کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں انہوں نے ایک پل بھی نہ سوچا کہ حقیقت کے خوشنما پھولوں کو خدشات کی دھوپ میں جلانے کا انجام کیا ہوگا۔

☆ ☆ ☆

ام ثمینہ کو کچھ نہیں آ رہا تھا۔ آخر اماں کو ہو کیا گیا ہے کہاں تو اسے بستر سے قدم اتارنے نہیں دیتی تھیں اور کہاں اب پورے سارے گھر کا بوجھ اس کے کندھوں پر ڈال دیا تھا بلکہ ان کا رویہ تو پہلے سے بھی زیادہ خراب تھا اٹھتے بیٹھتے اسے تعلیم یافتہ ہونے کے طعنے دیے جاتے تھے وہ اس صورت حال سے بے حد پریشان تھی کبھی کبھی تو اس کا دل چاہتا سب کچھ چھوڑ کر میکے چلی جائے مگر ہارون کی محبت اس روک لیتی تھی ویسے بھی اس عمر میں والدین کو اپنی وجہ سے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس وقت سالن بناتے ہوئے اس کا گرمی سے برا حال تھا اوپر سے گوشت کی خوشبو الگ بے حال کر رہی تھی وہ منہ پر کپڑا رکھ کر دیگچی میں چمچہ چلاتی اور کھڑکی کے پاس جا کر زور زور سے سانس لینے لگتی تو کبھی واش بیسن کو تکتی اپنی حالت پر اسے رونا آ رہا تھا۔ اس نے آنسوؤں پر بند باندھنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی کام ختم کرنے کے بعد اندر جا کر لیٹی تو اے سی کی ٹھنڈک اندر تک اترتی چلی گئی۔
وہ کمروں میں بے سدھ ہو گئی تھی ہارون آفس سے واپس آیا اسے بکھرے بالوں اور ملگجے حلیے میں گہری نیند سوتا دیکھ کر اس کے پاس آ بیٹھا اور دھیرے دھیرے اس کے بال سہلانے لگا۔ اماں کے خراب برتاؤ کا اسے بھی پورا احساس تھا اپنی طرف سے تلافی کی پوری کوشش بھی کرتا تھا مگر چونکہ اماں سے شادی کی پہلی رات ہی گھریلو معاملات میں مداخلت نہ کرنے کا وعدہ کر چکا تھا اس لیے بے بس تھا۔ ام ثمینہ ابھی تو سر بہت بھاری ہو رہا تھا ہارون اس کے لاکھ نہ نہ کرنے پر بھی اسے ڈاکٹر کے پاس لے آیا۔
"آپ کی وائف بہت کمزور ہیں۔ انہیں مکمل آرام کی ضرورت ہے بیڈ ریسٹ کے ساتھ ساتھ ان کی غذا کا بھی بہت خیال رکھیے۔" ڈاکٹر پروفیشنل انداز میں اسے ہدایات دے رہی تھیں جسے وہ پوری توجہ

سے سن رہا تھا۔
"ہارون گرمی بہت ہوتی ہے کچن میں پنکھا نہ لگوا لیں۔" واپسی پر اس نے فرمائش کی۔
"کیوں نہیں تم کہو تو میں اسے ہی لگوا دوں میں آج ہی اماں سے بات کر کے ملازمہ کا بندوبست کرتا ہوں جو گھر کے کام کے ساتھ ساتھ کچن بھی سنبھال لے گی اب تم صرف بیڈ ریسٹ کرو گی اور ہاں اپنی غذا کا بھی پورا خیال رکھنا۔" اس نے انگلی اٹھا کر مسکراتے ہوئے پیار سے تنبیہہ کی وہ بہت اچھی پوسٹ پر تھا ایک ساتھ دس نوکر با آسانی افورڈ کر سکتا تھا مگر اماں کو یہ سب پسند نہیں تھا۔
آج اس کا ارادہ اماں سے اس بارے میں بات کرنے کا تھا رات کو وہ حسب معمول ان کے پاس آیا وہ اسی کے انتظار میں جاگ رہی تھیں وہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا وہ پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگیں۔
"اماں گرمی بہت ہوتی ہے میں سوچ رہا تھا کیوں نہ کچن میں پنکھا لگوا لیں۔" وہ خاموش رہیں وہ قدرے توقف سے پھر بولا۔
"اماں! ڈاکٹر نے ثمینہ کو بیڈ ریسٹ کا کہا ہے زیادہ کام اس کی صحت کے لیے ٹھیک نہیں کھانے کی خوشبو سے اسے متلی ہونے لگتی ہے کیوں نہ کسی ملازمہ کا بندوبست کر دوں۔" اس نے انہیں مطلع کیا تھا یا اجازت چاہی تھی جو بھی تھا مگر انہیں بہو کے لیے بیٹے کا فکر مند ہونا کھل گیا تھا۔
"واہ بیٹا واہ! ساری عمر ماں نے بھی اسی تپتے کچن میں کام کیا مگر تب تو کبھی پنکھے کا خیال نہ آیا اور اب بیوی کے لیے تڑپ رہے ہو۔ وہ کوئی انوکھا بچہ پیدا کرنے چلی ہے جو بستر سے نیچے پاؤں ہی نہ اتارے ہم بھی اس حالت سے گزرے تھے مگر ہم نے تو کبھی اتنے چونچلے نہ کیے۔ سب سمجھتی ہوں میں یہ سب ڈھکوسلے ہیں اس تعلیم یافتہ کے تاکہ جب کرنے کو گھر کا کوئی کام نہ ہو تو سارا دن بیٹھ کر مجھے گھر سے نکالنے کے منصوبے بنائے۔" وہ اس کا سر گود سے ہٹا کر غصے سے بولیں یہ اس کی نرم دل، ہمدرد اور محبت والی اماں تو نہیں تھیں۔ جنہیں وہ جانتا تھا یہ کوئی اور ہی خاتون تھیں جنہیں وہ قطعاً نہیں جانتا تھا۔
"مگر اماں ڈاکٹر۔" اس نے کمزور سا احتجاج کیا۔
"بھاڑ میں گئی ڈاکٹر ذرا سا گھر کا کام کرنے سے مر نہیں جائے گی تمہاری تعلیم یافتہ بیوی گھر کا جو معاملہ جیسا چل رہا ہے ویسا چلنے دو تم نے وعدہ کیا تھا گھریلو معاملات میں مداخلت نہیں کرو گے۔" بے لچک لہجے میں کہتی وہ اٹھ کر چلی گئیں ہارون بے چارگی سے ان کی پشت دیکھتا رہا۔ آخر کئی دنوں کی منت سماجت کے بعد وہ صرف اوپر کے کاموں کے لیے لڑکی رکھنے پر رضامندی ہوئی تھیں ام ثمینہ کے لیے یہ بھی بہت تھا۔

☆ ☆ ☆

"مہارانی صاحبہ! اگر آرام سے فرصت مل گئی ہو تو اوپر جا کر کپڑوں کو دیکھ لو سلامت بھی ہیں یا جل جل کر راکھ ہو چکے ہیں۔" ام ثمینہ کچن کی گرمی سے آنے کے بعد دو گھڑی کمر سیدھی کرنے لیٹی تو اماں کی تیز آواز گونجی۔ اسے رونا آ گیا ایک تو اتنی طبیعت خراب اوپر سے ان کی روز بروز بڑھتی تلخ مزاجی اور سختی ایسے میں ہارون کی محبت کا سہارا نہ ہوتا تو وہ کب کا مر چکی ہوتی چکراتے سر کو بمشکل سنبھالتے اوپر آ گئی۔
یہ سب کام کمو کے ذمے تھا جو اوپر کے کاموں کے لیے رکھی گئی تھی مگر اماں اسے اپنے ذاتی کاموں تک محدود رکھتی تھیں۔ چلچلاتے سورج کی گرمی سے بے حال ہوتے ہوئے وہ جلدی جلدی کپڑے اکٹھے کرنے لگی کپڑوں کے بنڈل کے ہمراہ وہ سیڑھیاں اترنے لگی۔ دھوپ آشنا آنکھیں نیم تاریک سیڑھیوں میں ٹھیک سے دیکھ نہیں پا رہی تھیں جی الگ متلا رہا تھا وہ ابھی درمیانی سیڑھی پر تھی کہ اسے زور کا چکر آیا ایک ہاتھ سے کنپٹی دبا کر دوسرے ہاتھ سے کپڑے سنبھالتے ہوئے اس نے اترنے کی کوشش کی کپڑوں کے ڈھیر سے لٹکتا چادر کا کونا اس کے پاؤں کے نیچے آیا وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور اگلے ہی پل رول ہو کر

سیڑھیوں سے گرتی چلی گئی سارے کپڑے ہوا میں اڑ اڑ کر ادھر ادھر گرنے لگے 'پورا گھر اس کی دلدوز چیخوں سے گونج اٹھا وہ اب نیچے سیڑھیوں کے پاس بے سدھ پڑی تھی کی سفید چادر ہوا میں اڑ کر لہرائی اور آہستہ آہستہ نیچے اتر کر اس کے خون میں ڈوبے وجود کو ڈھانپ لیا۔

☼ ☼ ☼

سنجیدہ خاتون اس وقت سجدے کی حالت میں زارو قطار روئے جارہی تھیں ان کی آنکھ سے ٹپکنے والا ہر آنسو سیدھا ان کے دل پر گر کر دل کی سیاہی بھی اپنے ساتھ بہائے لیے جارہا تھا بہت دیر اللہ کی بارگاہ میں معافی مانگنے اور گریہ زاری کے بعد انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو آنسوؤں میں مزید تیزی آگئی۔ آج ان کی ہر دعا کا عنوان ام ثمینہ تھی جو اس وقت آئی سی یو میں زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی تھی۔ اس کی اس حالت کی ذمہ دار وہ بجا طور پر خود کو سمجھتی تھیں نہ وہ اتنی کٹھور بنتیں اور نہ یہ سب کچھ ہوتا گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی تو وہ تیزی سے باہر آئیں' آنے والا ہارون تھا ان کا بہت دل چاہا وہ اس سے ثمینہ کے متعلق پوچھیں مگر بات کرنے کی ہمت کہاں سے لاتیں اس لیے چپ چاپ کھڑی رہیں۔ ہارون نے بھی بغیر کچھ کہے اک سرسری نظر ان پر ڈالی اور ان کے پاس سے گزرتا چلا گیا ویسی ہی نظر جیسی ام ثمینہ کو ہسپتال لے جاتے وقت ان پر ڈالی تھی۔

ثمینہ کی چیخ کی بازگشت ابھی باقی تھی جب ہارون ضروری فائل لینے گھر آیا سیڑھیوں کے پاس اس کا بے جان وجود خون میں ڈوبا تھا۔ سفید چادر جس کے کنارے لہو میں رنگ چکے تھے کفن کی مانند کندھوں تک اس کے اوپر پڑی تھی۔

"ام ثمینہ! ثمینہ یہ، یہ کیا ہوا' اماں کیا ہوا میری ثمینہ کو۔" یہ سب اس کے ہوش گم کرنے کو کافی تھا اس نے اماں کو جھنجوڑ کر ان سے پوچھا جو ابھی تک بے یقینی سے کبھی اسے اور کبھی ام ثمینہ کو دیکھے جا رہی تھیں۔

"وہ' وہ صاحب جی' باجی اوپر سے کپڑے اتارنے گئی تھیں۔" اماں کی بجائے پاس کھڑی گمو نے جواب دینا چاہا ہارون نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تم مر گئی تھیں کیا' تمہیں آخر اس گھر میں رکھا کس لیے گیا ہے۔" غصے سے اس کی آواز پھٹ پڑی تھی۔

"وہ' وہ صاحب جی مجھے بیگم صاحب نے منع کیا تھا ورنہ یہ کام تو میرے ذمے ہے۔" ہارون کے غصے سے خائف ہو کر وہ رو پڑی' ہارون بے یقینی سے اماں کو دیکھنے لگا۔ دفعتاً" اسے خیال آیا یہ وقت ان باتوں میں ضائع کرنے کا نہیں ہے۔ ام ثمینہ کو فوری ٹریٹمنٹ کی ضرورت ہے۔ اس نے لپک کر اسے دونوں ہاتھوں میں اٹھایا اور ماں کی بجائے گمو کو ساتھ آنے کا کہہ کر تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھا' دروازہ کھولنے سے پہلے مڑ کر ایک نظر ان پر ڈالی بے یقینی' دکھ' بے بسی' غصہ' اذیت کیا کچھ نہیں تھا اس ایک نظر میں' وہ ٹوٹ گئیں۔ وہ اب تک اسی نظر کے زیر اثر تھیں۔ ہارون اب کیش لینے آیا تھا سیف سے پیسے نکالنے کے بعد تیزی سے واپس پلٹا' برآمدے میں پچھتاوے کے آنسو بہاتی ماں کے پاس پل بھر رکا وہ ماں تھیں بیٹے کی خاموشی کی زبان پڑھ سکتی تھیں انہیں لگا جیسے وہ کہہ رہا ہو "ماں یہ تو نے کیا کیا۔" اس سے زیادہ انہیں پڑھنے کا حوصلہ نہ ہوا وہ منہ پر دوپٹہ رکھ کر روتی ہوئی تیزی سے اندر چلی گئیں وہ تاسف سے انہیں دیکھتے ہوئے شکستہ قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ خوشیوں کی کھیتی اندیشوں کی ظالم چڑیوں نے اجاڑ دی تھی۔ اب ہر پچھتاوا بے کار تھا۔

☼ ☼ ☼

ہارون مرتضیٰ خوبصورت سائنبورڈ تھامے کب سے گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا مگر اندر جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی یہ تو ڈیڑھ ماہ سے اس کا روز کا معمول تھا ام ثمینہ کے ساتھ ہونے والے حادثے نے گویا ان سب کی زندگی ہی بدل دی تھی' یہ سب کی

بہت دعائیں رہی تھیں جو وہ موت کی سرحدوں کو چھو کر واپس آگئی تھی مگر باوجود کوشش کے ڈاکٹرز بچے کو بچانے میں ناکام رہے تھے گمو کی زبانی جب اس کے والدین کو اس کے حالات پتا چلے تھے وہ بہت ناراض ہوئے تھے ام ثمینہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ انہوں نے اسے پھولوں کی طرح رکھا تھا شادی کے بعد اس کے ساتھ یہ سب ہوگا یہ تو ان کے وہم و گمان میں نہیں تھا۔ ممتاز بیگم تو باقاعدہ ہچکیوں سے رو دی تھیں۔ ہارون الگ شرمندہ تھا جبکہ سنجیدہ خاتون وہ تو گویا گوشہ نشین ہو چکی تھیں کھانا پینا سونا سب بھول کر مصلا سنبھالے بیٹھی رہتی تھیں۔ انہیں اپنی غلطی کا پورا پورا احساس ہو گیا تھا۔ ایک ہفتے بعد ام ثمینہ ڈسچارج ہوئی تو ممتاز بیگم اسے اپنے ساتھ لے آئیں تب سے اب تک وہ میکے میں تھی ہارون روز اس سے ملنے آتا تھا۔

ممتاز بیگم لان میں پودوں کو پانی دے رہی تھیں اس کے سلام کرنے پر سر پر ہاتھ پھیر کر حال چال بھی پوچھا اسے بہت خوشی ہوئی ورنہ شروع شروع میں ان کا رویہ بہت روکھائی لیے ہوتا تھا وہ ان کی اجازت سے اوپر ثمینہ کے کمرے میں چلا آیا۔

سامنے کی دیوار پر جگہ جگہ خوبصورت بچوں کی تصویریں ایستادہ تھیں۔ بیڈ کے دائیں طرف نفیس جھولا کھلونوں سے بھرا ہوا تھا۔ الماری کا ایک پٹ کھلا تھا اس میں بھرے بچوں کے کپڑے صاف نظر آرہے تھے یہ کمرہ ممتاز بیگم اور رضا صاحب نے آنے والے مہمان کے لیے اپنے ہاتھوں سے سجایا تھا۔ اب ام ثمینہ یہ سب ہٹانے نہیں دیتی تھی۔ وہ سامنے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی گود میں خوبصورت بچے کی تصویر تھی وہ کبھی انگلی کی پوروں سے اسے محسوس کرنے کی کوشش کرتی اور کبھی بے اختیار چومنے لگتی۔ ملگجے کپڑے' الجھے بال' موٹی موٹی آنکھوں میں صدیوں کی ویرانی نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ اسے اس حال میں دیکھ کر ان سب کے دلوں پر جو بیتی تھی یہ ان کا رب ہی جانتا تھا وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے سامنے آ بیٹھا اس نے حسب معمول اس کی آمد کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اس نے پھول بڑھایا ثمینہ نے معمول کی طرح لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا جہاں اس طرح کے کئی مرجھائے پھول پڑے تھے کچھ نیچے کارپٹ پر بکھرے تھے۔

"کیسی ہو؟" جواباً" ثمینہ نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا اس کی نظروں کا خالی پن ہارون کو روح میں اترتا محسوس ہوا۔ اس نے نظریں پھر سے تصویر پر مرکوز کر دیں وہ گھنٹہ بھر اس کے ساتھ بیٹھا اس سے باتیں کرتا رہا مگر پھر اس نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اسے واپس آفس جانا تھا وہ اس کا ہاتھ دبا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دروازے میں رک کر پیچھے دیکھا دونوں کی نظریں ٹکرائیں ثمینہ کی آنکھوں سے دو موتی ٹوٹ کر چہرے پر لکیر بناتے ہوئے تصویر پہ جا رکے ہارون نے آنکھیں موند کر طویل سانس کے ذریعے اندر کی گھٹن کو کم کرنا چاہا اور جیبوں میں ہاتھ ڈال کر آگے بڑھ گیا مگر قدم بہت بھاری ہو چکے تھے۔

☼ ☼ ☼

"ارے میں پوچھتی ہوں کس منہ سے ہارون نے میری بیٹی کو لے جانے کی اجازت مانگی ہے اگر اللہ تعالیٰ کے کرم سے اس کی جان بچ گئی ہے تو وہ لٹی باقی ہے کیا؟" اونچی آواز میں تیز تیز بولتی ممتاز بیگم سخت غصے میں تھیں۔

"بیگم ہم ساری عمر بیٹی کو گھر بھی تو نہیں بٹھا سکتے۔" رضا صاحب نرمی سے انہیں سمجھانے لگے حالانکہ ام ثمینہ کو واپس بھیجنے کو دل تو ان کا بھی نہیں مان رہا تھا یہ تو ان کا رب ہی جانتا تھا کیسے انہوں نے اپنی نازوں پلی بچی کی شکستہ حالت برداشت کی تھی وہ دونوں تو اسے آئی سی یو میں دیکھ کر حواس کھو بیٹھے تھے یہ ہارون ہی تھا جس نے اس نازک وقت میں ان کو سنبھال کر امید کی شمع ان کے ہاتھوں میں تھمائی تھی۔ وہ رات بہت بھیانک بہت طویل تھی ان سب نے رب کے حضور رو رو کر ام ثمینہ کی زندگی مانگی تھی یہ اس رب کی

رحمت تھی جو وہ موت کی دہلیز پر زندگی کا دامن تھامنے میں کامیاب ہو سکی تھی ورنہ ڈاکٹرز تو جواب دے چکے تھے۔ آج ہارون نے ام ثمینہ کو لے جانے کی بات کر کے ان کے زخم تازہ کر دیے تھے۔

"بات تو آپ کی بھی ٹھیک ہے رضا صاحب! بیٹی کو ساری عمر گھر بٹھانا والدین کے لیے آزمائش سے کم نہیں ہوتا۔" ان کے کافی دیر سمجھانے پر وہ ان سے متفق ہوتے ہوئے بولیں۔

"نیک بخت یہی تو میں تمہیں اتنی دیر سے سمجھا رہا ہوں۔"

"وہ تو میں سمجھ گئی ہوں مگر میری بات بھی آپ کان کھول کر سن لیں میں اس گھر میں اپنی بیٹی کو دوبارہ نہیں بھیجوں گی جہاں اس کی حیثیت دو کوڑی کی بھی نہ ہو۔ سنجیدہ خاتون نے تو حد ہی کر دی ساری باتیں ایک طرف ام ثمینہ کا آپریشن ہوا وہ اتنے دن ہسپتال میں زندگی و موت کی جنگ لڑتی رہی آنا تو دور کی بات انہوں نے فون تک نہیں کیا میری بیٹی ان کی دشمن تو نہیں تھی اکلوتی بہو تھی مگر وہ۔" کوئی سخت بات کہنے سے انہوں نے بمشکل خود کو روکا مگر آنکھوں میں آئے آنسو ضبط نہ کر سکیں۔ اب انہیں کون بتاتا سنجیدہ خاتون تو ندامت میں غرق بیٹے کا سامنا کرنا تک چھوڑ چکی تھیں بہو اور سمدھیوں کا سامنا کرنے کی ہمت کہاں سے لاتیں۔

"بس جی! آپ ہارون سے صاف صاف کہہ دیجیے بلکہ میں خود ہی بات کر لوں گی اگر ہماری بیٹی کو لے جانا چاہتا ہے تو اس کے لیے الگ گھر کا بندوبست کرے ورنہ بیٹی کی دو روٹیاں ہم پر بھاری نہیں ہیں۔" انہوں نے قطعیت سے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے بات ختم کر دی۔ رضا صاحب پر سوچ انداز میں سر ہلانے لگے۔

✡ ✡ ✡

تالاب کے درخت کے سب سے اوپری ٹہنی پر چڑیا نے اپنا گھونسلا بنایا تھا دن بھر کے تلاش کے بعد وہ دانا دنکا اکٹھا کر لائی تھی اور اب اپنے خالی پیٹ کی پروا کیے بغیر شور مچاتے بچوں کو پیار سے کھلا رہی تھی۔ ام ثمینہ کھڑکی سے ٹیک لگائے بڑی محویت سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ دروازے پر کھٹکا ہوا اس نے مڑ کر دیکھا دروازے پر ابا تھے اس نے جلدی سے دوپٹہ سر پر اوڑھ لیا وہ کھڑکی کے پاس کاؤچ پر آ بیٹھے وہ فلور کشن پر ان کے قریب بیٹھ گئی اور ہاتھ ہمیشہ کی طرح ان کی گود میں رکھ دیے جسے چوم کر وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے ام ثمینہ کی دیوانوں جیسی حالت اب مزید برداشت کرنے کا ان میں یارا نہیں تھا وہ مہینے غم منانے کو بہت تھے آج وہ اسے سمجھانے آئے تھے اس لیے بغیر کسی تمہید کے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر پوچھنے لگے۔

"اللہ پاک ہم سے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے نا؟" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ماں کبھی اپنے بچے کا برا چاہتی ہے۔" انہوں نے پھر پوچھا اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو میری جان ہم سے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والا اللہ، استغفر اللہ تمہارا برا کیسے چاہ سکتا ہے؟" وہ ان کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے پھر قدرے توقف سے بولے۔

"ایک بندے کی چاہت ہوتی ہے اور ایک اللہ کی چاہت ہوتی ہے مگر ہوتا وہی ہے جو اللہ کی چاہت ہوتی ہے اور جو اللہ کی چاہت پر راضی نہ ہوں وہی لوگ فاسقین ہوتے ہیں اللہ کے نافرمان۔"

"اللہ کی نافرمان۔" اس نے زیر لب دہرایا وہ پوری کی پوری کانپ گئی اور بے ساختہ کہہ اٹھی۔

"میں اللہ کی چاہت پر راضی ہوں۔" رضا صاحب نے مسکراتے ہوئے اس کا سر اوپر اٹھایا اور اس کے آنسو پونچھے۔

"پھر رو رو کے یہ ماتم کیسا؟" وہ شرمندگی سے کٹ کر رہ گئی۔

"اللہ پاک کو وہ بندے سخت ناپسند ہیں جو اس کی تقسیم پر راضی نہیں ہوتے وہ ان سے ان کی چاہت

بھی چھین لیتا ہے اور جو اللہ کی چاہت پر راضی ہوں انہیں ان کی چاہت بھی بخش دیتا ہے کیونکہ بے شک وہ ہر چیز پر قادر ہے۔" ان کے لفظوں کی تاثیر سکون بن کر اس کے دل پر اتر رہی تھی۔ رضا صاحب جو اس کے چہرے کے آثار چڑھاؤ کا بغور جائزہ لے رہے تھے پھر بولے۔

"بیٹا! یہ دنیا آزمائشوں کا گڑھ ہے ایمان والوں کو کبھی ان کے مالوں کے ذریعے آزمایا جاتا ہے کبھی اولاد کے ذریعے آزمایا جاتا ہے۔ اور کامل ایمان والے وہی ہوتے ہیں جو ان آزمائشوں پر پورا اترتے ہیں یہ جو سب کچھ ہوا یہ آپ کی آزمائش ہے۔ آپ تعلیم یافتہ ہیں باشعور ہیں۔ اب یہ آپ پر ہے کہ آپ اپنا نام فاسقین میں لکھواتی ہیں یا مومنین میں۔" فیصلہ اس پر چھوڑ کر وہ چلے گئے ام ثمینہ ان کی باتوں کے زیر اثر کتنی دیر سن ہو کر بیٹھی رہی۔

✡ ✡ ✡
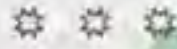
"ہارون بیٹا! اگر آپ ام ثمینہ کو لے جانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے آپ کو الگ گھر کا انتظام کرنا ہوگا۔ آگے آپ کی مرضی۔"

میں آج ام ثمینہ کو لینے آیا تھا مگر ابا کے الفاظ مجھے ساکت کر گئے گاڑی کا دروازہ جھٹکے سے کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں بہت لمبی مسافت طے کر کے لوٹا ہوں۔

میں ہارون مرتضیٰ سیٹ بیک سے ٹیک لگا کر اپنا محاسبہ کرنے بیٹھا تو معلوم ہوا یہ کام کوئی آسان کام نہیں۔ میرے والد کا انتقال میرے بچپن میں ہی ہو گیا تھا ان کے بعد اماں نے اپنے جینے کا مقصد مجھے بنا لیا اپنی ساری توجہ، سارا پیار، سارا وقت میرے نام کر دیا تھا۔ میں نے بھی ہمیشہ ان کی محبت کا مان رکھا کبھی نافرمانی نہیں کی جب شادی کا وقت آیا تب بھی سب کچھ ان پر چھوڑ دیا میری صرف اتنی شرط تھی کہ میری ہم سفر تعلیم یافتہ ہو اس طرح ام ثمینہ میری زندگی میں شامل ہو گئی مگر ہر ماں کی طرح اماں کو بھی بہو کے آنے کے بعد بیٹے کی نگاہیں بدل جانے کا خدشہ تھا تعلیم یافتہ لڑکیوں سے تو وہ ویسے بھی خائف تھیں۔ مجھ سے بنیادی غلطی یہیں پر ہوئی اپنے پیار توجہ اور محبت سے ان کے خدشے دور کرنے کی بجائے میں نے ان سے وعدہ کر لیا کہ کبھی گھریلو معاملات میں مداخلت نہیں کروں گا۔ پھر اس کے بعد گھر میں جو کچھ بھی ہوتا رہا میں آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھا بنا رہا۔ شاید اس طرح میں اپنی فرماں برداری ثابت کرنا چاہتا تھا مگر میں قطعاً" فراموش کر بیٹھا تھا کہ جس طرح ماں کو خوش رکھنا میری اولین ذمہ داری ہے ویسے ہی ام ثمینہ میری بیوی، میری رعیت ہے۔ جس کے لیے میں اللہ کی بارگاہ میں جواب دہ ہوں۔ شاید میری اسی غفلت کی مجھے اتنی بڑی سزا ملی اگر میں اعتدال سے کام لیتا اماں کو پوری توجہ، عزت اور مان دیتا جس کی بلاشبہ وہ حق دار ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ام ثمینہ کو بھی اپنی زندگی اور گھر میں اس کا جائز مقام دیتا تو آج مجھے یوں دو حصوں میں نہ بٹنا پڑتا۔

اماں اور ام ثمینہ میری زندگی میں آج تک یہی دو عورتیں آئی تھیں اور دونوں ہی مجھے جان سے زیادہ عزیز تھیں میں ام ثمینہ کے لیے اماں کو چھوڑ سکتا تھا اور نہ شاید اماں کے لیے ام ثمینہ کو چھوڑنے کا حوصلہ مجھ میں تھا میری غلطیوں نے مجھے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ اس وقت میرے پاس "کاش" کے سوا کچھ نہ تھا جس طرح زبان سے نکلا لفظ اور کمان سے نکلا تیر واپس نہیں آ سکتا اسی طرح اس کاش کی شدت و حسرت گزرا وقت لوٹانے سے قاصر تھی اور میں بے بس تھا۔

✡ ✡ ✡

نیلے آسمان پر روئی کے گالوں کی طرح بکھرے اکا دکا بادل ڈوبتے سورج کے رنگ میں رنگے تھے پرندوں کے غول کے غول اپنے پروں میں دن بھر کی تھکن سمیٹے اپنے آشیانوں کو رواں دواں تھے۔ سنجیدہ خاتون بہت افسردگی سے یہ منظر دیکھ رہی تھیں کیا پرندے تو ان کے آشیانے کے بھی اڑ چکے تھے شاید کبھی نہ لوٹنے

کے لیے مخریہ جانے کیوں سرِشام ہی انتظار کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔

ابھی کل ہی تو ہارون نے بتایا تھا اسے پاس والی نئی کالونی میں آفس کی جانب سے گھر ملا ہے حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھیں گھر کی سہولت تو کمپنی کی طرف سے شروع سے میسر تھی ہاں مگر اس سہولت سے مستفید ہونے کی ضرورت اب پیش آئی تھی مگر انہیں کوئی گلہ نہیں تھا وہ ہارون کو حق بجانب سمجھتی تھیں۔

اس نے انہیں یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ ان کے فرائض کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہیں کرے گا گزرے دنوں نے انہیں سرتاپا بدل دیا تھا ان کی ہٹ دھرمی اور دبدبا قصہ پارینہ بن چکا تھا کسی نے ان سے کچھ نہیں کہا تھا نہ ام ثمینہ کے والدین جواب طلبی کرنے آئے تھے نہ ہی ہارون نے ان سے کچھ کہا تھا اب تو اس کی آنکھیں بھی شکوہ کرنا چھوڑ چکی تھیں مگر سب کی سرد چپ نے انہیں توڑ ڈالا تھا۔ ضمیر کی عدالت میں جب جب حاضر ہوتیں خود کو قصوروار پاتیں وہ اپنے کیے پر بہت شرمندہ تھیں۔ ام ثمینہ کا صبر بے سکونی بن کے ان پر نازل ہوا تھا وہ ہر وقت بے چین رہتی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو ام ثمینہ سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتیں مگر اس کا سامنا کرنے کی ہمت کہاں سے لاتیں۔

اذان مغرب کی روح پرور آواز ہوا کی دوش پر سفر کرتی ان تک پہنچی وہ فوراً" اٹھ کھڑی ہوئیں۔

بے سکون دل کو سکون کی ضرورت تھی اور سکون بارگاہ الٰہی کے سوا کہاں مل سکتا تھا۔ انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو اپنی ساری خطائیں پھر سے یاد آنے لگیں وہ رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتی رہیں۔ باہر آئیں تو آسمان پر ستارے نکل آئے تھے۔ انہیں گھر کی تاریکی سے ہول اٹھنے لگے۔ دروازے پر کھٹکا ہوا' وہ ساری بتیاں جلا کر پلٹیں' دروازے پر نظر پڑتے ہی حیرت سے ساکت ہو گئیں۔

☆ ☆ ☆

گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے ہارون کی نظریں بار بار اپنے پہلو میں بیٹھی ام ثمینہ کی طرف اٹھ رہی تھیں جن میں ستائش سے زیادہ حیرت تھی۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں آپ؟" اس نے مسکرا کر پوچھا وہ جانتی تھی کہ بہت اچھی لگ رہی ہے آخر وہ دل سے جو تیار ہوئی تھی۔

"بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔" وہ اپنا سوال اس کی دل آزاری کے خیال سے گول کر گیا۔

"آپ اسی بات پر حیران ہیں نا کہ کل تک مجھے اپنا ہوش نہیں تھا اور آج اتنا بن سنور کر چمک رہی ہوں۔" اس نے ہارون کی آنکھوں میں اپنے عکس کو بغور دیکھا۔

"بات دراصل یہ ہے ہارون کہ میں فاسقین میں نہیں مومنین میں اپنا نام لکھوانا چاہتی ہوں جو اللہ کی چاہت پر سر جھکا دیتے ہیں اور اللہ پاک انہیں ان کی چاہت بخش دیتا ہے۔" وہ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر فلسفیانہ انداز میں بولی وہ کچھ سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ میں خالی پن تھا۔ الگ رہنے کی صورت میں اسے یہ خالی پن اسے ساری زندگی جھیلنا تھا کیونکہ ہارون نہ اس کے بغیر خوش رہ سکتا تھا اور نہ ہی اماں کے بغیر یہ وہ اچھی طرح جانتی تھی۔

"بائیں طرف نہیں گاڑی دائیں طرف موڑ دیں۔" مین روڈ کراس کرنے کے بعد سامنے دو راہا تھا بایاں راستہ نیو کالونی والے مکان کی طرف جاتا تھا جبکہ دایاں راستہ ان کے گھر کی طرف۔

"مگر کیوں؟ کیا سامان اٹھانا ہے۔ تم مجھے بتا دیتیں میں بعد میں لے آؤں گا۔"

"نہیں میں نے ابھی جانا ہے۔" بغور اس کی حیرانی دیکھتے ہوئے وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتی قطعیت سے بولی۔

"مگر۔" ہارون نے کچھ کہنا چاہا مگر وہ رخ موڑ کر سڑک کے کنارے بھاگتے درخت گننے لگی ہارون نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کندھے اچکا کر گاڑی گھر کے راستے پر ڈال دی۔

جب وہ گھر پہنچی تو اماں گھر کے اندھیرے دور کر چکی تھیں۔ انہیں اکٹھے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ حیرت تو اسے بھی بہت ہوئی تھی وہ تو جیسے نچڑ کر آدھی رہ گئی تھیں۔ بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ ام ثمینہ اچھی طرح جانتی تھی احساس ندامت اور یہ صدمہ ان کے لیے بھی بہت بڑا تھا گرمیوں کی کتنی طویل دوپہریں چوری چوری انہوں نے بھی تو تھکے تھکے سے کپڑے سی کر گزاری تھیں ہر ٹانکے کے ساتھ کتنے ارمان اور سپنے جوڑے ہوں گے۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ ان کی پلکیں بارِ ندامت سے جھکی جا رہی تھیں۔ اچانک ان کے ساکت وجود میں حرکت ہوئی انہوں نے اپنے ہاتھ اٹھا کر اس کے سامنے جوڑنے چاہے اس کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔

"اماں یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔ اللہ کے واسطے مجھے گناہ گار تو مت کیجیے۔" اس نے جڑنے سے پہلے ہی ان کے ہاتھ تھام کر چوم لیے۔ جو بھی تھا وہ اس کی ماں کی جگہ تھیں۔

"گناہ گار تو میں ہوں تیری۔ مجھے معاف کر دے میری بچی۔" وہ اسے گلے لگا کر زارو قطار رو دیں۔

"اگر آپ کے خلاف میرے دل میں کوئی شکوہ کوئی شکایت کوئی بغض ہوتا تو میں کبھی واپس اس گھر میں اپنی زندگی کی نئی شروعات کرنے نہ آتی۔" اس نے ان کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا تو ان کے ساتھ ساتھ ہارون بھی چونک کر حیرت اور خوشی سے اسے دیکھنے لگا۔

سنجیدہ خاتون کتنی ہی دیر اس کا چہرہ ہاتھوں میں لیے بے یقینی سے دیکھتی رہیں۔

"تیرا ظرف اتنا بڑا کیسے ہے؟"

"کیونکہ اماں میں تعلیم یافتہ ہوں۔ تعلیم نے ہی میری سوچوں اور ظرف کو وسیع کیا ہے۔ تعلیم ہی نے مجھے مقدر کی حقیقت باور کرائی ہے یہ میری تعلیم ہی ہے جس نے مجھے معاف کرنے کی عظمت سے آگاہ کیا ہے۔" وہ سادگی سے بولی۔ انہوں نے اس کا ماتھا چوم کر تعلیم یافتہ لڑکیوں کے متعلق اپنی غلط سوچ پر شرمندہ ہوتے ہوئے پھر سے گلے لگا لیا۔ آج انہیں اس بات پر فخر محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی بہو تعلیم یافتہ ہے۔

اماں کی نظروں میں اس کے لیے جو عقیدت تھی اور ہارون کی نظروں میں اس کے لیے جو فخر تھا وہ اسے اپنی آنکھوں میں معتبر کر رہا تھا۔

چاند کی چاندنی ایک دم سے زیادہ ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ ستاروں کی چمک میں بھی اضافہ ہوا تھا اس کے بالوں سے چھیڑ چھاڑ کرتی ہوا بھی بہت خوش تھی اسے ایسا لگا جیسے یہ سب اس کے فیصلے پر خوش ہوتے ہوئے آنے والی خوشیوں کی نوید دے رہے ہوں۔ اس نے سرشار ہو کر آنکھیں موند لیں۔

☆☆ ☆☆

عائشہ نصیر

رات کے نو بج رہے تھے اور متوقع بارش کے ڈر سے امی نے اسے اسی وقت چھت پر سے کپڑے اتار لانے کا آرڈر جاری کیا تھا اور چونکہ شام میں وہ اپنا واک مین چھت پر بھول آئی تھی سو اسی لیے خلاف توقع بنا چوں وچرا ان کا حکم ماننے میں ہی بھلائی سمجھی۔

اس وقت تار پر سے کپڑے اتارتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا تو دل ہی دل میں امی کے بے بنیاد خدشے پر ہنسی آئی۔ وہاں تو تاحد نگاہ تک بادل کا کوئی چھوٹا سا ٹکڑا بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ کہاں کہ بارش ہوتی۔ تارے البتہ خوب بکھرے پڑے تھے آسمان کی

مکمل ناول

رونق بڑھانے کو۔ لیکن امی کی احتیاط پسند طبیعت کہ بارش نہ بھی ہوئی تو ساری رات اوس گرتے رہنے سے کپڑوں میں ایک عجیب سی بو رچ بس جائے گی۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر سب سے پہلے تو واک مین گلے میں لٹکایا اور پھر دونوں بازوؤں میں کپڑے سمیٹتے ہوئے سیڑھیاں اترنے لگی۔ مبرین کا دوپٹہ اور احد کی قمیص تو پوری زمین پر گھسٹ رہی تھی لیکن نہ تو اس نے دیکھی تھی اور نہ ہی اسے کوئی پروا تھی۔ چھت کی سیڑھیوں کا آخری زینہ طے کرتے ہی اچانک بجلی چلی گئی۔

"اوہ نو۔" گھپ اندھیرا چھا گیا کہ اسے ایک لمحے کے لیے اپنا آپ اندھا محسوس ہوا تھا۔

"اب کیا کروں۔۔۔ اتنے اندھیرے میں سیڑھیاں اتروں گی تو کہیں گر گرا نہ جاؤں۔" کسے تو سوچ کر ہی جھرجھری آگئی۔

"فائقہ۔ ثمر۔ فیصل کوئی ہے کیا۔ پلیز کوئی موم بتی جلا دو، کوئی تو جواب دو۔ کہاں مر گئے ہو سب کے سب۔" سیڑھی پر کھڑی آوازیں دیتے اسے اب ڈر لگنا شروع ہو گیا تھا۔ وہاں بالکل سکون اور خاموشی تھی اس کا مطلب تو یہی تھا کہ چچی کے پورشن میں اس وقت کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔ بچے بھی نیچے تھے اور وہ وہاں اس وقت اکیلی تھی۔

"یہ میں کسے آوازیں دے رہی ہوں۔ کوئی ہوتا تو جواب دے دیتا۔ اب اگر میری آواز سن کے کسی بھوت نے جواب دے دیا تو۔" یہ خیال آتے ہی اس کے جسم میں پھریری سی دوڑ گئی اور وہ مزید رکے بنا دھیرے دھیرے سیڑھیاں اترنے لگی تب نچلی سیڑھیوں سے فائقہ کو موم بتی ہاتھ میں پکڑے آتے دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔

"شکر ہے آگئیں تم ذرا جو کسی کا احساس ہو تم لوگوں میں مجھے تو اوپر کپڑے لانے بھیج دیا اور اب یہ بھی نہیں سوچا کہ لائٹ تو چلی گئی ہے میں نیچے آؤں گی کیسے۔" اس کے قدموں میں قدرے تیزی آگئی تھی۔

"لائٹ گئی تھی۔ سیڑھیاں تو وہیں دھری رکھی تھیں پھر تمہیں نیچے اترنے میں کیا مشکل درپیش تھی۔" فائقہ نے فوراً جواب دیا تھا۔

"وہ میں۔ بس ان کپڑوں کی وجہ سے۔" جلدی نیچے اترنے کی کوشش میں اس کا پیر کسی چیز میں اٹکا اور وہ بے ساختہ چیختی ہوئی فائقہ کو لیتے ہوئے زمین پر

جاگری۔
"اف ثانی! ستیاناس ہو تمہارا' موٹو تم میری ہڈی پسلی ایک کردی۔" تکلیف سے کراہتے فائقہ نے اسے ایک دھموکا رسید کیا۔
"ہائے میری کمر۔" اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے درد کی ایک تیز لہر کمر میں اٹھی تھی جو اسے پھر سے بیٹھنے پر مجبور کر گئی اور ثانیہ پر تو جیسے ہنسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔
"خود تو صحیح سلامت ہو نا' اس لیے اتنے دانت نکل رہے ہیں۔" فائقہ کو اس کی ہنسی دیکھ کر مزید غصہ آنے لگا۔
"اپنے دو من کے وزن کے ساتھ تم نے جو حشر میرا کیا ہے۔ اس کے لیے میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔"
"میں اگر تمہارا حشر نہ کرتی تو میرا حشر ہو جاتا۔ تھینک گاڈ کہ سامنے تم تھیں۔" اس نے بمشکل ہنسی کو بریک لگاتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔
"چلو اٹھو اب۔ اتنی چوٹ بھی نہیں لگی ہوگی جتنا واویلا کر رہی ہو تم۔ تمہاری عادت کا پتا ہے مجھے۔"
"اچھا۔ مجھے لگی ہے نا۔" فائقہ اسے گھورتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
"فائقہ! یہ موم بتی۔ ارے۔" موم بتی کے بارے میں استفسار کرتے ثانیہ اچانک چیخ اٹھی تھی کیونکہ موم بتی ایک طرف پڑی نا صرف ابھی تک جل رہی تھی بلکہ اپنے شعلوں کی لپیٹ میں احد کی شرٹ کو بھی لے لیا تھا۔
"ادھرو۔ بجھاؤ ذرا" زرد پڑتے چہرے کے ساتھ کہتے اس نے فائقہ کو جھنجھوڑ ڈالا۔ جو خود بھی یہ منظر دیکھ کر دم بخود تھی۔
"جبھی میں کہوں کہ یہ موم بتی کی روشنی اتنی تیز کیسے ہو گئی۔" فائقہ دھیرے سے بڑبڑائی۔
"اب کھڑے کھڑے دیکھ کیا رہی ہو' یہ باقی کپڑے تو ہٹاؤ' نہیں تو سب میں آگ لگ جائے گی۔" اسے ڈانٹنے کے ساتھ اس نے خود ہی وہ شرٹ چٹکی میں پکڑ کر سائیڈ پر کردی۔
"احد میری جان لے لے گا۔" وہ یہ سوچ کر روہانسی ہو رہی تھی۔
"اچھا ہی کرے گا۔ تم ہو ہی اس قابل۔" پانی سے بھرا مگ لا کر شرٹ پر انڈیلتے فائقہ نے جل کر کہا تھا اور تب ہی لائٹ بھی آگئی۔
"صرف احد کی شرٹ جلانے کے لیے گئی تھی یہ لائٹ۔"
"کیا ہوا۔ یہ جلنے کی بو کہاں سے آ رہی ہے۔ کچھ جلا دیا کیا تم لوگوں نے۔" کچھ دیر میں سبھی سر پر کھڑے پوچھ رہے تھے۔
"ہاں۔ وہ۔ میں۔" ثانیہ نے اٹک اٹک کر کہنا شروع کیا۔
"نیچے آ رہی تھی تب اندھیرا تھا اور میں۔ اصل میں میرا پیر سبرین کے دوپٹے میں الجھا اور میں گر پڑی۔" نامکمل اور بے ربط سی بات کہہ کر وہ سب کے چہرے دیکھنے لگی۔
"بس اتنی سی بات پر جلا کیا؟" احد جو کسی کام سے فیصل کے ساتھ آیا تھا حیران لہجے میں پوچھنے لگا۔
"ابھی تم نے پوری بات سنی کہاں ہے۔ آگ کی کہانی میں سناتا ہوں۔" فیصل بولا تو سبھی کی حیرت بھری نظریں اس کی جانب اٹھ گئیں۔ سب سے زیادہ الجھن ثانیہ اور فائقہ کی آنکھوں میں تھی جنہیں پوری طرح سے نظرانداز کیے وہ اپنی ہانکنے لگا۔
"تو کیا ہوا کہ جب ثانیہ بی بی زمین پر گریں تو ایک زوردار دھماکہ ہوا اور زمین سے آگ کے شعلے بلند ہونے لگے اور اس بھڑکتی آگ میں سب سے پہلے خاکستر ہوئی احد میاں کی فیورٹ شرٹ۔" فیصل کی تیز نظروں نے فوراً" ہی کونے میں پڑی احد کی جلی ہوئی شرٹ تاڑ لی اور ادھر احد تو تڑپ ہی اٹھا یہ بات سن کر۔
"کیا۔ تم لوگوں نے میری شرٹ جلا دی۔ کون سی والی جلائی ہے۔ جلدی بولو۔ وہ میرون والی تو نہیں تھی نا۔" وہ بے تابی سے لہجے میں ثانیہ سے پوچھ رہا

وہ بے بسی سے ہاتھ مسلتے اضطراب میں سر ہلاتے ہی کے پیچھے چھپ گئی کہ اب احد کسی کے کنٹرول میں آنے والا نہیں تھا۔
"امی!" وہ چلا اٹھا۔
"دیکھیے اس نکمی' نالائق لڑکی نے میری شرٹ جلا دی۔ میں اسے چھوڑوں گا نہیں' میں اس کا خون پی جاؤں گا۔" صدمے سے اس کا برا حال تھا۔
"شرم کرو احد! ایک شرٹ کے لیے بہن کا خون پیو گے۔" چچی نے گھرکا تھا۔
"دیکھ لینا۔ کسی دن اسی طرح تمہاری بھی کسی نئی ڈریس میں آگ لگے گی اور جس طرح آج میری شرٹ جلی ہے۔ اسی طرح تم بھی اپنے کپڑوں کی راکھ پر بیٹھ کر آٹھ آٹھ آنسو بہاؤ گی۔" منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے احد کا لہجہ خاصا پرعزم تھا۔
"بس کرو احد۔ اب ختم کرو یہ سب۔ ایک شرٹ ہی تو تھی' میں تمہیں اس کے پیسے دے دوں گی۔" امی بے زار ہو گئیں اس بحث سے۔
"وہ تو میں لے ہی لوں گا۔ لیکن آپ لوگوں کو کیا پتا' شرٹ مجھے کتنی عزیز تھی۔" ڈائیلاگ بازی میں احد کا کوئی جواب نہیں تھا۔
"اب شرٹ بھی انہیں عزیز ہونے لگی گویا شرٹ نہ ہوئی کوئی غمگسار ساتھی ہو گیا۔"
"یقیناً" کسی گرل فرینڈ نے دی ہوگی۔" فائقہ نے رقت زدہ ہو کے سوچا۔
"سبرین! اگر یہ باقی کپڑے تم نیچے لے جاؤ۔" امی نے سبرین کو آواز دی۔ پھر ناگواری سے بولی تھیں۔
"اس ثانیہ کا کیا بھروسا' انہیں بھی کسی بھاڑ میں جھونک دے۔"
"امی پلیز! میں نے جان بوجھ کر کچھ نہیں کیا۔" ثانیہ خفگی سے بولی۔ احد اس پر ایک خونخوار نظر ڈال کر جانے ہی لگا تھا کہ فیصل کے پکارنے پر رک گیا۔
"یہ دیکھو' ایک کالر ہی صحیح سلامت بچا ہے' اسے اپنی عزیز از جان شرٹ کی آخری نشانی سمجھ کر سینے سے لگاؤ۔ بلکہ گلے میں لٹکاؤ۔" شرارت بھرے لہجے میں کہتے فیصل نے وہ کالر اس کے گلے میں لٹکانا چاہا۔
"شٹ اپ۔" حلق کے بل چلاتا وہ اسے ایک طرف پھینک کر دھم دھم کرتا سیڑھیاں اتر گیا امی بھی نیچے چلی گئیں اور ثانیہ فائقہ کے پیچھے اس کے کمرے میں چلی آئی۔

☼ ☼ ☼

"کہاں جا رہی ہو؟" بلیک موتیوں سے سجے خوبصورت بلیک شیفون کے ڈریس کو اس نے بڑی سی چادر میں چھپا تو لیا تھا لیکن اپنے چہرے کا کیا کرتی' جہاں نفاست سے کیے گئے میک اپ نے چہرے کی دلکشی مزید نمایاں کر دی تھی اور اس وقت جب ثانیہ کا خیال تھا کہ سبھی اپنے آفسز اور کالجز جا چکے ہوں گے احد نے اپنے کمرے سے نکل کر نا صرف اس کا یہ خیال غلط ثابت کر دیا بلکہ اب کڑے لہجے میں تفتیش بھی کرنے لگا تھا احد اس سے صرف دو سال ہی بڑا تھا مگر رعب اس طرح جماتا تھا جیسے دس سال بڑا ہو۔
"کالج۔" اس کی نظریں بلیک سینڈل میں مقید

لائٹ پنک نیل پالش سے سجے اپنے کومل دودھیا پیروں پر تھیں۔

"کتنے خوبصورت لگ رہے ہیں میرے پیر' کہیں انہیں میری نظر ہی نہ لگ جائے۔" اس نے گھبرا کر سوچا۔ اور ادھر احد جی بھر کے حیران ہوا اس کے جواب پر۔

"کیا۔ کالج؟ اور وہ بھی اس طرح تیار ہو کر۔"

"ہاں' وہ کالج میں فنکشن ہے نا۔" اس نے بے حد ضبط سے جتایا۔

"تمہارے کالج والوں کو اور کوئی کام نہیں ہے' جب دیکھو فنکشنز' پڑھائی کم اور پارٹیز زیادہ ہوتی ہیں کیوں؟۔"

"تو میں کیا کروں۔ یہ فنکشنز کیا میں ارینج کرواتی ہوں۔" وہ جھلائی۔ اچھا خاصا جا رہی تھی نہ جانے کہاں سے آ گیا تھا یہ دماغ چاٹنے کے لیے۔

"آج کس چیز کا فنکشن ہے؟" اس نے دوبارہ پوچھا تھا۔

"فائنل ایئر کی فیئر ویل پارٹی ہے۔" اس نے بتایا۔

"وہ تو فائنل ایئر کی ہے نا' تم کیوں جا رہی ہو۔" وہ اس کی جان چھوڑنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" اس کا صبر تمام ہو گیا۔

"امی' آکر جان چھڑائیں میری اس جنگلی سے۔" اس نے چلا کر امی کو آواز دی جو غالباً" اسی طرف آ رہی تھیں۔

"کیا ہوا' پھر جھگڑا شروع ہو گیا تم دونوں کا۔"

"کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔" احد اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔

"میں تو بس اتنا پوچھ رہا تھا کہ اکیلی کیوں کالج جا رہی ہے' جب سبرین اور فائقہ نہیں جا رہیں تو۔"

"وہ میرے کالج میں نہیں پڑھتیں۔" اس نے دانت پیس کر اطلاع دی۔

"اور میں روزانہ اکیلی ہی کالج جاتی ہوں۔"

"لیکن روزانہ میں اور آج میں بہت فرق ہے۔ آج

ہے امی' آج ٹرانسپورٹرز کی ہڑتال ہے۔" امی کو دیکھتے ہوئے اس نے رول کیا ہوا اخبار تانی کے سر پر مارا۔

"جھوٹ۔ بالکل جھوٹ' ایسی کوئی خبر اخبار میں نہیں آئی۔" تانیہ کا بس نہیں چل رہا تھا' اپنا سر دیوار سے مارے یا پھر احد کا سر پھاڑ دے۔

"باسی اخبار پڑھنے کے بجائے تازہ اخبار پڑھا کرو' بہت سی خبریں بروقت مل جایا کریں گی۔" احد کو اس کی تپی ہوئی شکل دیکھ کر بہت لطف آ رہا تھا۔ اصل آگ اسے تب لگی جب امی نے احد کی بات سنتے ہی جانے سے منع کر دیا۔

"ٹھیک کہہ رہا ہے احد۔ اگر واقعی ٹرانسپورٹرز کی ہڑتال ہے تو پھر کوئی ضرورت نہیں ہے کہیں جانے کی۔ اور بالفرض چلی بھی جاؤ تو آؤ گی کیسے۔ یہاں کوئی اتنا فارغ نہیں ہے کہ اپنے کام دھندے چھوڑ کر تمہیں لانے لے جانے کو بیٹھا رہے۔ رہو آرام سے گھر میں' وہاں کی تقریب تمہارے نہ جانے سے رک نہیں جائے گی۔" امی کا ایسا حتمی لہجہ سن کر وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ کہہ ہی نہیں پائی۔ وہ تو جب امی کچن جانے کے لیے پلٹیں تب اسے ہوش آیا۔

"امی! میری بات سنیے' مجھے کالج جانا ہے ہر حال میں' ہڑتال تو کیا آج کرفیو بھی لگا ہوتا میں تب بھی کالج جا کر دکھاتی' مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا گاڑی ملے نہ ملے' مجھے احد چھوڑ کر آئے گا۔" شدید غیظ و غضب میں اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔

"توبہ اس لڑکی کی زبان ہے یا دو دھاری تلوار' اب میرے منہ کو بھی آنے لگی' دنیا دیکھے گی تو مجھ پر تھو تھو کرے گی کہ یہ تربیت کی ہے بیٹیوں کی۔" وہ امی ماں تھیں' تانیہ کا جذباتی انداز انہیں شدید طیش دلا گیا۔

"میں کہتی ہوں سدھر جاؤ تانی' لڑکیوں پر یہ ضد اور ہٹ دھرمی اچھی نہیں لگتی' سب کچھ چھڑوا کر گھر بٹھا دوں گی' تب تمہیں پتا چلے گا یہ میری ہی دی ہوئی ڈھیل ہے' جو تم اتنی بدزبان اور خودسر ہوتی جا رہی ہو۔" احد اب کچھ پشیمان سا ہو گیا تھا' معاملہ اتنا بگڑ جائے گا' دیکھ کر اور اوپر سے تانی نے جو رونا شروع کر دیا۔"

خاطر میں لائے بغیر اپنے روز مرہ کے کاموں میں مصروف ہو گئیں اور اب وہ اس کے پاس بیٹھا اسے منانے کے طریقے سوچ رہا تھا۔

"چھوڑو نا تانی' اتنا رونے والی کون سی بات ہے' امی نے جو کہا وہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں' تم واقعی بدتمیزی کرتی جا رہی ہو۔" اسے مناتے ہوئے وہ کیا بات کہہ گیا اس کا احساس اسے تب ہوا جب تانیہ نے سوں سوں کرتے اپنی شعلہ نگاہوں سے اسے گھورا۔ وہ گڑبڑا کر وضاحت دینے لگا۔

"وہ میرا مطلب ہے۔ چلو دفع کرو۔ اٹھو میں تمہیں کالج چھوڑ آؤں۔" اس نے فوراً" ہی بات بدلتے ہوئے صلح کا ہاتھ بڑھایا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے' شادی۔ بہا چکے۔ آگ لگا دی میری خوشی کو اب خوش ہو' دل میں ٹھنڈ پڑ گئی تمہارے' اور اب آ کر یہ جھوٹی ہمدردی بھی دکھا رہے ہو' جیسے میں تو تمہارے ساتھ چل ہی پڑوں گی۔ دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔" احد کی ہمدردی نے اسے مزید تاؤ دلا دیا۔ اور پھر اپنا بیگ اٹھا کر بنا اس کی طرف دیکھے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"رکو تانی' میں آ رہا ہوں۔" اسے آواز دیتے احد نے اپنی بائیک کی چابی اٹھا کر امی کو اطلاع دی اور پھر گویا بھاگتے ہوئے اس کے پیچھے آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج کا دن بے حد تھکا دینے والا تھا۔ بری طرح سے اس کے اعصاب اور بے پناہ تھکن جیسے پور پور میں اتری محسوس ہو رہی تھی۔ اور کمرے میں داخل ہوتے ہی جب اس نے کمرے کی اتنی ابتر حالت دیکھی اس کی ذہنی کوفت اور بھی سوا ہو گئی۔ لگتا تھا آج کسی نے بھی یہاں جھانکنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ صبح اس طرح وہ یہ کمرہ چھوڑ کر گیا تھا اب بھی ویسا ہی بکھرا ہوا تھا۔ ایک گہری سانس لے کر بیڈ پر بیٹھتے اس نے شوز اتارے اور پھر نیم دراز ہو کر چند لمحوں کے لیے

آنکھیں موند لیں۔ تب ہی دروازے پر کھٹکا ہوا تھا اور کسی کی آمد بھی محسوس ہوئی مگر اس نے آنکھیں کھولنے کی زحمت نہیں کی۔

"حارث! کیا ہوا۔ آج بہت تھک گئے ہو۔" اس کی فکر و تشویش میں ڈوبی میٹھی مہین آواز سن کے بھی وہ آنکھیں نہ کھولتا تو شاید وہ حارث نہ ہوتا۔ اسے دیکھتے ہی حارث کی آنکھوں میں جو دیے روشن ہوئے تھے' ثانیہ محجوب سی ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔

"بہت تھکن ہو رہی ہے۔" اس کے ستے ہوئے چہرے اور سرخ آنکھوں کو دیکھتے ہوئے اس نے دوبارہ استفسار کیا۔

"تم نے تو کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا نا اب تک۔ کم از کم کھانا تو وقت پر کھا لیا کرو حارث۔ دیکھو تو ساڑھے دس بج رہے ہیں۔" اس کے لہجے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔ اور حارث یک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔

ڈارک گرین کلر کے لباس میں کچھ اور بھی نمایاں اس گلابی مائل دودھیا رنگت' سیاہ خوابناک آنکھیں اور سیاہ لمبے بالوں کو چوٹی میں باندھے وہ پانچ فٹ تین انچ کی نازک سی گڑیا پل بھر میں اس کی ساری تھکن چرا لے گئی تھی۔ اس پر پڑنے والی حارث کی ہر نظر یونہی اس کی شدتوں میں اضافہ کر دیتی تھی۔

"اب ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔" اس کی نظروں کی وارفتگی نے اس کے چہرے پر گلال بکھیرا تھا اور وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

"کئی کئی دن گزر جاتے ہیں تمہیں دیکھے۔ کبھی چند لمحوں کے لیے اپنی موہنی صورت دکھاتی بھی ہو تو اس پر بھی میرے دیکھنے پر اعتراض۔ میں نہ تو اپنے دل کو روک سکتا ہوں' نہ اپنی آنکھوں کو۔ اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔" کچھ بے بسی سے کہتا وہ اٹھ کر اس کے سامنے آگیا۔ ثانی کی دھڑکنوں میں یکایک شور برپا ہو گیا۔

"تم فریش ہو لو' میں کھانا گرم کر دیتی ہوں۔" اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے وہ دھیمے لہجے میں بولی تھی۔

"ابھی تمہیں ثانی۔ کچھ دیر اور رہو میری نظروں کے سامنے۔" اس کے لہجے میں نہ جانے کیا اصرار تھا کہ وہ اپنی جگہ بندھ سی گئی۔ وہ اس کے دل کے اتنے ہی قریب تھا کہ اگر وہ چاہتی بھی تو بھی اس کی کوئی بات ٹال نہیں سکتی تھی۔

"تم یہ نوکری چھوڑ کیوں نہیں دیتے حارث۔" قدرے توقف سے ثانیہ نے کہا تھا۔

"تمہارے تو ایگزامز بھی ہونے والے ہیں نا ان کی تیاری کب کرو گے۔" اس کا فائنل ایئر چل رہا تھا اور اب اس کی رات دن کی مصروفیات دیکھ کر اس سے زیادہ ثانیہ کو اس کی ایگزامز کی ٹینشن ہونے لگی تھی۔

"میرا مسئلہ جاب نہیں ہے ثانی۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا تھا۔

"جب تک شبلی چاچو کے گھر کی تعمیر مکمل نہیں ہو جاتی میں ٹینشن فری نہیں ہو سکتا۔"

"ایک تو یہ چاچو بھی نا۔۔۔" چبا کر کہتے اس نے سارا غصہ ان پر نکالا۔ حارث کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ ابھی تک صحیح اندازہ نہیں لگا پایا تھا کہ وہ اس کے لیے کس حد تک جذباتی تھی۔

"مجھے ذرا اچھے نہیں لگتے۔" اس نے اپنی خوبصورت ناک سکوڑی۔

"بری بات ثانی۔ چاچو ہیں۔"

"مجھے پھر بھی اچھے نہیں لگتے۔" اسے جیسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

"اور تم بس ان سے صاف صاف کہہ دو حارث کہ تمہارے ایگزامز ہونے والے ہیں وہ اپنا کوئی اور انتظام کر لیں۔ اتنا احساس تو انہیں بھی ہونا چاہیے۔ اپنے اکلوتے بیٹے کو تو پڑھائی کے لیے لندن بھیج دیا۔ اور خود کسی کے مستقبل' کسی کے کیریئر کی پروا کیے بنا صرف اپنا کام نکلوانا جانتے ہیں۔" تنگی سے بولتے ہوئے اس کی نظر حارث کے چہرے پر پڑی تو اس کا شانہ ہلا کر پوچھا۔

"تم سن رہے ہو نا میں کیا کہہ رہی ہوں۔"

"تم سناؤ اور ہم نہ سنیں۔ اب ایسے بھی حالات نہیں۔" حارث نے اس کا ہاتھ تھاما تو اس نے چونک کر نظر اس کے ہاتھ میں جکڑے اپنے ہاتھ پر ڈالی مگر چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔

"سنو حارث! چاچو سے بات ضرور کرنا' نہیں تو پھر میں ان سے بات کروں گی۔"

"اچھا! کیا کہو گی ان سے؟" اس نے بے حد دلچسپی سے پوچھا۔

"یہی کہ حارث کی جان چھوڑ دیں۔" وہ بے حد سنجیدہ تھی۔

"اور وہ پوچھیں گے نہیں کہ حارث کی جان سے تمہارا کیا واسطہ۔" اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ ثانیہ کے چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ آگئی۔

"جب وہ پوچھیں گے تب میں انہیں بتا دوں گی فی الحال۔۔۔" اس نے حارث کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"میں کھانا گرم کرنے جا رہی ہوں۔۔۔ کھانا کھا کر جلدی سو جانا۔۔۔ مجھے لگتا ہے تمہاری نیند بھی پوری نہیں ہوتی' جبھی تمہاری آنکھیں مستقل سرخ رہنے لگی ہیں۔" ثانیہ اس کی آنکھوں کو بغور دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ جب وہ اس طرح حارث کی صحت کے متعلق تشویش ظاہر کرتی تھی' اس کی فکر میں ہلکان ہوتی تھی' تو حارث کا تن من ایک انوکھی خوشی سے لبریز ہو جاتا تھا۔ اس کا اندرونی خلفشار' اس کی ذہنی پراگندگی' اس کی ہر تکلیف' ہر پریشانی یوں غائب ہو جاتی تھی جیسے وہ کبھی ان سے آشنا ہی نہ رہا ہو۔ اسے اپنا وجود تو کیا اپنی روح تک ہلکی پھلکی اور تر و تازہ محسوس ہونے لگتی تھی۔ پورے دن کے سخت معمول میں اس کی خوشبو سے مہکے ان ہی چند خوبصورت لمحات کا تصور تو حارث کو بہلائے رکھتا تھا۔

"اف تمہارا کمرہ کتنا بے ترتیب ہو رہا ہے۔ آج تو میرا اس طرف آنا ہی نہیں ہوا لیکن خیر میں کل ٹھیک کر دوں گی۔ اچھا اب میں جا رہی ہوں۔ گڈ نائٹ۔" جلدی سے کہتی وہ اتنی عجلت میں کمرے سے نکلی کہ وہ اس سے واپس آنے کے متعلق کچھ پوچھ ہی نہ سکا۔

وہ کھانا ٹرے میں لے کر کچن سے نکلنے لگی تھی کہ امی کسی کام سے ادھر آ نکلی تھیں اور انہیں دیکھ کر اس کا دل ایک لمحے کے لیے ڈوب سا گیا۔ اسی بات کا تو اسے ڈر تھا۔

"یہ کھانا کس کے لیے لے کے جا رہی ہو؟" ان کے لہجے میں حیرت بھری تھی۔

"وہ حارث کے لیے۔" اس پل حارث کا نام لیتے ہوئے اس کے چہرے پر نہ جانے کیا کیا رنگ بکھرے تھے جسے دیکھتے ہی ان کے دل میں خطرے کی ہزاروں گھنٹیاں ایک ساتھ بج اٹھی تھیں۔

"تم۔۔۔ یہ ادھر لاؤ۔" انہوں نے سخت لہجے میں کہتے ہوئے اس کے ہاتھوں سے ٹرے لے لی۔

"کس نے کہا تھا تم سے' اس کے لیے کھانا لے جانے کے لیے۔"

"کیا ہو گیا ہے امی' کیا اب میں اس کے لیے کھانا بھی نہیں لے جا سکتی۔" ثانیہ نے تاسف سے انہیں دیکھا۔

"نہیں۔ میں ہوں نا۔ میں لے کر جا سکتی ہوں۔ اور تم سے میں ایک بار پہلے بھی کہہ چکی ہوں ثانی۔ دوسروں کے غم میں گھلنا چھوڑ دو۔ مت کاٹا کرو وقت بے وقت اس کے کمرے کے چکر اب تم بچی نہیں رہی ہو۔ آخر کب آئے گی تمہیں اس بات کی سمجھ۔"

وہ اسے جو سمجھانا چاہ رہی تھیں۔ وہ بخوبی سمجھ رہی تھی مگر بات صرف اتنی سی تو نہیں تھی امی کو تو حارث سے بلاوجہ کا بیر تھا۔ وہ فیصل سے ہنسی مذاق کرتی تھی' انہوں نے کبھی منع نہیں کیا۔ اس کی صفی سے اچھی خاصی گپ شپ تھی اس پر بھی امی نے کبھی اعتراض نہیں کیا تھا۔ مگر حارث کا تو صرف نام ہی اس کے منہ سے سنتے وہ آپے سے باہر ہو جاتی تھیں۔ اب بھی اس نے امی سے زیادہ بحث تو نہیں کی کہ انہیں اس پر مزید غصہ آجاتا تھا۔ مگر وہ دل ہی دل میں جھلا کر رہ گئی تھی۔

❁ ❁ ❁

حارث منجھلے چچا کا بیٹا تھا۔ تبھی تو حارث کے بچپن

میں ہی چل بسی تھیں اور چچا چھ سال پہلے اس دنیا سے منہ موڑ گئے تھے۔ باپ کی زندگی میں پھر بھی حارث پر حالات کی سختیاں اتنی اثر انداز نہیں ہوئیں۔ لیکن بعد میں گزرتا ہر دن اسے اس گھر میں اپنی حیثیت یاد دلاتا گیا اس کے بابا اپنے دیگر بھائیوں کی طرح بہت امیر یا جمع جتھا کرنے والے انسان نہیں تھے۔ کمانے اور کھانے کے اصول پر کاربند۔ نہ ہی کوئی زمین و جائیداد خریدی تھی جو بعد میں حارث کے کام آسکتی۔ اس کے ان کے مرنے کے بعد حارث کافی مشکلات میں گھر گیا تھا۔ حالانکہ دادا' پردادا کی پراپرٹی ضرور تھی لیکن جب تک تایا اور دیگر چچاؤں کو کوئی شدید ضرورت نہ پڑتی۔ وہ اپنی خاندانی زمینیں بیچنے کے حق میں ہرگز نہیں تھے۔ حارث کی ضرورت نہ تو انہیں نظر آرہی تھی اور نہ ہی بھتیجا ہونے کے ناتے اس کے تعلیمی اخراجات اٹھانا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔

ایسے میں حارث کو وہی کرنا پڑا جو اکثر اپنی تعلیم پوری کرنے کے لیے مڈل کلاس نوجوانوں کو کرنا پڑتا ہے۔ یعنی صبح پڑھائی اور شام میں پارٹ ٹائم جاب۔ حارث خاصا حساس انسان تھا اور یہ حساسیت اس میں یونہی نہیں آئی تھی۔ بچپن ہی سے چچیوں کی ڈانٹ پھٹکار سنتا۔ اپنے بچوں کے ہوتے ہوئے بھی ہر کام کے لیے اسے دوڑاتا اور کھانے کے وقت بچا کچھا اس کے سامنے رکھ دینا۔ ابو اپنی فل ٹائم جاب میں مصروف رات کو جب تھکے ماندے گھر آتے تو وہ چاہ کر بھی انہیں کچھ نہ بتا پاتا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حارث کے ساتھ کسی کے سلوک میں کوئی نمایاں بہتری تو نہیں آئی البتہ سبھی نے اپنے بدنما رویوں پر تہذیب اور شائستگی کا لبادہ ضرور اوڑھا لیا تھا کہ اب وہ جوان ہوچکا تھا بچہ نہیں رہا تھا جسے جھڑک کر ڈانٹ ڈپٹ کر اپنا کوئی کام کروایا جاتا یا بےزاری جتائی جاتی۔ ان ساری مشکلوں اور کٹھنائیوں کے بیچ اگر کسی کا ساتھ اس کے لیے دم غنیمت تھا تو وہ تانیہ تھی۔ نخریلی اور مغرور سی تانیہ جس نے کبھی حارث سے ٹھیک سے بات بھی نہیں کی تھی۔ نجانے کیسے اور کیسے وہ اس کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ پہلے پہل حارث خود بھی بے یقین سا تھا' وہ ڈر رہا تھا۔

کہیں یہ کوئی دھوکا نہ ہو۔ کوئی نئی آزمائش' کوئی امتحان نہ ہو۔ صحرا میں بھٹکنے والے مسافر کو بھی نخلستان کی موجودگی چند لمحوں کے لیے اپنی آنکھوں کا دھوکا محسوس ہوتی ہے۔ وہ یونہی اس کی طرف نہیں بھاگ پڑا اور حارث تو ویسے ہی اپنوں کی بے اعتنائی کا مارا ہوا تھا۔ اس کی بے یقینی اپنی جگہ ٹھیک ہی مگر گلابوں سے معطر وجود والی تانیہ جب اس کی دنیا سجانے چلی آئی تو وہ چاہ کر بھی اس سے منہ نہ موڑ سکا۔ وہ اس کی زندگی میں کسی دعا کی طرح شامل ہوئی تھی اور اب اس کی زندگی بن گئی تھی۔ اس کا ہر رشتہ' ہر جذبہ تانیہ سے شروع ہو کر تانیہ پر ختم ہوتا تھا۔ حارث کے لیے گویا ساری دنیا ایک تانیہ کے وجود میں سمٹ آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کہاں مرگئی تھیں تم' کب سے آئی بیٹھی ہوں۔" تانیہ اور صبورین کے مشترکہ کمرے میں داخل ہوتے ہی فائقہ کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"مجھے کہاں ہونا تھا۔ کچن میں ہی تھی۔" بےزاری سے جواب دیتی وہ اس کے پاس ہی آکر بیٹھ گئی۔

"جھوٹ۔ آتے ہوئے میں نے کچن میں جھانکا تھا تب تو تم وہاں نہیں تھیں۔"

"اچھا۔ تب شاید میں حارث سے کھانے کا پوچھنے گئی ہوئی تھی۔" اس نے کچھ سوچ کر بتایا' اپنی بات پر فائقہ کے چہرے کے بدلتے رنگوں پر غور کیے بنا صبورین کو آواز دی جو کارپٹ پر اپنے گرد ڈھیر سارے کشنز رکھے شاید نوٹس بنانے میں مصروف تھی۔

"ایک کشن پھینکنا ادھر۔"

"پھر۔ کھانا کھایا اس نے۔" فائقہ فکرمندی سے پوچھ رہی تھی۔

"منحوس انسان۔ اس طرح پھینکنے کا کہا تھا میں نے۔" وہ اس کی بات سننے کے بجائے صبورین پر

پڑی۔ جس نے کشن نشانہ تاک کر اس کے منہ پر مارا تھا اور اب ہنس رہی تھی۔

"تانی! میں تم سے پوچھ رہی ہوں۔" فائقہ نے جھلا کر اسے دھپ لگائی۔

"ہاں بھئی۔ امی نے کروائی تھیں۔ تم کیوں اتنی فکر کررہی ہو۔ اس سے پہلے بھی کی ہے۔" تانیہ کا لہجہ طنزیہ تھا۔ فائقہ ہونٹ بھینچ کر رہ گئی۔ یہ تو سچ ہی تھا کہ اس نے کبھی حارث کی پروا نہیں کی تھی۔ کبھی اسے وہ یاد آتا بھی تھا تو کسی کام کے لیے جب تہرا فیصل اس کا وہ کام کرنے سے منع کردیتے تھے۔ لیکن اب پچھلے کچھ عرصے سے بہت کچھ بدل سا گیا تھا اور یہ بات وہ تانیہ کو نہیں سمجھا سکتی تھی۔

"سنا تھا ہڑتال تھی کل آج۔" فائقہ نے کہا تو وہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"کس سے سنا تم نے۔ یہ بکواس تو احد نے ہی کی تھی۔ وہ تو جھوٹ بھی اتنی بار بولتا ہے کہ اس پر سچ کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اگر مجھے اپنے علاقے کی بس نہیں مل رہی تھی تو اس کا مطلب ہڑتال ہرگز نہیں تھی۔ تو ہمارا علاقہ ہی اتنا فضول ہے' احد نے بھی جسے ابھی چھوڑ کر ہی بہت بڑا احسان کردیا تھا' سبھی لڑکیوں کے پاس اپنی کنوینس تھی' ایک میں ہی باقی رہ گئی تھی اپنی پھوٹی قسمت پہ رونے کو۔"

"تو گھر فون کردیتیں تم۔"

"اچھا۔ گھر فون کرکے مرنا تھا میں نے' امی نے تو پہلے ہی مجھے آج کے دن کالج جانے کے تمام تر خطرات سے آگاہ کردیا تھا۔ مجھے لانے کے لیے کسی کو بھیجتیں نہ بھیجتیں' لیکن میری خاطر تواضع کا اچھا انتظام کررکھتیں وہ۔" فائقہ کا مشورہ سن کے تانیہ نے داستان سنا کر اس کے متوقع نتائج بھی بتادیے۔

"تو پھر گھر کیسے آئیں آخر۔ کیا کسی گاڑی کے [illegible] کر گھر تک کا سفر طے کیا۔"

"ارے نہیں۔ اب ایسی بھی آفت نہیں پڑی تھی۔ اس سے پہلے ہی میرے نزدیک ایک بڑی خوبصورت سی گاڑی آکر رک گئی۔" تانیہ کے چہرے پر بڑی جاندار مسکراہٹ آگئی تھی۔

"اف۔ ہوگئی ہیرو کی انٹری۔" صبورین نے یہ سنتے ہی تبصرہ کیا۔

"کیا واقعی ایسا ہی ہوا تھا؟" فائقہ کو شاید یقین نہیں آیا۔

"ہاں بھئی۔ میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔" تانیہ کافی سنجیدہ تھی۔

"اور۔ گاڑی کے اندر کون تھا تمہارے خوابوں کا شہزادہ۔" وہ ہنسی تھی۔ تانیہ نے چونک کر اسے دیکھا پھر بولی۔

"پہلی بات تو یہ کہ میں کسی گاڑی والے کا خواب نہیں دیکھتی۔"

"کہ وہ تو ڈرائیور بھی ہوسکتا ہے۔" صبورین نے پھر جملہ ٹانکا تھا' وہ نظرانداز کرکے کہتی رہی۔

"دوسری بات یہ کہ میرے خوابوں کا شہزادہ میرے آس پاس ہی رہتا ہے اسے مجھ تک پہنچنے کے لیے کسی شاہی سواری کی ضرورت نہیں۔" اس کی اس بات پر صبورین نے بے تحاشا چونک کر بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ جبکہ فائقہ اپنی ہی دھن میں تھی۔

"اب بتا بھی دو۔ گاڑی میں کون تھا؟"

"سیدان شاہ۔" اپنے ناخنوں کو دیکھتے ہوئے تانیہ نے صرف اس کا نام لینے پر اکتفا کیا۔ اور صبورین اچھل پڑی اس کی بات پر۔

"کیا۔ تم سیدان بھائی کے ساتھ گھر آئی تھیں۔"

"عجیب اتفاق ہے۔" فائقہ بھی کچھ شاکڈ تھی۔

"کوئی اتفاق نہیں ہے۔ وہ روزانہ اسی راستے سے گزرتا ہے۔" اس نے ان کی حیرت بھانپ کر بتایا۔

"تمہیں کیسے پتا؟" فائقہ کی نظریں کچھ کھوجتی ہوئی تھیں۔

"اس نے کہا مجھ سے۔ اور میں نے یقین کرلیا۔ ظاہر ہے وہ بھی گھر ہی آرہا تھا اگر میں بھی مزید خوار ہونے کے بجائے اس کے ساتھ ہی گھر آگئی تو کیا برا کیا۔" یہ تانیہ کا انداز تھا کہ اس نے آج سیدان کے

ساتھ اگر زیادہ عقلمندی کا ثبوت نہیں دیا اور یہ بات اس نے امی کو بھی نہیں بتائی تھی۔ انہیں پتا چل جاتا تو اس کی اچھی خاصی شامت آجاتی تھی۔
"کیا امی کو پتا ہے اس بات کا؟" سبرین نے پوچھا۔
"نہیں ۔۔۔ اور خدا کا واسطہ ہے تم بھی انہیں کچھ نہ بتانا۔" اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے تھے۔
"اچھا نہیں کہوں گی ۔۔۔ لیکن آئندہ احتیاط کرنا۔" اس کا انداز وارن کرنے والا تھا وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔ وہ چھوٹی ہونے کے باوجود بعض اوقات ثانیہ کو چپ رہنے پر مجبور کر دیتی تھی۔
"سنو تو۔ سیدان نے اور کیا کہا تم سے؟" سبرین کے جاتے ہی فائقہ نے پراشتیاق لہجے میں دریافت کیا تھا۔
"کیا اسے مجھ سے کچھ کہنا بھی تھا۔" اس کا سوال سمجھ کے بھی ثانیہ نے مصنوعی حیرانی دکھائی۔
"زیادہ بننے کی ضرورت نہیں ہے۔" فائقہ نے تپ کر اسے ایک مکا جڑ دیا۔
"تم جانتی ہو میں کیا پوچھ رہی ہوں ۔۔۔ جب وہ تمہیں بقول تمہارے چھپکے چھپکے تاڑتا رہتا ہے تو پھر آج موقع ملنے پر اس نے تم سے دل کا حال کیوں نہیں کہا۔"
"ہاں ۔۔۔ یاد آیا ۔۔۔ اس نے کچھ کہا تو تھا۔" اس نے سوچنے کی اداکاری کی۔
"لیکن پتا ہے کیا فائقہ ۔۔۔ وہ اتنی عجیب باتیں کرتا ہے کہ میرے تو سر پر سے گزر جاتی ہیں اب اگر مجھے پتا ہوتا کہ تم آکر مجھ سے یہ سب پوچھو گی تو میں اس کی باتیں یاد کر لیتی یا پھر اپنے سیل فون میں ریکارڈ کر لیتی۔"
"ہرے ہو منحوس ۔۔۔ تمہاری عقل میں بھی کوئی چیز بیٹھتی ہے۔" فائقہ کو غصہ آگیا۔
"او ہو ۔۔۔ بے چارا! اتنا لگ بول بول کے تھک گیا ہوگا اور یہاں میڈم کی سمجھ میں ہی کچھ نہیں آیا ۔۔۔ تم سے تو رومانس وہ کرے، جس کا دماغ خراب ہو۔" ثانیہ بے اختیار ہنستی چلی گئی۔
"تمہیں اس سے بڑی ہمدردی ہو رہی ہے

فائقہ ۔۔۔ کہو تو تمہاری اس سے سیٹنگ کروا دوں۔"
"جی نہیں ۔۔۔ میں اپنی جگہ بالکل سیٹ ہوں۔" وہ مزید چڑ گئی تھی۔
"ویسے اس کی حالت دیکھ کر میں کبھی کبھی اس بارے میں سوچنے بھی لگتی ہوں۔" ثانیہ نے مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے کہا۔
"کمینی چڑیا۔" وہ زیر لب بڑبڑاتی اٹھ کھڑی ہوئی اب مزید یہاں رہنا بے سود تھا۔
"رکو نا فائقہ ۔۔۔ ایک مزے کی بات تو میں تمہیں بتانا بھول ہی گئی۔" اسے جاتے دیکھ کر ثانیہ کے ذہن نے فوراً ایک نئی بات نکالی اور فائقہ جاتے جاتے پلٹ آئی۔ اس میں تجسس کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ اس کے سامنے اگر کوئی ذرا سا اشارہ بھی دیتا تو وہ پھر پوری تفصیل جانے بغیر جان نہیں چھوڑتی تھی اور اس کی اسی نفسیات سے ثانیہ اکثر کھیلتی رہتی تھی۔
"وہ مجھے آئس کریم کھلانے بھی لے گیا تھا۔"
"سچ۔" بے یقینی سے اچھل پڑتے اس نے ثانیہ کے چہرے پر نظر ڈالی ۔۔۔ اور دوسرے ہی پل جو بھی چیز اس کے ہاتھ لگی اس نے اٹھا کر ثانیہ کو مارنی شروع کر دی تھی۔ اسے غصہ اپنے بے وقوف بننے پر آیا تھا اور ثانیہ کی ہنسی بے قابو ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم چاچی۔" آج وہ کافی دنوں بعد چاچو کے پورشن کی طرف آئی تھی کہ جب سے سیدان کی آمد ہوئی تھی تب سے وہ کم ہی ادھر کا رخ کرتی تھی اور اس میں بھی اس سے زیادہ امی کی تنہائی پسند طبیعت کا عمل دخل تھا۔ ورنہ پہلے تو وہ سارا دن یہیں پائی جاتی تھی۔ چاچی کا سارا کام بھی نمٹا دیتی کہ ان کی نہ کوئی بیٹی تھی اور نہ کوئی بہو۔ اس وقت بھی چاچی کچن میں ہی مصروف تھیں وہ پرجوش انداز میں سلام کرتی کچن میں ٹیبل کی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔
"کیا بات ہے اتنے دنوں بعد یاد آرہی ہے چاچی کی۔" چاچی خفگی سے بولی تھیں۔

"سچ کہوں تو یاد کافی دنوں سے آرہی تھی، لیکن امتحانات ہونے والے ہیں نا تو اسی کی مصروفیت میں ۔۔۔ خیر آپ بتائیے کیا کر رہی ہیں، یہ ناشتے کا وقت تو نہیں ہے۔" اس نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں! ناشتے کا وقت تو نہیں ہے لیکن سیدان آج آفس نہیں گیا، کل رات اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی تو میں نے جانے سے منع کر دیا۔ بے چارہ بچہ ۔۔۔ گھر سے، گھر والوں سے دور، خیال تو ہمیں ہی رکھنا پڑے گا نا۔ اور سچی بات ہے ثانیہ سیدان مجھے بالکل اپنے صفی کی طرح لگتا ہے، اسے دیکھتی ہوں تو لگتا ہے جیسے صفی سامنے کھڑا ہو۔" چاچی کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا صفی کے لیے بھی اور سیدان کے لیے بھی۔
"اللہ رے! آپ کی سو کالڈ ممتا ایک پرائے لڑکے کو دیکھ کر بیٹا یاد آتا ہے پھر حارث کو دیکھ کر دل میں کوئی احساس کیوں نہیں جاگتا جسے اپنی ماں کی صورت تک یاد نہیں ۔۔۔ آپ اپنی پیاسی ممتا کی تسکین حارث پر پیار لٹا کر بھی تو کر سکتی ہیں نا کہ کسی غیر چہرے میں اپنے بیٹے کو ڈھونڈ کر۔" یہ تلخ سوچ ذہن میں ابھری اور زبان پر آتے آتے رہ گئی۔
"سنا ہے فائقہ کا ہاتھ مانگنے اس کے ماموں آرہے ہیں آج کل میں۔" چاچی نے کہا تو وہ حیران سی ہو گئی اس خبر پر۔
"اچھا! مجھے تو اس بارے میں کچھ نہیں پتا۔ آپ کو چچی نے بتایا؟"
"نہیں بھئی، مجھے تو تمہاری ماں نے بتایا ہے اور تب مجھے حیرت بھی ہوئی تھی کیونکہ میرا خیال تھا کہ تمہاری امی ایک بار فائقہ کے بارے میں ضرور سوچیں گی۔ گھر کی ہی بچی ہے اور پھر اتنی پیاری اور سلجھی ہوئی، لیکن انہوں نے ایسا کوئی ذکر نہیں چھیڑا۔ پھر میں نے سوچا کہ شاید وہ اپنے سسرال میں سے بہو لانا ہی نہیں چاہتیں حالانکہ آج نہیں تو کل انہیں اسد کے لیے بھی لڑکی دیکھنی ہی ہے نا۔ پھر فائقہ کیا بری ہے ویسے بھی نئے زمانے اس جیسی لڑکیاں ناپید ہیں۔" چاچی کو

آج اچانک ہی فائقہ اس دنیا کی خوبصورت اور خوب سیرت لڑکی نظر آنے لگی۔ اور ثانیہ ششدر بیٹھی سوچ رہی تھی کہ کل جب صفی کے لندن جانے سے پہلے وہ اس کی منگنی بلکہ نکاح کرنے کا سوچ رہی تھیں۔ تب انہیں فائقہ کی یہ خوبیاں نظر کیوں نہیں آئیں۔ اعلا حسب نسب، امیر اور خوبصورت ترین لڑکی کی تلاش میں جوتیاں گھساتے ہوئے انہوں نے ایک بار بھی ثانیہ یا فائقہ کو زیر غور لانے کی زحمت نہیں کی تھی۔
"خیر یہ خیال زیادہ دیر میرے ذہن میں نہ بھٹک سکا۔ کیونکہ شولی نے مجھے خبر ہی ایسی سنا دی تھی۔" کچھ دیر کے توقف کے بعد چاچی دوبارہ گویا ہوئیں۔ اور اس کے کان کھڑے ہو گئے۔
"کیسی خبر چاچی؟" وہ ایکدم الرٹ ہو گئی۔
"یہی کہ منیب بھائی صاحب ذکیہ کے بھائی کو لفٹ نہیں کروانے والے۔ کیونکہ وہ اپنی فرزندی میں حارث کو لینے کا سوچ رہے ہیں۔" چاچی نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بات ختم کی تھی اور ثانیہ کو اپنا وجود کسی ان دیکھی آگ میں لپٹا محسوس ہونے لگا۔
"یہ ۔۔۔ یہ ۔۔۔ کیا کہہ رہی ہیں؟" اس کی آواز واضح طور پر کپکپا گئی تھی۔ چاچی اس کی حالت سے یکسر بے نیاز دودھ چولہے پر چڑھاتے ہوئے تفصیلات بتانے لگیں۔
"یہ بات مجھے کل ہی شولی نے بتائی ہے، اور تمہاری طرح مجھے بھی سن کر بڑی حیرت ہوئی تھی کہ جس یتیم و یسیر بھتیجے کے سر پر انہوں نے آج تک کبھی دست شفقت نہیں رکھا بیٹا سمجھنا تو دور اسے کبھی پیار سے بلایا تک نہیں۔ آج یہ اس کے لیے اتنی محبت کیوں امڈ پڑ رہی ہے کہ اپنی اکلوتی نازوں پلی بیٹی کو اسے سونپنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ بھی اس صورت میں کہ وہ ابھی پڑھ رہا ہے ۔۔۔ مستقل جاب کوئی ہے نہیں، مستقبل کا کچھ پتا نہیں ہے ۔۔۔ اور ظاہر ہے میرا ذہن جا بھی کیسے سکتا تھا منیب بھائی کے کاروباری ذہنیت کی طرف ۔۔۔ سچی بات ہے بھئی ۔۔۔ تمہیں تو نہ آئے ایسے داؤ پیچ کھیلنے

لوگوں نے تو اب رشتوں کو بھی اپنے مفادات کی خاطر استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔" چاچی کون سی پہیلیاں بجھوا رہی تھیں اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

"کون سا مفاد چاچی؟" لب کاٹتے ہوئے اس نے مضطرب لہجے میں دریافت کیا۔

"ارے! یہ تو بالکل سامنے کی بات ہے۔ بھلے ہی آج حارث کے پلے کچھ نہ ہو، لیکن مستقبل قریب میں جو اسے ملنے والا ہے اسے سوچ کر ہی ضیب بھائی نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ مرحوم حفیظ بھائی نے تو جو کمایا خرچ کر ڈالا۔ لیکن ان کے باپ یعنی ہمارے سسر اپنے بچوں کے لیے جو زمینیں اور جائیدادیں چھوڑ کر گئے ہیں' حصے کرنے کے بعد بکنے کے بعد ہر ایک کو جو رقم ملے گی۔ لاکھوں میں ہوگی۔ اور پھر یہ گھر اس میں بھی اس کا برابر کا حصہ ہے۔ سب مل ملا کر دیکھو تو مالی لحاظ سے حارث کو آئندہ کبھی کوئی مشکل درپیش ہونے کا امکان نہیں۔ ضیب بھائی یہی سوچ کر نہایت دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے حارث کو اپنے کھونٹے سے باندھنے کا بندوبست کر رہے ہیں۔ بھلا اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے انہیں ایسا کھرا' بھلا' مودب اور صاحب جائیداد داماد اور کہاں ملے گا۔" چاچی اپنے تجزیے پیش کر رہی تھیں یا شوشے چاچو کی باتیں۔ لیکن جو بھی تھا سب سچ تھا۔ ثانیہ جانتی تھی ہمیشہ اپنے فائدے کے بارے میں سوچنے والے ضیب چچا اگر حارث پر مہربان ہونے کا سوچ رہے ہیں تو یقیناً" اس کے پیچھے اپنا کوئی فائدہ بھی دیکھ رہے ہیں۔ اس سے مزید وہاں نہ رہا گیا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے ثانیہ! کہاں جا رہی ہو' بیٹھو آرام سے' کھانا کھا کر جانا میں آج تمہارے چاچو کی فرمائش پر سندھی بریانی بنا رہی ہوں۔" چاچی نے اسے اٹھتے دیکھ کر ٹوکا۔

"نہیں چاچی! آج دوپہر میں امی نے کھانا بنانے کا مجھ سے کہا تھا اب میں یہیں بیٹھ جاؤں گی تو نہیں لگے گا کہ میں نے جان چھڑائی ہے۔" اس نے وجہ بتائی۔

"ایک تو یہ تمہاری ماں بھی نا۔ چلو خیر میں تمہارے لیے بھجوا دوں گی۔" تمہاری [illegible]

ماں کے بارے میں کچھ کہتے کہتے بروقت لب روک لیے۔ وہ ایک مبہم سی مسکراہٹ کے ساتھ انہیں تھینکس کہتے ہوئے نکل آئی۔ اور دو قدم بعد ہی اسے رک جانا پڑا کہ وہ اچانک ہی اس کے سامنے آگیا تھا۔

"ارے آپ یہاں۔" اسے دیکھتے ہی سیدان کی آنکھوں میں شوق اور بے تابی کے جلتے رنگ چمکے تھے۔ ثانیہ گھبرا سی گئی۔

"کیوں؟ میں یہاں نہیں آسکتی۔"

"یہ تو آپ خود سے پوچھیں' ہم تو یہی سوچتے رہتے ہیں کہ جب آپ یہاں آسکتی ہیں تو پھر آتی کیوں نہیں۔" اس کے لہجے میں سکون سا تھا۔ ثانیہ خاموشی سے اسے دیکھے گئی۔

آج وہ معمول سے مختلف حلیے میں تھا۔ نیوی بلیو کلر کے شلوار قمیص میں اس کا دراز قد' مضبوط سراپا' ثانیہ بالکل گڑیا سی لگنے لگی تھی کہ اس کے سامنے اس لمحے اس کی تمتمائی ہوئی گندمی رنگت' ہلکی بڑھی ہوئی شیو' پیشانی پر بکھرے بال اور سوجی ہوئی سرخ آنکھوں کو دیکھ کر ثانیہ اپنی جگہ جم سی گئی۔

"واقعی فائقہ بالکل ٹھیک کہتی ہے۔ اس بندے کی پرسنالٹی غضب ہے۔" اس نے دل ہی دل میں اس کی وجاہت سے متاثر ہو کے اعتراف کیا تھا۔

"ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے ہفتوں بعد اپنے چاچو' چاچی سے ملنا آپ کو مناسب لگتا ہے۔" وہ سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے گویا اسے آنکھوں ہی آنکھوں سے دل میں اتار رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بولتی تھیں اور ثانیہ اس کی آنکھوں کی کشش سے خوفزدہ ہونے لگی تھی۔

"ہو سکتا ہے انہیں آپ کا نہ آنا اتنا نہ کھلتا ہو۔ لیکن یہاں جو کوئی اور دیدہ و دل فرش راہ کیے آپ کو دیکھنے کے انتظار میں جلتا بجھتا رہتا ہے۔ کم از کم اس کا ہی کچھ خیال کر لیا کیجیے۔" گمبھیر لہجے میں کہی گئی اس کی اس بات پر ثانیہ کو اپنے جسم کا سارا خون اپنے رخساروں میں سمٹتا محسوس ہوا اسے لگا اگر وہ کچھ دیر

مزید سیدان کے سامنے کھڑی رہی تو یہیں بے ہوش ہو کر گر جائے گی۔

"میں چلتی ہوں۔" لرزتے ہوئے لہجے میں کہتے اس نے قدم آگے بڑھانے چاہے۔

"رک جائیے ثانیہ! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔" سیدان نے بے اختیار اسے پکارا تھا وہ رکی ضرور لیکن پلٹی نہیں۔

"وہ پھر کبھی کر لیجیے گا۔ مجھے اس وقت جلدی ہے پلیز۔" وہ بمشکل اپنی بات کہتے وہاں سے چلی آئی تھی کیونکہ جو بات سیدان اس سے کہنا چاہ رہا تھا' وہ اس وقت اسے سننے کی ہرگز متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تائی! اسد بھائی چائے مانگ رہے ہیں۔" وہ کچن میں برتن دھونے کے بعد ریک میں لگا رہی تھی جب سبرین نے کچن میں جھانکا۔

"تو بنا دو نا۔" اس نے بے نیازی سے کہا۔

"اور تم کیا کرو... گی۔" سبرین نے اسے گھورا۔ جواباً" اس نے بھی تمام تر غصہ آنکھوں میں سمو کر اسے دیکھا۔

"اندھی ہو۔ دیکھ نہیں رہی ہو کہ ابھی بھی میں ایک کام ہی کر رہی ہوں اور تم آن ہرس ایک اور آرڈر لے کر۔ ابھی مجھے رات کا کھانا بھی بنانا ہے۔" اس نے یہ بات کرتے ہوئے برتن زور سے پٹخے۔

"چائے میں بنا لیتی لیکن۔ مجھے اپنے کل کی ٹیسٹ کی تیاری کرنی ہے۔" سبرین نے قدرے نرم ہو کر بتایا۔

"چائے بنانے میں پانچ منٹ بھی نہیں لگیں گے۔ میرا کچھ بوجھ ہلکا کر دو گی تو دعائیں دوں گی۔ ورنہ کہیں تم اس ٹیسٹ میں بری طرح فیل ہی نہ ہو جاؤ۔" اس نے ڈھکے چھپے انداز میں جو دھمکی دی۔ سبرین کا تو رنگ ہی اڑ گیا۔

"ہائے۔ اللہ نہ کرے کیسی باتیں کرتی ہو تم۔ نحوست والی۔" وہ فوراً" ہی گھبرا کر چائے کا پانی چڑھانے لگی۔ ثانیہ نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے اپنا کام ختم کیا اور باہر نکل آئی۔ امی اوپر چچی کی طرف تھیں موقع غنیمت جانتے ہوئے وہ صفائی کے لیے حارث کے کمرے کی طرف چلی آئی۔

نہ جانے کیا بات تھی کہ یہاں آتے ہی وہ اس کمرے پر اس کمرے کی ایک ایک چیز پر اپنا حق محسوس کرتی تھی۔ ایسا استحقاق' ایسی اپنائیت تو کبھی اسے اپنے کمرے میں بھی محسوس نہیں ہوئی تھی اور ایسا کیوں تھا۔ صرف ایک شخص کی بدولت' وہ شخص اس کا تھا۔ اس سے وابستہ ہر ایک چیز اسے پیاری تھی۔ اس وقت بھی بڑی تندہی اور لگن سے وہ اس بکھرے ہوئے کمرے کی حالت درست کر رہی تھی۔

ایک تو حارث بھی اسد کی طرح بے ترتیبی پھیلانے کا عادی تھا اور آج تو شاید صبح سے صفائی بھی نہیں ہوئی تھی یہاں کی۔ اس کے اور سبرین کے کالج جانے کے بعد امی باقی کام تو کر لیتی تھیں لیکن صفائی ستھرائی کے لیے ایک جز وقتی ملازمہ رکھی گئی تھی۔ لیکن آج لگتا تھا اس نے بھی اس طرف دھیان نہیں دیا۔ ایسا اکثر ہوتا تھا اسی لیے ثانیہ دن میں ایک مرتبہ تو ضرور ہی حارث کے کمرے کا چکر لگاتی تھی یہ دیکھنے کے لیے کہ کمرہ کس حالت میں ہے۔ پھر کمرہ ٹھیک کرنے کے ساتھ ساتھ حارث کے کئی دن کے کپڑے بھی پریس کر کے ہینگ کر دیتی ثانیہ کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ یہ سب امی کی نظر بچا کر کرے۔

اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ کافی ٹائم ہو گیا تھا۔ اس لیے جلدی جلدی میں بیڈ شیٹ ٹھیک کرنے لگی اور تب ہی تکیہ اٹھاتے ہوئے وہ براؤن کور والی ڈائری اس کی نظر میں آئی۔ بے اختیار ہی چونک کر اس نے وہ ڈائری اٹھالی۔ کچھ جاننے کا تجسس۔ اپنے بارے میں حارث کے جذبوں کا وہ اظہار جو وہ آج تک اس سے کر نہیں پایا تھا اسے وہ ڈائری کھولنے پر مجبور کر گیا۔

بہت سے خالی صفحوں کے بیچ وہ نظم۔ اس کی دھڑکن اچانک ہی بڑھ گئی۔

[illegible]

اتنی بڑی رات نہ ہو
رنج دنیا کے نہ ہوں
کوئی غم ذات نہ ہو
دل کے آنگن میں بھی
بارش صدمات نہ ہو
اگر تم ساتھ رہو
زیست جنگل کی طرح
اتنی بیاباں نہ لگے
اپنا سایہ بھی ہمیں
خود سے گریزاں نہ لگے
یہ بھرا شہر ہمیں
اتنا بھی ویراں نہ لگے
تم اگر ساتھ رہو
ایسی پلکیں نہ ہوں تر
آنکھ پر نم نہ رہے
دل کی دنیا میں بھی
دکھ کا موسم نہ رہے
کوئی اندوہ نہ ہو
کوئی غم ہم نہ ہو
اگر تم ساتھ رہو

وہ گم سی بیٹھی تھی اور ذہن نہ جانے کہاں کہاں بھٹک نکلا تھا کہ دروازے پر ہونے والے کھٹکے سے وہ سراسیمگی سے ڈائری ایک طرف رکھتے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اندر آنے والا حارث تھا۔ اسے دیکھ کر وہ اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔

"کیا ہوا سکتے میں چلے گئے کیا؟" سے اس طرح کھڑے دیکھ کر وہ بولنے سے باز نہ رہ سکی۔

"چاند دن میں جھلک دکھلا جائے تو ایسا ہو جایا کرتا ہے۔ کوئی دعا اچانک ہی قبولیت کا درجہ پا جائے۔ تب بھی کچھ ایسی ہی بے یقینی ہوتی ہے اور کوئی بہت ہی پیارا، جان سے عزیز بہت دنوں بعد سامنے آجائے تو آنکھیں اسی طرح بے اختیار ہو جایا کرتی ہیں۔ اگر مجھے بھی سکتہ ہو گیا تو حیرانی کیسی۔" وہ اس کے قریب آکر اپنی پر حدت نظریں اس پر جمائے بول رہا تھا۔ تانیہ کو اپنا چہرہ تپتا محسوس ہوا۔

"بہت ڈائیلاگ بولتے ہو حارث۔" اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی حتی الامکان کوشش کی۔ وہ ہنس پڑا۔

"تمہیں یہ ڈائیلاگز لگتے ہیں۔ یار... یہ کہتے ہوئے کچھ تو خیال کیا ہوتا میرے جذبوں کا، جو تمہیں دیکھتے ہی ساری احتیاطیں بھلائے تم پر برسنے کے لیے مچلنے لگتے ہیں۔ ویسے ایک بات بتاؤں، ابھی گھر آتے ہوئے میرے دل میں شدت سے یہ خواہش ابھری تھی کہ تمہیں دیکھ پاؤں۔ زیادہ نہیں، تھوڑی سی دیر کے لیے، صرف ایک نظر۔ بس ایک بار تمہاری صورت نظر آجائے۔" بولتے بولتے اس کا لہجہ دھیما ہوا تھا اور شدتیں سرخی بن کر آنکھوں سے چھلکنے لگی تھیں۔

"اس کمرے تک آتے آتے میری یہ خواہش مایوسی میں بدل گئی تھی۔ لیکن مجھے کیا پتا تھا۔ طلب کی شدت اور دعاؤں کی بدولت معجزے ہو جایا کرتے ہیں۔"

"تم پاگل ہو حارث۔" اس کی دیوانگی تانیہ کو سہا گئی۔

"صرف تمہارے لیے۔"

"میں جا رہی ہوں۔" اس نے راہ فرار اختیار کرنی چاہی۔

"کیوں، مجھے دیکھتے ہی تمہیں جانے کی کیوں سوجھنے لگتی ہے۔" حارث نے جلدی سے اسے بازو سے پکڑ کر اس کے جانے کی کوشش ناکام بنا دی۔

"تمہیں مجھ سے ملنے کی کوئی لگن ہو نہ ہو، کم از کم میرے حال پر تو ترس کھا لیا کرو۔ تمہارے پاس دل نام کی کوئی چیز ہے یا نہیں۔"

"نہیں۔" تانیہ جھٹ بول اٹھی۔

"کیونکہ وہ میں کسی کو دے چکی ہوں۔" اس نے شرارت سے کہا تھا۔ حارث کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

"پلیز حارث! کافی دیر سے یہاں ہو، امی مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں آگئیں نا۔ تو فاتحہ ہی پڑھ لینا مجھ پر۔"

"اتنا ڈرتی ہو تم۔ میرا ساتھ کیسے دے پاؤ گی۔" حارث کی اس بات پر وہ چونک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ ذہن میں اچانک ہی چھوٹی چچی کی باتیں گونج اٹھی تھیں۔ ایک عجیب سا اضطراب وجود کو گھیرنے لگا۔

"حارث!" اس کے منہ سے بلا ارادہ ہی نکلا تھا۔

"کیا ہوا؟" اس کی خالی الذہنی کی کیفیت محسوس کر کے حارث کچھ بے چین سا ہو گیا۔

"کچھ نہیں... بس ایک بات کرنی تھی تم سے۔ لیکن ابھی مجھے جانا ہے، میں کوشش کروں گی آج یا کل کسی بھی وقت تم سے مل کر کہہ ڈالوں۔"

"ایسی کیا بات ہے؟" وہ الجھ گیا۔

"بس ہے ایک بات، جو کرنی بہت ضروری ہے۔" تانی نے اس کا چہرہ دیکھا جہاں غور و فکر کی پرچھائیاں نظر آنے لگی تھیں۔

"تم زیادہ ٹینشن مت لو، میں شام کو ہی آجاؤں گی، تم سے بات کرنے کے لیے۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔" باہر سے سبرین کی آواز سنتے ہی وہ عجلت میں کمرے سے نکل گئی تھی اور حارث الجھا سا کھڑا رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

اس کا سیل بج رہا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی اپنے کپڑے پریس کرنے کے لیے امی کے کمرے میں لے آئی تھی اور موبائل چارجنگ پر لگا دیا اب جو وہ بجنا شروع ہوا تو تانیہ گھبرا گئی۔

"اف توبہ ہے۔ مجھے بھی موبائل یہیں پر چارج کرنا تھا۔" اس نے موبائل اٹھا کر امی کی طرف دیکھا جو کچھ دیر پہلے ہی سر درد کی دوا کھا کر لیٹی تھیں۔ اور پھر اسکرین پر نگاہ کی جہاں حارث کا نام جگمگا رہا تھا۔ اس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کال ڈسکنیکٹ کر دی۔ جس دن وہ حارث سے ملی تھی، اسے آج تیسرا دن تھا۔ اسے پتا تھا، اس نے حارث کی بے چینی بڑھا دی ہے۔ لیکن تانیہ کو اب تک کوئی موقع ہی نہیں مل سکا تھا حارث سے تفصیلی بات کرنے کا اور کھڑے کھڑے وہ یہ بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔

"آئم سوری حارث، میں تمہاری کال ریسیو نہیں کر سکتی۔" زیر لب بڑبڑاتے اس نے موبائل آف کر دیا۔ اور اپنے کپڑے اٹھانے لگی۔

"تانی! تمہیں فائقہ اوپر بلا رہی ہے۔" اس لمحے ثمر نے اندر جھانکا۔

"کیوں؟ کیا خود نیچے آتے ہوئے اس کی شان گھٹ رہی تھی۔" فائقہ کا یہ پیغام اسے بے زاری میں مبتلا کر گیا۔

"وہ سب مجھے نہیں پتا۔" ثمر نے کندھے اچکائے۔

"اور سنو، تمہارے ماموں کی فیملی آنے والی تھی نا آج؟" اسے جانے کے لیے پلٹتے دیکھ کر تانیہ نے آواز دی۔

"آنے والی تھی نہیں، آنے والی ہے آج شام کو۔" ثمر نے جواب دیا تھا۔

"چلی جاؤ تانی۔" امی نے چہرے پر سے دوپٹہ ہٹا کر اسے دیکھا۔

"مدد کے لیے بلوا رہی ہو گی تمہیں، تیاری کروا دینا اس کے ساتھ۔"

"جی اچھا۔" اس نے گہری سانس لے کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"شکر ہے، میں نے امی کو سوتا سمجھ کر حارث کی کال ریسیو نہیں کی۔" امی نہیں جاگتا پا کر اس نے دل ہی دل میں شکر کا کلمہ پڑھا۔

"ہاں جی میڈم، کہیے کیا بات ہے جو اس بھری دوپہر میں بجائے قیلولہ کرنے کے ہماری یاد آگئی اور ہمیں بھی بے آرام کیا۔" فائقہ اسے اپنے گھر کے بجائے چھت پر بنے اس اسٹور روم نما حبس زدہ کمرے میں ملی۔ چھلنگا چارپائی پر نیم دراز، پنکھا فل اسپیڈ پر چلائے۔ اس کی بات پر اسے گھورنے لگی۔

"تم... پھر میں کہاں سوتی ہو جھوٹی، جواب اپنی اتنی قدر

بڑھانے گئے لیے کیسی بکواس کر رہی ہو۔"

"ضروری تو نہیں کہ جو چیز پہلے کبھی نہ ہوئی ہو' وہ اب بھی نہ ہو گی اور شاید میں نہ آتی لیکن امی نے کہا کہ میں تمہارے مہمانوں کی دعوت شیراز کے لیے تمہاری مدد کروا دوں۔ میری بھولی امی۔ انہیں کیا پتا کہ تم آخری وقت پر ہر کام کرنے کی عادی ہو۔" نانیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس کا خیال تھا فائقہ چڑ جائے گی' لیکن وہ اپنے ناخن چباتے ہوئے کسی الجھن کا شکار لگ رہی تھی۔ اس کی باتوں پر دھیان ہی نہیں دیا۔

"مجھے بہت گرمی لگ رہی ہے۔ پتا نہیں تم کیوں آکر بیٹھ گئی ہو اس تنور میں۔ چلو نیچے تمہارے کمرے میں چلتے ہیں۔"

"ہاں' میرے کمرے تو جیسے اے سی لگا ہوا ہے نا۔" فائقہ چڑی۔

"پھر بھی اس سے تو ٹھیک ہے کم از کم۔" اس نے پیشانی سے پسینہ پونچھا۔

"دیکھو' پانچ منٹ میں جل تھل ہو گئی ہوں۔"

"کچھ نہیں ہوتا' پانچ منٹ اور بیٹھ جاؤ۔" فائقہ نے کوئی اثر نہیں لیا۔

"اچھا پھر جلدی بکو' میں زیادہ دیر تمہارے ساتھ اپنی دوپہر برباد نہیں کر سکتی۔" وہ چند لمحے تو خاموش رہی پھر کہنے لگی۔

"وہ لوگ آج رشتہ مانگنے آرہے ہیں۔"

"پتا ہے مجھے کوئی نئی بات کرو۔" نانیہ اکتا گئی۔

"سو تم۔ اتنی بے دلی سے سن رہی ہو۔ مجھے اپنی بات کہہ کے کوئی فائدہ نہیں۔ بے جاؤ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" وہ اچھی خاصی ناراض ہو گئی۔

"اُف' اب یہ دل سے سننا کیسا ہوتا ہے۔ اچھا بتاؤ۔ کیا بات ہے۔ ویسے تو مجھے بھی تمہیں کچھ بتانا ہے' لیکن پہلے تم بولو۔ تم نے اتنی ٹینشن کیوں لے رکھی ہے جبکہ تمہارے گھر والوں نے ابھی رشتہ منظور بھی نہیں کیا۔" دوپٹہ جھلتے ہوئے وہ اسے جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی جبکہ فائقہ اس کی پہلی بات پر ہی اٹک گئی تھی۔

"کیا بتانا ہے تمہیں مجھے۔ کہیں اس سیدان سے متعلق تو نہیں۔" فائقہ نے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ نانیہ کا دل چاہا اس کا گلا دبا دے۔

"خدا کے لیے فائقہ' اس سیدان کو اپنے ذہن و دل سے نکال پھینکو' کیوں وہ چوبیس گھنٹے تمہارے اعصاب پر سوار رہتا ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ وہ چاہے جتنا بھی ہینڈسم سہی لیکن میں اسے ہمیشہ تمہارے حوالے سے سوچتی ہوں۔" اس نے برملا وضاحت دی۔ نانیہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر دھیرے سے بولی۔

"مت سوچو اسے میرے حوالے سے فائقہ' جب میں ایسا نہیں سوچتی تو۔"

"لیکن کیوں تانی' وہ اتنا اچھا انسان ہے اور تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ وہ۔"

"چھوڑو فائقہ۔" نانیہ نے بیچ میں ہی اس کی بات کاٹ دی۔

"ہم۔ تم یہ بتاؤ حارث کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

"حارث۔" فائقہ کا دل اتنی زور سے دھڑکا تھا کہ وہ خود بھی حیران رہ گئی۔

"کچھ نہیں۔ تم اس کے بارے میں کیا سوچتی ہو۔ لیکن۔ میرے ذہن و دل میں اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔" نگاہیں جھکائے گلابی پڑتے چہرے کے ساتھ نانیہ نے اس کی سماعتوں پر بجلی گرائی تھی۔ اور فائقہ حق دق سی اسے دیکھتی رہ گئی۔

"تم شاید حیران ہو رہی ہو گی۔ کیونکہ اس سے پہلے میں نے کبھی تمہارے سامنے ایسا کوئی ذکر نہیں کیا۔ لیکن میں کیا کرتی فائقہ۔ مجھے ڈر لگتا تھا تم تو جانتی ہو' اس گھر کے لوگوں کے اس کے لیے کیا جذبات ہیں' میں نہیں چاہتی تھی کہ میری وجہ سے وہ کسی نئی مصیبت میں پڑے۔"

"اتنی بڑی بات تم نے مجھ سے چھپائی تانی۔ تم مجھے اپنا دوست کہتی ہو نا۔" کچھ بے یقینی اور تأسف بھرے لہجے میں اس سے پوچھتے فائقہ کو اس سے

تصدیق چاہ رہی تھی۔ نانیہ کو وہ مظلوم سی نظر آنے لگی۔

"نہیں مانتی ہوں فائقہ۔ مجھے تمہیں یہ بات پہلے بتا دینی چاہیے تھی' مگر تب میں یہ سوچ کر چپ تھی کہ جب تک حارث کو اچھی سی نوکری نہیں مل جاتی اور وہ بابا سے میرا ہاتھ مانگنے کی پوزیشن میں نہیں آجاتا۔ میں منہ نہ ہی کھولوں تو بہتر ہے۔"

"اچھا۔ تو کیا اب اس نے تایا جی سے تمہارا ہاتھ مانگ لیا ہے۔ نہیں نا۔ پھر اب بھی مجھے یہ سب بتانے کی کیا ضرورت تھی۔" فائقہ نپی تلی سی پوچھ رہی تھی۔ اسے اندازہ تو تھا کہ یہ بات سن کر فائقہ کو دھچکا لگے گا۔ مگر وہ اتنا خفا ہو گی یہ اس نے بالکل نہیں سوچا تھا۔

"آئم سوری فائقہ۔ آئم سو سوری۔" اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ فائقہ کو کیسے منائے۔

"کیا تمہیں خود سے کبھی بھی اس بات کا احساس نہیں ہوا؟" اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے نانیہ نے اس کا چہرہ دیکھا۔

"نہیں' مجھے لگتا تھا کہ تم جو اس کی اتنی کیئر کرتی ہو تو صرف ایک کزن ہونے کے ناتے اور باقیوں کے لاتعلق رویوں کا ازالہ کرنے کے لیے۔" نگاہیں جھکائے وہ اپنی اندرونی کشمکش پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ نانیہ چپ سی رہ گئی۔

پہلے اس کا دل چاہا تھا' وہ فائقہ کو اس کے بابا کے عزائم بتا دے۔ مگر پھر نے اپنا یہ ارادہ بدل دیا۔ ابھی یہ صرف ایک سنی سنائی بات تھی' جو چاچی کی زبانی اس تک پہنچی تھی۔ یہ ان کا قائم کیا گیا کوئی مفروضہ بھی ہو سکتا تھا۔ پھر بھی اس نے حفظ ماتقدم کے طور پر فائقہ کو اپنے دل کی بات بتا دی تھی۔ اب آگے جو بھی ہوتا' وہ فائقہ سنبھال لیتی اور نانیہ کے اطمینان کے لیے یہ ایک بات کافی تھی۔

"اچھا' تم نے مجھے اپنی پریشانی شیئر کرنے کے لیے بلایا تھا نا۔ بتاؤ کیا پرابلم ہے تمہارا؟" نانیہ نے بات بدلتے ہوئے اسے یاد دلانا چاہا۔ وہ چونکی پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"نہیں تانی۔ بس ایسے ہی۔" جو پریشانی وہ اسے بتانے والی تھی۔ نانیہ نے تو اس کا وجود ہی ختم کر دیا تھا اب تو بس اسے صرف خود کو سنبھالنا تھا اور دل کو سمجھانا تھا۔

"کیا فائقہ! تم مجھے بتا نہیں رہیں۔ اتنا ناراض ہو گئی ہو۔" نانیہ کچھ اور ہی سمجھی تھی دکھ سے کہتے ہوئے اس کا لہجہ دھیما ہو گیا۔

"نہیں۔ وہ بات نہیں ہے۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"اصل میں' میں یہ سوچ رہی تھی کہ۔" وہ کوئی بہانہ بنانے ہی لگی تھی کہ اچانک ہی باہر سے آتی قدموں کی دھمک نے اس کی یہ مشکل آسان کر دی۔

"کیا ہے۔ تم لوگ یہاں کیوں چھپی بیٹھی ہو۔ سیڑھیاں چڑھ چڑھ کے میری ٹانگیں دکھنے لگی ہیں۔" وہ صبورین تھی۔ تیز دھوپ سے اس نیم تاریک کمرے میں آتے وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تانی آپا! ہاتھ پکڑاؤ اپنا' ایسا نہ ہو فائقہ کو پکڑ کے لے جاؤں۔"

"کیوں؟ نانیہ سے کیا کام ہے؟" فائقہ نے حیران ہو کے پوچھا۔

"وہ تمہیں بعد میں بتادوں گی چلو تانی۔" صبورین نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"لیکن بات کیا ہے پہلے بتاؤ تو سہی؟"

"تم چلو میں بتا رہی ہوں۔" اسے ہاتھ سے پکڑے وہ اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے نیچے لے آئی۔

"اب بتاؤ' کیا مسئلہ ہے' کون سی آفت آگئی ہے؟" نانیہ نے جھلا کر اس سے اپنا بازو چھڑایا جو وہ یوں پکڑے ہوئے تھی' جیسے نانیہ کہیں بھاگ ہی جائے گی۔

"وہ۔ سیدان بھائی آج شام کی فلائٹ سے لاہور جا رہے ہیں۔" صبورین نے دھیمے لہجے میں بتایا۔

"کیا۔ تم مجھے یہ بات بتانے کے لیے نیچے لائی ہو۔" نانیہ کا جی چاہا کہ وہ اس کے منہ پر کس کر ایک

تعمیر چھوڑ دے۔"

"وہ جانے سے پہلے تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں چچی کی طرف گئی تھی تب انھوں نے ریکوئسٹ کی کہ میں تمہیں ان سے ملوا دوں۔" سیورین کی باتوں پر وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔

"پلیز تانی چلی جاؤ۔ سیدان بھائی بہت اچھے ہیں' آئی تھنک تمہیں پسند بھی کرتے ہیں شاید اسی بارے میں تم سے بات کرنا چاہ رہے ہوں۔"

"اگر تم میرے دل کی بات جانتیں تو مجھ سے یہ سب نہ کہتیں۔" وہ صرف یہ سوچ کر رہ گئی سیدان نے اسے پرپوز کیا تھا۔ اسی لیے تانیہ اس سے ملنے سے کترا رہی تھی' اس نے واضح الفاظ میں اپنی محبت کا اظہار کیا تھا اور پھر اپنا رشتہ بھیجنے کے متعلق اس کی مرضی طلب کی تھی۔ تانیہ کو اسے صاف منع کرنا تھا۔ اسے بتانا تھا کہ میری زندگی میں تم نہیں کوئی اور ہے۔ جس سے میں محبت کرتی ہوں۔ جس کے ساتھ اپنی پوری زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ لیکن نہ جانے کیوں تانیہ ایسا کر نہیں پائی تھی۔ شاید اسے اچانک سے اسے ناامید کرنے کی' اس کا دل توڑنے کی اس کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ اس نے صرف ایک ہی جملہ کہنے پر اکتفا کیا تھا۔ میں آپ کو سوچ کر بتاؤں گی۔ یہ سن کر سیدان کی آنکھوں میں اطمینان اتر آیا تھا۔ اور تانیہ وہاں سے چلی آئی تھی۔

شام میں وہ کچن میں رات کے کھانے کی تیاری کررہی تھی۔ جب فائقہ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ نیچے آئی تھی۔

"ہاں تانی۔ جلدی بتاؤ وہ بات جس کے لیے دوپہر میں سیورین تمہیں ہانکتے ہوئے نیچے لے آئی تھی؟" اوپر اس کے مہمان بیٹھے تھے مگر فائقہ کی طبیعت میں اتنا صبر نہیں تھا کہ وہ ان کے جانے کا انتظار ہی کرلیتی۔

"وہ کچھ خاص نہیں۔" اس نے خود کو لاپروا ظاہر کیا۔

"سیدان لاہور جارہا ہے تو جانے سے پہلے مجھے پرپوز کرنا چاہتا تھا۔"

"کیا۔؟" فائقہ اپنی جگہ سے اچھل پڑی اس کی بات سن کر۔

"سیدان نے تمہیں پرپوز کردیا۔ اور تم نے کیا کہا' دل توڑ دیا اس کا؟؟"

"نہیں بھئی۔ اب میں اتنی بھی کٹھور نہیں ہوں۔" تانیہ نے مسکراہٹ چھپائی وہ فائقہ کو ذرا تنگ کرنا چاہ رہی تھی۔

"اچھا۔" اسے کچھ حیرت ہوئی۔

"پھر بتاؤ نا تم نے اس سے کیا کہا؟" اب کے اس نے کچھ جھنجلا کر پوچھا۔

"اگر اتنا ہینڈسم بندہ تمہیں پرپوز کرتا تو تم کیا کرتیں؟" تانیہ نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"میں۔" اس نے چند لمحے سوچا پھر بولی۔

"اگر میں کسی اور کو پسند نہ کرتی تو یقیناً" ایسا پرپوزل قبول کرلیتی۔"

"بے فکر رہو میں نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔" وہ رخ موڑ کر پتیلی میں چاول ڈالنے لگی تھی۔ فائقہ الجھ گئی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا۔ کسی میں بھی نہیں؟؟"

"سنو فائقہ' تم نے سیدان کو دیکھا ہے نا۔" وہ بے حد سنجیدگی سے کہتے ہوئے اس کے قریب آئی۔

"اس کی جو شخصیت ہے جو اس کے بولنے کا' بات کرنے کا انداز ہے' جب وہ بات کرتا ہے نا فائقہ تو جیسے سحر سا پھونک دیتا ہے اور سامنے والا چاہے بھی تو بھی اس کی کسی بات کو منع نہیں کرسکتا' بالکل ایسے ہی جب اس نے مجھ سے یہ کہا کہ "تانیہ جی' آپ کو تو مجھ جیسے ہزاروں مل جائیں گے۔ لیکن مجھے آپ جیسی تانیہ کہیں نہیں ملے گی۔" تو سمجھو فائقہ اس ایک لمحے میں جیسے میرا دل میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا اور میں چپ کسی بت کی مانند واپس چلی آئی تھی۔"

تانیہ کیا کہہ رہی تھی۔ فائقہ ساکت سی اسے دیکھتی رہ گئی۔ وہ اسے مذاق بھی سمجھ لیتی۔ اگر تانیہ کا کھویا کھویا لہجہ۔ اس کی آنکھوں' اس کے چہرے سے چھلکتی سنجیدگی محسوس نہ کرلیتی تو۔

"تم پاگل ہوگئی ہو تانی' دوپہر میں مجھ سے کیا کہہ

رہی تھیں اور اب۔ تم نے حارث کے بارے میں نہیں سوچا۔" اسے تانیہ کی دماغی حالت پر شبہ ہونے لگا تھا۔

"حارث۔ حارث۔ چھوڑو نا فائقہ تم اس کا ذکر۔" وہ جیسے بے زار ہو اٹھی۔

"اچھا ہوتا' میں تمہیں اس کے بارے میں بتاتی ہی نہیں۔"

"اس کی پرسنالٹی دیکھ کر پھسل گئی ہو یا پھر اس کی دولت دیکھ کر۔" فائقہ نے کاٹ دار لہجے میں پوچھا۔

"پتا نہیں فائقہ۔ لیکن اب میں واقعی اس کے بارے میں سوچنے لگی ہوں۔" وہ بے بسی سے بولی تھی۔

"لعنت ہو تم پر۔" فائقہ کے لہجے میں جتنا تنفر تھا۔ تانیہ نے قدرے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ اس لمحے سیورین کچن میں داخل ہوئی اور فائقہ کو دیکھ کر چونک گئی۔

"اچھا! تم یہاں گپیں لڑانے بیٹھی ہو' اور اوپر چچی کا پارہ ساتویں آسمان کو چھو رہا ہے۔" فریج سے پانی کی بوتل نکالتے سیورین نے اسے اطلاع دی اور باہر نکل گئی۔ اس نے ایک تیز نگاہ اس پر ڈالی اور باہر نکلنے لگی۔

"رکو فائقہ' بات تو سنو میری۔" تانیہ نے گھبرا کر اس کا ہاتھ پکڑا۔

"مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔ میری بلا سے بھاڑ میں جاؤ۔" ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے نکل گئی تھی۔

"اف! یہ پاگل تو سچ سمجھ بیٹھی۔" تانیہ نے سر تھام کر سوچا تھا۔

"خیر۔ کوئی بات نہیں۔ میں بعد میں اسے سب بتادوں گی۔" اس سوچ نے اسے مطمئن کردیا تھا۔

☼ ☼ ☼

دوسرے دن چھٹی تھی۔ امی خالہ کی طرف جارہی تھیں۔ اس سے پوچھا تو اس نے منع کردیا۔

"میرا موڈ نہیں ہو رہا۔ سیورین سے پوچھ لیں۔"

"کیوں۔ یہ وہاں جانے کا سن کر ہی تمہارا موڈ کیوں خراب ہونے لگتا ہے۔" امی کو اس کی بات بری لگی اور انھوں نے اس کا اظہار بھی کردیا۔

"وہ تمہاری خالہ کا گھر ہے' وہاں بھی تمہارے کزنز رہتے ہیں۔ کبھی یہاں کے لوگوں سے ہٹ کر بھی اپنے ننھیال والوں کو لفٹ کروادیا کرو۔"

"افوہ امی' میں نے ایسا کب کہا۔" وہ کچھ پشیمان ہوئی۔

"وہ تو میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے کچھ اور۔ خیر آپ کہتی ہیں تو چلی جاتی ہوں۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے مجھ پر احسان کرنے کی' سیورین تو جا ہی رہی ہے میں نے تم سے اس لیے پوچھ لیا تھا کہ شہلا تمہیں یاد کررہی تھی۔" انھوں نے خالہ کی بیٹی کا نام لیا۔

"تم سے تو اتنا نہیں ہوتا کہ اسے اک فون ہی کرلو۔" وہ ناگواری سے بڑبڑاتے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی تھیں۔

"تانی! میرے لیے ناشتا بنادو جلدی سے۔ میں نہانے جارہا ہوں۔" امی اور سیورین کے جانے کے بعد جب وہ لاؤنج میں ٹی وی سے ٹائم پاس کررہی تھی۔ گلے میں تولیہ ڈالے احد نے پیچھے سے آکر کافی زور سے اس کے سر پر چپت ماری تھی اور وہ چیخ اٹھی تھی۔

"احد! تمیز سے بات کیا کرو۔ ورنہ کسی دن تمہارے یہ ہاتھ میرے ہی ہاتھوں ٹوٹیں گے۔"

"اوہو! ایک شو کی شاگرد۔" وہ زور سے ہنسا تھا۔

"اب اس سے پہلے کہ میں تمہیں اپنے داؤ پیچ سکھاؤں۔ اٹھ کر کچن کا رخ کرو۔" اسے چڑانے کے لیے احد نے اس بار تولیہ اتار کر اس پر جھاڑا تھا۔

آج چونکہ چھٹی تھی۔ اسی لیے حارث بھی گھر پر ہی تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ حارث جاگ گیا ہو تو اس کا ناشتا بھی ساتھ ہی تیار کردے۔

تانیہ حارث کے کمرے کی طرف چلی آئی تھی۔ لیکن ادھ کھلے دروازے نے اسے حیرت میں مبتلا

کر دیا۔ کچھ دیر تو وہ کھڑی اندر جانے اور نہ جانے کے آپشن پر غور کرتی رہی۔ پھر دھیرے سے دروازہ دھکیلتے اندر داخل ہو گئی۔ کمرے میں ابھی تک نائٹ بلب روشن تھا اور اس کی دھیمی دھیمی روشنی میں وہ اسے بیڈ پر اوندھا لیٹا نظر آیا۔

"حارث! سو رہے ہو کہ جاگ رہے ہو۔" تانیہ نے ہولے سے اسے پکارا اس کے جسم میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ گیارہ بج چکے تھے اب تک تو اسے جاگ جانا چاہیے تھا۔ تانیہ کو پریشانی ہونے لگی۔ اس نے سوئچ بورڈ پر ہاتھ مار کر تمام لائٹس آن کر دیں تب کہیں جا کر اس نے کروٹ بدلی اور اپنی سرخ انگارہ آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تھا اور دوسرے ہی پل پھر سے آنکھیں موندلی تھیں۔

"حارث! تمہاری طبیعت ٹھیک ہے نا۔" تانیہ سے رہا نہیں گیا وہ اس کے قریب آگئی دھیرے سے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کی پیشانی پر رکھا اور پھر فوراً" ہی اضطراری انداز میں پیچھے کھینچ لیا۔ اس کی ہتھیلی جل اٹھی تھی۔

"اف خدایا! تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔" حارث نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھا۔ اور یہاں گھبراہٹ کے مارے تانیہ کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ چند لمحوں کے لیے تو اسے سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ لیکن پھر کسی خیال کے آتے ہی وہ فیصل کو بلانے کے لیے بھاگی تھی۔

کچھ ہی دیر میں فیصل ڈاکٹر کو بلا لایا تھا اور گھر کے دیگر افراد بھی حارث کے کمرے میں آموجود ہوئے تھے۔ حارث کا بخار ایک سو تین سے تجاوز تھا اور ڈاکٹر نے دوائیاں لکھنے کے ساتھ ٹھنڈی پٹیاں رکھنے کی بھی ہدایت کی تھی۔ تانیہ ایک طرف کھڑی اپنے دل کو سنبھالنے کی کوششوں میں تھی جو حارث کو اس حالت میں دیکھ کر بکھرنے کو تھا۔ اس وقت اسے کسی کی بھی پروا نہیں رہی تھی بلکہ اسے یہ ہوش تک نہیں تھا کہ حارث کے لیے اس کی اس قدر پریشانی پر باقی گھر والے کیا سوچ رہے ہیں۔

"وہ تمہیں حارث کے بخار کا کب پتا چلا؟" ڈاکٹر کے جانے کے بعد فائقہ کی امی اس سے پوچھ رہی تھیں۔ کچھ عجیب سے لہجے میں۔

"کچھ دیر پہلے ہی۔" ایک نامکمل سا جواب دے کر وہ ٹھنڈا پانی لانے کے لیے باہر نکل آئی۔

"انہیں حارث کی کوئی فکر نہیں ہے انہیں پریشانی ہے تو صرف اس بات کی کہ مجھے یہ بات کیسے پتا چلی۔ میں اس کے لیے اتنی فکر مند کیوں ہوں۔ میں اس کے کمرے میں کیا کر رہی تھی۔ وہمی بیمار ذہنیت کے لوگ۔" وہ شدید فرسٹریشن کا شکار ہونے لگی تھی آئس کیوبس نکال کر پانی میں ڈالے اور پٹیاں بنا کر کمرے میں چلی آئی۔

"لاؤ تانی مجھے دے دو۔" چھوٹی چچی نے اسے پانی لاتے دیکھا تو کہا۔ اس کا دل چاہا منع کر دے لیکن پھر کچھ سوچ کر پانی کا باؤل انہیں تھما دیا اور خود بیڈ پر اس کے پیروں کے پاس بیٹھ گئی۔

"پلیز حارث! جلدی سے ہوش میں آجاؤ۔ میں تمہیں اس طرح نہیں دیکھ سکتی۔" اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے ہاتھوں کو اس کے دہکتے تلووں پر رکھتے تانی نے دل سے اسے پکارا تھا۔ آنسو نہ جانے کب پلکوں کی باڑھ پھلانگ کر رخساروں کو تر کرنے لگے تھے۔ اسے احساس تک نہیں ہوا تھا فائقہ چند لمحوں پہلے ہی وہاں آئی تھی اور اب دیوار سے ٹیک لگائے تانیہ کو دیکھتے ہوئے وہ عجیب ہی احساسات کا شکار ہونے لگی تھی۔ اسے بے حد تکلیف ہو رہی تھی۔ لیکن اسے اس تکلیف کا سبب خود بھی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا یہ تکلیف حارث کی خراب طبیعت کی وجہ سے تھی یا پھر تانیہ کو اس طرح حارث کے لیے روتے دیکھ کر اس کا دل یہ برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اٹھو حارث! ناشتا کر لو۔ پھر تمہیں دوائی بھی لینی ہے۔" وہ تیز تیز بولتی ناشتے کی ٹرے لیے اندر آئی تھی۔ وہ جو ــــ سوچوں میں گم تھا چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"مجھے پتا ہے بیماری میں کچھ بھی کھانے پینے کا دل نہیں کرتا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ بغیر کچھ کھائے تم یہ دوائی بھی تو نہیں لے سکتے۔ اسی لیے فٹافٹ اٹھ جاؤ دیکھو آج میں تمہارے لیے دودھ اور بریڈ نہیں لائی۔ تم بور ہو گئے ہو گے نا جبھی میں نے آج دلیہ بنایا ہے ذرا الگ طریقے سے۔ اگر تمہیں یہ بھی پسند نہ آئے تو بھی کوئی بات نہیں۔ تم کھچڑی کھا لینا۔ میں نے ڈاکٹر سے پوچھا تھا اس نے بتایا کہ تم کھچڑی کھا سکتے ہو۔" تانیہ نان اسٹاپ بول رہی تھی اور حارث خاموشی سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ شدید بخار کی حالت میں جب جب بھی اس کی آنکھ کھلتی جب بھی اسے ذرا ہوش آتا۔ اس کے لیے فکر مند ہوتی اس کے لیے روتی ہوئی وہ اس کے قریب ہوتی اور اس تھوڑی سی دیر میں ہی اسے اپنے پاس پا کر اس کے دل میں لگی آگ مزید بھڑک جاتی اور بخار جو کم ہو رہا تھا مزید شدت اختیار کر لیتا۔

آج چوتھے دن اس کی حالت قدرے سنبھلی تھی اور آج بھی تانیہ اس کی تیمارداری میں اسی طرح ہلکان ہو رہی تھی۔

"کیا ہوا؟ تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟" خود پر مستقل جمی اس کی نظریں محسوس کر کے وہ ٹھٹک گئی۔ پھر کسی خیال کے آنے پر خود ہی ہنس پڑی۔

"لیکن میں تم سے یہ کیوں پوچھ رہی ہوں۔ تم تو ہمیشہ مجھے ایسے ہی دیکھتے ہو اور مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔" نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے وہ شرارت سے بولی تھی۔

حارث نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔ وہ چاہتا تھا تانیہ یہاں سے چلی جائے۔ اس کی موجودگی، اس کی باتیں اسے مستقل اذیت میں مبتلا کیے ہوئے تھیں۔

"کیا ہے حارث۔ بیمار ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم بس چپ کا روزہ رکھے بیٹھے رہو۔ کچھ تو بولو بات کرو تاکہ مجھے بھی اطمینان ہو کہ تمہاری طبیعت ٹھیک ہو رہی ہے۔" وہ اس کی خاموشی پر الجھنے لگی۔

"میری طبیعت اب بھی بہتر نہیں ہو گی تانی۔ اس لیے اچھا ہو گا تم یہاں سے چلی جاؤ۔" اتنی دیر بعد اس نے کہا بھی تو کیا جملہ اور کتنے عجیب سے لہجے میں۔

"چلی جاؤ تانی مجھے وحشت ہو رہی ہے تمہاری موجودگی سے۔" اس کا لہجہ چیخ گیا تھا اور تانیہ بہت سی بنی اسے دیکھتی رہ گئی۔

"تمہیں مجھ سے وحشت ہو رہی ہے حارث۔ مجھ سے۔"

"ہاں۔ تم سے۔ تمہاری اس دوغلی شخصیت سے، تمہاری ان پر فریب باتوں سے، تمہاری ان مصنوعی بناوٹی اداؤں سے، جن سے میں اتنا عرصہ پاگل بنتا رہا۔ تم مجھ "بے چارے" سے ہمدردی کر رہی تھیں اور میں نہ جانے کیا سمجھ بیٹھا۔ لیکن۔ اب اور نہیں۔ مجھ پر مزید مہربانیاں کرنے کے بجائے تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ ترس کھانے کے لیے اس دنیا میں بہت سے لوگ ہوں گے۔ اپنا یہ جذبہ مجھ پر لٹانے کے بجائے ان کے لیے بچا رکھو میں آل ریڈی تمہاری نوازشوں کا بھگتان بھر رہا ہوں۔" اس کی زردیاں گھلی رنگت اس لمحے سرخ پڑ گئی تھی مٹھیاں بھینچ کر کہتے ہوئے وہ اس کے دل اس کے خلوص اس کے جذبوں کی دھجیاں بکھیر رہا تھا۔ اور تانیہ ساکت بیٹھی اس درد کی شدت ناپ رہی تھی جو چند لمحوں میں ہی جسم و جاں کو نڈھال کر گیا تھا۔

"میں نے۔ میں نے۔ کیا کیا ہے حارث۔ مجھ سے ایسا کیا ہو گیا ہے جو تم۔ میرے ساتھ اس طرح سے بات کر رہے ہو۔۔؟" الفاظ اس کے حلق میں ہی اٹکنے لگے تھے۔ اور آنسوؤں کا ایک سیلاب سا آنکھوں میں امڈ آیا تھا۔ وہ کب عادی تھی حارث کے اس رویے کی۔ اسے تو صرف حارث کی جذبے لٹاتی نگاہیں، اس کا رس گھولتا لہجہ یاد تھا۔ وہ سراپا محبت تھا اس کے لیے، اور اب کتنا اجنبی، کتنا بے گانہ لگنے لگا تھا۔

"میری جان تو تم پہلے ہی نکل چکے ہو۔ اور اب اس طرح ناراض ہو کر مجھے میری خطا بتاتے ہو۔ پھر جتنا برا بھلا چاہو مجھے کہہ دینا۔" اس کے منہ سے بے ربط سے جملے نکل رہے تھے۔

"تمہاری کوئی خطا نہیں ہے تانی۔ غلطی تو میری ہے۔ میں ہی تمہیں سمجھ نہیں پایا۔" اس کا لہجہ بوجھل تھا اور آنکھوں میں عجیب ہی طوفان مچل رہے تھے۔

"مجھے لگتا تھا' تم اس گھر کے لوگوں سے مختلف ہو۔ تم اس ساری دنیا سے الگ ہو۔ مجھے۔ مجھے اپنے اتنے قریبی رشتوں کی لاتعلقی تاثر نہیں کرتی تھی۔ مجھے ان نام نہاد اپنوں کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی تانی۔ جب سے میں نے تمہیں اپنا سمجھنا شروع کیا تھا۔ تمہارا مجھ سے اپنائیت جتانا' میری فکر کرنا' میرا خیال رکھنا۔ تمہارے میرے طرف بڑھتے ہوئے ہر قدم کو میرا یہ خوش فہم دل محبت پر محمول کرتا رہا۔ میں نے تمہیں اپنی دنیا مان لیا تھا تانی۔ لیکن میں بھول گیا تھا کہ تم بھی اسی گھر کی باسی ہو' انہی منافق لوگوں کے بیچ رہتی ہو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ تم پر ان کا کوئی رنگ نہ چڑھتا۔ تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا تانی؟" وہ لہو رنگ ہوتی آنکھیں اس پر جمائے اس سے پوچھ رہا تھا۔

"میں بری بھلی جیسے بھی تھی' اپنی زندگی جی رہا تھا۔ تمہیں کس نے کہا تھا میرے زخموں پر اپنے ہمدردی کے پھائے رکھنے کو؟ کیوں آئیں تم میرا دل رکھنے کے لیے مجھ پر ترس کھانے کے لیے کاش۔ میں پہلے جان لیتا۔ اتنا بڑا دھوکا کھانے سے پہلے صرف اتنا سوچ لیتا کہ مجھ جیسے تہی دست پر زندگی کبھی بھی اتنی مہربان نہیں ہو سکتی۔ میں ایک بہت بڑے فریب کا شکار ہو رہا ہوں۔ تم میرے ساتھ ہمدردی تو جتا سکتی ہو۔ لیکن تمہارا دل۔ تمہاری محبت تو صرف سیدان کے لیے ہے۔"

"سیدان۔ سیدان۔" تانیہ جو منجمد بیٹھی سن ہوتے ذہن کے ساتھ اس کی باتیں سن رہی تھی' اس نام پر اس کی ساری حسیات جاگ اٹھیں' وہ آنکھوں میں دنیا جہان کی بے یقینی لیے اسے دیکھنے لگی۔

"تم۔ تم۔ تم۔ سیدان کی وجہ سے۔" اس کی رنگت سفید پڑ گئی تھی' منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم نے جو بھی کچھ کہا۔ اسے میں کبھی بھول بھی جاؤں۔ لیکن یہ آخری بات۔ تم نے میری محبت پر شک کیا ہے حارث ٹوبے۔ اور اس کے لیے تمہیں بہت پچھتانا پڑے گا۔" آنکھیں لبالب پانیوں سے بھر گئی تھیں۔ بمشکل اپنی بات پوری کر کے وہ بہت تیزی سے باہر نکل آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تانی! کیا ٹائم ہو رہا ہے' اٹھ بھی جاؤ اب۔ وقت بے وقت سونے کی تمہاری یہ منحوس عادت نہ جانے کب ختم ہو گی۔" وہ کمبل میں منہ سر لپیٹے پڑی تھی جب امی نے اس پر سے کمبل کھینچتے ہوئے ناگواری سے کہا تھا۔ کمبل کے ہٹتے ہی اس نے جلدی سے تکیے میں منہ چھپا لیا۔ اگر امی اس کی سرخ اور سوجی ہوئی آنکھیں دیکھ لیتیں تو اس کے لیے بڑا مسئلہ پیدا ہو سکتا تھا۔

"اب اتنی بھی بیمار نہیں ہو کہ نماز تک نہ پڑھ سکو۔ جلدی اٹھو' عصر کا وقت نکلا جا رہا ہے۔" یہ آخری بات انہوں نے ذرا بڑبڑا کر کہی تھی۔ مگر اس کی سماعتوں میں پڑ گئی پچھلے ایک ہفتے سے جو بخار کی بدولت وہ بستر سے لگی ہوئی تھی یہ جملہ امی اتنا کثر میں کہا گیا تھا۔

"تو نہ کریں ناخدمتیں۔ کس نے کہا ہے مجھ پر یہ کرم نوازی فرمانے کو۔ اچھا ہی ہے جلد سے جلد مر جاؤں۔ جان تو چھوٹے گی ان جھمیلوں سے۔" اس کا دل پہلے ہی بھر بھر آ رہا تھا اس پر امی کی یہ بات۔ جو اتنی بڑی تو نہیں تھی مگر اسے روہانسا کر گئی۔

"تانیہ! کون سے جھمیلے؟" امی نے فوراً ہی ٹھٹک کر قہر آلود نظریں اس پر جماتے ہوئے کڑے لہجے میں

دریافت کیا۔

"ایسے کون سے روگ ہیں تمہاری جان کو جو اپنے مرنے کی دعائیں مانگ رہی ہو۔ بے ڈھنگی ہو۔ بے ڈھنگی ہی رہو گی ہمیشہ۔ سو بار کہا ہے جوان لڑکیوں کے منہ سے ایسی بکواس اچھی نہیں لگتی۔"

"جوان لڑکیوں کے منہ سے کون سی بات اچھی لگتی ہے آپ لوگوں کو۔ یہ بتائیے ذرا۔ اس سے تو اچھا ہے جوان ہونے سے پہلے ہی ان کی زبانیں کٹوا دیا کریں کوئی مسئلہ ہی نہیں رہے گا۔"

"کاش! تمہاری تو کٹوا ہی دیتی۔" انہوں نے دانت پیسے تھے۔

"یہ گز بھر کی زبان لے کر سسرال جاؤ گی تو مجھے کوسنے ملیں گے۔ یہ تو کوئی کوئی ہی ہوتا ہے ڈگے کی طرح قسمت کا دھنی۔ کہ بیٹی کے سسرال کا کوئی جھنجھٹ ہی نہ ہو۔" امی نے نہ جانے یہ بات کس حوالے سے کہی تھی۔ تانیہ حیران ہو گئی۔

"کیا مطلب امی؟" وہ پچھلے ہفتہ دس دن سے خود فراموشی کی کیفیت میں تھی تو کیا کچھ معاملات اس حد تک آگے بڑھ گئے تھے۔

"فائقہ کے ماموں کی فیملی تو بہت بڑی ہے۔"

"تو فائقہ کے ماموں کی بات کون کر رہا ہے؟" امی نے اسے یوں دیکھا جیسے وہ پاگل ہو گئی ہو۔

"میں تو حارث کی بات کر رہی ہوں۔ تمہارا وہی کزن۔ جس کا غم تمہیں دن رات گھلائے رکھتا ہے۔" امی کا انداز طنز سے بھرپور تھا اور ادھر اس کے جسم سے جان نکل گئی تھی۔

"اب اٹھ بھی جاؤ جلدی سے۔ اور کچھ نہیں تو فائقہ کو مبارک باد ہی دے آنا۔" امی چلی گئی تھیں یہ کہہ کر۔ شاید وہ اس کی دلی کیفیت سمجھ گئی تھیں۔ جبھی تو ان کے لہجے میں اتنا طنز تھا۔ حارث کے لیے بھی اور اس کے لیے بھی۔

اور تانیہ دھواں دھواں چہرہ لیے دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گئی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ابھی ابھی جو کچھ امی نے کہا وہ سب سچ ہے۔ حارث اس سے خفا تھا۔ بدگمان تھا لیکن وہ اس پر اتنی بڑی قیامت کیسے ڈھا سکتا ہے۔ بغیر اس کی کوئی صفائی سنے اسے اتنی کڑی سزا کیسے دے سکتا ہے۔ اس کا دل چاہا کہ جا کر حارث کا گریبان پکڑ کر اس سے اس بے وفائی کی وجہ پوچھے۔ اسے خوب برا بھلا کہے۔ اس کی جان ہی لے لے۔ وہ اس کی محبت پر شک کر رہا تھا اور خود اپنے جذبوں میں کتنا کھرا تھا کہ ایک ذرا سی غلط فہمی کی وجہ سے اتنا بدگمان ہوا کہ اب کسی اور کا ہاتھ تھامنے چلا تھا۔

سبرین کسی کام سے کمرے میں آئی تھی اسے یوں آنسو بہاتا دیکھا تو گھبرا گئی۔

"کیا ہوا تانی! رو کیوں رہی ہو۔ کیا امی نے کچھ کہا ہے؟" کچھ دیر پہلے امی کو کمرے سے نکلتا دیکھ کر وہ یہی سمجھی۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس کے گلے لگی تھی اور رو رو کر اسے پوری داستان کہہ سنائی تھی۔ حالانکہ یہ کام سبرین کے بار بار پوچھنے پر بھی اس نے نہیں کیا تھا جب وہ اس کی اداسی کی وجہ پوچھ پوچھ کر تھک گئی تھی۔

"میں نہیں جانتی سبرین۔ ہمارے بیچ یہ سیدان کب اور کیسے آیا۔" اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"تمہاری اپنی بے وقوفی سے۔" سبرین سنجیدگی سے بولی۔

"میری بے وقوفی۔" وہ چونک گئی۔

"ہاں! تمہاری پہلی بے وقوفی تو یہ ہے کہ تم نے مجھے اس بات سے لاعلم رکھا۔ جب اتنا پوچھ رہی تھی میں تم سے۔ تب تم نے کیوں نہیں بتایا مجھے۔ تب بتا دیتیں تو معاملات اس حد تک تو نہ بگڑتے۔ میں حارث بھائی سے بات کرتی اور پھر اس دن۔ جب سیدان بھائی لاہور جا رہے تھے۔ یاد ہے تمہیں فائقہ تم سے پوچھنے کے لیے نیچے آئی تھی۔" سبرین نے اسے یاد دلایا تو اس کے ذہن میں اس شام کا پورا منظر تازہ ہو گیا۔ اس وقت سبرین تو وہاں نہیں تھی مگر بعد میں تانیہ نے اسے فائقہ سے کیے گئے اپنے مذاق

کے بارے میں بتا دیا تھا۔

"تو؟" ثانیہ نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ تو سبرین انکشاف کرتے ہوئے بولی۔

"تو اس دن حارث بھائی نے تمہاری باتیں سن لی تھیں۔ جو بھی فضول قسم کا مذاق تم فائقہ سے کر رہی تھیں نا۔ اسے حارث بھائی نے سچ سمجھ لیا تھا۔"

"کیا۔۔؟" اس کا لہجہ ڈوب گیا۔

"تم نے مجھے اس وقت کیوں نہیں بتایا۔"

"تو مجھے کیا پتا تھا کہ تم فائقہ سے کیا باتیں کر رہی ہو۔ میں کچن کی سائیڈ آرہی تھی تب وہ وہیں تھے۔ انہوں نے مجھ سے پانی بھی مانگا۔ اس وقت اگر مجھے ذرا بھی اندازہ ہوتا کہ تم اپنے پیروں پر خود کلہاڑی مارنے جارہی ہو تو میں تمہیں روک لیتی۔ لیکن یہ بات بھی تو تم اب ہی بھولی ہونا کہ حارث بھائی تم سے اتنے خفا ہیں۔ اور انہوں نے تمہیں اتنا کچھ سنا دیا ہے سیدان بھائی کو لے کر۔" اپنی بات ختم کرکے سبرین نے گہری سانس لی۔

"مجھے کیا پتا تھا۔ کہ میرا یہ مذاق مجھے اتنا مہنگا پڑ جائے گا۔" اس کی آواز بھیگ گئی۔

"تمہیں تو مہنگا پڑ گیا لیکن حارث بھائی کا سوچو ذرا۔ ان کے دل پر کیا بیتی ہوگی کتنا ہرٹ ہوئے ہوں گے وہ۔ اتنا پیار کرتے ہیں وہ تم سے اور سیدان بھائی کے لیے تم نے جو کچھ کہا۔ انہیں دکھ تو ہونا ہی تھا۔ پہلے ہی کون سا وہ رشتوں کے معاملے میں بہت خوش نصیب ہیں۔"

"تو پھر اب کیا ہو سکتا ہے سبرین۔ اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔" صورتحال کی سنگینی کا اندازہ کرکے وہ پھر سے رو دی۔

"ہو سکتا ہے۔ اگر میں ان سے بات کروں۔" سبرین نے کچھ سوچ کر کہا۔

"نہیں۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" اسے ایکدم سے غصہ آگیا۔

"حارث کے ساتھ جو ہو رہا ہے ہونے دو وہ اسی قابل ہے۔ اسے کوئی غلط فہمی ہو بھی گئی تھی تو اسے مجھ سے بات کرنی چاہیے تھی۔ معاملہ کلیئر کرنا چاہیے تھا۔ لیکن اس نے ایسا کچھ نہیں کیا تو ٹھیک ہے۔ مجھے بھی کیا پڑی ہے کہ میں خود سے جاکے اسے صفائیاں دوں۔ وہ جس سے شادی کرنا چاہتا ہے کرے میں کوئی اس کے بغیر مر نہیں جاؤں گی۔"

"واہ کیسے ایک پل میں بدل جاتے ہیں تمہارے خیالات۔" سبرین نے استہزائیہ انداز میں کہتے ہوئے سر ہلایا۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے بھاں بھاں کرکے روتے ہوئے کن عزائم کا اظہار کر رہی تھیں تم کہ جی چاہتا ہے سب کچھ تباہ کر دوں، ساری دنیا کو آگ لگا دوں۔ اسے جان سے مار دوں یا اپنی جان لے لوں اور اب کتنی آسانی سے ہاتھ جھاڑ کر پیچھے ہٹ گئی ہو۔"

"تو کیا کروں؟" وہ چلا اٹھی۔

"کیا سچ مچ اپنی جان لے لوں اس ناقدرے انسان کے لیے۔"

"خدا کے لیے۔" سبرین نے گھبرا کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔

"فی الحال تو تم اپنے یہ پھٹے ڈھول جیسی آواز بند کرو۔ امی نے سن لیا تو تمہارے ساتھ میری بھی شامت آئے گی۔ تم اٹھو۔ میں سوچتی ہوں تمہارے لیے کچھ۔" اسے بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے سبرین نے تسلی آمیز لہجے میں کہا تھا۔ آنسو صاف کرتے ہوئے وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼
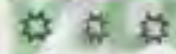
جس دن سے ثانیہ بیمار پڑی تھی۔ اس نے فائقہ کو نہیں دیکھا تھا۔ اسے حیرت بھی ہو رہی تھی کہ اسے اس کی خیریت پوچھنے تو آنا ہی چاہیے تھا حالانکہ وہ تو ایک دن بھی ثانیہ سے ملے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ جب وہ اس سے ناراض ہوتی تھی تب بھی اسے خوب ڈانٹ کر دل کی بھڑاس نکال لیتی تھی پھر اب ایسا کیا ہو گیا تھا جو وہ یوں اجنبیت کا مظاہرہ کرنے پر اتر آئی اپنی سوچوں میں الجھتے وہ اوپر فائقہ کے کمرے میں چلی آئی تھی۔

"کیا ہو گیا ہے فائقہ۔ اتنے دنوں سے تم نیچے کیوں نہیں آئیں۔ آج کل تمہارا مزاج بھی کچھ عجیب سا ہو گیا ہے۔ پتا بھی نہیں چلتا کس بات پر خوش ہو گئی ہو اور کس بات پر ناراض۔" اسے دیکھتے ہی وہ شروع ہو گئی تھی۔ فائقہ نے ہاتھ میں پکڑا سیل فون ایک طرف رکھا اور دونوں ہاتھ بالوں میں پھنساتے ہوئے بولی تھی۔

"میں ناراض نہیں ہوں ثانیہ۔ میں بس شرمندہ ہوں۔" اس کی آواز اتنی ہلکی تھی کہ ثانیہ بمشکل سن پائی۔

"کیا کہا تم نے۔ شرمندہ ہو۔ کیوں؟"

"سب جانتی تو ہو ثانیہ۔ انجان کیوں بن رہی ہو۔"

"او اچھا اس لیے۔" بات کی تہہ تک پہنچتے ہی ثانیہ سر ہلا کر رہ گئی۔

"لیکن فائقہ تمہیں شرمندہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ سب تو چچا جی کی خواہش ہے نا۔ تم نے تو ایسا نہیں چاہا ہوگا۔" وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولی، فائقہ کا رنگ متغیر سا ہو گیا تھا اس کی بات پر۔

"پھر بھی ثانیہ۔ تم سوچ رہی ہو گی کہ مجھے تو انکار کر دینا چاہیے تھا۔" وہ مضطرب سی انگلیاں چٹخا رہی تھی۔

"لیکن یقین کرو۔ مجھے بالکل پتا نہیں تھا۔ بابا ایسا سوچ رہے ہیں۔"

"میں جانتی ہوں فائقہ۔ تمہیں وضاحتیں دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" ثانیہ نے اس کے ہاتھ تھامے۔

"پتا ہے ثانی۔ جب بابا نے ماموں کو انکار کیا تو میرے دل سے ایک بھاری بوجھ اتر گیا تھا۔ اس وقت مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ ان کے ذہن میں کیا ہے۔ کہنا تو نہیں چاہیے لیکن اگر تب مجھے ان کی خود غرض سوچ کا پتا چل جاتا تو میں انہیں کبھی ماموں کو انکار نہ کرنے دیتی ٹھیک ہے میں نے کبھی حسن کے بارے میں اس طرح سے نہیں سوچا تھا لیکن حارث سے حارث کی بہ نسبت تو میں خوشی خوشی اپنی زندگی حسن کے ساتھ گزارنے پر تیار ہو جاتی۔" فائقہ نے یہ بات کہتے ہوئے ثانیہ کی طرف نہیں دیکھا وہ جانتی تھی کہ اس کے آخری جملے سے ثانیہ کو تکلیف ہوئی تھی۔ لیکن اس سے زیادہ درد تو خود اس کے دل میں اٹھا تھا۔ دل ہی دل میں حارث کو چاہتے اب اسے اپنے جذبوں کی شکست چھپانے کے لیے، محض اپنی انا بلند رکھنے کے لیے یہ سب کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ منافق نہیں بننا چاہتی تھی مگر اس لمحے بن گئی تھی۔ اپنی ذات کا بھرم رکھنے کے لیے اسے یہ بھی کرنا پڑ گیا تھا۔

بابا نے یہ بات تایا جی کے ذریعے حارث تک پہنچائی تھی اور فائقہ کو پتا تھا کہ حارث جیسا بالحاظ اور ہمیشہ دوسروں کے دل اُن کے احساسات کی پروا کرنے والا انسان کبھی بھی انہیں انکار نہیں کر سکتا اور بابا کی خواہش بھی بنا چوں و چرا کیے پورا کر دے گا۔ اسی لیے اب فائقہ کو خود ہی انکار کرنا تھا۔ کیونکہ اب اگر وہ ان کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس رشتے میں بندھ بھی جاتی تو بھی ہمیشہ ثانیہ کا ساتھ چاہنے والا حارث شاید کبھی اسے اپنے دل تک رسائی نہ دیتا۔ اور فائقہ ساری زندگی با دل نخواستہ ۔۔۔ اس رشتے میں بندھے حارث کا دل جیتنے کی کوشش میں گزار دیتی اور حاصل وصول شاید تب بھی کچھ نہ ہوتا۔ زندگی بھر غیر یقینی حالات سہنے نارسائی کی آگ میں جلنے سے بہتر یہی تھا کہ وہ آج ہی اپنی یکطرفہ محبت کے حصار سے نکل کر کوئی دانشمندانہ فیصلہ کرتی اور اس نے کیا کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

نہ جانے کتنے دن گزر گئے تھے۔ اس کا دوبارہ حارث سے سامنا نہیں ہوا تھا اس کے بعد جس دن حارث نے اس پر اپنے دل کا سارا غبار نکالا تھا اور سچ تو یہ تھا کہ حارث کے اس غصے اور خفگی کا پس منظر جاننے کے بعد ثانیہ کو اس سے کوئی شکایت بھی نہیں رہی

تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ حارث کی طرف سے فی الحال کوئی رد عمل سامنے نہیں آیا تھا۔ ابا جی نے منیب چچا کی جو خواہش اس تک پہنچائی تھی اس پر بھی وہ مکمل خاموشی اختیار کیے ہوئے تھا۔ گھر کی فضا ان دنوں کچھ پرسکون مگر بوجھل اور تناؤ بھری ہو گئی تھی۔ لیکن پھر یہ عارضی سکون بھی اس دن غارت ہو گیا جب فائقہ نے اپنے کہے کے عین مطابق حارث سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔

چچی تو اس معاملے میں اپنا منہ بند کیے ہوئے تھیں لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ فائقہ، تانیہ کو کچھ نہ بتاتی۔ چچا منیب اس کے انکار کو کوئی اہمیت نہیں دے رہے تھے اور فائقہ نے گھر میں اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ ویسے ہی وہ چچا منیب کی بہت لاڈلی تھی اور آج تک اس کی ہر بات مانتے رہنے کی عادت نے ہی فائقہ کو یوں من مانی کرنے کی شہ دی تھی۔ ایک ہی گھر تھا اس لیے باقی سب بھی زیادہ دیر اس قصے سے لاعلم نہ رہ سکے۔ تایا جی تو یہ سنتے چچا منیب کو سمجھانے بیٹھ گئے کہ جوان اولاد پر زبردستی اچھی نہیں ہوتی اگر فائقہ کی مرضی نہیں ہے تو کیوں اس کی زندگی خراب کرنے پر تلے ہوئے ہو لیکن منیب چچا کو بھی گویا ضد سی ہو گئی تھی کہ وہ حارث کو اپنا داماد بنا کر ہی دم لیں گے اگر حارث خوش تھا اور راضی تھا۔ وہ حارث کی خاموشی کو اس کی خوشی سمجھے بیٹھے تھے۔ تو وہ کیوں فائقہ کی جذباتی پن اور بے وقوفانہ ضد کے آگے سر جھکاتے۔ جسے اپنے برے بھلے کی پہچان نہیں تھی۔ ادھر گھر میں یہ سب چل رہا تھا اور ادھر تانیہ کے دل پر منوں بوجھ آپڑا تھا۔

وہ تو اس سارے ہنگامے سے پہلے ہی حارث کی جانب سے انکار کی منتظر تھی لیکن حارث کی طرف سے انکار تو کیا سرے سے کوئی ری ایکشن بھی سامنے نہیں آیا یہاں تک کہ فائقہ نے خود اس رشتے سے انکار کر دیا اور وہ سوچ رہی تھی کہ یہ بات تو یقیناً حارث تک بھی پہنچی ہوگی۔ پھر بھی وہ منیب چچا کو منع نہیں کر رہا کیا واقعی اس کے دل سے تانیہ کی محبت ختم ہو گئی تھی کیا اس نے سچ میں حارث کو اس بری طرح ہرٹ کیا ہے کہ وہ اسے اپنے دل، اپنی زندگی سے نکال کر اس کی جگہ کسی اور کو دینے کی سوچ رہا ہے۔ تانیہ کا حارث پر یقین متزلزل ہونے لگا تھا۔ ساری تسلیاں جس سے وہ اب تک خود کو بہلاتی آرہی تھی اب اسے اپنا منہ چڑاتے محسوس ہونے لگیں۔ ایک وہم یہ بھی ستانے لگا تھا کہ شاید حارث اس کی سیدان میں دلچسپی محسوس کر کے ہی پیچھے ہٹا ہو۔ وہ خود بھی تو نہیں گئی تھی اس کی غلط فہمی دور کرنے کو ایسے میں حارث اگر ایسا کچھ سوچتا بھی تو حق بجانب ہوتا۔

پھر ایک اداس سی شام میں جب وہ چھت پر ڈھلتے سورج کی نارنجی کرنوں میں بیٹھی قنوطیت زدہ سوچوں کے زیر اثر تھی۔ فائقہ نے پیچھے سے آکر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"تم یہاں کیوں بیٹھی ہو۔" وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

"اس تیز چبھتی ہوئی دھوپ کو دسمبر کی نرم گرم دھوپ سمجھ کر سینکتے ہوئے۔ تمہارا کیا دماغ الٹ گیا ہے۔"

"نہیں خیر۔ اب اتنی بھی تیز نہیں ہے۔" وہ دھیرے سے مسکرائی۔

"تھکی تھکی ماند پڑتی یہ دھوپ مجھے کہاں سے چبھے گی بھلا۔"

"ہاں۔ تمہیں تو کوئی اور ہی چیز چبھ رہی ہے۔" فائقہ کا انداز معنی خیز تھا۔ تانیہ نے نظر انداز کر دیا وہ اس لیے اس پر اپنے دل کی کوئی کیفیت آشکار کرنے کے موڈ میں نہیں تھی مگر تب اسے اپنی پوری توجہ فائقہ پر مرکوز کرنی پڑی جب اس نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"میں آج حارث سے بات کرنے گئی تھی۔"

"کیا بات؟"

"یہی کہ میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ میں انکار کر چکی ہوں۔ وہ بھی بابا کو منع کر دے۔" اپنے ہاتھوں پر نظریں جمائے وہ کہہ کر چپ ہو گئی۔ تانیہ کا خیال تھا وہ آگے بھی کچھ کہے گی۔

مگر جب وہ اسی طرح گم سم بیٹھی رہی تو اسے خود ہی سوال کرنا پڑا۔

"پھر۔ کیا جواب دیا اس نے؟"

"ہوں۔" اس نے ایک گہری سانس لے کر اسے دیکھا۔

"کیا جواب دیتا۔ کہنے لگا ٹھیک ہے تم جیسا چاہتی ہو ویسا ہی ہوگا۔"

"کاش! وہ جان سکتا کہ میں کیا چاہتی ہوں۔" اس کے دل سے ہوک اٹھی تھی۔

تانیہ اس کے دل سے بے خبر اپنی دھڑکنیں شمار کرنے میں مصروف تھی۔ جو چند لمحوں کے لیے اسے تھمتی محسوس ہوئی تھیں۔ فائقہ کیا سوچ رہی تھی اسے پتا نہیں تھا اس کا ذہن تو بس ایک ہی نکتے پر مرکوز تھا۔ اگر فائقہ، حارث سے نہ کرتی تو وہ خوش خوش فائقہ کو اپنی زندگی میں شامل کر لیتا اس کی زندگی میں تانیہ کے لیے کوئی جگہ نہیں رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"سنو تانی! حارث بھائی تمہیں بلا رہے ہیں۔" احد کی شرٹ پر استری پھیرتے ہوئے سبرین کی بات سن کر اس کے ہاتھ لمحہ بھر کو تھمے تھے۔

"کیوں؟"

"تم ملو گی تو تمہیں بتائیں گے نا۔ مجھے کیوں بتاتے۔" اس نے بے زاری سے جواب دیا۔

"تم لاؤ یہ شرٹ مجھے دو اور جاؤ ان کے پاس۔" سبرین نے اس کے ہاتھ سے شرٹ لینی چاہی مگر تانیہ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"مجھے کسی سے نہیں ملنا۔ اس لیے براہ مہربانی تم مجھے اپنا کام کرنے دو۔" اس کے لہجے میں خود بخود روکھا پن در آیا تھا۔ سبرین غصے اور تاسف کے ملے جلے تاثر سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

"خدا کے لیے اب تو اپنی یہ فضول کی اکڑ ختم کرو کیوں یہ معاملہ دوبارہ بگاڑنے پر تلی ہوئی ہو۔"

"جو چیز بھی بنی ہی نہ ہو۔ اس کے بگڑنے کا کیا سوال۔" وہ بے نیازی سے اپنا کام کرتی رہی۔

"پلیز تانی! صرف ایک بار ان کی بات سن لو وہ کچھ کہنا چاہ رہے ہیں تم سے۔"

"مجھے مت بتاؤ کہ وہ مجھ سے کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ میں اس کی زندگی میں اپنی حیثیت جان چکی ہوں۔ بے وقوف ضرور ہوں لیکن اتنی بھی نہیں کہ ایک ہی جگہ سے بار بار دھوکے کھاؤں۔"

"شکر ہے آج کم از کم تم نے یہ تو مانا کہ تم بے وقوف ہو۔" اس کی آواز کہاں سے آئی تھی۔ اس نے حیران ہو کر سبرین کی طرف دیکھا اور پھر اس کی نظروں کے تعاقب میں دروازے کی طرف وہ جیبوں میں ہاتھ پھنسائے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"بے وقوف۔ جلد باز۔ ضدی اور سنگدل۔" چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ سجائے بولتا ہوا وہ اندر آیا۔ سبرین اسے آتے دیکھ کر جانے کے لیے پر تولنے لگی۔

"رکو سبرین، تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔" حارث نے اس کا ارادہ بھانپ کر اسے جانے سے روک دیا۔

"جانا انہیں ہے۔ یہ تو مجھ سے ہی انتظار نہیں ہوا اور میں خود انہیں لینے چلا آیا۔ چلیے میڈم۔" اپنی بات ختم کرتے ہی حارث نے پر شوق نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کی کلائی مضبوطی سے تھام لی۔

"کہاں؟" اس نے گھبرا کر اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کی۔

"جہاں تم سے سارے حساب کتاب چکتے کر سکوں۔ یوں سمجھ لو۔ اغوا کر کے لے جا رہا ہوں تمہیں۔ جو تم نے میرے ساتھ کیا ہے۔ اس کی اتنی سزا تو تمہیں ملنی ہی چاہیے کم از کم۔" مسکراہٹ دبائے گمبھیر لہجے میں کہتے وہ تانیہ کو مزید نروس کر گیا۔

"او کے سبرین۔ ملتے ہیں پھر۔" اس نے جاتے ہوئے سبرین کو کیا اشارہ کیا وہ دیکھ نہیں سکی بس میکانکی انداز میں اس کے ساتھ چلتی گئی۔ بائیک کے پاس پہنچ کر ہی حارث نے اس کی کلائی چھوڑی تھی

جہاں اس ذرا سی دیر میں ہی اس کی انگلیوں کے نشان ثبت ہو گئے تھے دوسرے ہاتھ سے اسے سہلاتے تانیہ نے ایک خفگی بھری نگاہ اس پر ڈالی۔

"دیکھو نا۔ اب کیا یہ کام بھی مجھے ہی کرنا پڑے گا۔" اسے اپنی جگہ جمے دیکھ کر وہ چڑ گیا۔ سہاول ناخواستہ اس کے پیچھے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے تانیہ نے اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا اور پھر جب بائیک ایک جھٹکا کھا کے آگے بڑھی تو اس نے بے اختیار اس کے شانے پر اپنی گرفت سخت کی تھی۔

"ہاں اب بتاؤ۔ کیا کہہ رہی تھیں تم۔" وہ اسے آئس کریم پارلر لے آیا تھا اور بیٹھتے ہی پورے دل اور دھیان سے اس کی جانب متوجہ ہو کر گویا ہوا۔

"تم بے وقوف اور میں دھوکے باز۔"

"نہیں۔ تمہیں سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ میں نے جو کہا اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔" تانیہ اس وقت حارث کے سامنے عجیب سی جھنجلاہٹ کا شکار ہونے لگی تھی۔ لہجہ نارمل رکھنے کی کوشش میں بھی تلخی اس سے چھلکی پڑ رہی تھی۔

"بے وقوف تم ہو جو ہر ایک کی باتوں میں آجاتے ہو۔ کوئی ہمدردی جتائے تو پیار سمجھ بیٹھتے ہو اور کوئی دل سے مجبور ہو کر تمہارے قریب آئے تو تم اس کی محبت کو بھیک اور ترس کا نام دے کر اس کے منہ پر دے مارتے ہو' خود کو تم اس دنیا کی مظلوم ترین ہستی سمجھتے ہو اور باقی سب تمہیں ظالم' جابر' مطلبی' خود غرض اور خود پرست نظر آتے ہیں اور اپنے احمق پن کی انتہا تو دیکھو کہ تمہیں یہ بھی نہیں پتا ہو تا کہ تم سوچ کیا رہے ہو۔ تمہیں کرنا کیا ہے اور تمہیں کہنا کیا ہے۔" آئس کریم آگئی تھی۔ اس نے ہونٹ بھینچ کر بمشکل خود کو مزید کچھ کہنے سے روکا۔ حارث جو محویت سے اس کا غصیلا روپ دیکھ رہا تھا۔ اس کے بھینچے ہوئے ہونٹوں اور سرخ چہرے کو دیکھ کر ہنس پڑا۔

"اپنے نازک ہونٹوں پر اتنا ظلم ڈھانے کی ضرورت نہیں۔ جو کچھ بھی میرے لیے تمہارے دل میں ابل رہا ہے۔ نکل پھینکو۔ میں بالکل ایزی ہو کر سن رہا ہوں بلکہ سمجھو ہمہ تن گوش ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اب اور کچھ نہیں کہنا بلکہ مجھے تو تم سے یہ سب بھی نہیں کہنا تھا۔" کہتے ہوئے اس کا لہجہ دھیما ہوا تھا اور آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔

"آئس کریم کھاؤ تانی۔ تمہارے آنسوؤں نے اسے بھی پگھلانا شروع کر دیا ہے۔" حارث نے زیر لب مسکراتے نرم لہجے میں کہا تھا۔ اس لمحے تانیہ کے آنسو اس کے دل پر ٹھنڈی میٹھی پھوار بن کر گر رہے تھے اور وہ خود بھی اس خوش کن احساس پر حیران سا تھا جو اپنے لیے تانیہ کو روتے دیکھ کر اسے ہونے لگا تھا۔

"اچھا۔ تمہارے اس طرح رونے کی وجہ کیا ہے۔ تمہاری خاطر تو میں نے چچا جان تک کو ناراض کر دیا۔ تمہیں پھر بھی تسلی نہیں ہو رہی حالانکہ زندگی میں پہلی بار وہ مجھ پر اس قدر مہربان ہوئے تھے کہ مجھے اپنا بیٹا بنانے کی سوچ رہے تھے۔" حارث کا لہجہ بظاہر سنجیدہ تھا اس لیے تانیہ اس کے پیچھے چھپی شرارت محسوس نہ کر پائی اور پھٹ پڑی۔

"اتنا ہی افسوس ہو رہا ہے تو اب جا کر بن جاؤ ان کا بیٹا۔ خوشی خوشی گود لے لیں گے لیکن مجھ پر یہ احسان مت ہی دھرو تم۔ انکار تم نے میری وجہ سے نہیں' فائقہ کے کہنے پر کیا ہے۔ اب اس نے ہری جھنڈی دکھادی تو آگئے مجھے زیر بار کرنے کے لیے۔ مجھے لگتا تھا۔ تم مجھ سے پیار کرتے ہو لیکن نہیں تمہارے دل میں تو شروع سے ہی فائقہ ہے۔ میں بے وقوف بنتی رہی اتنا عرصہ۔ یہ اس کا پرپوزل ہی تھا کہ تمہیں نہ میں یاد رہی نہ میری محبت تمہارا بس چلتا تو تم شاید اسی وقت اس سے نکاح پڑھوا لیتے۔ ایک چھوٹی سی غلط فہمی کو بنیاد بنا کر تم مجھ سے جان چھڑانے کی فکر میں تھے۔"

"اف! اتنی بدگمانیاں۔" حارث نے سر تھام لیا۔

"منفی بدلہ لے رہی ہو مجھ سے۔" اس کی روئی روئی آنکھوں میں دیکھتے اس نے پوچھا۔

"کس چیز کا بدلہ؟" تانیہ نے آئس کریم کپ پر نگاہ ٹکائی جو لیکوئیڈ سا بنتا جا رہا تھا۔

"تو ہمارے بیچ یہ فائقہ کہاں سے آگئی؟"

"جس طرح ہمارے بیچ سیدان آیا تھا۔" حارث کی بات پر اس نے فوراً کہا۔

"وہ تمہاری کری ایٹ کی ہوئی سچویشن تھی۔" اسے یاد دلاتے ہوئے حارث کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ تانیہ کا چہرہ قدرے پھیکا پڑ گیا اور ساتھ ہی اس کا جوش بھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں مانتی ہوں' میں نے فائقہ کے سامنے کچھ بکواس کی تھی۔ لیکن تم نے جو سنا مجھ سے اس کی تصدیق کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔" اس کے لہجے میں شکوہ ابھر آیا۔

"جو بات میں نے تمہارے ہی منہ سے سنی تھی۔ اس کی تصدیق میں تم سے کیسے کرتا۔" حارث حیرت سے بولا۔

"پھر بھی۔ تم ایک بار ہی مجھ سے پوچھ لیتے۔ بغیر کچھ جانے بوجھے اس طرح الزام تو نہ لگاتے۔" تانیہ کی آواز آنسوؤں کے سبب ایک بار پھر بھاری ہونے لگی۔

"پتا ہے حارث جب سیدان نے مجھے پرپوز کیا۔ میں اس وقت انکار کرنا چاہتی تھی۔ لیکن پھر میری مروت آڑے آگئی اور میں اسے کچھ نہیں کہہ پائی۔ لیکن اسی شام میں نے اسے منع کر دیا تھا اس کے جانے کے کچھ دیر بعد۔ فون پر۔ میں اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ اگر مجھے اس کے منہ پر ہی انکار کرنا ہوتا تو اسی وقت کر دیتی لیکن۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے میرے دل کی نرم دل ملکہ۔ اب ذرا مجھے بھی تھوڑی رعایت دے دیجیے اور میری وضاحت بھی سن لیجیے پلیز۔" حارث نے اس کی بات بیچ میں ہی کاٹ دی اور اس کی آنکھوں میں استہزا ابھر آیا۔

"اچھا۔ جو تم نے کیا' کیا اس کی بھی کوئی وضاحت ہو سکتی ہے؟"

"بالکل ہے۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

"تم نے نہ جانے کیا کچھ سوچ لیا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ میں صرف تم سے محبت کرتا ہوں اور شادی بھی صرف تم ہی سے کروں گا۔ آئی بات سمجھ میں۔" وہ میز پر قدرے جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا تھا۔ اس کی نگاہیں بے اختیار جھک گئیں۔

"لیکن میں تمہاری اس بات کا یقین کیوں کروں؟"

"کیونکہ تم بھی مجھ سے پیار کرتی ہو۔" اس کا لہجہ تفاخر و یقین سے بھرپور تھا۔

"اور تم سے یہ کس نے کہہ دیا کہ میں تم سے پیار کرتی ہوں۔" وہ ابرو اچکاتی طنزیہ انداز میں بولی۔

"میں نہیں جانتا' تم محبت کو کن معنوں میں لیتی ہو۔ لیکن میری زندگی کے تمام رنگ صرف اور صرف تم سے ہیں۔ مرتا ہوں تم پر۔ جیتا ہوں تو تمہیں دیکھ کر اور تم۔ میری نظروں پر تمہارا اسمٹ جانا۔ میرے اظہار پر تمہارا کھل جانا۔ میرے تلخ لہجے پر تمہارا رو پڑنا اور میرے روٹھ جانے پر بیمار پڑ جانا۔ کیا ہے یہ سب۔" وہ بھاری بوجھل لہجے میں اس سے پوچھ رہا تھا۔

"ہمدردی اور ترس بقول تمہارے۔" تانیہ نے دھڑکنوں کے شور کو نظر انداز کرتے اسی ٹون میں جواب دیا۔

"آئی ایم سوری۔ بھول نہیں سکتیں وہ سب باتیں۔" حارث اب بالکل سنجیدہ ہو چکا تھا۔

"میں مانتا ہوں' میں نے تمہیں بہت ہرٹ کیا ہے۔ لیکن کیا کرتا تانی۔ تب بہت بے اعتباری تھی میری جیسی زندگی تم نے جی ہوتی' تو تمہیں اندازہ ہوتا۔ رشتے' خلوص' اپنائیت۔ ان چیزوں پر سے میرا ایمان اٹھ چکا ہوتا' اگر تم نہ ہوتیں' اور جب مجھے محسوس ہوا کہ تمہاری محبت بھی ایک فریب' ایک ڈھکوسلا ہے' تو میں۔ خود پر سے ہر اختیار کھو بیٹھا تھا۔ مجھے لگا تھا اب میرے پاس کچھ نہیں بچا۔ جینے کے

لیے کوئی امید کوئی سہارا نہیں۔ اپنی پوری زندگی میں اگر میں نے اللہ سے کسی کو مانگا تھا تو وہ صرف تم تھیں ثانی لیکن اس وقت مجھے اپنی دعائیں، تمنائیں رائیگاں جاتی محسوس ہوئیں —— تب میرے ذہن و دل کی کیا کیفیت تھی۔ میں چاہوں تو بھی تمہیں نہیں سمجھا سکتا۔" حارث کہہ رہا تھا اور ثانیہ ندامت کے بھاری بوجھ تلے دبتی جارہی تھی۔ حارث پر خفا ہوتے وہ یہ بات بھول ہی گئی تھی کہ اس کے ایک چھوٹے سے مذاق سے حارث کو کتنی اذیت ہوئی تھی وہ کتنا ہرٹ ہوا تھا۔ اور ثانیہ بجائے اس سے سوری کہنے کے الٹے دکھڑے لے کر بیٹھ گئی۔

"اور جہاں تک بات ہے فائقہ کی۔ تو چچا نے براہ راست مجھ سے بات نہیں کی تھی۔ اگر کرتے بھی تو بھی میں انہیں انکار نہیں کرسکتا تھا اور نہ ہی کرنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ فائقہ خود انکار کرے۔" حارث کی اس بات پر ثانیہ نے کچھ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"کچھ لوگوں کو ریجیکٹ ہونے کی نہیں، ریجیکٹ کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں عادی ہوں ان چیزوں کا۔ لیکن فائقہ میں ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ اسے ریجیکٹ ہونے کی اذیت اور سبکی سہنی پڑے۔ فائقہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ اسے یقیناً" اب تک کسی ایسی صورت حال کا سامنا نہیں کرنا پڑا ہوگا۔ بس یہی وجہ تھی میرے چپ رہنے کی۔ مجھے علم تھا کہ فائقہ بھی کبھی مجھ سے شادی کے لیے راضی نہیں ہوگی۔"

"لیکن کیوں۔" ثانیہ جو حیرت سے اس کی بات سن رہی تھی بول پڑی۔

"تمہیں یہ یقین کیوں تھا کہ فائقہ تم سے شادی نہیں کرے گی۔ تمہاری یہ لاجک میری سمجھ سے باہر ہے۔ مطلب۔ اگر اسے کوئی اعتراض نہیں ہوتا پھر۔ پھر تم کیا کرتے۔"

"میں کہہ رہا ہوں نا کہ ایسا ہرگز نہ ہوتا۔ بھلا ایک ایسا انسان جسے آج تک اس نے کزن کا درجہ بھی نہیں دیا۔ وہ اسے شوہر کے روپ میں کیسے قبول کرسکتی۔" وہ افسردگی سے کہتے ہوئے مسکرایا۔ اب ثانیہ کی سمجھ میں یہ بات آبھی گئی کیونکہ کچھ دن پہلے ہی تو فائقہ نے حسن کو حارث کی نسبت بہتر قرار دیا تھا۔ ایسے میں کہاں گنجائش نکلتی تھی کہ وہ حارث کے ساتھ اپنی پوری زندگی گزار دیتی۔

"اچھا۔ اب تم بتاؤ تمہاری ناراضی ختم ہوئی یا نہیں؟" حارث نے بات بدلی۔

"میں ناراض نہیں تھی۔ مجھے بس غصہ تھا تم پر تھوڑا سا۔" ثانیہ نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے کہا تھا۔

"امیزنگ۔" اس نے سرہلایا۔

"جب تمہارا تھوڑا سا غصہ ہی اتنا جان لیوا ہوتا ہے تو پھر شدید غصے کا کیا عالم ہوتا ہوگا۔ مجھے ابھی سے اپنی خیریت کی فکر پڑگئی ہے اور پرابلم ہے کہ اب میں پیچھے بھی نہیں ہٹ سکتا۔ شبلی چاچو سے بات جو کرچکا ہوں۔"

"تم نے چاچو سے بات کرلی۔ کب؟" اس کی آواز بلند ہوگئی تھی۔

"کل رات ہی۔" وہ اس کی کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔

"میں نے ان کے حضور اپنی عاجزانہ و مودبانہ گزارش پیش کی کہ پچھلے ایک مہینے سے جو میں دن رات کی تمیز بھلائے اپنا سکھ چین حرام کیے ان کے گھر کی تعمیر و تزئین میں اپنا وقت اور توانائی صرف کررہا ہوں۔ تو اب وقت آگیا ہے کہ وہ بھی میرا کام کرنے کے لیے اپنی تھوڑی سی توانائی خرچ کریں اور۔ تایا جی سے ان کی دختر نیک اختر کا ہاتھ مانگ کر دو دلوں کو ملانے جیسا کار عظیم سرانجام دے کر ثواب عظیم حاصل کریں۔" ثانیہ کو اچانک ہی دل سے ایک بھاری بوجھ سرکتا محسوس ہوا اور اس سارے وقت میں پہلی بار وہ بے حد ہلکی پھلکی ہوکر کھل کر مسکرائی تھی۔

"تھینک گاڈ تمہارے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ ویسے تمہارا کیا خیال ہے ثانی تایا جی مان جائیں گے نا۔" حارث کی فکر پوری طرح دور نہیں ہوئی تھی۔

"ضرور مانیں گے۔ اور نہیں بھی مانے تو بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ میں ہوں نا ان سے منوانے کے لیے۔ جب نبیب چچا اپنی بیٹی کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال سکتے ہیں۔ تو ابو کو بھی میری خوشی کا خیال رکھنا پڑے گا۔ مجھے اپنی زندگی تمہارے ساتھ ہی گزارنی ہے حارث۔ میرا جینا اور مرنا اب تمہارے ساتھ ہی ہوگا ان شاءاللہ۔" اس کا لہجہ بے حد مضبوط تھا۔ خود پر حارث کی والہانہ نگاہیں محسوس کرتے اس نے سر جھکا لیا تھا اور تب ہی حارث کی دھیمی سی سرگوشی اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

"آئی لو یو ثانی! آئی لو یو سو مچ۔" اس کے لبوں پر ایک خوب صورت سی مسکان آکر ٹھہر گئی تھی۔

ثانیہ مطمئن تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ابو کو حارث کے رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ بہت ممکن تھا۔ بات پہلے چھیڑی جاتی تو صورت حال مختلف ہوتی۔ لیکن نبیب چچا کے فیصلے نے اور اس کے پیچھے کارفرما وجوہات نے انہیں بھی حارث کے بارے میں اپنا نظریہ تبدیل کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ حارث کے لیے اپنے ماں باپ کے بدلتے خیالات ثانیہ کو پہلے ہی چونکا گئے تھے اور جب اسے اصل وجہ پتا چلی تو وہ اندر تک پرسکون ہوگئی تھی۔ حارث ان باتوں سے لاعلم تھا اور ثانیہ اسے لاعلم ہی رکھنا چاہتی تھی۔ ورنہ حارث جیسے حساس انسان کے اعتبار کو بہت بری طرح چوٹ لگتی اور شاید وہ ثانیہ کو بھی انہی لوگوں کی فہرست میں لاکھڑا کرتا جنہوں نے اسے اپنایا بھی تھا تو صرف اپنی غرض اپنے مطلب کی خاطر۔ اور ثانیہ ایک بار اس کی بے اعتباری بھگت چکی تھی دوبارہ نہیں بھگت سکتی تھی۔ اوروں کا حارث سے کوئی بھی مفاد ہوتا لیکن ثانیہ کی تو پوری زندگی ہی اس سے وابستہ تھی۔ اسی لیے اس نے حارث کو اپنی محبت کا اعتماد دے کر اس کے اندیشے دور کیے تھے۔

عشنا کوثر سردار

میں بالکل نہیں جانتی تھی کہ مجھے نائل شاہ سے محبت کیوں نہیں ہوئی تھی۔ وہ جب اپنے تمام کام چھوڑ کر میرے پاس بیٹھتا تھا اور پوری توجہ سے مجھے دیکھتا تھا تو میرے اندر اتنی ہمت بھی نہیں باقی بچتی تھی کہ اس کی سمت دیکھ سکوں یا اس کی نظروں سے نظریں ملا سکوں۔

"مجھے اپنی آنکھیں دیکھنے دو عمارہ سید۔ مجھے ان آنکھوں میں لکھی آیتیں پڑھنے دو۔ تمہاری چپ وہ باتیں نہیں کہتی جو تمہاری یہ خاموش آنکھیں کہہ سکتی ہیں۔ تم مجھ سے نظریں کیوں چراتی ہو؟" وہ بولا تھا اور میں اپنی نظریں ساحل پر ٹوٹتی موجوں پر جما کر اس سے بالکل بے نیاز بن گئی تھی۔

"تم نوال احمد کے ساتھ خوش تھے نا؟ وہ تمہیں میری طرح ستاتی نہیں تھی؟" میں نے پوچھا تھا تو وہ مجھے کسی قدر حیرت سے تکنے لگا۔

"آر یو میڈ؟ کریزی۔ میں تم سے تمہارے بارے میں بات کر رہا ہوں اور تم نوال احمد کے بارے میں بات کر رہی ہو؟ تمہیں وحشت کس بات سے ہوتی ہے؟ مجھے تمہاری نظروں میں وہ بات کیوں دکھائی نہیں دیتی جو دینی چاہیے؟"

"کیا دیکھنا چاہتے ہو تم میری آنکھوں میں؟" میں نے اپنا پورا اعتماد بحال کرتے ہوئے دھیما سا مسکرا کر اس کی سمت دیکھا تھا۔

"تمہاری آنکھوں میں کچھ ہے جو میں پڑھ نہیں پاتا اور کچھ ہے جو بھید بنا بیٹھا ہے۔" وہ الجھ کر بولا تھا۔

"کیا مطلب؟" میں نے مکمل توجہ سے اسے دیکھا تھا۔

"میں تمہارے اندر کیوں نہیں جھانک پاتا؟ ایسا کیوں لگتا ہے کہ تم نے بہت سے پہرے بٹھا رکھے ہیں اور میں ان پہروں کو توڑنے کی سکت نہیں رکھتا۔" وہ تھکے لہجے میں بولا تھا۔

"نائل شاہ! تمہارے لیے کوئی نیا تجربہ ہے کیا؟ تمہیں لڑکیوں کو سمجھنے کا ہنر نہیں آتا؟" میں مسکرائی تھی۔

"تم عام لڑکیوں جیسی کیوں نہیں ہو؟" وہ الجھ کر بولا تھا۔

"تمہیں میں اچھی لگوں گی اگر میں رنگوں کی، تتلیوں کی اور خوابوں کی باتیں کروں؟ کم آن نائل شاہ میں ٹوئنٹی فرسٹ سنچری کی لڑکی ہوں۔ تمہیں پندرہویں صدی کی لڑکیاں پسند ہیں تو ٹائم مشین میں بیٹھ کر پیچھے سفر کیوں نہیں کر جاتے۔" میں لہروں کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی مسکرائی تھی۔

"میں گئے زمانوں میں پلٹنے کا جنون نہیں رکھتا۔ میں وہاں جانا چاہوں گا اگر تم وہاں ہو تو۔" اب وہ مسکرایا تھا۔ بڑی تروتازہ مسکراہٹ تھی۔ اس لمحے وہ بہت بھلا بھلا سا لگا تھا۔

"تمہیں نوال احمد یاد آتی ہے؟" مجھے نہیں معلوم تھا میں اسے پیچھے کی طرف کیوں دھکیلتی تھی جب بھی وہ میری طرف آتا تھا۔ میں جیسے بند باندھنے کے جتن کرنے لگتی تھی اور جب وہ دور ہوتا تھا تو میں پہروں اسے سوچتی بھی رہتی تھی۔ میرے اندر وہ کشمکش کیسی تھی اور کیونکر تھی۔

"عمارہ سید۔!" اس نے میرا ہاتھ تھاما تھا۔ میری

ری بات اس ایک لمحے میں سمٹ آئی تھی۔ اور اں رواں ساعت بن گیا تھا۔

"مجھے گزرے ہوئے لمحوں میں مت دھکیلو۔ میں وہاں رہنا نہیں چاہتا جہاں تم نہیں ہو۔ میں ان لمحوں میں جینا چاہتا ہوں جہاں تم میرے ساتھ ہو۔" اس نے اپنا چہرہ میرے قریب کر کے سرگوشی کی تھی۔

"تم اتنے جتن کیوں کرتی ہو مجھ سے دور جانے کے اور پھر پاس آنے کے؟ جب جانتی ہو کہ یہ ممکن ہی نہیں اور محبت تمہیں ایسا کرنے بھی نہیں دے گی؟ تو پھر یہ تگ و دو بھی کیوں؟ جب دور جانا ممکن ہی نہیں؟" وہ اپنا چہرہ میرے بہت قریب لا کر میری آنکھوں میں بغور تکتا ہوا کہہ رہا تھا۔ اس کی نظروں کی تپش سے میرا چہرہ سلگنے لگا۔ میں اس کی سمت سے ایک لمحے میں چہرہ پھیر گئی تھی۔

اس نے میری سمت اسی طرح بغور تکتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر میرا چہرہ تھاما اور اپنی طرف پھیر لیا تھا اور مدھم لہجے میں بولا تھا۔

"تمہیں میری مخالف سمت سرپٹ دوڑنا کیوں پسند ہے؟ یہ فرار مطلوب کیوں ہے؟ جب کہ جانتی ہو میں تمہیں دور جانے دوں گا ہی نہیں؟ تو پھر یہ کوششیں بھی کیوں؟ اتنا بچپنا کیوں ہے تمہارے اندر؟ یہ بچوں سی ضد کیوں ہے؟ محبت تمہیں بتاتی نہیں کہ یہ ٹھیک نہیں؟" مجھے لگا میرے اندر کوئی طوفان کی سی کیفیت ہو اور سارا وجود اس طوفان کے دہانے پر ہو۔ میرا اندر جیسے قیامتوں کے زیر تھا۔ وہ شاید جان گیا تھا کہ میری کیفیت کیا ہے، تبھی بہت آہستگی سے میرے گرد اپنا بازو حمائل کر دیا تھا۔

"محبت کو اپنے پیچھے آنے دو عمارہ سید۔ اس کی انگلی تھام کر چل نہیں سکتیں تو اس سے آگے بھی مت بھاگو۔ محبت لوٹ گئی تو ناؤں تک واپس نہیں آئے گی۔ محبت کو ساتھ چلنے دو۔ محبت تمہیں بہت کچھ کہنا چاہتی ہے۔ اسے غور سے سنو۔ اپنے کان بند کرنے کا عمل روک دو۔ اور نفی میں سر ہلانے کی عادت ترک کر دو؟" وہ مجھے نئے اسلوب سکھا رہا تھا۔ اس کو جیسے ہر بات پر دسترس تھی۔ میرے اندر کے موسموں پر بھی اور میری سوچوں تک بھی۔ وہ مجھے سطر سطر پڑھ رہا تھا جیسے۔

"تم میرے اندر گویا آئینوں سے اندر کیسے جھانک لیتے ہو نائل شاہ؟ تمہاری نظریں یہ سب کیسے جان لیتی ہیں؟ تمہارے پاس میرے اندر لگے تالے کی چابی کیسے کہاں سے مل جاتی ہے؟" میں ہارے ہوئے لہجے میں بولی تھی۔

"اور مجھے وہ چابی ڈھونڈنے پر اکسانا کون ہے؟" وہ میری ناک شرارت سے دباتا ہوا مسکرایا تھا۔

"تمہیں اچھا لگتا ہے اپنے اندر تالے لگانا اور پھر ساری چابیاں سمندر میں کہیں گہرے پانی میں پھینک دینا اور پھر نظروں ہی نظروں میں سمجھانا کہ جاؤ اور ڈھونڈ کر لاؤ اور میری تلاش کا سفر مکمل کرو؟" مجھے اتنے اچھے سے کیسے جان سکتا تھا؟ مجھے ہر بات کے لیے ہر بار اتنی حیرت کیسے ہوتی تھی؟

"میں نے تمہیں کبھی نہیں کہا کہ میری تلاش کا سفر مکمل کرو اور میرے پیچھے آؤ۔ تم میری تلاش میں کیوں آتے ہو۔ یہ سلسلہ روک کیوں نہیں دیتے؟" میں نے جتایا تھا۔

"میں یہ سلسلہ بریک بھی کر دوں تو تمہاری آنکھوں سے دامن کیسے چھڑاؤں گا؟ تمہاری آنکھیں ہر پل مجھ سے کہتی رہتی ہیں۔ مجھے ڈھونڈو۔ میری تلاش کرو۔ میرے ساتھ بندھ جاؤ۔" وہ مسکرا رہا تھا میں نے ہاتھ کا ایک مکا بنا کر اس کے شانے پر دے مارا تھا۔ وہ مسکرا دیا تھا۔

"تم مذاق مت سمجھو۔ تمہاری آنکھیں سچ میں مجھ سے کہتی ہیں۔"

"اور تم میرے لیے سمندر میں کود جاؤ گے؟" میں نے باور کرانے کو کہا تھا۔

"سمندر میں ہی تو ہوں۔ باہر آنے کا راستہ ڈھونڈ رہا ہوں۔ پتا ہے تو بتاؤ۔ میری انگلی تھام کر راستوں کی نشاندہی نہیں کر سکتیں تم؟" وہ شکوہ کر رہا تھا۔

"مجھے خود راستوں کی خبر نہیں تو تمہارے لیے نشاندہی کیسے کروں؟" میں نے تعرض برتا تھا۔

"تم مجھے سمندروں میں بھٹکنے کو چھوڑ دینا چاہتی ہو؟ تمہیں ڈر نہیں اگر میں ڈوب جاؤں؟ اور میرا وجود باقی نہ رہے؟ کب سے اسی سفر میں ہوں میں تھک گیا تو؟" وہ اندیشے میرے سامنے رکھ رہا تھا۔ میں نے ان آنکھوں میں جھانکا تھا اور میرے اندر کی دنیا اس کی حامی ہونے لگی تھی۔

"صرف تم ان سمندروں سے مجھے نکال سکتی ہو عمارہ سید۔ کیوں غافل ہو اس حقیقت سے یا پھر انجان؟" اس کی آنکھیں میرے اندر جھانک رہی تھیں۔ اور میرے اندر ایک تلاطم برپا تھا۔ میری دھڑکنوں کی آواز اتنی تھی کہ خود مجھے سنائی دے رہی تھی۔

"یہ جو دھڑکنوں میں شور ہے اسے تم کیا نام دو گی

عمارہ سید؟" وہ شہادت کی انگلی میرے دل پر رکھتا ہوا بولا تھا اور میں حیران ہو گئی تھی۔

اسے میرے اندر تک رسائی کیسے تھی؟

وہ کیسے مجھے اندر تک جان رہا تھا اور پڑھ رہا تھا؟

"جھوٹ ہے؟" میں نے سرگوشی میں کہا تھا۔ کوئی اور کا ای تھی جیسے۔ میری آواز میرے ہی اندر کہیں دب گئی تھی۔ میں نے اپنا آپ اس کے بازوؤں سے چھڑانا چاہا تھا مگر سارا وجود جیسے بے جان پتھر سا ہو گیا تھا۔

"میں گزرنے والے کسی منظر کو پلٹ کر نہیں دیکھنا چاہتی نائل شاہ! میں اپنی نفی نہیں کر سکتی! مجھے ڈر لگتا ہے۔ تم کچھ نہیں جانتے! کچھ بھی نہیں! یہ دھڑکنوں کا شور جو تم سن رہے ہو یہ بے معنی بھی ہو سکتا ہے اور ان آنکھوں میں جو سمندر ہے۔ ان کی گہرائی بے کار بھی ہو سکتی ہے سو مجھے کھوجنے کی کوششیں ترک کر دو۔ یہ سب بے کار ہو گا۔"

یہ کہہ کر وہاں سے نکلنے لگی تھی۔ میرے اندر اتنا شور کیوں تھا۔ میں اس کی نفی بھی کیوں کرنا چاہتی تھی۔ میں نے قدم اندر رکھا تھا تو دو آنکھوں نے مجھے بغور دیکھا تھا۔ نوال احمد فون پر کسی سے بات کر رہی تھی لیکن اس کی ساری توجہ مجھ پر تھی۔

"نوال مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" میں نے اس کے سامنے رک کر کہا تھا۔ اس نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔ اور پھر اپنا بات کرنے کا سلسلہ روک کر میری طرف آ گئی۔

"تم پریشان لگ رہی ہو۔" وہ اتنی میٹھی اور کیئرنگ کیسے ہو سکتی تھی؟ مجھے اس کے انداز ہمیشہ الجھاووں میں مبتلا کر دیتے تھے۔

"نہیں۔ میں پریشان نہیں ہوں۔" میں نے سر انکار میں ہلا کر اپنے سارے اندر کی نفی کی تھی۔

"تم کس سے بات کر رہی تھیں؟" میں نے پوچھا تھا۔

"میں آذر سے بات کر رہی تھی۔ میرا ایڈمشن آکسفورڈ کی ایک یونیورسٹی میں ہو گیا ہے۔ بس اس سلسلے میں بات ہو رہی تھی۔" وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔

"تم ایسی کیسے ہو سکتی ہو؟" میں نے اسے بغور دیکھ کر کہا تھا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکی تھی۔

"تم اتنی بے تاثر اور برف سی کیسے ہو سکتی ہو؟" مجھے اس کا ایسا رویہ قبول کیوں نہیں تھا؟ ایسا کون سا چور دبا بیٹھا تھا میرے اندر؟ میں چیخنا کیوں چاہ رہی تھی؟ ایسی کون سی الجھن تھی میرے اندر؟ کیا میں فرسٹریٹڈ تھی؟ میں فرسٹریشن کا شکار تھی؟ اور سبب کیا تھا اس کا؟ نوال احمد چپ چاپ مجھے دیکھ رہی تھی۔ جب میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا۔ میرا اپنا ہاتھ مجھے یخ برف سا لگا تھا۔ جیسے میں زندگی سے خالی کوئی وجود تھی۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" نوال احمد کو فکر ہوئی تھی۔

"رکو میں ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں۔ مجھے تمہاری حالت ٹھیک نہیں لگ رہی۔" اس نے اچھا بننے کی انتہا کر دی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر روک دیا تھا۔

"ہم دونوں کزنز میں کیا بات مشترک ہے نوال احمد؟" میں نے پوچھا تھا۔

"تم کیسے سوال کر رہی ہو عمارہ سید؟ یہ کیسا موازنہ ہے؟" وہ الجھ کر بولی تھی۔

"ہم میں کچھ بھی مشترک نہیں ہے نوال احمد۔" میں نے سر نفی میں ہلایا تھا۔

"تمہاری یہی بات ہمیں ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے اور۔ تمہارا اتنا اچھا ہونا مجھے کبھی اچھا نہیں لگا۔ میں نے کچھ چرایا ہے تم سے۔ تمہاری سب سے قیمتی شے۔ تم اس کو لے کر مجھ سے اتنے اچھے سے پیش آنے کی یہ رواداری کیسے جاری رکھ سکتی ہو؟" مجھے حیرت ہوئی تھی اس کے اس نرم رویے پر۔

وہ مجھے چپ چاپ ایسے دیکھ رہی تھی جیسے میں غیب کی کوئی بات کر رہی ہوں جس کا اس کی زندگی سے کوئی واسطہ نہ ہو۔

"ہم میں کچھ مشترک نہ بھی سہی عمارہ سید مگر کچھ ہے جو ہمیں جوڑتا ہے۔ میں ایسے کٹ کر نہیں رہ

سکتی؟" وہ مصلحت پسندی کا دامن تھامے رکھنا چاہتی تھی۔
"میرے لیے کوئی سزا تجویز کرنا نہیں چاہو گی تم؟" میں نے جیسے خود کو کٹہرے میں پیش کر دیا تھا۔ وہ بہت نرمی سے مسکرا دی تھی۔ اور اس کی اس مسکراہٹ سے میرا خون جلتا تھا۔ اس کا نرم خو لہجہ۔ اس کا مصلحت پسندانہ انداز۔ وہ ایسی کیوں تھی۔
"میں تمہیں کیوں سزا دوں عمارہ سید؟ مجھے اس کا کیا حق ہے تم کیوں اتنا سوچتی رہتی ہو؟ پاگل ہو جاؤ گی تم۔" میں نے اسے بغور دیکھا تھا۔ مگر اس کی نگاہ میں تو کوئی ریاکاری نہیں تھی۔
"تمہارے پاس میرے لیے کوئی سزا کیوں نہیں؟ میرے دل پر جو بوجھ ہے کیا تم اسے ہٹا نہیں سکتیں؟ میں سانس نہیں لے پاتی تو اس کی وجہ تم ہو۔" میرا انداز تھکن سے چور تھا۔ میرا دم جیسے اندر ہی اندر گھٹتا تھا۔
"تم نے کچھ نہیں چرایا عمارہ سید! وہ میرا نہیں تھا تو تمہارے ساتھ ہے۔ ہم صرف اچھے دوست تھے۔" وہ میری طرف دیکھنے سے گریزاں تھی۔
"جھوٹ بولنا کیوں اتنا پسند ہے تمہیں نوال احمد! تمہیں اس سے محبت تھی۔ پچھلے پانچ سال سے تم اس کے ساتھ تھیں اور تم اس کے ساتھ زندگی گزارنے کی پوری پلاننگ بھی کر چکی تھیں۔ تم اس کے ساتھ زندگی آغاز بھی کر چکی ہوتیں اگر میں درمیان نہ آتی۔ تم مجھے اتنا بینی فٹ کیوں دے رہی ہو؟ یہ امیونٹی کس چکر میں؟ صرف اس لیے تاکہ میں تمہیں بہت عزیز ہوں؟ اور تم میرے لیے یہ قربانی بھی دے سکتی ہو؟ کہ اپنی محبت کو میرے ہاتھ میں خود سونپ دو؟ تم۔ تم اتنی ہمت کیسے ہے نوال احمد؟ تمہارا ہاتھ اوپر کیوں ہے؟ مجھے ان نوازشوں سے بہت الجھن ہوتی ہے۔ تم عنایات کرنے کا سلسلہ روک کیوں نہیں دیتیں؟ کیا تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا؟ نائل شاہ کے تمہارے زندگی سے جانے سے؟" میں اسے جھنجھوڑنا چاہتی تھی۔
"نائل شاہ کو مجھ سے محبت کبھی نہیں تھی سید۔ ہم ایک دوسرے کے لیے نہیں بنے۔ محبت "ٹھیک" اور "غلط" ہمارے اپنے ہوتے ہیں۔ وہ کیا جو تمہیں ٹھیک لگا اور میں نے وہ کیا جو مجھے لگا۔ محبت کی کوئی کیلکولیشن نہیں ہوتی یہ آکا فزکس اور کیمسٹری کے سارے قانون کو جھٹلا دیتی ہے اور ابرو بھی کرتی ہے۔ تمہیں الزام دینا فضول ہے۔ تم نے وہ نہیں چرایا۔ نائل شاہ کو محبت تھی نہیں۔ سو آج وہ میرے ساتھ نہیں ہے۔ اسے تم سے محبت ہوئی تو اس میں غلط کیا ہے؟" وہ کیسی پُرخلوص اور مثبت انداز فکر کی حامل تھی۔ مجھے چڑ ہوتی تھی۔
"اگر میں تمہاری زندگی میں نہیں آتی تو تم آج اس کے ساتھ ہوتیں نا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔
"نائل شاہ کو چوائس کا حق کس نے دیا؟ میں نا؟ اگر میں آئی ہی نہ ہوتی تو آج سب ٹھیک ہوتا۔" میں جیسے آغاز سے شروع کر کے ہر شے کو بدلنا چاہتی تھی۔
"تم کیا کچھ مٹاؤ گی عمارہ سید؟ یہاں دوبارہ لکھنے کچھ نہیں ہے۔ محبت صرف ایک بار لکھی جاتی اور اس کے بعد صرف ایک فل اسٹاپ لگتا ہے۔ فضول میں پریشان ہو رہی ہو۔ اتنا سوچو مت۔ محبت بدل بدل کر لکھا نہیں جا سکتا۔ تم کہانی کو اپنی مرضی کا اختتام دے سکتی ہو۔ محبت اپنے اختتام اور آغاز کو آپ منتخب کرتی ہے۔ یہ حقیقت تمہاری سمجھ میں آنا بہت ضروری ہے اور پھر ہر شے اپنی جگہ پر ہو گی۔"
نوال احمد "نرم خو" لڑکی کیا اس پر کسی قیامت کا سایہ نہیں تھا۔ اس کے اندر کوئی شور نہیں تھا؟ اس نے کھو دیا تھا اور میں نے چرایا تھا۔
میں نے اس کی ساری زندگی چرا لی تھی اور وہ پھر بھی مثبت سوچ رہی تھی۔ اسے مجھ پر غصہ آنا تھا۔ اسے کوئی ملال ستاتا تھا۔ کیسی عجیب لڑکی تھی وہ؟ لو میں اس جیسی کیوں نہیں تھی؟
"نوال احمد! مجھے اپنا جیسا بنا دو۔ میں مر جاؤں

"اپنے اندر کی گھٹن سے تھک کر میں نے کہا
"نائل شاہ کو مجھ سے محبت کیوں اور کیسے ہوئی؟ میں چاہتی تھی وہ مجھ سے محبت کرے۔ میرا نوٹس لے۔ مجھے نظر انداز نہ کرے۔ اور وہ تمہارے ساتھ نہ ہو۔ یہ جرم نہیں تو اور کیا ہے؟ میری نیت ٹھیک نہیں تھی۔ میں نے تمہارے ساتھ غلط کیا۔ نائل شاہ کے ساتھ غلط کیا اور خود اپنے ساتھ بھی ایسا کیا۔ میں ... جو سب کے لیے "غلط" تھا وہ میرے لیے ٹھیک" کیسے ہو گیا؟ محبت اتنی اندھی ہو سکتی ہے؟" میں اپنے طور پر وضاحتیں دے رہی تھی اور جواز ڈھونڈ رہی تھی۔ اور نوال احمد کی آنکھیں کیسی ٹھنڈی ٹھار تھیں۔ کیا وہ برف سی ہو رہی تھی؟
"میں خوابوں میں بھٹکنا نہیں چاہتی۔ مجھے فریب سے باہر آنا ہے نوال احمد۔ میری مدد کرو نوال نائل کی محبت مجھے مار دے گی۔ اور تمہاری سرد مہری بھی۔" میں نے تھکن سے چور لہجے میں کہا تھا۔
"وہ میرے لیے نہیں ہے۔ وہ تمہارے لیے تھا۔ میں اگر نہیں آئی ہوتی تو آج سب ٹھیک ہوتا۔" میں الجھاووں میں ابھی کوئی ڈور تھی اور میرا سرا مجھے آپ نہیں مل رہا تھا۔ نوال احمد مجھے تنہا چھوڑ کر وہاں سے چلی گئی تھی۔ اور مجھے لگا تھا۔ میرے اندر کا شور اور بڑھ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"نوال احمد جا رہی ہے نائل شاہ! اسے روکو۔" میں نے اس کے سامنے آتے ہی کہا تھا۔ وہ خاموشی سے مجھے دیکھنے لگا۔
"تم ایسے چپ چاپ کیوں ہو؟ روکو اسے، تمہیں اس کے جانے سے کوئی نقصان نہیں ہو گا؟" مجھے حیرت تھی کہ وہ کچھ ری ایکٹ کیوں نہیں کر رہا تھا۔
"تم اوور ری ایکٹ کر رہی ہو عمارہ سید! اب نارمل ہو۔ تم نارمل طریقے سے بی ہیو کرنا شروع کر دو تو تمہیں سب ٹھیک لگنے لگے گا۔" وہ بھی نوال احمد کے لہجے میں بات کر رہا تھا۔
"نائل شاہ! تم ایسا کیسے کر سکتے ہو؟ وہ تمہارے ساتھ تھی۔ پورے پانچ سال تک تم اس کے ساتھ رہے۔ تمہیں وہ خواب بھی نہیں ستاتے جو اس نے تمہارے لیے دیکھے؟" میں اسے جھنجھوڑنا چاہتی تھی۔
"تم سارے کھیل صرف اپنے زاویے سے کیوں کھیلنا چاہتی ہو عمارہ سید؟ تمہیں پچھتاوے اتنا کیوں ستا رہے ہیں؟ اگر میں نوال احمد کے ساتھ نہیں ہوں تو ایک سمپل سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی کہ ایسا کیوں ہے؟ مجھے اس سے محبت نہیں تھی۔ ہمیں محبت نہیں ہوئی۔" وہ دہرا رہا تھا۔
"تمہیں اس سے محبت ہو جاتی نا اگر میں تمہاری زندگی میں نہیں آتی؟" میں نے اس کے سامنے ایک سوالیہ نشان رکھ دیا۔ مگر وہ اس قدر پرسکون تھا۔ اس کی نظروں میں کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ وہ بھی جیسے بے حس ہو رہا تھا۔
"میں اگر جانتی کہ میرے آنے سے کوئی اتنا بڑا واقعہ پیش آنے والا ہے تو شاید میں یہاں کبھی واپس نہ آتی۔" میں پر ملال تھی۔ پچھتا رہی تھی۔
"تم لکھے کو بدلنے کی سعی کر رہی ہو عمارہ سید؟" اس نے مجھے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا تھا جیسے میں پاگل ہو رہی ہوں۔
"میں لکھے کو بدلنے کی کوشش نہیں کر رہی۔ ایسا کچھ لکھا نہیں ہو گا۔ تم مان کیوں نہیں لیتے کہ یہ ساری میری غلطی ہے؟ میں — محبت کرنے لگی۔ کب کیوں کیسے؟ میں جان ہی نہیں پائی کہ محبت کا آغاز کب ہوا اگر میرے اندر جیسے یہ محبت کی کونپل خود بخود پھوٹی۔ میرا دل چاہا میں تمہیں حاصل کر لوں اور میں نے چھین لیا۔" میں نے صاف گوئی سے کہا۔
مجھے احساس ہی نہیں ہوا کب میں کمزور پڑی اور کب میری آنکھوں سے آنسو نکل کر بہتے ہوئے رخساروں پر آ گئے۔ نائل شاہ مجھے خاموشی سے کچھ دیر تک یونہی تکتا رہا تھا پھر ہاتھ بڑھا کر میری آنکھوں کی نمی کو اپنی پوروں پر چننے لگا۔

"عمارہ سید! محبت کی کہانیوں کو کسی شمار نہیں کیا جا سکتا۔ تم اپنی مرضی کا اختتام نہیں دے سکتیں۔ محبت طے شدہ نہیں ہے تم مان کیوں نہیں لیتیں۔؟" وہ ملائمت سے سمجھانا چاہ رہا تھا۔

"میں نہیں جانتی کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ مگر مجھے نیند نہیں آتی۔ میرے اندر سکون نہیں ہے۔ یہ سکون نہیں ہے تو کیوں نہیں ہے؟ اس کی وجہ کیا ہے؟ میں جمع تفریق کرتے کرتے تھک گئی ہوں۔ تقسیم کرنا مجھے نہیں آتا اور مثالوں سے مجھے کوئی آشنائی ہے ہی نہیں۔ محبت اتنی پیچیدہ کیسے ہو سکتی ہے؟ محبت ایسی ہوتی ہے کیا؟" میں نے اس کی سمت دیکھا تھا۔

"محبت کے معنی ہم سب کے لیے مختلف ہوتے ہیں عمارہ سید! مجھے محبت الگ زاویے سے دکھائی دیتی ہے۔ میرے لیے تمہاری آنکھوں میں دیکھنا' تمہارا ہاتھ تھامنا اور تمہارے ساتھ چلتے رہنا محبت ہے۔ میرے دل کا تمہارے لیے دھڑکنا' تمہاری چاہ کرنا' تمہارے ساتھ جینا۔ بس یہی محبت ہے۔ یہ میری محبت ہے۔" اس نے سرگوشی میں کہتے ہوئے میرا ہاتھ تھام کر لبوں سے لگایا تھا۔ اور میرے سارے وجود پر جیسے چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ میں اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ کھینچ لینا چاہتی تھی۔ وہ میرے ارادے سے واقف تھا تبھی اس نے میرے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کر دی تھی۔

"عمارہ سید! ہاتھ تھامے رکھنا محبت ہے۔ ہاتھ تھام کر چلتے رہنا محبت ہے۔ چھوڑ دینا محبت کی نفی کرنا ہے۔" وہ مجھے مدھم لہجے میں کہتا ہوا جتا رہا تھا۔

"اور تم نے تبھی نوال احمد کا ہاتھ چھوڑ دیا؟ نوال احمد کی آنکھوں کی خاموشی وہ سکوت تمہیں دکھائی نہیں دیا؟ تم ایسے بے حس کیسے ہو گئے ہو نائل شاہ؟ تم بھی خود غرض ہو۔ صرف اپنے بارے میں سوچتے ہو۔ میں نے بھی صرف اپنے بارے میں سوچا تھا۔ میں جانتی تھی تمہارے لیے نوال احمد کی نظروں میں محبت تھی۔ اس کی آنکھوں سے اس کے لہجے سے محبت کے رنگ پھوٹتے تھے۔ وہ آنکھیں بند کر کے سوتی بھی تھی تو محبت اس کی آنکھوں سے جھانکتی تھی۔ اور مجھے اس محبت سے الجھن ہوتی تھی۔ تم جب اس کے ساتھ چلتے تھے۔ اس سے بات کرتے تھے تو میں تمہیں وہاں سے ہٹانے کے جتن کرنا چاہتی تھی۔ مجھے جلن ہوتی تھی۔ میں تمہیں کہیں دور لے جانا چاہتی تھی۔ چرا کر' چھپا کر' بہت چپکے سے' بہت دور کہیں۔ مجھے نوال احمد کی محبت سے بہت خوف آتا تھا۔ مجھے تب بھی نیند نہیں آتی تھی۔ میں سوچتی تھی' جتن کرتی تھی۔ اور پھر میں نے تمہیں چرا لیا۔ تم میری طرف آ گئے۔ مگر اب سکون کیوں نہیں؟ مجھے چین نہیں پڑتا اب؟ یہ اضطراب کیسا ہے؟"

میں اسے قائل کر لینا چاہتی تھی۔ کہ میں نے نوال احمد کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ میں اپنے طور پر عدالتیں لگاتی تھی۔ اپنے طور پر وضاحتیں' دلیلیں دیتی تھی اور سب بے کار رہتا تھا۔

"عمارہ سید! ہمیشہ طے شدہ نتائج نہیں آ سکتے۔ تمہاری دلیلوں میں دم نہیں ہے کیونکہ تمہاری آنکھوں میں جو بے سکونی ہے وہ تمہارے لہجے کا ساتھ نہیں دیتی۔" نائل شاہ بولا تھا۔

"تم مجھ پر یقین کیوں نہیں کرتے نائل شاہ۔ میں نے بہت برا کیا؟" میں ہارے ہوئے لہجے میں بولی تھی۔

"کیا برا کیا تم نے؟ ہم دونوں کو ایک خواب سے جگایا؟ سوچو اگر ہم آج ساتھ ہوتے تو یہ رشتہ اور کتنے دن چلتا؟ ایسی محبت کتنے دن تک پنپ سکتی ہے جس کی بنیاد ہی نہ ہو؟ قصور کسی کا نہیں ہے نوال احمد کا جو ریت پر محل بنا رہی تھی نہ میرا جو یقین اور گمان کے درمیان کہیں رکا ہوا تھا۔ اور نہ تمہارا جو اپنی خواہشوں کا نتیجہ تب بھی چاہتی تھی اور اب بھی چاہتی ہے۔" مجھے اپنے سامنے بٹھاتا ہوا بولا تھا اور خود میرے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا تھا۔

"تم ایسا کیوں کر رہی ہو عمارہ سید؟ تم اتنی خود غرض ہو گئیں؟"

"میں خود غرض نہیں ہوں۔ تبھی تو سوچ رہی

ہوں۔" میں نے چیخنا چاہا تھا۔

"تم محبت کو ہمیشہ customise نہیں کر سکتیں عمارہ سید! ناہی ہمیشہ تمہاری پسند کا نتیجہ آنا شرط ہے۔ محبت کے پھولوں کو اپنے اندر محسوس کرنا اور پھر اس کی آبیاری کرنا۔ میں نے صرف تم میں دیکھا ہے۔ تمہیں کسی وقت میں سب کچھ چاہیے۔ اور دوسرے وقت میں کچھ نہیں۔ تم عجیب ہو۔ بہت زیادہ عجیب۔ تم محبت کو اپنے ہاتھ کی کٹھ پتلی بنانا چاہتی ہو۔ اپنے زاویے سے چلانا چاہتی ہو۔ اور یہ ٹھیک نہیں ہے۔" وہ مجھے بغور دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ نائل شاہ! یہ ٹھیک نہیں ہے۔ جو بھی میں نے کیا۔ جو بھی مجھ سے سرزد ہوا وہ ٹھیک نہیں تھا اور اس کا احساس مجھے آج ہوا ہے۔"

"آج؟" نائل شاہ نے مجھے دیکھا تھا۔

"تمہیں آج اچانک کیسے احساس ہو گیا؟ اگر کچھ غلط ہوا ہے تو اس کا احساس تو تمہیں پہلے ہو جانا چاہیے تھا نا عمارہ سید؟"

وہ مجھے پھر سے رد کر رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا میں بہت زور سے چیخوں اور اسے خاموش کر دوں۔ وہ مجھے سمجھ نہیں رہا تھا۔ نوال احمد مجھے نہیں سمجھ رہی تھی۔ میں خود جانتی تھی کہ میں غلط تھی میں نے غلط کیا تھا۔ مگر وہ دونوں میری غلطی ماننے کو تیار کیوں نہیں تھے؟

"کیا تم مجھے چھوڑ کر میرے بنا جی سکتی ہو؟" نائل شاہ نے مجھے ۔۔۔ شانوں سے تھام کر میری آنکھوں میں دیکھا تھا۔ اور میری دنیا میں جیسے ایک ہلچل سی مچ گئی۔ کیا تھا اس کی نظروں میں؟

اس کی آنکھوں میں ایسا کیا تھا کہ میری دنیا کو اپنے سنگ باندھ رہا تھا؟ میں اس سے بندھ کیسے گئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آگے کچھ دیکھ کیوں نہیں پائی تھی۔ کیا مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ میں اس کے بنا جی سکتی؟

"مجھے تم سے کوئی جنونی عشق نہیں ہوا نائل شاہ' پیار محبت بڑا الگ شے ہے۔ میں کتابوں کی دنیا میں نہیں جیتی' میری دنیا میں اس لفظ کا کوئی وجود نہیں ہے۔" میں جیسے اپنے حواس میں نہیں تھی۔ میں کیا کر رہی تھی میں آپ نہیں جانتی تھی۔

میں جانتی تھی تو بس اتنا کہ اب اس کا نتیجہ ویسا ہونا چاہیے۔ جیسا میں چاہتی ہوں۔ میں ضدی تھی؟ خود غرض تھی؟ کوئی کچھ بھی سوچے مگر میں ہر حالت میں اس دائرے سے باہر آنا چاہتی تھی جس میں میرا دم گھٹ رہا تھا۔ میں کیوں ایسا چاہ رہی تھی۔ مجھے صرف اپنی من مانی کرنے کی عادت تھی؟ یا پھر صرف بقول نائل شاہ کے اپنی مرضی کے نتیجے درکار تھے؟

وہ مجھے ساکت سا دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے یقین نہیں تھا کہ میں ایسا کہہ سکتی ہوں۔

"تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔ عمارہ سید۔" وہ میرے سفاکی سے کہنے پر بہت ہرٹ ہوا تھا۔ میں اپنی ہی خو میں سر نفی میں ہلانے لگی۔ میرے شانوں پر اس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑی۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ دور ہٹ گیا تھا۔

"تم پاگل ہو عمارہ سید! جس حقیقت کو میں مان چکا ہوں۔ نوال احمد مان چکی ہے۔ اسے تم ماننا نہیں چاہ رہیں۔ کوئی کسی کو کسی سے چھین نہیں سکتا! محبت اپنے ربط خود بناتی ہے۔ کوئی توڑ جوڑ آپ کی مرضی کی نہیں چلتی۔ میں تمہارے قریب آیا کیونکہ مجھے تم سے وہ ربط محسوس ہوا جو مجھے تم سے باندھ سکتا تھا۔ اور جو مجھے نوال احمد سے نہیں باندھ سکا۔ تمہارے ہاتھ میں میرے نام کی جو رنگ ہے یہ معنی رکھتی ہے۔ میں یہ رنگ تمہیں پہنا سکا کیونکہ یہ تعلق اسی طور بندھنا تھا ہم اپنی مرضی سے رشتے نہیں بناتے۔ یہ آسمانوں میں بندھتے ہیں۔ تم نے چاہے کوئی چال چلی ہو یا مجھے نوال احمد سے بقول تمہارے چرایا یا چھپایا ہو۔ مگر یہ تعلق بہرحال اس طور جڑنا تھا۔ میں تمہارے قریب آ سکا۔ کیونکہ میں نے تمہاری آنکھوں میں وہ دیکھا جو میں نوال احمد کی نظروں میں دیکھنا چاہتا تھا مگر کبھی نہیں دیکھ سکا۔ میں نے اس کی انگلی میں کوئی انگوٹھی رنگ کبھی نہیں پہنائی۔ اسے وعدوں سے باندھا ہی اپنا

پابند کیا۔ وہ مجھے چاہتی تھی ٹھیک ہے۔ میں بھی اسے پسند کرتا تھا۔ مگر وہ محبت نہیں تھی یا پھر یوں کہو کہ وہ ربط آسمانوں پر کہیں نہیں جڑا تھا۔ تبھی میں تمہارے قریب آسکا۔ اور اسی لیے مجھے تمہارے ساتھ وہ کشش محسوس ہوئی جو وہ لوگوں کو تب محسوس ہوتی ہے جب ان میں کوئی گہرا ربط آسمانوں پر جڑا ہو۔

میں تمہیں سیریس نہیں لے رہا تھا۔ مجھے لگا یہ غلط فہمی جلد دور ہو جائے گی کہ ہمارا رشتہ کیا ہے۔ مگر تم شاید کبھی نہیں سمجھو گی۔ تمہارے دور دور ہٹنے پر بھی میں نوال احمد کے قریب کبھی نہیں جاسکوں گا۔ تاہم سے یہ رشتہ توڑ کر اس سے تعلق باندھ پاؤں گا۔ اس بات کا تمہارے لیے سمجھنا بہت ضروری ہے۔" میں نے اس کی ان سنی کرتے اپنے ہاتھ کی اس تیسری انگلی سے رنگ نکالنے کو اپنا ہاتھ بڑھایا تھا مگر جانے کیا ہوا تھا کہ میری نظریں دھندلانے لگیں۔ وہ پلٹ کر دور جانے لگا۔ اور یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ اگر وہ دور گیا تو میں کیا کروں گی۔ کس طرح جیوں گی۔

میرے سارے اعداد و شمار میں یہ شمار تو ہوا ہی نہیں تھا کہ اگر محبت روٹھ جائے تو سدباب کیا ہوتا ہے اور کیسے جیتے ہیں۔ وہ اتنی دور گیا بھی نہیں تھا۔ میری زندگی سے نکلا بھی نہیں تھا۔ تو مجھ سے سانس نہیں لیا جا رہا تھا جان وجود سے نکل رہی تھی تو اگر وہ دور چلا جاتا تو میں کیسے جی پاتی؟

"تو کیا میں واقعی اس سے محبت کرتی تھی؟ اور وہ جلنا وہ حسد۔ صرف اس لیے تھا کہ میں نائل شاہ سے محبت کرنے لگی تھی؟ وہ میری ضد نہیں تھا۔ میرے اندر کی خواہش تھا۔ میری روح اس سے بندھی تھی۔ تبھی تو میں وہ میلوں کا فاصلہ پار کر کے اس تک آئی تھی۔

میں کوئی پاگل پن کر رہی تھی۔" میری آنکھوں کو دور کا منظر دھندلا دکھائی دیا تھا۔

میں نائل شاہ کے لیے رو رہی تھی؟ کیا میں اسے کھونے کے لیے خود کو تیار کر رہی تھی؟ مجھے لگا تھا مجھ سے سانس نہیں لیا جائے گا۔ مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ دھڑکنوں میں سکوت چھانے کو تھا۔

"تم یہ پاگل پن مت کرو عمارہ سید! ابھی ... ہم میں کچھ نہیں تھا۔ ہوتا تو اتنی آسانی سے ختم ہو... میں یہاں سے جا رہی ہوں۔ میرے لیے زندگی راستے کھول رہی ہے۔ تم اپنے ہی ہاتھوں اپنی زندگی کے راستے خود پر بند مت کرو۔ جاؤ روکو اسے۔" نوال احمد جانے کب وہاں آئی تھی۔ وہ میری آنکھوں سے میرے آنسو اپنے ہاتھوں سے پونچھ رہی تھی۔

"مجھے تم سے کوئی گلہ شکوہ نہیں ہے۔ نائل شاہ اب بھی میرا اچھا دوست ہے۔ مجھے اس سے کچھ انسیت ہو چلی تھی مگر وہ محبت نہیں تھی۔ محبت کو اپنے زاویے سے توڑنے موڑنے کی کوشش مت کرو۔ محبت ایک ندی جیسے بہتی ہے۔ اپنے مطابق چلانا چاہو گی تو ممکن نہیں ہوگا۔ مگر مشکل ضرور بن جائے گی۔ وہ بہت غصے میں جا رہا ہے اسے روکو۔ تم جانتی ہو تم اس کے بنا جی نہیں پاؤ گی سو بے وقوفی بند کرو۔" وہ بول رہی تھی اور میں نے پہلی بار محسوس کیا تھا میرے دل سے کوئی بوجھ سرک رہا ہو۔

وہ لمحہ ادراک تھا۔ جس کا احساس مجھے آج پہلی بار ہوا تھا۔ کسی اور کے احساس دلانے پر نہیں۔ خود اپنے اندر سے اس احساس کو محسوس کرنے پر، میں پچھتاووں میں جی رہی تھی۔ مجھے ملال تھا صرف یہ کہ میں نے کسی کو چھینا ہے۔ نوال احمد کو ہرٹ کیا۔ نائل شاہ کو اپنا پابند کیا۔ مجھے لگا وہ صرف میری ضد تھی محبت نہیں۔

مگر اب مجھ پر کھلا کہ مجھے محبت تھی تبھی میں سات سمندر پار سے اس جال میں آئی۔ وہ تعلق ازل سے بندھا تھا۔ اور میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔

میں نے دوڑ کر اس کا تعاقب کیا تھا۔ اور اسے پیچھے سے جالیا۔ وہ رک گیا تھا میں اسے تھامے کھڑی اس کے کندھے پر آنسو بہا رہی تھی۔ اس نے مجھے اپنے سامنے کر لیا۔

"پاگل لڑکی اب کیوں رو رہی ہو؟" میری آنکھوں کو اپنی پوروں سے اس نے پونچھا تھا۔

"مجھ سے دور مت جاؤ۔" میں نے پہلی بار وہ کہا تھا جو میرا دل کہنا چاہتا تھا۔

"کیوں؟ تم مجھے پریشان کرتی ہو۔ پھر تمہارے ساتھ کیوں رہوں؟ تم نے کہا تھا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔ پھر میرے پیچھے کیوں آئیں؟" نائل شاہ بغور دیکھ رہا تھا اور مجھ میں اتنا کچھ کہنے کی ہمت تو تھی مگر یہ کہنے کی ہمت نہیں رہی تھی کہ مجھے اس سے محبت ہے۔ کبھی کبھی کہنا کتنا مشکل ہو جاتا ہے نا؟ میری جان تن سے جا چکی تھی۔ نائل شاہ نے مجھے تھام کر قریب کرلیا اور میرے گرد اپنے بازوؤں کا حصار باندھ لیا تھا۔

"یہ محبت ہے عمارہ سید! جو دور جانے نہیں دیتی۔ اور دور جانے کے خیال سے ہی جان نکلنے لگتی ہے۔ تمہارا جو یہ ننھا منا سا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا ہے۔ صرف اس خوف میں کہ مجھے تم کھونا نہیں چاہتیں۔ محبت میں کھونے کی سکت نہیں ہوتی نہ ہمت میں اسی بات کا ادراک تمہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ محبت کوئی ضد نہیں ہے۔ تمہارے اندر جو محبت تھی تمہیں اس کا احساس ہونا خود آپ ضروری تھا اور وہ دلیلوں سے ہوتا تھا نہ وضاحتوں سے۔ تمہارے اندر سے اس کا احساس تمہیں ہونا تھا۔" اس نے میری چھوٹی سے ناک دبائی تھی۔

"تم مجھے چھوڑ کر جا رہے تھے؟" میں نے شکوہ کیا۔

"نہیں مجھے معلوم تھا تم مجھے جانے نہیں دو گی۔" وہ مسکرایا۔

"اور اگر میں پیچھے نہ آتی تو۔" مجھے اپنے اندر طمانیت کا احساس ہوا تھا۔ میں نے کھل کر سانس لی۔

"تم مجھ سے دور کبھی نہیں جاسکتیں عمارہ سید۔ یہ محبت ہے اور محبت یقین ہے۔" نائل شاہ پر یقین سا مسکرایا تھا اور مجھے خود سے کچھ اور قریب کیا تھا۔

"میں ان دھڑکنوں کو سن سکتا ہوں بغور۔ میں جانتا ہوں یہ دل کیا کہتا ہے۔" وہ سرگوشی میں بولا۔ اور میں نے مسکراتے ہوئے اس کے شانے پر اپنا سر رکھ دیا۔

☆ ☆

[illegible]

شناخت

سبزہ سبزہ سوکھ رہی ہے پھیکی زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر
دور افق تک گھٹتی، بڑھتی، اٹھتی، گرتی رہتی ہے
کہر کی صورت بے رونق دردوں کی گدلی لہر
بستا ہے اس کہر کے پیچھے روشنیوں کا شہر

زنداں کی بلند دیواروں کے اُس پار کی دنیا بہت حسین ہوتی ہے ڈھیروں مناظر نظروں سے گزرتے ہیں آوازیں سماعتوں سے ٹکراتی ہیں آزاد اور پر لطف زندگی چاروں طرف رقصاں ہوتی ہے۔ آزادی ایک حسین اور نایاب چیز ہے اس کی قدر و قیمت و اہمیت اس سے پوچھیں جس پر جیل کی چھوٹی سی دنیا میں کائنات محدود کر دی جاتی ہے۔ کرن میں ــــ نیا سلسلہ "روداد قفس" کے نام سے شروع کیا ــ ہے۔ جیلوں میں قید خواتین کے حالات واقعات پر مبنی۔ آخر ایسے کون سے مسائل و حالات تھے جن کی وجہ سے وہ قید و بند کی صعوبتیں اٹھانے پر مجبور ہوئیں۔ اس سلسلے کی کوئی کہانی آپ کے پاس ہے تو ہمیں روانہ کریں۔ ہم نوک پلک سنوار کر اسے شائع کریں گے۔

"بیرسٹر بلال احمد شاہ کی گھریلو ملازمہ اپنے شوہر کو قتل کرنے کے جرم میں گرفتار۔" بریکنگ نیوز کا ریڈ الرٹ بار بار جل بجھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد رات آٹھ بجے کا خبرنامہ شروع ہو گیا۔ نیوز کاسٹر نک سک سے تیار اب تفصیل سے خبر پر روشنی ڈال رہی تھی۔

"ملک کے نامور اور کامیاب وکیل سید بلال احمد شاہ کی گھریلو ملازمہ نے شام سات بجے اپنے شوہر پر قاتلانہ حملہ کیا جس کے نتیجے میں اس کا شوہر اجمل خان ہلاک ہو گیا۔ تفصیل جاننے کے لیے ہم رابطہ کریں گے اپنے نمائندے علی عمران سے۔

جی علی! کیا تفصیلات ہیں آپ کے پاس اس حادثے سے متعلق؟"

"جی آمنہ! یہ حادثہ شام سات بجے بیرسٹر بلال کے گھر پر جو کہ سیکٹر نائن میں واقع ہے پیش آیا۔ تفصیلات ہمارے ذرائع کے مطابق یہ ہیں کہ ورده نامی اس ملازمہ نے اپنے شوہر سے ہونے والے تنازعہ پر اسے خنجر سے وار کر کے قتل کر دیا۔ اس کے فوراً بعد اس نے پولیس کو اطلاع دی اور اقبال جرم کرتے ہوئے خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔" مائیک ہاتھ میں تھامے نمائندہ اپنے مخصوص تیز طرار انداز میں تفصیلات بتا رہا تھا۔

"علی! کیا وجہ بتائی جاتی ہے اس قتل کی؟ کیا پولیس مجرمہ ورده سے کچھ معلوم کرنے میں کامیاب ہوئی؟" آمنہ نامی نیوز کاسٹر اب مزید سوال کر رہی تھی۔

"آمنہ! وجہ تو ابھی معلوم نہیں ہو سکی۔ پولیس نے لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا اور مجرمہ کو حراست میں لے لیا ہے۔"

"بیرسٹر صاحب کا اس واقعہ پر کیا ردعمل ہے؟"

"وہ خود تو یہاں موجود نہیں ہیں۔ وہ غالباً" کراچی میں ہیں اور پولیس بھی ان سے رابطہ کرنا چاہ رہی ہے لیکن تاحال وہ دستیاب نہیں ہو سکے۔"

"ٹھیک ہے علی عمران! ہم آپ سے مزید اپ ڈیٹ لیتے رہیں گے۔ جی ناظرین! ہم ابھی آپ کو بتا رہے تھے کہ ورده نامی اس گھریلو ملازمہ کا تعلق اسلام آباد کے

ایک مشہور اور کامیاب وکیل بلال احمد شاہ سے ہے۔ قتل ان کے گھر پہ ہوا ہے پولیس انہیں شامل تفتیش کرنا چاہ رہی ہے مگر وہ فی الحال کسی سے بھی رابطے میں نہیں ہیں۔ اس وقت وردہ نامی یہ قاتلہ پولیس کی حراست میں ہے اس حوالے سے ہم آپ کو مزید بتاتے رہیں گے ہمارے ساتھ رہیے۔" بار بار وہی الفاظ دہراتے وہ اپنے چینل کی برتری ثابت کرنا نہیں بھولی تھی۔

"یاد رہے ناظرین! یہ خبر آپ تک سب سے پہلے ہمارے چینل نے پہنچائی تھی۔" یہ کہتے ہوئے وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ سید زادہ بلال احمد شاہ کا قہران کے چینل کی اس ایجنسی پر کس بری طرح ٹوٹنے والا تھا۔

☼ ☼ ☼

ناشتے کی لمبی سی میز پہ صرف ایک اکلوتا ذی نفس موجود تھا۔ اس نے جلدی جلدی ہاتھ چلاتے ہوئے چائے تھرمس میں ڈالی اور کپ ٹرے میں دھر کر باہر کی طرف بڑھ آئی۔ وہ ناشتے میں ہمیشہ دو کپ چائے پیتے تھے۔ اسے کبھی ان کی عادات کی سمجھ نہیں آئی تھی لیکن اسے سمجھ کر کرنا بھی کیا تھا۔ ملازم اور مالک کا تعلق صرف کام اور اجرت تک محدود ہوتا ہے۔ تاہم سید بلال صاحب اس کے نزدیک اپنی نوعیت کے منفرد اور انوکھے ترین انسان تھے۔

وہ بڑے ویل بلانڈ اور ویل مینرڈ انسان تھے۔ کبھی کبھی تو اسے لگتا کہ وہ اپنے بازو پہ موجود گھڑی کی سوئیوں سے بھی تیز رفتار تھے۔ وہ جانتی تھی کہ اگر ان کی ڈیلی روٹین میں ناشتے کے لیے بیس منٹ کا وقت تھا تو یہ بیس منٹ انیس تو ہو سکتے تھے مگر اکیس ہونا ناممکن تھا۔ روایتی ایلیٹ کلاس کی طرح انہیں ناشتا کرتے ہوئے اخبار پڑھنا سخت ناپسند تھا۔ درحقیقت وہ ایک وقت میں ایک ہی کام کے قائل تھے۔ انہیں تبدیلی سے نفرت تھی۔ ان کا ناشتا ہمیشہ بڑا مخصوص سا ہوتا تھا۔ ان کا ڈنر رات نو بجے ہوتا تھا اور اگر کسی وجہ سے وہ نو بجے نہ پہنچ پاتے تو پھر وہ کھانا بھی نہ کھاتے۔

وہ جانتی تھی وہ بے انتہا "خوش باش" تھے۔ اپنی چھوٹی اور بڑی محدود کیخوس والی زندگی میں اس نے صرف مردوں کو شلوار قمیص اور دھوتی کرتا میں ملبوس دیکھا تھا۔ شادی کے بعد شہر آنے پر اس نے جانا کہ مرد تو کوٹ سوٹ، ٹوپیس، جینز شرٹ اور ٹریک سوٹ نامی لباس بھی پہنتے ہیں۔ سید صاحب عموماً "مغربی پہناوا" پسند کرتے تھے۔ صبح وہ اسے جاگنگ یا واک کے اوقات میں ٹریک سوٹ میں ملبوس نظر آتے تھے، اس کے بعد خوب صورت تھری پیس یا ٹوپیس جس کے اوپر مخصوص وکیل کا گاؤن ہوتا۔ چار بجے واپس آنے کے بعد وہ شاور لے کر سادہ اور آرام دہ شلوار سوٹ زیب تن کرتے اور دو گھنٹے آرام کے بعد شام کی چائے پیتے۔ اس کے بعد وہ پھر سے تیار ہو کر وکلا بار یا پھر جم خانہ چلے جاتے۔

رات آٹھ بجے واپس آنے کے بعد وہ ایک بار پھر نیا لباس بدلتے اور ڈنر ٹیبل پر آجاتے، اس کے بعد گیارہ بجے تک وہ اسٹڈی میں بزی رہتے "مختلف کیس دیکھنا، نوٹس بنانا، کلائنٹس سے ملنا عموماً" اسی دوران چلتا تھا۔ ان کے گھر آنے کی اجازت صرف چند خاص اور کافی پرانے کلائنٹس کو ہی تھی، جو کہ عموماً "ان کے مستقل کلائنٹس میں شامل تھے۔ چند با اثر گھرانوں کے وہ مستقل قانونی مشیر بھی تھے۔

ان کی بے انتہا مصروف زندگی صرف کورٹ، بار ایسوسی ایشن، جم خانہ میں تقسیم تھی۔ اپنے لیے وہ کیا چاہتے تھے کیا سوچتے تھے وہ بے خبر تھی۔

شخصیت کے لحاظ سے بھی ہر طرح سے بڑے مکمل اور متاثر کن نظر آتے تھے، عمر پینتیس سے چالیس کے درمیان تھی، کنپٹیوں کے چند بال سفید نظر آتے تھے، اونچا لمبا قد، مضبوط جسم اور گندمی رنگت، وہ کلین شیو تھے مگر مونچھیں تھیں جو کہ بڑی شاندار لگتی تھیں۔

اخلاقی لحاظ سے بھی بہت بلند مرتبہ تھے۔ اسے [illegible] تھا کہ وہ [illegible] میں کیسے شعلہ بیاں مقرر تھے مگر وہ اتنا ضرور جانتی تھی کہ وہ گھر میں نہایت دھیمے پن سے مخاطب ہوتے تھے، بہت نرم مزاج تھے، ہمیشہ اسے تنخواہ کے علاوہ بھی کچھ نہ کچھ دیتے دلاتے رہتے تھے۔ کبھی سختی اور ڈانٹ ڈپٹ یا روک ٹوک کا تو سوال ہی نہ تھا۔

سارے گھر کا انتظام "وردہ" کے سر پہ تھا۔ وہ ملازمہ ضرور تھی مگر کبھی کسی نے اسے احساس نہیں دلایا تھا۔ سید بلال احمد شاہ کے اس گھر میں جو کہ "شاہ لاج" کے نام سے جانا جاتا تھا وردہ نامی ایک ہاؤس کیپر، ایک صفائی کرنے کے لیے جز وقتی ماسی، دو مالی، ایک ڈرائیور (جو کہ وردہ کا شوہر اجمل خان تھا) اور چھ گارڈز تھے۔ کام والی ماسی کے جانے کے بعد وہ گھر میں تنہا ہوتی، سب سے پہلے وہ صاحب کے کپڑے نکالتی، اگر تو کسی کو استری کی ضرورت ہوتی تو استری کرنے کے بعد ان کی لمبی سی دیوار گیر الماری (وارڈ روب) جس کا نام اسے کوشش کے باوجود یاد نہیں ہوتا تھا میں لٹکا دیتی۔ اس کے بعد وہ جوتے پالش کر کے رکھ دیتی۔ وہ جانتی تھی کہ صاحب کو اپنے موجودگی میں اسے یہ سب کام کرتے دیکھنا غصہ دلا دیتا۔ حالانکہ وہ اس کے مطابق بہت ٹھنڈے دماغ کے آدمی تھے مگر انہیں اپنے حکم کی خلاف ورزی کسی صورت پسند نہ تھی۔ ان دونوں کاموں سے فراغت پا کر وہ کچن کا رخ کرتی، کچن سارے کا سارا اس کے ذمہ تھا۔ ناشتے کے برتن سمیٹنے کے بعد وہ اپنے اور اجمل خان کے لیے دوپہر کا کھانا تیار کرنا شروع کر دیتی۔ یہ ہمیشہ مختصر سا ہوتا۔ دوپہر کے کھانے پہ اجمل اسے اپنی صبح سے لے کر اب تک کی روداد سناتا اور شام تک کے لیے رخصت ہو جاتا، ان دونوں کی شادی کو تقریباً سال ہو چکا تھا۔

اجمل خان کا تعلق بنیادی طور پر "بھکر" سے تھا وہ ایک لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھتا تھا، وردہ اس کی بچپن کی منگ تھی، شہر میں ان کے ہاں کام کرتے دو سال بیت چکے تھے، اب وہ وردہ سے شادی کر کے اسے بھی یہاں لے آیا تھا جس کی وجہ سے دونوں فریقین کو سہولت تو ہو گئی تھی اجمل خان کی معاملات [illegible] میں اضافہ ہوا تھا۔

اس وقت وردہ کا "شاہ لاج" میں بے حد اہم کردار تھا بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ گھر کے لیے ریڑھ کی ہڈی اختیار کر چکی تھی تو بے جا نہ ہوگا۔ جز وقتی ماسی کو نکال کر تقریباً سارا گھر اس کے ذمہ تھا۔ وہ بہترین منتظمہ تھی اور جب سے وہ "شاہ لاج" میں آئی تھی بلال صاحب بھی خود کو کافی ریلیکس محسوس کرتے تھے۔ اس سے پہلے آنے والی ملازماؤں سے انہیں ہمیشہ شکایتیں ہی رہی تھیں مگر یہ وردہ کا ہی کمال تھا جس نے ان کی ساری شکایتیں دور کر دی تھیں۔ یہ مختصراً "شاہ لاج" کے مالک و ملازم طبقے کا تعارف تھا۔ آج بھی اس گھر میں ایک عام اور معمول کی صبح تھی۔

وہ جاگنگ سے لوٹے تو وردہ کچن میں ناشتا بنانے میں مصروف تھی، وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ شاور لے کر فریش ہونے کے بعد انہوں نے ضروری کاغذات سمیٹے، بریف کیس تیار کیا، سیل فون چارجنگ سے الگ کر کے پاکٹ میں ٹھونسا اور ساتھ ہی والٹ کی موجودگی کا یقین کر کے وہ بریف کیس تھامے باہر کی سمت بڑھ آئے۔

"گڈ مارننگ سر۔" وردہ نے حسب معمول انہیں وش کیا۔

"مارننگ۔" انہوں نے سر ہلا کر کہا اور چیئر پر بیٹھ گئے۔

وردہ ناشتا لینے چلی گئی۔ وہ اتنی پڑھی لکھی نہیں تھی مگر یہ آداب اسے سیکھنے پڑے تھے۔ بلال صاحب بڑے خوش ذوق اور ریفائن تھے، ان کی زبان سیکھتے سیکھتے وردہ کو دانتوں پسینہ آگیا تھا۔ اس کا سب سے بڑا مسئلہ اسلام آباد آنے کے بعد یہی بنا تھا کہ وہ بے چاری ازحد بگڑی علاقائی زبان بولتی تھی جس کی سمجھ اجمل خان کو تو آتی تھی مگر بلال صاحب کو تو ایک لفظ نہ پلے پڑتا اس کا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسے ان کی زبان سیکھنی پڑی حالانکہ اردو کچھ اتنی خاص مشکل بھی نہ تھی مگر اس نے ساری زندگی "بھکر" بھی نہیں پورا دیکھا تھا، [illegible] کے [illegible]... اتنی جانتی تھی کہ مرد کے سامنے

نظر جھکا کر بات کرنی چاہیے اور دوپٹہ سر سے سرکنے نہ پائے۔ مگر یہاں آ کر اسے پتا چلا کہ صبح اٹھتے' آفس جاتے' واپس آتے' رات کو سونے سے پہلے اسے اپنے صاحب کو مختلف وشنگز "wishings" بھی دینا ہوں گی۔ جیسے گڈ مارننگ' ہیو آ نائس ڈے' گڈ لون' گڈ نائٹ وغیرہ وغیرہ۔

اور اس نے بڑی زیرک نگاہی سے حالات کا جائزہ لے کر بہت تیزی سے یہ سب سیکھا تھا بلکہ یہ کہنا درست تھا کہ وہ ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ کوئیک لرنر بھی تھی۔

حالانکہ دوپٹہ ابھی بھی اس کے سر پہ بڑی خوب صورتی اور مضبوطی سے لپٹا ہوا تھا اور وہ ہمیشہ ان سے نظر جھکا کر بات کرتی تھی۔

اس نے جلدی جلدی ناشتے کے لوازمات ٹیبل پہ سیٹ کیے اور ان کی دائنی سائیڈ پہ کھڑی ہو گئی۔

"یہ اجمل خان کی آج کل کیا مصروفیات ہیں؟" وہ چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے پرسوچ انداز میں پوچھ رہے تھے۔

"مصروفیات؟ آپ کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔" وہ حیرانی سے بولی۔

"رات آٹھ بجے تک۔ اس کے بعد کہاں ہوتا ہے؟"

"وہ۔۔۔ وہ کہہ رہا تھا کہ کسی فیکٹری میں جا رہا ہے۔ نائٹ شفٹ میں۔" وہ قدرے ہکلا کر بتا رہی تھی۔ اس کے لیے سید بلال صاحب کا یوں اتنی تفصیل سے پوچھنا بڑی حیرت کا سبب تھا۔ عموماً" وہ صبح ناشتے کی میز پہ قطعا" بولنا پسند نہیں کرتے تھے۔

"ہوں۔ واپسی کب تک ہوتی ہے؟" انہوں نے ہنکارا بھرا۔

وردہ نے اس بار قدرے پریشانی سے انہیں دیکھا۔ اسے اب احساس ہوا تھا کہ کہیں وہ اجمل کے خلاف ایکشن نہ لینے کا سوچ رہے ہوں۔ آخر وہ اس بات کو بڑی آسانی سے بنیاد بنا سکتے تھے کہ وہ ان کے علم میں لائے بغیر اور ان کی اجازت کے بغیر کہیں اور نوکری کر رہا تھا۔

"بارہ بجے تک آجاتا ہے۔" اس نے مزید آہستگی سے بتایا۔

وہ اس کی بات کے جواب میں خاموشی سے سرہلا کر چائے پینے لگے۔ اور کچھ دیر بعد وہ چلے گئے' وردہ کو مسلسل اب یہ ٹینشن لگی ہوئی تھی کہ کسی طرح دوپہر ہو جائے اجمل دوپہر کے کھانے پہ آئے اور وہ اسے سب کچھ بتاوے۔ سمجھ وہ جانے اور اس کا صاحب۔

سوچتی ہوئی وہ معمول کے کاموں میں مصروف ہو گئی' دوپہر کا کھانا بنایا اور اپنے کوارٹر میں آ کر اجمل خان کا انتظار کرنے لگی۔ اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ آیا تو وردہ نے فورا" اس کا چہرہ کھوجا وہ معمول کے مطابق ہی تھا' اس کا مطلب انہوں نے اجمل سے ابھی کوئی بات نہ کی تھی۔ اس نے کھانا اس کے سامنے رکھتے ہوئے صبح ہونے والی گفتگو کہہ سنائی۔

وہ ہاتھ روکے تشویش کے عالم میں اس کی بات سنتا رہا۔

"ویسے مجھے اپنے صاحب ایسے لگتے تو نہیں کہ وہ تجھ پہ غصہ ہوں گے۔ ہو سکتا ہے وہ صرف معلومات کے لیے پوچھ رہے ہوں۔" وہ اس کا پریشان چہرہ دیکھ نہ سکی اور اسے تسلیاں دینے لگی۔

"ہاں ایسا ہی ہوگا۔" وہ سر جھٹک کر کھانے کی سمت متوجہ ہو گیا۔ وردہ نے بھی شکر ادا کرتے ہوئے کھانے کی سمت ہاتھ بڑھا دیا۔

☼ ☼ ☼

وردہ کا یہ اطمینان زیادہ دن تک قائم نہیں رہ سکا تھا۔ چند دن بعد بلال صاحب نے اس سے اجمل کی جائے کار کا پتا پوچھا وردہ کو پتا ہوتا تو بتاتی' وہ پریشانی سے انہیں دیکھتی رہی جبکہ وہ بڑبڑا کر اٹھ گئے کہ وہ خود دیکھ لیں گے۔ اس رات اس نے حسب معمول پھر سے سب کچھ اجمل کو کہہ سنایا۔

"یہ۔۔۔ (گالی) کیوں میرے پیچھے پڑ گیا ہے؟" وہ بدتمیزی سے بولا تھا۔

وردہ نے بے اختیار زیرلب استغفراللہ پڑھا۔ پتا نہیں منہ سے گالی دے کر اسے کتنا سکون کیوں محسوس کرتا ہے۔

"تم انہیں خود بتا دو کہ تم کون سی فیکٹری میں کام کرتے ہو۔ ان کی پریشانی دور ہو جائے گی۔" وردہ نے اپنے تئیں آسان ترین حل بتایا تھا۔

"تو چپ کر اور اپنے مشورے اپنے پاس رکھ۔" اس نے بے دریغ وردہ کو جھڑکا۔ وہ خفت سے سرخ پڑ گئی۔ لیکن اس دن کے بعد اس کا موڈ اجمل سے قدرے خراب ہی رہا۔ حالانکہ اگر وہ "بنگلہ" میں ہوتی تو ہنسی خوشی اس کی مار پیٹ بھی برداشت کر لیتی مگر یہ اسلام آباد کی مہذب آب و ہوا کا اثر تھا کہ اس سے اجمل کا اتنا خراب لہجہ بھی برداشت نہ ہوا تھا۔ دو دن بعد خود بخود اجمل نے اس کا موڈ ٹھیک کر لیا تھا۔ وہ اس کے لیے سونے کی بالیاں لے کر آیا تھا' حالانکہ وہ جیولری جیسے آسیب کا شکار نہ تھی مگر اس کے باوجود اسے اجمل کی طرف سے ملنے والے اس قیمتی تحفے پر بے پناہ خوشی ہوئی تھی۔ لیکن اس کے ذہن سے اجمل کی "پراسرار نوکری" اور اس کے بارے میں تفصیلات جاننے پر ہونے والی جھنجلاہٹ او جھل نہیں ہوئی تھی۔

اسی شام اس نے بلال صاحب کو کچھ پریشان سا دیکھا تھا۔ اس کا دل چاہا وہ پوچھ لے مگر قصدا" خاموش رہی ویسے بھی اس کے نزدیک یہ انتہا درجے کی بدتمیزی ہوتی اور وہ قطعا" بدتمیز نہیں تھی وہ سرے اسے اپنی حدود کا پتا تھا اور تیسرے وہ جانتی تھی کہ وہ جس بھی پریشانی میں مبتلا ہیں۔ بہت جلد اس سے چھٹکارا پالیں گے وہ ٹینشن کو قطعا" سر پہ سوار کرنے والے انسان نہیں تھے۔ وہ ہمیشہ مسائل کو بہت جلد حل کر لیا کرتے تھے' ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ وہ اگر اسے صبح پریشان دکھائی دیے ہوں تو شام تک وہ اسی موڈ میں رہیں۔ وہ معمول کے مطابق ناشتا کرنے میں مصروف تھے ہمیشہ کی طرح دوسرا چائے کا مگ پیتے ہوئے کافی گہری سوچوں میں دکھائی دے رہے تھے۔

"شام کا کھانا مت بنانا۔ مجھے آج لاہور جانا ہے۔ ایک ہفتے میں کورٹ سے لوٹ آؤں گا اور میرا کوئی اچھا سا ڈریس سلیکٹ کر کے تیار کر دینا۔" وہ ہدایت دیتے ہوئے اٹھ گئے۔

"جی صاحب جی میں کر دوں گی' آپ کو کتنے دن لگیں گے؟"

"شاید کل تک لوٹ آؤں۔ کچھ کہہ نہیں سکتا' مصروفیت پر منحصر ہے اگر کچھ مزید کام نہ نکل آئے تو جلد لوٹ آؤں گا ورنہ ممکن ہے واپسی پرسوں تک ہو۔" وہ کبھی کبھار ہی اتنے تفصیلی جواب دیا کرتے تھے۔

"جی ٹھیک ہے۔ کچھ سامان وغیرہ تیار کرنا ہے آپ کا؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں اس کی ضرورت نہیں۔" وہ بریف کیس اٹھاتے ہوئے بولے۔ وردہ نے فورا" آگے بڑھ کر انہیں بلیک مخصوص گاؤن پکڑا دیا تھا۔

"اللہ حافظ۔" وہ آہستگی سے کہتے مڑ گئے۔

"فی امان اللہ۔" وہ دل سے بولی۔

ان کے جانے کے بعد وہ معمول کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ دوپہر میں وہ لوٹے تو اجمل ان کے ساتھ تھا۔ مختصر سی تیاری کے بعد وہ لاہور روانہ ہو گئے۔ وردہ جلدی جلدی بکھرا سامان سمیٹتی' کھانا ٹرے میں سجا کر کوارٹرز کی طرف چلی آئی۔ اجمل اسی کے انتظار میں بیڈ پہ لیٹا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ وہ کھانا اس کے آگے رکھنے لگی۔

"وردہ! سید صاحب کب تک آئیں گے؟ بتایا تو ہو گا تجھے؟" وہ نوالہ لیتے ہوئے استفسار کرنے لگا۔

"ہاں بتا رہے تھے کہ ایک دو دن لگ جائیں گے۔" وہ گلاس میں پانی ڈالنے لگی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" اس نے سرہلاتے ہوئے گلاس تھام لیا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ پھر سے کہیں جانے کے لیے تیار تھا۔

"ہو سکتا ہے میں شام میں دیر سے لوٹوں۔ تم انتظار مت کرنا۔ سو جانا۔" وہ جلدی جلدی جوتے پہن رہا تھا۔

وردہ نے لٹ کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے اداسی سے اسے دیکھا وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ کتنی تنہا تھی اور اکیلاپن محسوس کرتے کرتے وہ تھک چکی ہے مگر خاموش رہی جس طبقے سے اس کا تعلق تھا وہاں عورت کا اپنے حق کے لیے بولنا اسے معتوب و مغضوب بنا دیتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ بیڈ پہ بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

اسے اپنا آپ بے حد مظلوم لگ رہا تھا اور اس میں ایسا کچھ جھوٹ بھی نہ تھا' اجمل سے زیادہ وقت تو وہ سید صاحب کے پاس گزارتی تھی۔ ان کے کام کرتے ہوئے' انہیں ناشتا' کھانا دیتے ہوئے' ان کے کپڑے تیار کرتے ہوئے' رات کو انہیں گرم دودھ یا کافی دینے کے بعد عموماً جب وہ لوٹتی تو اجمل گہری نیند میں ہوتا۔ ان کے درمیان رسمی گفتگو بھی برائے نام ہی رہ گئی تھی۔ اسے آج کل اپنا آپ کسی روبوٹ سے مشابہ لگ رہا تھا۔ احساسات و جذبات سے عاری روبوٹ جس کا مقصد صرف کام کی تکمیل رہ جاتا ہے۔

بھکر سے اسے اسلام آباد لے کر آتے ہوئے اجمل نے اسے اس بات سے قطعاً" بے خبر رکھا تھا کہ اسے اپنی بیوی کی حیثیت کی بجائے ملازمہ کی حیثیت سے لے کر جا رہا ہے۔ مگر جب اسے یہاں آکر پتا چلا تو بھی اس نے کوئی واویلا نہیں کیا تھا بلکہ بڑی خوش اسلوبی سے حالات کا رخ دیکھ کر خود کو اسی سانچے میں ڈھالتے ہوئے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے وہ وہیں لیٹ کر روتے ہوئے غنودگی میں چلی گئی نیند میں جاتے ہوئے بھی اسے یہ تکلیف دہ خیال ستا رہا تھا کہ اجمل نے اسے یہاں لا کر کسی بے کار اور فالتو چیز کی طرح پھینک دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

سید بلال احمد شاہ اگلی رات کو ساڑھے گیارہ بجے کے قریب لوٹ آئے تھے' یہ اتفاق ہی تھا کہ اجمل یا اجمل لوٹا نہیں تھا جس کی وجہ سے وردہ جاگ رہی تھی۔ ان کی گاڑی کی آواز پر وہ اپنے کوارٹر سے باہر آ گئی۔

"السلام علیکم۔" وہ اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آ گئی۔

"وعلیکم السلام۔ تھینک گاڈ وردہ! تم جاگ رہی ہو۔ پلیز ٹیک اٹ۔" انہوں نے تھکن زدہ انداز میں کہتے ہوئے کچھ شاپنگ بیگز اس کی طرف بڑھا دیے۔ اس نے سب کچھ اٹھا لیا اور ان کے پیچھے چل دی۔ وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئے تو وردہ نے ہاتھوں میں پکڑے بیگز صوفے پہ رکھ دیے۔

"میرا کوئی آرام دہ سوٹ نکال دو وردہ۔" وہ تھکے ہوئے سے بیڈ پر بیٹھ گئے' وردہ نے سلیپر ان کے آگے دھرے اور خود ڈریسنگ روم کی سمت بڑھ گئی۔ جبکہ وہ شوز اتارنے لگے' وردہ نے ان کا براؤن شلوار سوٹ نکالا اور باتھ روم میں لٹکا کر آ گئی۔ اسے باہر آتا دیکھ کر وہ کھڑے ہو گئے۔

"کچھ کھانے کو لے آؤ پلیز۔ لنچ بھی نہیں لیا آج میں نے۔" وہ جاتے جاتے اسے کہہ گئے۔

وردہ نے سر ہلاتے ہوئے شوز اٹھا کر شو ریک میں دھرے' کوٹ اٹھا کر رکھا اور باہر نکل گئی۔ کچن میں آکر کھانا گرم کرتے ہوئے اس کا دھیان ــــ بار بار اجمل کی طرف جا رہا تھا۔ وہ ابھی تک نہیں آیا تھا اور جانے کیوں اس کی آنکھیں بار بار بھیگتی جا رہی تھیں۔

"یہ اکلاپا یہ تنہائی اور اس میں جلتا یہ میرا وجود ــــ تجھے خبر بھی نہیں ہو گی اجمل! اور وردہ مر جائے گی۔" وہ ٹرے سیٹ کرتے ہوئے روتے ہوئے چلی گئی۔

ان کے کمرے کی طرف آتے ہوئے اس نے دوپٹے سے آنکھیں رگڑ لی تھیں۔ وہ کھانا لے کر لوٹی تو وہ فریش ہو کر باہر آ چکے تھے۔ وردہ نے ٹرے ان کے آگے دھری اور خود پانی لینے واپس مڑ گئی۔ جب وہ دوبارہ واپس آئی تو وہ کھانے میں مصروف تھے۔ اس نے پانی ان کے قریب رکھا اور خود کچھ ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

"کیا پریشانی ہے وردہ؟" وہ اچانک پوچھنے لگے۔ وردہ نے جھٹکے سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا وہ بڑے مگن سے [illegible] مصروف تھے۔

"کوئی پریشانی نہیں ہے صاحب جی۔" وہ گڑبڑا سی گئی۔

"پلیز کال می سر۔" انہوں نے ٹوکا وہ خاموش ہو گئی۔

"میں نے کچھ پوچھا ہے تم سے؟" وہ اپنا سوال بھولے نہیں تھے۔

"میں تمہارے رہتے رہتے تھک گئی ہوں سر۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ انہوں نے چونک کر سر اٹھایا۔ بڑے سلیقے سے دوپٹہ اوڑھے وہ اپنی نم آنکھوں سمیت پلکیں جھپک جھپک کر آنسو روک رہی تھی۔ اس کے کانوں پہ دو موٹی موٹی لٹیں جھول رہی تھیں۔ وہ چند لمحوں کے لیے چپ رہ گئے۔

"تو کوئی مصروفیت تلاش کرو۔ بکس پڑھا کرو۔ موویز دیکھا کرو۔" انہوں نے آسان ترین حل بتائے۔

"مجھے ٹی وی کا شوق نہیں ہے۔" وہ آہستگی سے بولی تھی۔

"اور بکس؟"

"میں اتنی پڑھی لکھی نہیں ہوں اور نہ ہی میرا کوئی ادبی ذوق ہے۔" اس نے کہا۔ وہ چند لمحے خاموش رہے۔

"تم لوگ اپنی فیملی کیوں نہیں بناتے؟" انہوں نے استفسار کیا۔

"فیملی؟" وہ نا سمجھی سے انہیں دیکھنے لگی۔

"ہاں' کوئی بے بی پلان کرو۔" انہوں نے عام سے لہجے میں کہا۔ اس بار نا سمجھی کا تاثر دیتے دیتے بھی وہ سرخ پڑ گئی۔ وہ انہیں سختی سے ٹوکنا چاہتی تھی مگر اپنی حیثیت اور ان کا احترام مانع آ گیا۔ وہ سختی سے لب بھینچ کر سر جھکا گئی۔ وہ چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتے رہے اس کے نقوش میں کسی پہاڑی ندی کی سی منہ زوری تھی۔ کشش سے انکار نہ کیا جا سکتا تھا۔

انہوں نے ٹرے ایک طرف کھسکا دی اور خود پانی پینے لگے۔ وردہ نے آگے بڑھ کر ٹرے اٹھا لی۔

"مجھے تمہیں بتانا تھا کہ اجمل کی مصروفیات آج کل بہت مشکوک ہیں۔ مجھے اس کی رپورٹ ملا [illegible] میں قیام کے دوران ہی مل چکی ہے۔ میں مزید انکوائری کروا رہا ہوں۔ وہ تمہیں کسی فیکٹری میں جانے کا صرف جھانسا دے رہا ہے۔ جبکہ حقیقتاً" ایسا کچھ نہیں ہے وہ اپنے دوستوں کے ساتھ خاصے غلط کاموں میں ملوث ہے اور مزید کیا کیا کر رہا ہے وہ جلد مجھے معلوم ہو جائے گا۔ تم ذرا محتاط رہو۔" انہوں نے بتایا۔

وردہ زرد چہرے کے ساتھ انہیں دیکھتی رہی۔ ہکا بکا' ہراساں اور پریشان۔

"یہ ــــ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ کیا کر رہا ہے وہ؟ اب کیا ــــ ہو گا اور ــــ میں ــــ میں کیا کروں؟" اس نے وحشت زدہ نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے ہکلا کر کہا۔ انہیں اس سے دلی ہمدردی ہوئی اور کچھ افسوس بھی۔ وہ خاصے غلط بندے کے ہاتھ چڑھ گئی تھی۔

"تم کچھ نہ کرو۔ بس خاموش رہو اور اس سے کچھ پوچھنا مت ورنہ وہ مشکوک ہو جائے گا۔" وہ اسے خبردار کر رہے تھے۔

"آپ اسے منع کریں۔ وہ کیوں کر رہا ہے یہ سب؟" وہ رونے لگی دل تو پہلے ہی دکھا ہوا تھا۔

"کیا کہا جا سکتا ہے۔ غلط کمپنی بھی اس کی وجہ ہو سکتی ہے اور جہاں تک بات ہے میرے منع کرنے کی تو ابھی کچھ نہیں ہو سکتا۔ پہلے مجھے یہ پتا چلا لینے دو کہ وہ آخر کر کیا رہا ہے۔" انہوں نے تسلی دی تھی۔

"میں ــــ کیا کروں؟" وہ بے بسی سے کہتی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی' ہاتھوں میں تھامی ٹرے لرزنے لگی۔

"اٹس او کے وردہ! پلیز کام ڈاؤن۔ میں ہوں ابھی سب دیکھنے کے لیے۔" وہ اٹھ کر اس کے مقابل آ گئے۔ انہوں نے ہاتھ اس کے سر پہ دھرا تھا۔ ہمدردی ملتے ہی اس کے آنسو مزید تیزی سے بہنے لگے۔ مگر وہ جھٹکے سے مڑی اور باہر نکل گئی۔ اسے یہ سب بہت ناقابل یقین سا لگ رہا تھا۔

"کیسے ممکن تھا یہ سب؟ اجمل! اجمل اس کا اجمل جانے کیا کیا کرتا پھر رہا تھا۔ وہ کتنی بے خبر تھی؟" وہ کوارٹر میں واپس آئی تو حیرت انگیز طور پر وہ پہلے سے ہی

موجود تھا۔

"کہاں تھی تو؟" اجمل خاصے بگڑے ہوئے موڈ میں تھا۔ ورده ساکت سی اسے دیکھتی رہی۔

"کھانا دے رہی تھی صاحب کو۔" اس کا لہجہ دھیما تھا۔

"اچھا۔۔۔؟" اس نے خاصے طنزیہ انداز میں کہا۔ "اچھا" خاصا بے یقین سا تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ میں جھوٹ بول رہی ہوں؟" وہ جھٹکے سے اکھڑ گئی۔

"اپنی آواز نیچے رکھ۔" وہ دھاڑا تھا۔ ورده کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

"تو ایسا کیوں کر رہا ہے اجمل؟" وہ سسک اٹھی۔

"سچ بتا مجھے کیا کر رہی تھی وہاں؟ کھانا دے رہی تھی یا دل بہلا رہی تھی؟" وہ سختی سے باز پرس کر رہا تھا۔ وہ رونا دھونا بھول کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"بکواس بند کر۔" وہ پوری قوت سے چلائی تھی۔

اجمل چند لمحے خونی نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر اونہہ کہہ کر کروٹ بدل گیا۔ وہ سلگتے دل و دماغ کے ساتھ بیٹھی رہی اور پھر تیزی سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

سید بلال احمد شاہ اگلے چند دن بے حد مصروف رہے تھے۔ اس دوران وہ بالکل بھول چکے تھے کہ انہوں نے ورده سے کیا کہا تھا۔ ان کی کورٹ میں مسلسل سماعتیں تھیں جس کی وجہ سے وہ اور کسی طرف متوجہ ہی نہ ہو سکے تھے اور دوسری طرف ورده بے حد پریشان اور خوفزدہ تھی۔ وہ ان سے پوچھنا چاہتی تھی ان سے معلوم کرنا چاہتی تھی کہ وہ کچھ کر کیوں نہیں رہے؟ اجمل کی سرگرمیاں ہنوز وہی تھیں۔ اور اس دن کے بعد تو وہ ورده کو مزید اگنور کرنے لگا تھا۔ ایک رات وہ گھر لوٹا تو اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور لہجہ بدلا ہوا اکھڑا اکھڑا ہوا سا۔ وہ دنگ سی تھی۔ "علامات" بتاتی تھیں کہ وہ کیا کر کے آیا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ کسی نے جیسے اس کے گرد ایک خاردار باڑ ٹھونک دی تھی۔ جس میں سے باہر نکلنے کا راستہ اسے نظر نہیں آتا تھا۔ اسے اجمل سے نفرت محسوس ہوئی تھی۔

پہلی بار۔۔۔ اور وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ نفرت اب مزید بڑھنے والی تھی۔ اگلے دن اس نے متورم آنکھوں اور سرخ چہرے کے ساتھ جب سید صاحب کو ناشتا سرو کیا تھا تو وہ بے تحاشا چونک گئے۔

"کیا بات ہے؟ طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟"

"جی۔" وہ مدھم لہجے میں کہتی مڑ گئی۔ کچھ دیر بعد لوٹی تو ہاتھ میں چائے کا تھرماس تھا۔

"مجھے بتاؤ؟ کیا مسئلہ ہے؟ کوئی جھگڑا ہوا ہے اجمل کے ساتھ؟" اب کی بار ان کا لہجہ سخت تھا۔ ورده نے آہستہ سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کوئی جھگڑا نہیں ہوا تو پھر ایسی شکل کیوں بنائی ہوئی ہے؟"

"آپ نے پتا کروایا وہ کن لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے؟" وہ ان کے سوال کو نظر انداز کر کے پوچھنے لگی۔

"عجیب گھٹیا اور شرابی جواری قسم کے لوگ اس کے دوست ہیں۔ بعض چھوٹی موٹی جیل بھی کاٹ چکے ہیں۔ نت نئے جرائم میں ملوث ہوتے رہتے ہیں۔ مگر چونکہ ثبوت نہیں ہوتا اس لیے پکڑے نہیں جاتے۔" وہ چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے بتا رہے تھے۔

"تو آپ اسے منع کریں نا۔" وہ بے کلی سے بولی۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ جواباً کچھ بھی نہ کہا۔ ورده کے اندر مزید اکھاڑ پچھاڑ ہونے لگی۔ پتا نہیں یہ معاملہ کس طرح طے ہونا تھا۔

مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی۔ اگلے دن اسے خود ہی سب پتا چل گیا۔ اجمل تاش کی بازی ہار گیا تھا جس کے نتیجے میں وہ بے اندازہ کی ہوئی رقم کے ساتھ ساتھ سونے کی وہ بالیاں بھی لے گیا جو اس نے چند دن پہلے ہی ورده کو تحفتاً دی تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ ان کے شوز پالش کر رہی تھی۔ رات میں اسے بالکل بھول گیا تھا جس کی وجہ سے وہ ان کے سامنے بیٹھی شوز پالش کر رہی تھی۔ کام میں اس کی مہارت قابل داد تھی۔ ذرا سی بھی پالش اس کے ہاتھ یا بازو پہ نہیں لگی تھی۔ تیزی سے چلتے ہاتھوں کے ساتھ اس کی اطراف میں نکلی لٹیں بھی جھول رہی تھیں۔

"بس ٹھیک ہے لاؤ دے دو۔" انہوں نے کہا۔

ورده نے چمکتے شوز ان کے سامنے دھر دیے۔ بہت دن گزر گئے تھے اس نے ان سے کچھ بھی معلوم نہ کیا تھا اور نہ ہی انہیں ہمیشہ کی طرح یہ کہا تھا کہ وہ اجمل کو منع کریں۔ آخر کس برتے وہ یہ سب کہتی؟ وہ ان کے سرپرست تو نہیں تھے اور نہ ہی دین دار۔ رشتہ تو بالآخر ملازم و مالک کا ہی تھا۔

دوسری طرف اجمل کے سدھرنے کے کوئی آثار نہ تھے بلکہ وہ اب کھل کر مقابلے پہ اتر آیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں اس نے اب کھلم کھلا اپنی سرگرمیاں شروع کر دی تھیں اکثر راتوں کو غائب رہتا۔ کئی قیمتی اشیاء بھی بیچ چکا تھا نیز ورده کا اب تک پس انداز کیا گیا خرچ بھی وہ اس سے ہتھیا چکا تھا۔ کئی بار دونوں میں تلخ کلامی بھی ہو چکی تھی۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ ورده کو اس سے نفرت ہو گئی تھی اور وہ بھی اتنی شدید کہ اسے لگتا تھا کہ وہ اسے مار ہی نہ ڈالے۔

زندگی اس سے زیادہ بدصورت اسے پہلے کبھی نہ لگی تھی۔ دن رات ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے جا رہے تھے اور وہ تھی کہ وہیں جامد۔ پھر چند دن بعد ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے اسے بے حد برافروختہ کر دیا۔ اجمل کو پھر سے پیسوں کی ضرورت تھی اور اس کا اصرار تھا کہ وہ اسے سید صاحب سے پیسے لا کر دے۔ ورده نے صاف چٹا انکار کر دیا جس پر اجمل نے غصہ میں آ کر اس پر ہاتھ اٹھا لیا۔ اس نے بری طرح مار کھانے کے باوجود بھی ہامی نہیں بھری تھی۔ جس پر اجمل کو اور زیادہ غصہ آیا تھا اور وہ گھر میں موجود چیزیں (وہ قیمتی اشیاء جو وہ امانت رکھتی تھیں) اٹھا کر لے گیا تھا۔ معاملہ خطرناک حد تک سنجیدہ اور ورده کی برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔ مگر مجبوری یہ تھی کہ وہ کچھ بھی کرنے کی پوزیشن میں نہ تھی۔

فاصلے تھے کہ صدیوں پہ محیط ہوتے جا رہے تھے۔ اور سمٹنے کے کوئی آثار نہ تھے۔

☼ ☼ ☼
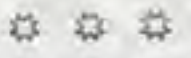
"یہ کیا ہے؟" ورده نے حیرت سے چارپائی پر پڑی چیز کو دیکھا۔

جواباً اجمل نے کچھ کہے بغیر چمڑے کے تھیلے میں سے وہ چیز نکال کر دکھا دی۔ ورده کی رگوں میں خون جمنے لگا۔ وہ ایک چمکتا ہوا خنجر تھا جس کا ایک سرا بے حد تیز دھار اور دوسرا دندانے دار تھا۔

"یہ کیوں لائے ہو؟" اس نے مدھم پڑتی دھڑکنوں کے ساتھ کہا۔

"حفاظت کے لیے۔" وہ مختصراً بولا۔

ورده مزید کچھ کہے بغیر مڑ گئی۔ پورا دن اس کا ذہن اسی ادھیڑبن میں رہا کہ آخر اجمل کیا چاہتا تھا۔ مگر اسے کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔

اگلے دن سید بلال احمد شاہ کو کراچی جانا تھا۔ اس نے ان کی تیاری میں مدد کی اور جب وہ جانے لگے تو اسے کہہ گئے تھے کہ انہیں دو ہفتے لگ جائیں گے۔ وہ اندر ہی اندر مزید پریشان ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"سلام سید صاحب۔" "فون پر یقیناً" کوئی پولیس آفیسر تھا۔ ان کی نیند فوراً" اڑ گئی۔ رات وہ ایک فنکشن میں گئے تھے لیٹ نائٹ واپسی کی وجہ سے صبح اٹھ نہ سکے اور چونکہ انہیں کوئی کام بھی نہیں تھا جبھی وہ فرصت سے سو رہے تھے مگر اس وقت ان کی نیند میں فون کی مسلسل بجنے والی بیل نے خلل ڈالا تھا۔

"خیریت؟ کیوں فون کیا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"آپ یقیناً" سو رہے تھے میں نے ڈسٹرب کر دیا؟" اس کا انداز معذرت خواہانہ تھا۔

"کام کی بات کرو۔" انہوں نے بمشکل اپنی ناگواری پہ قابو پایا۔

"ہو سکتا ہے آپ نے نیوز نہیں دیکھیں؟" اس کا بھی لہجہ بدل گیا۔
"کہنا کیا چاہتے ہو؟"
"آپ کی گھریلو ملازمہ وردہ اس وقت اپنے شوہر اجمل کو قتل کرنے کے الزام میں پولیس کی حراست میں ہے۔" اس نے دھماکہ کیا تھا۔ ان پر جیسے بجلی گری تھی۔
"کیا بکواس کر رہے ہو؟" وہ دھاڑے تھے۔
"میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ رات سے آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مگر آپ کا سیل آف تھا۔" وہ اب تیز تیز ساری تفصیلات بتاتا جا رہا تھا۔
سید بلال احمد شاہ کا رنگ بار بار بدل رہا تھا وہ ششدر رہ گئے تھے اس نازک اور چھوٹی موٹی لڑکی سے انہیں اس قدر خوفناک اقدام کی توقع تھی ہی کب۔ جانے انہیں وہ اتنا سارا حوصلہ کہاں سے سمیٹ لائی تھی۔ آخر ایسا کیا ہو گیا تھا؟ انہیں یہاں آئے صرف پانچ دن ہی تو ہوئے تھے اور ان پانچ دنوں میں ایسا کیا ہو گیا جس نے اسے اس قدر خطرناک کام کرنے پہ مجبور کر ڈالا۔ وہ سوچے جا رہے تھے۔
"سنو آفیسر! اسے کچھ نہیں ہونا چاہیے۔" ان کا لہجہ تحکمانہ تھا۔
"وہ تو ٹھیک ہے۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر مگر مجھ پر اوپر سے بھی بہت دباؤ ہے اس کیس کی تفتیش کے لیے۔ میں زیادہ دیر تک مزاحمت نہیں کر سکوں گا سید صاحب پلیز! آپ میری کنڈیشن سمجھیں۔" وہ خوشامدانہ انداز میں بولا۔
"تم فکر مت کرو۔ میں پہلی دستیاب فلائٹ سے واپس آ رہا ہوں۔ میں کیس خود دیکھ لوں گا۔" انہوں نے حتمی انداز میں کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔
کچھ دیر بعد وہ ایئرلائن کے آفس میں فون کر کے اپنی سیٹ بک کروا رہے تھے۔
جس نجی چینل نے اجمل قتل کیس کے سلسلے میں اپنی شینسی دکھاتے ہوئے بریکنگ نیوز چلائی تھی اس پر سید بلال شاہ کو اس قدر غصہ تھا کہ حد نہیں وہ انہیں ہر حال میں ایسا سبق دینا چاہتے تھے کہ دوبارہ وہ کسی معزز اور باعزت شہری کی شہرت پر حملہ کرنے کا سوچ بھی نہ سکیں اور اس کے لیے انہیں صرف چند فون کرنا پڑے تھے۔
اس چینل پر اتنا دباؤ ڈالا گیا تھا کہ اس کے اونرز نے باقاعدہ آ کر سید صاحب سے معافی مانگی تھی۔
شہباز ملک ان کے سب سے قریبی اور عزیز دوست بھی اس وقت ان کے پاس تھے ان سب کے جانے کے بعد انہوں نے نفرت بھرا ہنکارا ابھرا تھا۔
"بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ مگر یہ بے حس لوگ اتنا نہیں جانتے کہ لوگوں کو باخبر رکھنے میں اور دوسروں کی عزتوں کو اچھالنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔" ان کا لہجہ بے لچک تھا۔
وردہ سے ان کی ملاقات اسی رات اسپیشل روم میں ہوئی تھی۔ وہ دونوں آمنے سامنے کرسیوں پہ براجمان تھے انہوں نے غصے و بے زاری سے بھری نگاہ سامنے بیٹھی وردہ پہ ڈالی جو سر جھکائے ہوئے تھی۔
"دیکھو! اگر تم مجھے سچ نہیں بتاؤ گی تو کیس کیسے چلے گا؟ میں تمہارا دفاع نہیں کر پاؤں گا اور جلد یا بدیر مجبور ہو جاؤں گا کہ پولیس کو تفتیش کی اجازت دے دوں اور تم جانتی ہو یہ تمہارے ساتھ کیا کریں گے؟" وہ خود پر ضبط کرتے کرتے پھٹ پڑے تھے۔ وردہ کا جھکا ہوا سر نہیں اٹھا تھا۔
"آپ ان کو بولیں صاحب! اگر یہ مجھے پھانسی دے دیں۔" اس کا لہجہ سپاٹ تھا اور آنکھیں پر وحشت۔
"پھانسی اتنی آسانی سے نہیں ملتی محترمہ۔" ان کا لہجہ طنزیہ تھا۔ جواباً وہ خاموش رہی۔
"دیکھو! مجھے سب سچ بتا دو۔ ہو سکتا ہے کوئی درمیانی راہ نکل آئے۔" انہوں نے خود پہ قابو پا کر معتدل انداز میں کہا تھا۔ جواباً وہ پھر سے اسی مراقبے کی سی کیفیت میں چلی گئی تھی۔
آدھے گھنٹے تک اس کے ساتھ سر کھپانے کے بعد

بھی اسے اس پر مجبور نہ کر سکے کہ وہ کچھ بتا دے۔ وہ سختی سے خاموشی کی مہر لبوں پر لگا کے بیٹھ گئی تھی۔ نتیجہ کچھ نہ پا کر وہ خاصے جھنجلائے ہوئے اٹھے تھے۔

☼ ☼ ☼

"اے وکیل کی باورچن! ادھر آ۔۔۔ بڑے کھانے پکانا جانتی ہے نا تو۔۔۔ ادھر جب کنکروں سے بھری دال پکانی پڑے گی نا تو تب دیکھیں گے مہارت۔" یہ قیدی عورت کچن کی ہیڈ تھی جو اسے بلا رہی تھی۔
وردہ خاموشی سے اٹھ کر اس کے ساتھ چل دی۔ اس کے کیس میں کوئی پیش رفت نہ ہونے کی بنا پر اسے مستقلاً جیل میں ڈال دیا گیا تھا اور آج سے تو کام پر بھی لگایا جا رہا تھا۔ وہ کام میں مصروف ہو گئی۔ کئی دن ہوئے سید صاحب نے بھی آنا چھوڑ دیا تھا ظاہر سی بات تھی کہ جب وہ کچھ بتانے پہ آمادہ ہی نہ تھی تو وہ کیسے کیس کی پیروی کرتے۔
اس اذیت بھرے قید خانے میں صبح و شام کا کوئی حساب نہ تھا۔ دیگر قیدی عورتیں ایک دوسرے کے ساتھ نہایت کم مخاطب ہوتی تھیں اور اگر ہوتی بھی تو گالیوں سے بھری بڑی فحش زبان میں جسے سن کر ہی وردہ کے کانوں سے دھواں نکلنے لگتا۔
اسے ایک آزادی ضرور تھی بلکہ یہ سید صاحب کی ہی کرم فرمائی تھی کہ اس پر تاحال کسی قسم کا جسمانی تشدد نہیں کیا گیا تھا۔ البتہ اس کی ساتھی قیدیوں میں سے روز ہی کسی نہ کسی کی شامت آئی ہوتی تھی۔ ٹارچر سیل میں سے اٹھنے والی آوازیں اور چیخیں اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ بن کر گونجتی تھیں اور نیند اس کی آنکھوں سے اڑ جاتی۔ وہ انگلیاں کانوں میں ٹھونسے لرزتی رہتی اور وہی فریدہ نامی قیدی کچن ہیڈ اس کی حالت پہ قہقہے لگاتی اور اسے سمجھاتی کہ وہ یہ نازک مزاجیاں جلد بھول جائے گی اور اس سب کی عادی ہو جائے گی۔
وہ ہمیشہ وردہ کو "وکیل کی باورچن" کہہ کر بلاتی تھی۔ وردہ خاموش رہتی تھی بلکہ وہ کسی سے بھی مخاطب نہیں ہوتی تھی۔ فریدہ عموماً سب کے سامنے اس کا مذاق اڑاتی۔
"اے وکیل کی باورچن! آج نہیں تو کل تو ضرور بولے گی۔ آخر ایسا کیا کیا تھا تیرے خوند (خاوند) نے؟ اتنی معصوم مت بنا کر۔ چل بتا دے۔" وہ ہنستی تو باقی سب بھی اس کا ساتھ دیتیں۔ ان کے قہقہے وردہ کے کان پھاڑنے لگتے۔
وہ چپ چاپ کونے میں چھپ کر سر گھٹنوں میں دے لیتی۔

جیون جتنا اجڑ گیا ہے
اتنا ہی بہت ہے
پتھر آنکھوں سے زیادہ بھاری ہوتے ہیں
تھکی ہوئی شکستہ آنکھوں سے
نوکیلے اور کھردرے پتھروں کو
ہشاش بشاش کب تک دیکھوں
اور خون کے آنسو روتی آنکھوں کو
کب تک سہوں؟؟؟

☼ ☼ ☼

وہ اس وقت جم خانہ میں تھے جب انہیں پولیس اسٹیشن سے کال موصول ہوئی۔
"سید صاحب! انتہائی ضروری بات کرنا ہے آپ سے۔"
"بولو۔" وہ عجلت میں تھے۔
"اس کیس کا کیا کرنا ہے؟" لہجہ مودبانہ تھا۔
"کیوں؟ جلدی ہے کیا؟"
"آپ کے مخالفوں کی طرف سے دباؤ بڑھ رہا ہے سر! وہ ہر صورت اس معاملے کو کورٹ میں اور چینلز پر رلتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ بس یوں سمجھ لیں کہ وہ آپ کی عزت کو سڑک پہ لانا چاہتے ہیں۔" اس نے کہا۔
"میں دیکھتا ہوں کیا ہو سکتا ہے؟" ان کے ماتھے پہ ایک شکن آ گئی تھی۔
"اور سب سے زیادہ بڑی مشکل تو یہ ہے کہ وہ لڑکی

کچھ لگنے لگے۔ "آدھو نہیں ہے کیس بالکل الجھ کر رہ گیا ہے۔ استغاثہ کی طرف سے تو کوئی ہے ہی نہیں اگر ہم اسے قتل برائے دفاع کا نام دے دیں تو بڑی آسانی سے کیس ختم ہو سکتا ہے آگے آپ زیادہ علم رکھتے ہیں جو آپ مناسب سمجھیں۔" ایس ایچ او خالد بڑی تفصیل سے بتا رہا تھا۔

وہ سمجھنے والے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کچھ کہنے لگے۔ ان کی آواز بتدریج مدھم ہوتی گئی اور لہجہ پر اسرار۔ کچھ دیر بعد جب انہوں نے فون بند کیا تو ان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ انہیں یقین تھا کہ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

☼ ☼ ☼

وہ دوبارہ اس سے ملنے آئے تھے۔ وردہ کو ان سے ملنا کچھ خاص اچھا نہ لگا تھا۔ جب وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے کیس میں پیش رفت ہو تو وہ کیوں اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہے تھے۔

وہ اسے بڑی تفصیل سے سمجھا رہے تھے کہ اگر وہ ان کی بات مان لے تو سب کچھ آسان ہو سکتا ہے وہ کیس بڑی آسانی سے سنبھال لیں گے۔ وہ اسے ڈرا رہے تھے کہ یہ پولیس والے صرف ان کی وجہ سے رکے ہوئے ہیں ورنہ وہ اب تک اس سے سب کچھ اگلوا چکے ہوتے اور اس کے لیے وہ قطعاً" زیادہ محنت نہ کرتے بلکہ آدھے گھنٹے تک ہی وہ ان کا تھرڈ ڈگری تشدد برداشت کر لیتی تو زندہ رہنا مشکل ہو جاتا اور تب جب اسے جان کے لالے پڑ جاتے تو پھر اسے احساس ہوتا کہ وہ اگر اس کی بات مان لیتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ وہ ناثر انداز میں سب کچھ سنتی رہی۔

"آپ مجھے نہ سمجھائیں صاحب جی! آپ بس ان لوگوں سے کہو کہ وہ میرا کیس ختم کر کے مجھے پھانسی چڑھائیں۔" اس کے انداز ہنوز تھے۔

سید بلال کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ انہیں بے انتہا غصہ آیا تھا۔ یہ لڑکی نا صرف اپنی جان کی دشمن بنی ہوئی تھی بلکہ ان کی عزت کا جنازہ نکالنے کے بھی در پے تھی۔

"پھانسی تو تم ضرور چڑھو گی مگر ابھی نہیں۔ اس سے پہلے ہی یہ لوگ تمہیں موت کا مزا چکھائیں گے تم دعائیں مانگو گی مرنے کی۔ مگر موت نہیں اور پھر تمہیں احساس ہو گا کہ میں صحیح کہتا تھا۔ ٹھیک ہے میں کہہ دیتا ہوں کہ تم پر کی جانے والی عنایتیں ختم کر دیں۔ ویسے بھی آخر وہ کب تک میری بات مان سکتے ہیں۔ پولیس آفیسرز خواہ کتنے ہی کرپٹ سہی مگر قانون کے جواب دہ تو ہیں نا۔" وہ سرد اور بے مہر لہجے میں کہتے اٹھ کر چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

"مجھے یہ زندگی نہیں چاہیے۔ مجھے لوگوں سے نفرت ہے۔ کیوں وہ جھوٹ بولتے ہیں اور دھوکہ دیتے ہیں۔" وہ خود کلامی کر رہی تھی۔ اس کی لٹیں بڑی سوگواری سے اس کے گالوں کے گرد جھول رہی تھیں اور سیاہ بھیگی آنکھیں مسلسل برس رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

کچھ دنوں سے فریدہ کی نظر کرم کچھ زیادہ ہی اس پہ ہو گئی تھی۔ وردہ تو خود سے بھی بے خبر رہتی تھی مگر دوسری قیدی عورتوں سے یہ چھپا نہیں رہ سکا تھا۔ کئی ایک نے اس سے وجہ جاننے کی کوشش کی تھی مگر وہ جواباً" فکر نکران کی شکلیں دیکھتی رہی۔ اسے کچھ پتا ہوتا تو بتاتی اور جلد ہی اس کا پول کھل گیا۔ یہ اسے اس کی ساتھی قیدی نسرین نے بتایا تھا اور جو کچھ وردہ کے علم میں آیا وہ خاصا خوفناک تھا۔

ایک شام پٹرولنگ پہ آنے والے ایس پی کو وردہ بڑی پسند آئی تھی اور اس کی ڈیمانڈ پہ وردہ کو دو دن بعد اس کی خدمت میں پیش کیا جا رہا تھا۔ وردہ کو صحیح معنوں میں عزت کے لالے پڑ گئے تھے۔ اسے بے ساختہ سید صاحب کی باتیں یاد آئی تھیں۔ نسرین کی معلومات پہ شبہ ہو ہی نہیں سکتا تھا وہ جیل میں سب سے باخبر قیدی تھی۔

وردہ نے پھوٹ پھوٹ کر روتے گڑگڑاتے اس سے مدد مانگی تھی اور جواباً" وہ بڑے ہمدردی بھرے انداز میں اسے سمجھانے لگی کہ وہ سید صاحب سے مدد مانگے وہ یقیناً" بچھے نہیں رہیں گے۔ وردہ نے فوراً" اس کی بات ماننے کی ہامی بھر لی تھی مگر اب مسئلہ یہ تھا کہ اس کا پیغام سید صاحب تک کون پہنچاتا؟ آخر یہ ذمہ داری بھی نسرین نے اٹھالی۔ اس نے وردہ کو تسلی دی تھی کہ اگلی صبح تک وہ لا دے گی۔" اس کا پیغام سید صاحب تک پہنچانے کا انتظام کر دے گی وردہ کے لیے وہ رات بڑی قاتل تھی۔ پوری رات اسے نیند نہیں آئی تھی۔

نسرین کے حسب وعدہ اگلے روز سید صاحب موجود تھے۔ وہ انہیں دیکھتے ہی ان کے پیروں میں گر گئی۔

"مجھے بچائیں صاحب جی۔ مجھے بچائیں۔" وہ زور زور سے رو رہی تھی۔ انہوں نے بے ساختہ اسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور کرسی پہ بٹھا دیا۔

"کیا ہو گیا ہے وردہ؟ مجھے بتاؤ؟ دیکھو رو مت۔" وہ اسے تسلی دینے لگے۔ وہ سسکیوں کے ساتھ رک رک کر انہیں سب کچھ بتانے لگی۔ وہ ششدر سے بیٹھے اسے دیکھتے رہے۔

"بس اور کوئی راستہ نہیں رہا وردہ! تم مجھے سچ بتا دو۔ آخر ایسا کیا ہوا تھا جس نے تمہیں اس حد پر اترنے پہ مجبور کر دیا تھا؟ بولو؟ کیوں قتل کیا تم نے اجمل کو؟" وہ غراتے ہوئے تھے۔

وہ نفسیاتی طور پر بے حد کمزور پڑی ہوئی تھی اور اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جامد ہو چکی تھی۔ جبھی وہ پھٹ پڑی تھی۔

"سودا کرنا چاہتا تھا وہ میرا۔" وہ دبے لہجے میں چلا پڑی تھی۔

"کیا بکواس کر رہی ہو؟" وہ دھاڑے تھے۔

"ہاں ایسا ہی تھا۔ اپنے عیاش دوستوں میں جوا ہار گیا تھا۔ مجھے گھر آکر کہنے لگا کہ پیسے لا کر دوں آپ سے آپ یہاں تھے نہیں۔ آپ ہوتے تو میں شاید اپنی خودداری کو بالائے طاق رکھ کر آپ سے مانگنے چلی آتی مگر میری قسمت خراب تھی۔ آپ کراچی میں تھے۔ وہ مجھے مجبور کرنے لگا کہ گھر کے اندر سے کچھ قیمتی چیزیں چرا لاؤں۔ میں نے انکار کر دیا۔ میں اس کی عیاشیوں کے لیے اپنے کردار پر سمجھوتا نہیں کر سکتی تھی۔" وہ سانس لینے کو رکی تھی۔ آنسو ایک تواتر سے بہہ رہے تھے۔ سید بلال احمد اسے بھیگی آنکھوں اور حیرت سے سفید چہرہ لیے دیکھ رہے تھے۔

"پھر کیا ہوا؟" وہ سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھ رہے تھے۔

"اگلے دن وہ پہلے سے زیادہ خطرناک موڈ میں تھا۔ کہنے لگا اگر میں نے اس کی بات نہیں مانی تو وہ مجھے قتل کروا دے گا۔ اسی خنجر سے جو وہ اپنی حفاظت کے لیے لے کر آیا تھا۔ مجھے مرنے سے ڈر نہیں لگتا تھا مگر میں اس کی بات نہیں مان سکتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ ہر ظالم بزدل ہوتا ہے۔ وہ بھی ظالم ضرور تھا مگر اس میں مجھے مارنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ بزدل تھا۔ وہ صرف دھمکا سکتا تھا۔ میں نے بڑے دھڑلے سے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور اس سے کہا کہ وہ جو کر سکتا ہے کر لے۔ مجھے کوئی پروا نہیں۔ میرے جواب نے اسے پاگل سا کر دیا۔ اس رات اس نے مجھے بہت مارا مگر میرے انکار کو اقرار میں نہ بدل سکا۔ اگلے دن اس نے مجھے کہا کہ میں۔ میں اچھے سے کپڑے پہن کر تیار ہو جاؤں۔ مجھے اس کے ساتھ کہیں جانا ہے۔ میں تو اس کے کسی دوست کو عزیز کو نہیں جانتی تھی تو میں کیوں جاتی پھر؟؟؟

میں نے انکار کر دیا۔ اور وہ مزید بھڑک گیا۔ مجھے گالیاں دیتے ہوئے اس نے وہ خنجر نکال لیا۔ شاید وہ مجھے صرف دھمکانا چاہتا تھا۔ مگر میں نے غلط سمجھا۔ مجھے لگا وہ مجھے مارنا چاہتا ہے۔ میں نے اس سے خنجر چھیننا چاہا۔ وہ توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے بیڈ پر گر گیا۔ میں نے خنجر اس سے چھین لیا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ مجھے اس وقت کیا ہوا تھا؟ شاید میں اپنے حواسوں میں نہیں رہی تھی شاید میں پاگل ہو گئی تھی۔ میں نے جانتے بوجھتے خنجر اس کے پیٹ میں گھسیڑ دیا۔ میں نے اسے مار ڈالا۔ مجھے اس

وقت صرف یہ احساس تھا کہ یہ شخص میری عزت۔۔۔ میری زندگی کا دشمن تھا۔" وہ ہذیانی انداز میں بولتی جارہی تھی۔

"صاحب! عورت کردار کے بغیر باسی روٹی ہے جسے کوئی کھانا پسند نہیں کرتا۔ سب اسے چھان بورے میں پھینک دیتے ہیں۔ اگر میری عزت پہ داغ لگ جاتا تو میں مرجاتی۔۔۔ اسی لیے میں نے اسی کو ختم کردیا جو بظاہر تو میری عزت کا رکھوالا تھا مگر جب رہبر ہی راہزن بن جائیں تو قافلے راہ بھول جاتے ہیں۔ کبھی منزلوں تک نہیں پہنچ پاتے۔۔۔ اور آج یہاں پھر سے وہی کھیل شروع ہورہا ہے۔۔۔ مجھے بچالیں صاحب جی! آپ جو کہیں گے میں کروں گی۔ میں نے آپ سے بالکل سچ بولا ہے۔ میں باقی سب کے ساتھ بھی سچ بولوں گی۔" وردہ کی بات ختم ہوچکی تھی۔ اس کے آنسو سچے موتیوں کی مانند گر رہے تھے۔ کمرے میں عجیب خاموشی تھی۔

☼ ☼ ☼

اگر زندگی کی کوئی منطق ہے
تو پھر موت کی بھی کوئی منطق ضرور ہوگی
ہوسکتا ہے موت وہ نہ ہو
جو بظاہر نظر آتی ہے
ایک دائرہ جو ہروقت ہر طرف سفر کرتا ہے
جبکہ زندگی صرف دو ہی اطراف میں سفر کرسکتی ہے
ایک موت کی طرف
اور دوسری اگلی زندگی کی طرف
زندگی بعض اوقات خود کو بچانے کے لیے
دوسری زندگیوں کو ماردیتی ہے

"استغاثہ کی طرف سے پیروی نہ کیے جانے کی بنا پر عدالت مجرمہ کے اقبالی بیان پر یقین کرتے ہوئے اور مقتول کے مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث ہونے کی بنا پر اس ہلاکت کو سراسر دفاعی قتل قرار دیتی ہے۔ وردہ نامی ملزمہ کو اس کے سابقہ کردار اور محترم مسٹر بلال احمد شاہ کی گواہی پر باعزت بری کیا جاتا ہے۔" فیصلہ سنا دیا گیا

تھا۔ وردہ نے دو ماہ بعد اس قفس سے چھٹکارا پانے کے بعد باہر پھیلے مشرق تا مغرب نیلے امبر کو دیکھا اور اس کا دل چاہا وہ کسی پتنگ کی مانند دور تک اڑتی چلی جائے۔

زندگی میں ہمیشہ تاریکی نہیں ہوتی۔ روشنی ہر ایک کی قسمت میں ہوتی ہے ہر ایک کے حصے کی ہوتی ہے صرف اسے ڈھونڈنا پڑتا ہے جیسے وردہ! جس نے اپنی حصے کی کی تاریکی کو ہی کافی سمجھ لیا تھا۔ مگر یہ بلال احمد تھے جو اس کے حصے کی روشنی کو ڈھونڈ لائے تھے۔

جب اسے لگا تھا کہ چاروں طرف صرف اندھیرا تھا یا پھانسی کا لٹکتا پھندا تو وہ آگئے تھے اس کا ہاتھ تھام کر اسے زندگی کا وہ رخ دکھانے کے لیے جو آج سے پہلے اوجھل تھا۔

وہ اسے باعزت طور پر اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتے تھے اور اس درخواست کو اس کے سامنے رکھتے ہوئے انہوں نے صرف یہی کہا تھا۔

"میری ڈگریاں اور علم ناقص رہ گیا وردہ! اور تم جیت گئیں۔ تمہارا نظریہ کتنا سادہ اور سچا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ اگر زندگی میں انسان ایک باکردار عورت کو نہ اپنا سکے تو وہ خام ہے اور اگر اپنائی ہوئی عورت کی شناخت نہ کرسکے تو اس کا سارا علم بے کار۔"

اور اس نے ہاں کردی۔ اس کے سوا کوئی راستہ بھی تو نہ تھا۔ ایک اچھا انسان اسے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا تھا تو وہ کس برتے پہ انکار کرتی۔

☼ ☼ ☼

بڑا جانا پہچانا اور خوب صورت منظر تھا۔ بلال ناشتے کی ٹیبل پہ تھے اور وردہ جلدی جلدی انہیں ناشتا سرو کر رہی تھی۔

"آخر اتنی جلدی کس بات کی ہے تمہیں؟ بیٹھ جاؤ میرے سامنے۔" انہوں نے اسے ڈپٹا تھا۔ وردہ نے چمکتی آنکھوں سے مسکرا کر انہیں دیکھا۔ اس نفیس انسان نے وردہ کا جسم ہی نہیں روح بھی سیراب کردی تھی۔ وہ ان کے سامنے ٹک گئی۔

"آپ جلدی گھر آجایا کریں۔"

"کیوں بھئی؟"

"میں اکیلے رہتے رہتے تھک جاتی ہوں۔"

"تو مووی دیکھا کرو۔ بکس پڑھا کرو۔" وہ بظاہر بڑی سنجیدگی سے کہہ رہے تھے مگر دو ہونٹوں پہ شرارت نمایاں تھی۔

"مجھے دلچسپی نہیں ہے ان میں۔" اس نے ننھی سی ناک سکوڑی۔

"تو اپنی فیملی بنانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ بڑے جانے پہچانے سے سوالات تھے اور جوابات بھی۔ وردہ بے اختیار شرمائی۔ بلال کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ یہ لڑکی کتنی انمول تھی کاش کوئی ان کے دل سے پوچھتا۔

"تو پھر ٹھیک ہے شام میں میں جلد آجاؤں گا۔" وہ بولے۔

"مجھے کنفیوز مت کریں نا۔" اس نے احتجاج کیا تھا۔

وہ بے ساختہ کھلکھلا دیے۔

"اوکے جناب نہیں کرتا۔" انہوں نے ہاتھ اٹھا دیے۔ ناشتا ہوچکا تھا، جبھی وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ آگے بڑھ کر انہیں کوٹ پہنانے لگی۔ گزشتہ چند ماہ میں اس میں انقلابی تبدیلیاں آئی تھیں اور اس کا کریڈٹ سراسر بلال احمد کو جاتا تھا اس کی ذات کا اعتماد لوٹانے والے وہی تو تھے۔

جنہوں نے اسے اس کے ہونے کا مان بخشا تھا۔ وردہ نے مسکرا کر انہیں دیکھا اور انہیں چھوڑنے پورٹیکو تک چلی آئی۔

"اپنا خیال رکھیے گا۔ فی امان اللہ۔" وہ آہستگی سے بولی۔

انہوں نے اس کے شانے کے گرد ہاتھ پھیلا کر اسے نزدیک کرلیا پھر دھیرے سے پیشانی کو چھوا اور ہم سا ہولے تھے۔

"جزاک اللہ۔" وردہ کے اندر ٹھنڈک سی اتر آئی۔ ان کی گاڑی گیٹ سے نکلنے تک وہ وہیں کھڑی رہی پھر واپس پلٹ آئی۔ اس کا گھر اس کا آشیانہ اس کا منتظر تھا اس کے بااعتماد قدم کوٹھی کی طرف بڑھ رہے تھے اور اس نے ایک سرسری سی نگاہ بھی کوارٹرز پر نہیں ڈالی تھی جہاں وہ حادثہ اپنی تمام تر تلخ یادیں سمیٹے موجود تھا۔

وہ "وردہ بلال احمد شاہ" تھی۔ جس کی شناخت "مسز شاہ" تھی۔ اس نے اجمل کو مقدر سمجھا تھا جبکہ وہ تو صرف آزمائش تھا اس کا مقدر تو بڑا چمکدار تھا بالکل بلال کی آنکھوں کی مانند۔۔۔!

خدا کا قانون بڑا واضح ہے
"پاک باز عورتوں کے لیے پاک باز مرد۔"
اور کس میں ہمت ہے جو اس رب کائنات کے فیصلے کو چیلنج کرسکے۔ وہ بھی اللہ کا ایسا ہی ایک فیصلہ ہے۔

☼ ☼

گلابی جاڑوں کا جھٹپٹا تھا اور لوگ ابھی تک آغوش خواب میں ہی تھے سرد ہوا نے ہر ذی نفس کو ٹھٹھرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ گرم گرم بستر چھوڑنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا اور یہی وقت تھا نفس کے امتحان کا۔

اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے گرم بستروں کو چھوڑ کر اس کی بارگاہ میں حاضر ہونے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ مائیں' بچوں کو اسکول بھیجنے کے لیے اٹھی تھیں۔ انہیں دنیاوی کامیابی کی فکر تھی' آخرت کی نہیں۔ اسی چکر میں وہ اپنی نمازوں سے بھی غافل تھیں۔ معصوم بچے روتے بسورتے ماں کی ڈانٹ کھا کر اپنے بستروں سے نکل آئے۔

عبداللہ اذان دینے کے بعد منبر سے اتر آیا۔ یہ مسجد بستی سے کچھ باہر تھی۔ آس پاس آباد جھونپڑیوں کے رہنے والوں کے دم قدم سے یہ آباد مسجد پانچ وقت نمازیوں سے بھر جاتی تھی۔ عبداللہ خوب صورت جوان آدمی تھا۔ جس وقت وہ مسجد کے مینار پر کھڑا ہو کر لحن داؤدی میں اللہ اکبر کی آواز بلند کرتا تو اس کی آواز سے راہ چلتے بھی رک جاتے۔ درختوں پر اللہ کی حمد و ثنا کرتے پرندے بھی جھوم جھوم جاتے۔

فجر کی نماز کے بعد کچھ دیر عبداللہ چھوٹا سا درس دیتا' جو بستی کے لوگ ذوق و شوق سے سنتے اور کوشش کرتے کہ اس پر عمل بھی کریں۔ عبداللہ کہہ رہا تھا۔

"اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کہو میں تو اپنے رب کو پکارتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔ کیونکہ میں تم لوگوں کے لیے نہ کسی نقصان کا اختیار رکھتا ہوں' نہ کسی بھلائی کا' کہو مجھے اللہ کی گرفت سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ اور نہ میں اس کے دامن کے سوا کوئی جائے پناہ پا سکتا ہوں۔ میرا کام اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ کی بات اور اس کے پیغامات پہنچا دوں۔" (سورہ جن)

عبداللہ اس بستی کے لوگوں کی طرح ہی نادار تھا۔ اس کی خواہشات بھی محدود تھیں۔ اس کی صالح عادات اور دلکش آواز کے سب ہی معترف تھے۔ بستی کے لوگ اپنی محبت کا اظہار اپنی حیثیت کے مطابق کرتے اور کچھ نہ کچھ عقیدت و احترام سے عبداللہ کی نذر کر دیتے۔ جس سے اس کا کاروبار زندگی چل رہا تھا۔

انسان کے اندر قدرت نے فطری خواہشات بھی رکھی ہیں۔ عبداللہ اپنی زندگی سے مطمئن تھا۔ اپنی مفلسی کا خیال کر کے اس نے کبھی امیرانہ ٹھاٹ باٹ کی تمنا نہیں کی۔ وہ اپنے حال میں خوش و مطمئن تھا۔ وہ شادی کر کے اپنی زندگی کو سنت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مطابق گزارنا چاہتا تھا۔

مسجد کے قریب ہی ایک گھر میں نجیب احمد اپنی بیٹی اور بیوی کے ہمراہ رہائش پذیر تھے۔ نجیب احمد پانچ وقت نماز کے لیے مسجد جاتے تو عبداللہ سے بھی کچھ دیر بیٹھ کر بات ضرور کرتے۔ انہیں یہ نوجوان بہت اچھا لگتا تھا۔ سادہ مزاج' پر خلوص سا' وہ سوچتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں بیٹا دیا ہوتا تو یقیناً "عبداللہ جیسا ہی ہوتا۔ پھر ایک خیال نے انہیں چونکا دیا۔ اپنی بیٹی کے لیے انہیں عبداللہ سے بہتر کوئی اور انسان نہیں مل سکتا تھا۔ اور اس بات کا اظہار انہوں نے ایک دن عبداللہ کے سامنے کر بھی دیا۔

"میں آپ کی بیٹی کو دنیاوی عیش و آرام نہیں دے سکتا۔ میرے حالات آپ کے سامنے ہیں۔" اس نے ندامت سے کہا۔

"بیٹا میں جانتا ہوں اور مجھ سے بہتر تم جانتے ہو کہ دنیاوی کامیابی چند روزہ ہے' اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے۔ اور تم میری بیٹی کو سنوار دو گے۔ میری تم سے بس اتنی ہی استدعا ہے۔" عبداللہ نے مسکرا کر سر تسلیم خم کر دیا۔ چنانچہ ایک مبارک گھڑی میں دونوں کا

نکاح ہو گیا۔ بیوی کی موجودگی میں وہ مسجد کے حجرہ میں قیام نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا ساس سسر کے اصرار پر ان کے گھر میں آبسا۔

سارہ حسن و جمال میں یکتا تھی۔ اور اسے اس کا احساس بھی تھا۔ شادی سے پہلے وہ سادہ زندگی گزارتی تھی کہ والدین نے کہہ رکھا تھا بناؤ سنگھار کے سارے شوق شادی کے بعد پورے کرنا۔ اسے اچھے کپڑوں' زیورات کا بے حد شوق تھا۔ اور شادی کے بعد وہ اپنے

سارے شوق پورے کرنا چاہتی تھی۔ اس کے شوق کی تکمیل نے عبداللہ کو پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ عبداللہ بساط بھر محنت کرتا اور جو کچھ کماتا سارہ کے ہاتھ پر لا دھرتا۔ مگر اس کے چند روپوں سے سارہ کی امیدیں اور آرزوئیں پوری نہیں ہوتیں اور اس کے جواب میں روز گھر میں بدمزگی ہوتی۔ اور "اور" اور کی خواہش نے سارہ کو بے چین اور عبداللہ کو بے قرار کر دیا تھا۔ وہ دنیا کمانے کے چکر میں مسجد میں اپنی خدمات مکمل طور پر ادا نہیں کر پا رہا تھا۔ اس دوری سے اسے یہ فائدہ ہوا کہ وہ گھر میں وہ تمام چیزیں لے آیا جن کی سارہ خواہش مند تھی۔

آج وہ بہت دنوں بعد مسجد آیا تھا۔ مسجد میں کوئی موذن مقرر نہیں تھا۔ بستی کا ہی کوئی نیک بندہ اذان کے وقت اذان دے کر جماعت کروا دیتا۔ آج عبداللہ بازار سے جلدی آ گیا تھا۔ لہٰذا عصر کی نماز کے بعد ہونے والے درس میں شامل ہو گیا۔ وہ نیک بندہ حدیث قدسی بیان کر رہا تھا۔

"اے ابن آدم! ایک تیری چاہت ہے ایک میری چاہت ہے، ہو گا وہی جو میری چاہت ہے، بس اگر تو نے سپرد کر دیا خود کو اس کے جو میری چاہت ہے تو میں تجھے بخش دوں گا وہ بھی جو تیری چاہت ہے، اگر تو نے نافرمانی کی اس کی جو میری چاہت ہے تو میں تھکا دوں گا تجھ کو اس میں جو تیری چاہت ہے پس ہو گا وہی جو میری چاہت ہے۔"

عبداللہ کو کچھ ضروری کام کرنے تھے۔ اس لیے وہ اس کی تفسیر سننے کے لیے مسجد میں نہیں بیٹھا اور اٹھ کر گھر چلا گیا۔ گھر میں آسودگی تو آ گئی تھی، مگر سکون رخصت ہو گیا تھا۔ قناعت کی جگہ حرص و ہوس نے لے لی تھی۔ اب صرف دولت کی ہوس اور دنیا کی وابستگیوں نے عبداللہ کو بھی دنیا کا بندہ بنا دیا تھا۔ اللہ کا بندہ دنیا کا بندہ ہو کر رہ گیا تھا۔

دولت کبھی کسی کا ساتھ نہیں دیتی۔ وہ آج کسی کے پاس ہے، کل کسی اور کے پاس، یہی حالت عبداللہ کے ساتھ [illegible] بکے بعد، بکرے ہونے والے نقصان نے [illegible] کو ہی پریشان کر دیا۔ آہستہ آہستہ [illegible] بچے نہیں، وہ حوصلہ جو تنکا تنکا جوڑ کر بنایا تھا [illegible] نے لگا۔ پریشانیوں نے عبداللہ کو بیمار کر دیا جو تھوڑے بہت روپے بچے تھے وہ بھی اس کی بیماری پر خرچ ہو گئے۔ مرض بڑھتا گیا، جوں جوں دوا کی کے مصداق مفلسی نے پھر ڈیرہ جما لیا۔

سارہ اس ساری صورت حال سے پہلے ہی چڑچڑی ہو رہی تھی۔ عبداللہ کی بیماری نے اسے بہت ہی دلبرداشتہ کر دیا۔

عبداللہ صبح سے بخار میں پھنک رہا تھا۔ غنودگی نے اسے دنیا و مافیہا سے غافل کر رکھا تھا۔ کچھ لمحے پہلے ہی اسے کچھ ہوش آیا تھا ہوش میں آتے ہی اس نے سارہ سے پوچھا تھا۔

"آج کیا دن ہے؟"

"اونہہ مجھے کیا معلوم۔ تم اب اتنے بھی بیمار نہیں کہ تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ کیا دن ہے۔" سارہ نے جل کر جواب دیا۔

"اچھا الجھتی کیوں ہو، یہ بیماری بھی اللہ کی طرف سے ہے۔ شفا بھی وہی دینے والا ہے۔ اور سچ پوچھو تو مجھے اپنی بیماری کی وجہ سمجھ میں آ رہی ہے، میرے اعمال کا پھل ہے جو مجھے مل رہا ہے۔ ناشکری اور بے ایمانی بھی میٹھا پھل نہیں دیتی۔ میں جانتا تھا کہ تباہی ہے 'ان نماز پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں' پھر بھی میں نے نماز سے غفلت برتی۔ میں جانتا تھا کہ رب کہہ رہا ہے۔"

"یہ تمہارا کیا حال ہے کہ ہر اونچے مقام پر لاحاصل ایک یادگار عمارت بنا ڈالتے ہو اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو گویا تمہیں ہمیشہ یہاں رہنا ہے۔"

"اور پھر بھی میں پکے مکانوں کی جستجو میں لگ گیا۔ حالانکہ میں جانتا ہوں چند فٹ زمین کا ٹکڑا میرا آخری ٹھکانہ ہے، پھر بھی۔" عبداللہ تاسف سے کہہ رہا تھا اور لڑکھڑاتا ہوا مسجد کی طرف جانے والے راستے پر بڑھ گیا۔

"نہیں بھٹک گیا تھا چند لمحوں کے لیے، مگر ابھی دیر نہیں ہوئی، میں اپنے رب سے معافی مانگ لوں گا۔ میں اپنے رب کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں۔" بخار سے تپتے جسم کو وضو کرنے سے کچھ سکون ملا تھا۔ ایک آگ جو اندر اور باہر لگی ہوئی تھی، کچھ لمحوں کے لیے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ وہ کچھ شانت سا مسجد کی طرف بڑھ گیا۔

عبداللہ کی واپسی کی خبر ساری بستی میں آناً فاناً میں پھیل گئی۔ نماز کا وقت ہوا۔ عبداللہ کو محسوس ہوا جیسے کوئی غیبی طاقت اس کے جسم میں داخل ہو گئی ہے، اس کو اپنا آپ بہت اچھا لگا، بالکل ہلکا پھلکا تو وہ اس مقام پر جا کھڑا ہوا، جہاں کھڑے ہو کر وہ کبھی اذان دیا کرتا تھا، گو قدم ڈگمگا رہے تھے، بیماری کی وجہ سے ٹھیک طرح کھڑا بھی نہیں ہوا جاتا تھا، لیکن ایک شوق تھا جو اسے اس حالت میں سہارا دے رہا تھا۔

"پھر تباہی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں۔" یہ سورۃ یاد آئی اور اس کے آنسو بہہ نکلے۔ اس نے پوری طاقت کے ساتھ اپنی پرسوز آواز میں اللہ اکبر بلند کیا۔ بستی میں ہلچل مچ گئی اور آن کی آن میں خانہ خدا میں وہی پہلی سی رونق نظر آنے لگی۔ عبداللہ نے نماز پڑھنے کے بعد سجدے سے سر نہیں اٹھایا۔ جب لوگ اسے اٹھانے کے لیے آگے بڑھے تو اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک نور تھا اور ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم، قدرت کاملہ نے اسے اپنی آغوش رحمت میں لے لیا تھا۔

وہ سجدہ روح زمین جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

☼ ☼

ضرب ضمیر
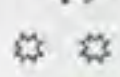
"السلام علیکم!" وہ دن کے سوا چار بجے آن لائن ہوئی تھی۔ فاخر بے اختیار مسکرا دیا۔
"وعلیکم السلام! کیسی ہو؟" مضبوط مردانہ ہاتھوں کی انگلیاں کی بورڈ پہ تھرکنے لگیں۔
"میں بالکل ٹھیک ' آپ کیسے ہیں؟" نپا تلا جواب محتاط انداز سے بھرپور تھا۔
"میں کیسا ہو سکتا ہوں تمہارے خیال میں؟" گفتگو کو طول دینے کے ہنر سے بخوبی واقف فاخر اسے باتوں سے گھیرنا شروع کر چکا تھا۔ نئی نئی چڑیاؤں کی ڈری سہمی اڑان اسے محظوظ کرتی تھی۔
"باتوں سے تو ٹھیک ٹھاک لگتے ہیں۔" رخسار نے جواب ٹائپ کر کے انٹر پریس کیا۔
"میں دیکھنے میں بھی خاصا ٹھیک ٹھاک لگتا ہوں ' پھر کیا خیال ہے؟" فاخر نے شرارت سے جواب لکھا۔
"دکھ رہا ہیں نہیں۔ محض لگتے ہیں۔" رخسار نے نچلے لب کے کنارے کو شرارتاً دانتوں تلے دبایا۔ فاخر کی چیٹ ونڈو پہ ظاہر ہوتے اس پیغام نے اسے کھل کر مسکرانے پہ مجبور کر دیا۔
"تو جناب ہم پر یہ بھی واضح ہو گیا کہ محترمہ سیمیں رخسار حس مزاح بھی رکھتی ہیں۔"
"کوئی شک؟" فوراً اتراتا ہوا جواب موصول ہوا۔
"نہیں! خاکسار کی یہ مجال کہ شک ہو سکتی ہے؟"
"خاکسار کی یہ مجال ہونی بھی نہیں چاہیے۔" دھونس بھرا جملہ۔ فاخر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ فاخر اسے اپنے رنگ پہ لا رہا تھا رفتہ رفتہ۔
"آپ کا حکم سر آنکھوں پہ۔" وہ آرام سے جیسے باتوں کے جال بننے لگا۔
"اچھا بات سنو۔" فاخر نے ٹائپ کیا ' لیکن اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ لکھتا ' چیٹ ونڈو پہ رخسار کا پیغام آیا۔
"میں نہیں سنوں گی۔"
"کیوں؟" وہ حیران ہوا۔
"کیونکہ مجھے آواز نہیں آ رہی نا ' صرف آپ کے پیغامات مل رہے ہیں۔" رخسار نے شرارت سے ٹائپ کیا۔
"ہاہاہا۔" وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔
"شکر ہے ' ورنہ میں سمجھا میری کوئی بات بری لگی اور تم خفا ہو گئیں۔" اس نے جواب بھیجا۔
"اچھی بے وقوفی ہے۔" رخسار محظوظ ہوئی۔
"اس میں بے وقوفی کی کیا بات ہے؟"
"بے وقوفی نہیں تو اور کیا ہے؟ آج پہلی مرتبہ ہماری بات ہو رہی ہے۔ میں بھلا کیوں خفا ہونے لگی۔ اجنبیوں کو اتنا فری نہیں کرواتی میں۔" وہ آخر میں شریر ہوئی تھی۔
"اجنبیوں کو نہیں کرواتیں نا ' میں تو شناساؤں کی فہرست میں شمار ہوتا ہوں۔" وہ بھی شوخی سے ٹائپ کر گیا۔
"حصار خوش فہمی سے نکل آیئے ' اور وہ سنائیے ' ابھی کہہ رہے تھے۔" رخسار نے بات کا پینترا پلٹ دیا۔
"اوکے ' اپنے بارے میں بتاؤ مجھے۔" فاخر نے اشتیاق بھرا سوال کیا۔

"اپنے بارے میں کیا بتاؤں ' بے سک انفارمیشن تو وفائل میں لکھی ہے۔" رخسار نے ٹائپ کر کے انٹر پریس کیا۔
"نہیں وہ نہیں یار ' رئیل نیم بتاؤ اپنا۔" فاخر نے اس کی بات نظر انداز کر دی۔ انگلیاں کھٹا کھٹ کی بورڈ پہ چل رہی تھیں۔
فیس بک اکاؤنٹس زیادہ تر فیک نیم سے بنائے جاتے ہیں اور ایک شخص ایک سے زیادہ اکاؤنٹس رکھ سکتا ہے۔ جیسے فاخر کے بھی دو اکاؤنٹس تھے ' ایک پرنس توقیر کے نام سے اور دوسرا فاخر توقیر کے نام سے۔ پروفیشنل یوز کے لیے فاخر توقیر کے نام اکاؤنٹ استعمال کرتا اور پرنس توقیر کا اکاؤنٹ محض دل پشوری کے لیے تھا۔ اور پرنس توقیر کے اکاؤنٹ میں سیمیں رخسار ایڈ تھی۔
"سیمیں رخسار نام ہے میرا۔" اس کا پیغام ملا۔ فاخر جانتا تھا کہ وہ غلط بیانی کر رہی ہے ' لیکن اس نے مزید

کچھ کہنے سے احتراز برتا۔

"خاصا Triditional نام ہے۔" اس نے رائے دی۔

"مطلب کیا ہے اس کا؟" وہ مزید ٹائپ کر رہا تھا۔

"چاندنی جیسے گالوں والی۔" رخسار نے جواب لکھا۔

"سچ میں؟"

"کیا سچ میں؟"

"میرا مطلب سچ میں تم چاندنی جیسے گالوں والی ہو' اگر ایسا ہے پھر تو میں تمہیں ضرور دیکھنا چاہوں گا' بولو کب ملو گی؟"

"کبھی نہیں۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ میں چاندنی جیسے گالوں والی نہیں ہوں۔"

"پھر تمہارا نام بھی تمہیں رخسار نہیں ہے۔" وثوق بھرا جواب فاخر نے بھیجا تھا۔ اگلی طرف سے دس پندرہ سیکنڈز تک کوئی جواب نہیں ملا۔ ظاہری بات ہے جواب کس بات کا آتا' فاخر نے سوال کیا تھا نہ ہی قیاس آرائی۔ اس کے لہجے میں یقین تھا جو رخسار کو لاجواب کر گیا' سو وہ جواب دینے سے گریزاں تھی۔

"رخ!" فاخر نے اسے مخاطب کیا۔

"جی!" فوراً جواب ملا۔

"جھوٹ بول رہی ہو؟" وہ رخسار کو بالکل ننھے منے نرم ملائم چوزے کی طرح پچکار رہا تھا' پھسلا رہا تھا' وہ صرف ایک لمحے کو پشیمان ہوئی کہ اس کا جھوٹ پکڑا گیا' لیکن اگلے ہی پل وہ اپنی جون میں لوٹ گئی۔

"ہاں!" رخسار نے اعتراف کیا۔

"تمہیں مجھ پہ بھروسا نہیں؟"

"نہیں۔"

"اب میں دوبارہ نہیں پوچھوں گا' جب تمہیں مجھ پر اعتبار آجائے تو خود بتا دینا' اوکے؟" وہ مفاہمت اختیار کر رہا تھا۔ وہ نئی تھی فاخر کے لیے' فاخر اسے کسی نہ کسی طرح اپنی راہ پہ لے ہی آتا' لیکن اس کے لیے پہلے رخسار کی ماننی پڑے گی' پھر ہی فاخر اپنی منوانے کی

پوزیشن میں آئے گا۔

"ٹھیک ہے؟" وہ اس کی رضامندی چاہ رہا تھا۔

"اوکے!" وہ راضی تھی۔

"اب میں جا رہی ہوں۔" اس کا پیغام ملا تو فاخر نے بھی گھڑی دیکھی' پونے پانچ ہو رہے تھے۔ وہ عموماً پانچ بجے آفس سے اٹھ جاتا تھا۔ اسے بھی گھر کی راہ لینے کا خیال آیا۔

"ٹھیک ہے' پھر کب آؤ گی؟" وہ گپ شپ کا وقت طے کرنا چاہ رہا تھا۔

"کیوں پوچھ رہے ہو؟" سوال کا جواب سوال میں ملا اور فاخر بھنا اٹھا۔ اس کی سرد مہری کا خول بھلا اتنا سخت کیوں ہے۔

"احمق ہوں' اس لیے پوچھ رہا ہوں۔" آنچ دیتا جملہ رخسار کو محظوظ کر گیا' وہ کھلکھلا کے ہنسی۔

"اوکے۔"

"بتاؤ نا۔" وہ پھر سوالیہ ہوا۔

"کیا؟" وہ انجان بنی۔

"کب آؤ گی؟"

"آپ انتظار کریں گے؟"

"کچھ باتیں کہے بغیر سمجھنے کی ہوتی ہیں' اب کیا ہر بات میں کہوں گا تب تمہیں سمجھ آئے گا۔" اس نے تیزی سے انگلیاں چلائیں۔

"میں جا رہی ہوں' جب فرصت ملے گی تب آؤں گی' اوکے۔" دوسری جانب رخسار کی انگلیاں بھی کی بورڈ پہ رقصاں تھیں۔

"فرصت کب ملے گی؟" فوراً پیغام آیا۔

"کل۔"

"کل کیوں؟ رات میں آن لائن نہیں آسکتیں؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"بھائی گھر پہ ہوتے ہیں' ان کے سامنے نیٹ یوز نہیں کرتی۔" اس نے اپنی مجبوری بیان کر دی۔

"اوہ! یعنی تمہارا بھائی بھی ہے۔ چلو ایک بات تمہارے متعلق معلوم ہوئی' وہ بھی بالکل سچ' ہے نا؟"

وہ ابھی بھی مشکوک تھا' رخسار مسکرا دی۔

"ہاں! بالکل سچ! ابھی بھائی کے آنے کا وقت ہے' میں چلوں' اللہ حافظ!" وہ الوداعی کلمات کہتی آف لائن ہو گئی اور فاخر مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

فاخر یقین سے نہیں جانتا تھا کہ سیمیں رخسار کے نام سے ظاہر ہونے والا یہ فیس بک اکاؤنٹ کسی لڑکی کا تھا یا لڑکے کا۔ لیکن وہ انٹرنیٹ کی دنیا کا پرانا کھلاڑی تھا۔ اس نے سیمیں رخسار کے انداز تخن سے بھانپ لیا کہ وہ لڑکی ہی ہے اور لڑکی بھی وہ جو ابھی ابھی انٹرنیٹ کی دنیا میں لینڈ ہوئی ہے اور جو بہت معصوم بھی ہے اور فلرٹ کرنے کے لیے نہایت موزوں بھی۔

ابھی ہفتہ بھر پہلے کی بات جب وہ اسے مشغل میلے کے پیج پہ ملی تھی۔ فاخر کی توجہ اس کی پروفائل پکچر نے اپنی طرف مبذول کروائی تھی کہ وہ کوئی ماڈل کی تصویر تھی لیکن بے انتہا دل لبھاتی تصویر نے فاخر کو خوامخواہ ہی اس کی پروفائل میں جانے پر مجبور کر دیا۔ سرمئی آنکھوں میں حزن و یاس کا سرخ سرمہ لگائے وہ گلابی رنگت کی لڑکی ادھ کھلے لبوں کے ساتھ کہی جانے والے کو روکنے کے لیے بے تاب سی کھڑی تھی۔ فاخر بلا ارادہ اس کے پروفائل میں گیا تھا۔ وہاں اسے اندازہ ہوا کہ اکاؤنٹ بالکل فریش ہے اور فرینڈ لسٹ میں بھی چند ایک فرینڈز تھے۔ فاخر نے بے وجہ ہی دوستی کی درخواست روانہ کر دی۔ سوئے نصیب اس کی درخواست سیمیں رخسار نے منظور کر لی۔ چند ایک پیغامات پر سلام کلام کا تکلف نبھایا گیا اور اس کے بعد پہلی باضابطہ چیٹنگ تھی جو ان دونوں کے درمیان ہوئی۔

☼ ☼ ☼

گزشتہ ایک ہفتے کے معمول کے مطابق چار بجے تھے اور فاخر ساری فائلیں کنارے کر کے فیس بک آن کر بیٹھا تھا۔ حسب توقع وہ چار بجے ہی چلی آئی۔

"کیسی ہو رخ؟" فاخر نے گفتگو میں پہل کی۔

"اچھی ہوں' جانتے تو ہیں آپ۔" رخسار کے جواب میں شرارت کا عنصر تھا۔

"بالکل! اور سناؤ کیا ہو رہا تھا۔" سلسلہ کلام آگے بڑھا۔

"کچھ خاص نہیں' بس وہی روٹین کی لائف ہے۔" رخسار کا پیغام چیٹ ونڈو پہ ظاہر ہوا۔

"اور روٹین کیا ہے تمہاری؟" فاخر نے ٹائپ کیا۔

"وہی جو لڑکیوں کی ہوتی ہے۔"

"پڑھتی ہو؟"

"نہیں BSC کیا' پھر اسٹاپ کر دی پڑھائی۔"

"کیوں؟"

"بھائی نے کہا لڑکیوں کے لیے گریجویشن کافی ہے۔"

"اوہ! پھر کیا کرتی ہو سارا دن؟"

"کچھ بھی نہیں۔" وہ اکتا سی گئی اس موضوع سے' فاخر سمجھ گیا۔

"کمال کرتی ہو۔" فاخر نے مضحکہ اڑایا۔

"بس کبھی غور نہیں کیا۔" اس نے مصنوعی کالر اکڑائے۔

"کرنا بھی مت' ورنہ نظر لگ جائے گی۔" وہ بھی شریر ہوا۔

"اور کچھ؟" وہ تابعداری سے بھرپور جواب دے گئی۔

"نہیں فی الحال اتنا ہی۔"

"اپنے بارے میں بھی کچھ بتائیں آپ؟" رخسار نے پیغام ٹائپ کر کے انٹر پریس کیا۔

"شکر ہے تمہیں مجھ میں دلچسپی تو ہوئی۔ ورنہ اب تک مجھے لگ رہا تھا میں خوامخواہ گمبل ہو رہا ہوں اور تم لفٹ ہی نہیں دے رہیں۔" وہ کھٹاکھٹ کی بورڈ پہ انگلیاں چلا رہا تھا اور چہرے پہ کھلتی شرارتی مسکان اس کی سرشاری کا پتا دے رہی تھی۔

"آپ کو لگتا ہے میں آپ میں دلچسپی لے رہی ہوں؟" رخسار بے اختیار ہنس پڑی۔

"ہاں!" ایک لفظی پروثوق جواب آیا تھا۔ وہ چپکی رہ گئی۔ ظاہر سی بات ہے فاخر اور رخسار کی پچھلے چھ

دنوں میں روز بات ہوتی رہی تھی تو دلچسپی سے انکار کیا۔

"چھوڑیں اس بات کو' اب مجھے اپنے اور اپنی فیملی کے بارے میں بتائیں۔" رخسار نے پہلو تہی کی۔ اس سوال کا جواب وہ خود کو بھی نہیں دینا چاہتی تھی۔

"فیملی تو چھوٹی سی ہے میری' ایک سسٹر ہے' مما' پپا اور مجھ سمیت کل چار لوگ ہیں۔ میں نے MBA کر رکھا ہے۔ ذریعہ معاش اپنا کاروبار ہے۔" فاخر نے مختصراً" اپنے بارے میں بتایا۔

"ویری نائس۔" رخسار نے ٹائپ کیا۔

"کون؟ میں؟" وہ جان کر اسے چھیڑ رہا تھا۔

"یہ ہی سمجھ لیں۔" وہ مسکرائی۔

"میں بہت کچھ سمجھنا چاہتا ہوں' شرط یہ ہے کہ تم سمجھاؤ۔" وہ ہنوز متبسم تھا۔

"مثلاً"؟" رخسار بھی اس بے معنی و بے کار گفتگو سے لطف اندوز ہونے لگی۔

"کہہ دوں؟ خفا تو نہیں ہو گی؟" ذو معنی جملہ رخسار کی چیٹ ونڈو میں ظاہر ہوا۔

"میں بہت سخت ناراض ہو جاؤں گی اگر آپ نے کوئی بے کار بات کی تو۔" رخسار کا بے تکلفی سے کہا گیا دھونس بھرا جملہ فاخر کو جی بھر کے محظوظ کر گیا۔ وہ اسے اپنے راستے پہ لا رہا تھا اور وہ آنکھیں بند کیے نکل بھی پڑی تھی۔

"تمہیں خفا کر کے میں نے جان سے نہیں جانا' میری جان۔" وہ قدرے بے باک تھا۔

"میں سچ میں ناراض ہو جاؤں گی تو پھر۔" وہ اس کے طرز تخاطب پہ بگڑی تھی۔

"اوکے بابا سوری۔" وہ واپس لائن پہ آیا۔

"اچھا سنو۔" فاخر نے ٹائپ کیا۔

"سنائیے۔ شرط یہ ہے کہ صرف سنائیے۔" وہ اس کی ٹانگ کھینچ رہی تھی۔

"تم مجھے سننا چاہتی ہو؟" وہ غالباً" سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"میں نے یہ کہا ہے آپ سے؟" وہ الٹا سوال پوچھنے لگی۔

"نہیں! لیکن مجھے لگا جیسے تم یہ کہنا چاہتی ہو۔"

"تو؟" رخسار نے بے زاری سے شانے اچکائے تھے۔ اس تو کے جواب میں فاخر نے اپنی نئی سم کا نمبر ٹائپ کر کے بھیجا۔ وہ عموماً" لڑکیوں سے اسی نمبر سے بات کیا کرتا تھا۔ اور یہ نمبر کسی کے پاس نہیں تھا۔

"یہ میرا سیل نمبر ہے' اسے اپنے پاس محفوظ کر لو۔ جب میری آواز سننا چاہو' میسج کر دینا میں خود کال کر لوں گا۔" وہ بہت آگے کی طے کر رہا تھا۔ جب رخسار کی بات اسے زمین پر واپس لے آئی۔

"میرے پاس سیل فون نہیں ہے۔" اس نے سیدھے لفظوں میں جواب دیا۔

"جھوٹ۔" وہ ماننے کو تیار نہیں تھا۔

"نہیں' سچ کہہ رہی ہوں' میں پرسنل سیل نہیں رکھتی۔ مما کے پاس ہے' مجھے ضرورت پڑتی ہے تو ان سے ہی لے لیتی ہوں' لیکن اس صورت حال میں آپ سے سیل پہ رابطہ نہیں رکھا جا سکتا۔ سمجھ رہے ہیں نا۔" وہ وضاحتیں دے رہی تھی۔

"تو تمہارے پاس پرسنل سیل کیوں نہیں ہے؟"

"ارے بابا! گھر پہ ہی تو ہوتی ہوں سارا دن' الگ سے سیل رکھ کر کیا کروں گی۔ پہلے تھا میرے پاس' پھر بھائی نے لے لیا کہ مما کا ہی یوز کر لیا کرو۔"

"اوکے۔" وہ مزید کوئی جرح کرنے سے باز رہا۔

"اب میں چلوں؟ بھائی کے آنے کا وقت ہے۔" وہ اجازت طلب کر رہی تھی۔

"تمہارا بھائی تمہیں نیٹ یوز کرنے سے منع کرتا ہے۔"

"اب تک انہیں معلوم ہی نہیں ہے کہ میں فیس بک یوز کرتی ہوں۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔" وہ حیران ہوا۔

"ارے بھائی! میں ان کی غیر موجودگی میں استعمال کرتی ہوں۔ ویسے بھی پی سی بھائی کے روم میں ہے' ان کی موجودگی میں آن لائن ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہو گا۔" اس کا پیغام چیٹ ونڈو پہ ابھرا اور فاخر کو غصہ آگیا۔

"بھائی نہیں ہوں میں تمہارا آئندہ نہ کہنا۔" وہ خفگی سے ٹائپ کر رہا تھا۔

"تو کیا بھن ہو؟" وہ شریر ہوئی۔

"ہم صرف دوست ہیں' کوئی بلڈ ریلیشن نہیں ہو سکتا ہمارا' ہاں اگر تم راضی ہو تو کوئی مضبوط رشتہ استوار کیا جا سکتا ہے۔" وہ شوخ ہوا۔

"ہو گئی آپ کی فضول گوئی؟ اب میں جاؤں؟" وہ نہ جانے کیوں خفا ہونے کے بجائے مسکرا رہی تھی۔

"میں روکوں گا تو رک جاؤ گی؟" وہ جانے کیا سننے کا خواہش مند تھا۔

"روک کر دیکھ لیجیے معلوم ہو جائے گا۔" اس کا جملہ بہت ناز بھرا تھا۔ فاخر مسکرا دیا۔

"پھر کبھی فرصت سے دیکھوں گا' تمہارے دل لبھاتے انداز۔" وہ لفظوں سے کھیلنے لگا۔

"ابھی مجھے بھی گھر کے لیے نکلنا ہے' تمہاری باتوں میں پہلے ہی کافی لیٹ ہو گیا ہوں۔" اس نے ٹائپ کیا۔

"میں نے آپ کو پابند تو نہیں کیا؟" رخسار کو برا لگا تھا۔

"میری بدقسمتی ہے یہ کہ تم ابھی تک گریز برت رہی ہو۔" فاخر اس کے گرد سحر باندھ رہا تھا۔

"اللہ حافظ! اپنا خیال رکھیے گا۔" وہ بڑی مشکل سے اس کی باتوں کے جادو سے نکل کر ٹائپ کر پائی۔

"بات تو سنو۔" فاخر نے تیزی سے اسے روکا۔

"کہیے۔" رخسار نے ٹائپ کیا۔

"کل کب آؤ گی؟ میں سارا دن فری رہوں گا' کل سنڈے ہے۔" وہ تیزی سے ٹائپ کر رہا تھا۔

"کل بہت مشکل ہے' سنڈے کو بھائی' مما' سارا دن گھر پہ ہی ہوتے ہیں' ان کی موجودگی میں بہت مشکل ہے۔" رخسار کا جواب فاخر کو تپانے کے لیے کافی تھا۔

"آخر یہ تمہارا بھائی کون سی توپ چیز ہے؟"

"کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟" رخسار الجھی۔

"ہر بات کا ریفرنس تمہارے پاس تمہارا بھائی ہے' بھائی یہ' بھائی وہ' بھائی فلاں' بھائی بے قصائی تو نہیں۔" وہ گستاخانہ لکھتا چلا گیا۔

"تمیز سے بات کیجیے' بھائی کے بارے میں فضول بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ بھی تپ گئی۔

"تمہارا بھائی کوئی دودھ کا دھلا نہیں ہو گا۔ کیا اس کے پاس پرسنل سیل نہیں ہے؟ یا وہ اتنا زاہد و متقی پرہیزگار ہے کہ فیس بک یوز نہیں کرتا۔" رخسار لاجواب ہوئی۔

"تو پھر تم پر اتنی پابندی کیوں؟" رخسار کے ذہن میں باغیانہ خیال کی بوچھاڑ ہونے لگی۔

"جو چیز تمہارے بھائی کے لیے جائز ہے۔ وہ تمہارے لیے شجر ممنوعہ کیوں؟ اور اگر اتنی ہی تمہیں اپنے بھائی کی باتوں کی پروا ہے تو کیوں ان کی لاعلمی میں فیس بک استعمال کرتی ہو۔ کیوں مجھ سے باتیں کرتی ہو؟ اپنے بھائی کے نام نہاد اصولوں کو فالو کیوں نہیں کرتیں جو صرف تم پر لاگو ہونے کے لیے بنائے گئے ہیں۔" وہ کھٹا کھٹ ٹائپ کیے جا رہا تھا۔

"مجھے کہنے دو کہ تمہارا بھائی ایک ڈپلومیٹک آدمی ہے۔"

"رخ!" وہ جواب نہیں دے رہی تھی' فاخر نے اسے مخاطب کیا۔

"رخ!" وہ ہنوز خاموش تھی۔

"رخ! خفا ہو گئی ہو؟" وہ پریشان ہوا' لیکن رخسار اب بھی خاموش تھی۔ چیٹ ونڈو میں صرف فاخر کے پیغامات ظاہر ہو رہے تھے۔ ایک کے بعد ایک' ایک کے بعد ایک۔

"جواب تو دو پلیز!" وہ واقعتاً" بے چین تھا۔ رخسار کی انگلیوں نے بہت آہستگی سے حرکت کی۔

"you hurt me" فقط تین لفظی جملہ ٹائپ کر کے وہ کھٹ سے آف لائن چلی گئی اور فاخر سر پیٹ کر رہ گیا۔

"کیا ضرورت تھی اتنی حق پرستی ظاہر کرنے کی۔ اب وہ مڈل کلاس احمق محبوبہ روٹھ گئی۔ پتا نہیں کتنے نخرے کر کے مانے گی' اف۔" وہ آفس سے نکلتے ہوئے

دل ہی دل میں خود کلامی کیے جارہا تھا۔
"دھت تیرے!"

راہ پر ان کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں
اور کھل جائیں گی دو چار ملاقاتوں میں

وہ مسکراتے ہوئے کار اسٹارٹ کرنے لگا۔ اس کی نظر میں رخسار ایک آسان شکار تھی، جس کے ساتھ زوردار افیئر چلایا جاسکتا تھا اور فاخر اس سچویشن کو بہت انجوائے کرتا تھا، جیسی یہاں درپیش تھی۔

رخسار نے باتوں باتوں میں اسے بتایا تھا کہ وہ انٹرنیٹ یوز نہیں کرتی تھی۔ ابھی مہینہ بھر پہلے اس نے کوکنگ چینل کی ایک من پسند ریسیپی کے لیے ان کا فیس بک پیج جوائن کرنا چاہا۔ جس کے لیے اسے اپنا فیس بک اکاؤنٹ بنانا پڑا۔ پھر وہ اپنے پسندیدہ کوکنگ شو میں لائیو شامل ہونے لگی، فیس بک کے ذریعے "اتفاق سے یوں ہی وہ شغل میلے کے پیج پر گئی اور وہاں فاخر سے ہائے ہیلو کر بیٹھی، ہائے ہیلو سے بات آگے بڑھی اور وہ اس سے روز باتیں کرنے لگی۔ اس نے گھر والوں پر اپنا یہ شغل شو کرنے کی کوشش نہیں کی تھی" اور دن کے وقت جب فرصت فراغت کے عالم میں وہ فیس بک یوز کرتی تو آف لائن جانے سے پہلے فیس بک ہسٹری ڈیلیٹ کرنا نہیں بھولتی" فاخر بہت آرام سے اسے بغاوت پر اکسانے والا تھا اور جیسے وہ با آسانی فاخر کے دام میں بخوشی چلی آئی تھی، یہ کام بھی بہت مشکل نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کی آنکھ کھلی کمرے میں ہوتی کھٹر پٹر کی آواز سے وہ چند لمحے یوں ہی کسلمندی سے پڑا رہا، پھر آہستگی سے رخ پھیر کر سیدھا ہو بیٹھا۔ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگاتے اس کی نگاہ کھڑکی کے پردے سرکاتی مما پر پڑی۔

"السلام علیکم مما!" وہ جماہی روکنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"وعلیکم السلام! جیتے رہو۔" انہوں نے کارپیٹ پر بکھرے کشنز سمیٹتے ہوئے دعا دی۔

"زوہیب دو مرتبہ کال کرچکا ہے، تمہارا موبائل آف کیوں ہے؟" وہ جو سائیڈ ٹیبل پہ دھرا چائے کا مگ اٹھا کر لبوں سے لگا رہا تھا چونک گیا۔

"موبائل کی چارجنگ ختم تھی مما! شاید آف ہی ہوگیا۔" محض ایک گھونٹ بھر کر وہ عجلت میں کپ واپس رکھتا واش روم میں جا گھسا۔

گھڑی دیکھنے کی اس نے زحمت نہیں کی تھی کیونکہ اسے معلوم تھا ڈھائی تین سے کم نہیں بجے ہوں گے۔ ظاہری بات ہے، صبح پانچ بجے تو وہ سویا تھا، اتنا وقت ہو ہی جانا تھا، اس نے کل ہی زوہیب کو لنچ ساتھ کرنے کا عندیہ دے رکھا تھا۔ دس منٹ میں وہ ایمرجنسی باتھ لے کر باہر نکلا تھا اور پیشانی پہ بکھرے بھیگے بالوں سے ٹپکتے پانی کی پروا کیے بنا وہ جاگرز پاؤں میں ڈال کر تسمے باندھنے لگا، اسی دم دروازے پہ دستک ہوئی۔

"کم آن ان۔" وہ اجازت دیتے ہوئے ڈریسنگ کی جانب بڑھ آیا۔ وہ ڈریسنگ کی دراز کھولے دوسرا سیل فون نکال رہا تھا۔

"فاخر بھائی!" مہر کی آواز پہ وہ سیدھا ہوا اور ہاتھ میں پکڑا سیل فون ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"مجھے.... مجھے کچھ پیسے چاہیے تھے۔" وہ تھوک نگلتی بمشکل مدعا بیان کرپائی۔

"کیوں؟" سوال جواب نہ ہوں ایسا ممکن ہے بھلا؟ وہ اب بھیگے بالوں میں برش چلا رہا تھا، مہر ذرا سا ہچکچائی۔

"وہ میری فرینڈ ہے نا نازش! اس کی برتھ ڈے پارٹی ہے، گفٹ لینا ہے اس کے لیے اور اپنی نئی ڈریس۔" فاخر کی شخصیت کا رعب و دبدبہ ایسا تھا یا نہ جانے مہر بڑے بھائی کے سامنے احتراماً نظریں نہیں اٹھا رہی تھی، جو بھی تھا لیکن مہر کو فاخر سے مدعا بیان کرنا ہمیشہ مشکل لگتا تھا۔ حالانکہ وہ کوئی خوف ناک جلاد قسم کا شخص نہیں تھا۔ اچھی خاصی چارمنگ پرسنالٹی کا مالک اور کیئرنگ نیچر رکھنے والا فاخر نہ جانے کیوں اتنا پُررعب لگتا کہ ہمیشہ سے بالی گرلز کے ساتھ ساتھ مہر بھی اپنے بھائی سے خاطر خواہ فاصلہ رکھنے پر مجبور تھی۔

فاخر نے مزید کچھ کہے بغیر جیب پاکٹ سے والٹ برآمد کیا اور اس میں سے اچھا خاصا اماؤنٹ نکال کر مہر کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"تھینک یو بھائی!" وہ تشکر سے مسکرائی۔ فاخر نے پیار سے اس کے سر پہ ہلکی سی چپت لگائی اور پلٹ کر آف موبائل سے سم نکال کر فل چارجڈ سیل میں لگانے لگا۔ مہر کمرے سے نکل آئی۔

وہ پہلی منزل کی سیڑھیاں اتر رہی تھی جب زوہیب سے سیڑھیوں پہ ہی مڈبھیڑ ہوگئی۔

زوہیب ان کا چچازاد ہونے کے ساتھ فاخر کا بہترین دوست بھی تھا، علاوہ ازیں اس کی نسبت مہر سے طے تھی، لیکن فی الحال مہر اس بات سے ناواقف تھی۔

"السلام علیکم!" وہ اپنے سامنے دھانی رنگ کے پرنٹڈ لباس میں ملبوس نکھری نکھری مہر کو دیکھ کر ٹھہر گیا۔ چہرے پہ بکھری مدھم مسکان سے مہر کے دائیں رخسار پہ بنتا بھنور اس کی توجہ کا مرکز ہوا۔

"وعلیکم السلام! کیسی ہو؟" وہ ہشاش بشاش سا مسکرا رہا تھا۔

"جیسی لگ رہی ہوں۔" وہ شرارت سے کھلکھلائی، وہ بھی ہنس پڑا۔

"دلفریب نرم صبح کی شگفتہ کھلی تازہ کلی کی مانند۔" دل بے اختیار ہوا۔ اس نے کوئی خوب صورت بات کہنے سے خود کو باز رکھا۔ ہر کام کا مناسب وقت ہوتا ہے اور زوہیب کے خالص جذبوں کی رونمائی کا وقت ابھی دور تھا۔ وہ سر پہ ہاتھ پھیر کر خود کو سرزنش کرتا مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گیا، مہر بھی سر جھٹکتی سیڑھیاں اترنے لگی۔

وہ اور زوہیب لنچ کے بعد زوہیب کے گھر چلے آئے تھے۔ زوہیب اپنے والد کے ساتھ اتنے بڑے گھر میں تنہا رہتا تھا۔ چچی کا انتقال چار برس پہلے برین ٹیومر جیسے موذی مرض کی بدولت ہوا تھا۔ زوہیب اور فاخر گہرے دوست تھے اور اسی وجہ سے زوہیب نے فاخر کے بزنس سے منسلک ہونے کو جاب پر ترجیح دی۔ دونوں گھروں میں کمال کی بے تکلفی تھی۔

فاخر لاؤنج میں صوفے پر نیم دراز دونوں پیر پھیلائے زانو پہ زوہیب کا لیپ ٹاپ رکھے فیس بک میں گم تھا۔

"یہ لے!" اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ گرما گرم بھاپ اڑاتی کافی کا مگ زوہیب اس کی طرف بڑھائے کھڑا تھا۔ اس نے بائیں ہاتھ میں مگ تھام لیا۔ دائیں ہاتھ کی انگلیاں ابھی بھی کیز روندنے میں مصروف تھیں۔

"تو آج کل یہ نئی مصروفیات ڈھونڈ رکھی ہے تونے۔" وہ زوہیب کو کسی رخسار کی بابت بتا چکا تھا۔ یوں بھی وہ دونوں ایک دوسرے کی تمام آئی ڈیز اور پاسورڈز سے اچھی طرح واقف تھے۔

"مصروفیت کہاں؟ تفریح کہو بس۔" فاخر لاپروائی سے بولا تھا۔

"وہ بھی کچھ ہی دیر کی۔ اس کے بھیا جی کی تلوار جو ہر وقت ننگی رہتی ہے سر پہ۔" اس کا لہجہ تمسخرانہ تھا۔ زوہیب کو ناگوار گزرا۔

بہترین دوست ہونے کے باوجود وہ فاخر کی اس حرکت سے بے حد چڑتا تھا۔ پتا نہیں کہاں سے اسے فلرٹ کا چسکا پڑ گیا تھا۔ آئے دن نت نئی گرل فرینڈز بدلنا اس کی ہابی بن چکی تھی۔ گو کہ اس نے آج تک چیٹنگ، میٹنگ، ڈیٹنگ، شاپنگ اور ہوٹلنگ سے آگے حد پار نہیں کی تھی، لیکن زوہیب اس پر بھی اکثر و بیشتر اسے وعظ و نصیحت کی ڈوز پلاتا رہتا تھا۔ اور فاخر ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دینے میں کمال رکھتا تھا۔ موڈ ہوتا تو بحث کیے چلا جاتا اور نہ چپ چاپ زوہیب کی سن کر مسکرائے جاتا اور زوہیب کی جان جل کر خاک ہوجاتی، لیکن مجال ہے جو فاخر پر اثر ہوتا ہو۔

"ہاں تو ٹھیک ہے نا! اس کا بھائی ہوگا کوئی شریف النفس انسان، جس نے بہن کے لیے بھی حدود متعین کر رکھی ہوں گی۔" زوہیب نے اسے ملامتی نظروں سے دیکھا۔

"ہاں! ایسا ہی مولوی ثناء اللہ کی اولاد ہو گا نا!" وہ پھر شرارت سے ہنسا۔ زوہیب نے پھر تنبیہی نگاہ ڈالی۔

"ارے تو خواہ مخواہ مجھ سے خفا ہو رہا ہے، میں نے کیا کیا ہے بھلا؟" فاخر نے مصنوعی معصومیت بھرے انداز میں کہا۔

"بالکل! تو نے کیا کیا ہے؟ یہ جو آئے دن ایک نئی بچی تیرے پہلو میں نظر آتی ہے وہ تو اپنے آپ جادوئی ڈور سے بندھی چلی آتی ہے تو بھلا کیا کرتا ہے، تو تو ابھی خود کم سن اور کم عقل ہے۔" زوہیب نے جی بھر کے لعنت ملامت کی تھی اسے اور اس کے جواب میں فاخر کا قہقہہ بہت بے ساختہ تھا۔

"تو تو اچھے خاصے حاسد رقیب کا پارٹ پلے کر رہا ہے یار۔" فاخر ہنوز غیر سنجیدہ تھا۔

"استغفراللہ! خدا بچائے، جو میں تیرا رقیب بنوں۔" زوہیب کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے اٹھ گیا۔

"تو بھئی! میں کسی بھی لڑکی کو مجبور نہیں کرتا اپنی فرینڈشپ کے لیے 'کرلی تو ٹھیک' نہیں تو اپنا راستہ لو' میں کسی کا ہاتھ پکڑ کر تو اپنے ساتھ نہیں لاتا نا۔ تالی دونوں ہاتھ سے بجتی ہے، میرا کام آفر کرنا ہے۔ باقی قبول کرنا یا نہ کرنا ان کی مرضی، تم مجھے قصوروار نہیں ٹھہرا سکتے۔" وہ اب سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"میں نے کب کہا کہ ان کی غلطی نہیں ہوتی، لیکن ترغیب تو تو ہی دیتا ہے نا بے چاریوں کو اپنی جھوٹی محبت کا جال پھینک کر۔ تجھے کیا ملتا ہے مہینہ، ڈیڑھ مہینہ کسی لڑکی کے ساتھ دوستی گانٹھ کے۔" گفتگو سنجیدگی کے مدار میں داخل ہونے لگی تھی۔

"یہ سب صرف تفریح ہے یار!" جواب خاصی غیر سنجیدگی سے آیا تھا۔ زوہیب تلملا کر رہ گیا۔

"اور تیرے اس فن میں قصور کسی کا بھی ہو، بھگتنا صرف صنف نازک کو بھگتنا پڑتا ہے۔"

"یار! تو پتا نہیں کون سی دنیا میں رہ رہا ہے۔ یہ آج کل الیکٹرانک میڈیا کے دور میں کون اتنا شریف، پارسا ہوتا ہے جس کا کوئی افیئر نہ ہو؟" فاخر لاپروائی سے بول رہا تھا۔ پھر زوہیب کو سنجیدہ پا کر مزید کہنے لگا۔

"ایسے میں صنف نازک ہو یا قوی دونوں کے شمار ہے پہلے کے افیئرز کوئی معنی نہیں رکھتے۔ یہ سب صرف وقت گزاری ہے۔ بعد میں نہ کسی مرد کو یاد رہتا ہے کہ اس کی بیوی کتنے افیئرز نبٹا چکی ہے اور نہ کسی بیوی کو یاد رہتا ہے کہ اس کے شوہر نے کتنی گرل فرینڈز کے ساتھ شادی کا وعدہ کر رکھا تھا۔ سب بھول جاتے ہیں ڈونٹ وری۔"

"تو نہیں سدھرے گا؟"

زوہیب تاسف سے سر جھٹک گیا۔ یعنی وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔

"تو کوشش کرتا رہ مجھے سدھارنے کی۔ تیری محنت رنگ لائے گی مجھے یقین ہے۔" وہ مزے سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"ابھی میرا دماغی توازن اللہ کے فضل سے سلامت ہے۔" زوہیب کافی کے مگ اٹھا کر کچن میں چلا گیا۔

پیچھے فاخر نے مسکراتے ہوئے اپنے فیس بک اکاؤنٹ کا نیو میسج آپشن کلک کیا اور سینڈ ٹو کے آپشن میں سیمیں رخسار لکھ کر میسج باکس میں پیغام ٹائپ کرنے لگا۔

زندگی یوں بھی بہت کم ہے محبت کے لیے
روٹھ کر وقت گنوانے کی ضرورت کیا ہے

میسج لکھ کر اس نے سینڈ کا آپشن کلک کیا اور چند لمحوں کے توقف سے لیپ ٹاپ آف کر دیا۔

☼ ☼ ☼

وہ آفس میں بیٹھا ساڑھے تین بجے سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ پرسوں وہ خفا ہو کر گئی تھی آج دو دن گزر گئے اس کا کوئی پیغام نہیں آیا۔ یہاں تک کہ فاخر کے بھیجے گئے پیغامات اور سوری کارڈز (جو اس نے رخسار کی wall پر پوسٹ کیے تھے) کا رد عمل تک نہیں آیا تھا۔ وہ کچھ بے چین سا ہو رہا تھا۔ جبھی زوہیب کمرے میں داخل ہوا اس کے ہاتھ میں دو تین فائلز تھیں جو اس نے فاخر کے سامنے میز پہ دھر دیں۔ فاخر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

"یہ آج ہی ویری فائی کرنی ہے۔ میں نے علی درید سے کمپلیٹ کروا دی ہیں تو یاد سے دیکھ لینا۔ او کے۔" وہ عجلت میں کہتا پلٹ رہا تھا۔

"بات سن!" فاخر نے اسے جاتے جاتے پکارا وہ مڑ کر پلٹا۔

"آج ضروری ہے کیا؟" زوہیب کو وہ کچھ بے زار سا لگا۔

"ہاں! کیوں؟" زوہیب نے بھنویں اچکائیں۔

"تو پھر تو دیکھ لے پلیز! مجھے ابھی نکلنا ہے گھر کے لیے۔" وہ کرسی سے پشت ٹکاتے گویا تھا۔

"خیریت۔؟" زوہیب پلٹ آیا۔

"ہاں! بس وہ مما اور مہر کو پھوپھو کے گھر ڈراپ کرنا ہے۔ ابھی کال آئی تھی ان کی۔"

"ابھی جا رہا ہے؟" زوہیب اس کے سامنے پڑی فائلیں اٹھاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"کچھ دیر میں۔ ایک دو میلز چیک کرنی ہیں۔" زوہیب سر ہلاتا کمرے سے نکل گیا۔

"السلام علیکم!" چیٹ باکس اوپن ہوا۔ اور سیمیں رخسار آن لائن بلنک ہونے لگی۔ فاخر ٹیک سیدھا ہو کر کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہوا۔

"وعلیکم السلام!" فاخر نے فوراً جواب روانہ کیا۔

"ابھی تک خفا ہو؟" فاخر بے تاب سا ٹائپ کر رہا تھا۔

"میں ناراض تو نہیں تھی۔" رخسار کا جواب ونڈو پہ ظاہر ہوا۔

"تم بنا الوداع کے چلی گئی تھیں۔ مجھے لگا بہت سخت ناراض ہو تم۔ پھر دو دن سے کچھ خیر خبر نہیں؟ میں پریشان تھا تمہارے لیے۔"

وہ ٹائپنگ کیے گیا۔

"آپ کی بات اس وقت بہت بری لگی تھی مجھے، غصہ بھی بہت آیا تھا ایک مرتبہ دل چاہا آپ کو لسٹ سے ہی ریموو کر دوں۔"

"نہیں پلیز! ایسا غضب مت کرنا۔ اپنا غصہ بے شک اتار لو مجھ پر۔" فاخر نے ترت جواب دیا۔

"اب کیا فائدہ۔ غصہ باسی ہو چکا ہے۔" وہ شرارتاً لکھ گئی۔

"چلو! پھر دوبارہ تازہ غصہ دلا دوں تمہیں؟" وہ بھی شریر ہوا۔

"اس کارِ خیر کو پھر کبھی پہ اٹھا رکھیے۔ کیونکہ ابھی مجھے جانا ہے کہیں۔"

"کہاں جا رہی ہو۔؟"

"کیوں بتاؤں؟ آپ ڈراپ کرنے آئیں گے۔؟" وہ مسکرائی۔

"تم بلاؤ اور میں نہ آؤں۔ ایسے تو حالات نہیں۔"

"سوال یہ ہے کہ میں آپ جناب کو کیوں بلاؤں؟" وہ اترائی۔

"جواب یہ ہے کہ ایک چانس تو ملنا چاہیے۔"

"ویسے کہاں رہتی ہو تم؟ میرا مطلب کراچی میں کہاں؟" وہ ٹائپ کرتے ہوئے گھڑی پہ نگاہ ڈال رہا تھا۔ سوا چار ہو چکے تھے اور اسے نکلنا بھی تھا لیکن۔

"کلفٹن۔" چند لمحوں کے توقف سے اس کا جواب ملا۔

"میری قسم کھا کے کہو۔" فاخر کے مان بھرے انداز نے رخسار کو مسکرانے پہ مجبور کر دیا۔

"اللہ کے سوا کسی اور کی قسم کھانے سے گناہ ملتا ہے۔" وہ بات بدل رہی تھی۔

"اور جھوٹ بولنے سے تو ڈھیروں ڈھیر ثواب ملتا ہے نا۔" وہ طنز کر رہا تھا۔

"تف ہے مجھ پہ کہ ابھی تک تم مجھ پہ بھروسہ نہیں کر سکیں۔ اور جب اعتبار ہی نہیں ہے تو خالی خولی باتوں کا کیا فائدہ۔" وہ یک بیک خود ترس ہوا۔ رخسار گھبرا گئی۔

"اعتبار کی باتیں مت کریں۔ اگر اعتبار نہیں ہوتا تو میں آپ سے بات ہی نہیں کرتی۔ ہر فضول بندے سے باتیں نہیں کرتی میں۔"

وہ صفائی دے رہی تھی۔

"شکر کہ تم مجھے فضول بندہ نہیں سمجھتیں۔" وہ مسکرا رہا تھا کیونکہ رخسار اپنی روش بدلنے

لگی تھی۔
"میرے سمجھنے سے یا نہ سمجھنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہیں تو آپ فضول ہی۔" اس کے جملے میں بے تکلفی تھی۔
"اچھا! یہ کس نے میرے متعلق اتنی پرائیوٹ انفارمیشن دی تمہیں۔"
وہ سرعت سے ٹائپ کر گیا۔
"میرا دل کہتا ہے۔" رخسار کا جواب جھٹ ونڈو پہ نظر آیا۔
"اپنے دل سے کہو زیادہ میرے ارد گرد نہ رہا کرے۔"
"خوامخواہ کیوں پابند کروں بے چارے کو؟"
"اگر اس بے چارے کو مجھ سے محبت ہو گئی نا تو تمہارے اختیار سے بھی باہر نکل جائے گا یاد رکھنا۔" فاخر قطعی نہیں چاہتا تھا کہ ابھی چیٹنگ کا سلسلہ موقوف ہو۔
"آپ مجھے ڈرا رہے ہیں؟" وہ متفکر سے انداز میں پوچھ رہی تھی۔
"تم ڈر رہی ہو؟" فاخر اس کی کیفیت جاننے کا خواہشمند ہوا۔
"ہاں!" یکسر رخسار نے بلا چون و چرا تسلیم کیا۔
"محبت سے ڈر رہی ہو... نادان لڑکی۔" اس نے حظ اٹھایا۔
"آپ نے محبت کی ہے...؟"
"نہیں کی تو نہیں لیکن اب لگتا ہے کہ مجھے محبت ہونے لگی ہے۔"
وہ چارہ ڈالنے لگا۔
"کس سے؟" رخسار نے سوال کیا۔
"تمہیں کیوں بتاؤں؟ ہے ایک لڑکی تھوڑی روڈ سی۔ مجھے بالکل گھاس نہیں ڈالتی۔" وہ آخر میں شریر ہوا۔
"او کے نہ بتائیں۔ میں کون سا اسے جانتی ہوں۔"
"نہیں خیر! تم تو اسے بہت قریب سے جانتی ہو۔"
"اچھا! کون ہے وہ؟" وہ متجسس ہوئی۔
"نہیں بتاؤں گا۔" وہ اسے بے چین محسوس کرنا چاہتا تھا۔
"ویسے تو بہت اعتماد، اعتبار اور بھروسے کے علم بردار بنتے ہیں۔ ابھی کیا ہوا؟" وہ طنز کر رہی تھی۔ فاخر کھل کے مسکرایا۔ لیکن پیام بھیجنے میں جان کر توقف کیا۔
"کون ہے؟ اب بتا بھی چکیں۔" حسب توقع بے تابی سے پوچھا گیا۔
"تم خود اصرار کر رہی ہو۔ بعد میں غصہ مت کرنا۔" وہ وارننگ دے رہا تھا۔
"نہیں کروں گی۔ بھئی پکا وعدہ اب بتائیں بھی کس نے پیار کیا آپ کو؟"
"تم نے۔" رخسار جانتی تھی وہ یہی کہے گا۔ یہی تو وہ سننا چاہتی تھی۔
"ہاہاہا... واٹ ربش!" وہ حسب توقع جواب پا کر ہنس رہی تھی۔ فاخر سمجھ گیا تیر بالکل نشانے پہ لگا ہے۔
"ہنس لو۔ ہنس لو۔ جس دن تمہیں ادراک ہوا اس دن پوچھوں گا۔" وہ جان کر ڈائیلاگ بول رہا تھا۔
"خوامخواہ۔ مجھ سے کیا پوچھیں گے؟ آپ کے اپنے ذہن کی اختراع ہے میرا کیا قصور۔" وہ معصوم بنی۔
"او ظالم۔ حسن والوں کی یہی ادائیں تو مار ڈالتی ہیں۔"
ایک اور ڈائیلاگ۔
"اپنے حواسوں میں واپس آجائیے۔ میں جا رہی ہوں۔" وہ اس کی بات کو سنجیدگی سے نہیں لے رہی تھی۔ "لیکن کب تک۔" فاخر نے اس گلیشیئر کو آنچ دی تھی۔ اب پگھلا کر پانی کر دینا بہت مشکل تو نہیں تھا۔ اور پانی کو تو اپنی مرضی کے کسی بھی سانچے میں ڈالو وہ اسی میں ڈھل جاتا ہے۔
"ایک بات تو بتا کر جاؤ۔" فاخر اتنے دلچسپ موڑ پہ گفتگو کا اختتام نہیں چاہتا تھا، جبھی اسے روکنے لگا۔ تھوڑی دیر اور سہی۔ ابھی لوہا گرم تھا ضرب کاری تھی۔

"اچھا ایک منٹ ٹھہریے۔ میں ابھی آئی۔" اس کا جواب جھٹ ونڈو پہ ظاہر ہوا اور فاخر نے بھی گھڑی پہ نگاہ کی۔ پونے پانچ ہو گئے تھے اس نے فون اٹھایا گھر انفارم کرنے کے لیے اسی دم اس کا سیل گنگنایا۔
"ممّا سے کہنا میں پندرہ، بیس منٹ میں پہنچتا ہوں۔ ایک ارجنٹ کام میں بزی ہوں او کے۔" مہر کا فون تھا اس نے کہہ کر بند کر دیا۔ رخسار ابھی تک نہیں آئی تھی۔
"جی جناب! آگے کیا کہہ رہے تھے آپ؟" دو منٹ بعد اس کا انتظار تمام ہوا۔
"کہاں گئی تھیں؟"
"اُفوہ! گئی تھی کہیں! آپ پوچھیے کیا پوچھ رہے تھے! مجھے دیر ہو رہی ہے۔" وہ جھنجلائی تھی۔
"بہت جلدی میں ہو؟" وہ خوامخواہ گفتگو کو طول دے رہا تھا۔
"میں جا رہی ہوں۔" اس نے دھمکایا۔
"اچھا سنو تو... میں پوچھ رہا تھا کراچی میں کہاں رہتی ہو؟"
"گلستان جوہر... بس!" اس نے جان چھڑائی تھی۔
"او گریٹ!" فاخر کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اتنے نزدیک رہتی ہو گی۔
"کیوں۔ کیا ہوا؟" وہ حیران ہوئی۔
"میں بھی یہیں رہتا ہوں۔ تمہارے قریب۔" آخری دو الفاظ میں ذو معنویت تھی۔
"میں جا رہی ہوں۔" رخسار نے فاخر کی بات نظر انداز کرتے ہوئے ٹائپ کیا۔
"ایڈریس تو بتا کر جاؤ اپنا۔ اب تو دل کو سمجھانا اور بھی مشکل ہو جائے گا۔" فاخر نے انگلیاں کی بورڈ پہ چلائیں۔
"کس خوشی میں؟" رخسار اس کی جرات پہ دنگ تھی۔
"اپنا پرپوزل بھجواؤں گا تمہارے لیے۔ آئی ایم ناٹ کڈنگ۔"
"فضول باتیں مت کریں۔ میں جا رہی ہوں۔" فاخر کی بات سے پہلو تہی کرنے میں ہی بھلائی تھی۔
فاخر مسکرا دیا اور پیغام ٹائپ کرنے لگا۔
ابھی آئے ابھی بیٹھے ابھی آنچل سنبھالا ہے
تمہاری جاؤں جاؤں نے ہمارا دم نکالا ہے
بہت بے چارگی بھرا شعر رخسار پڑھ کر مسکرائی۔
"اللہ حافظ اپنا خیال رکھیے گا۔" وہ الوداع کہہ رہی تھی۔ فاخر اس کی بے نیازی سے محظوظ ہوتے ہوئے مزید ٹائپ کرنے لگا۔
ہم چھین لیں گے تم سے یہ شان بے نیازی
تم مانگتے پھرو گے اپنا غرور ہم سے
رخسار کی مسکراہٹ ـــــ ہنسی میں تبدیل ہوئی فاخر کا یہ پیغام پڑھ کر۔
"بے انتہا ڈھیٹ واقع ہوئے ہیں آپ۔" شرارت چھلکاتا جملہ جھٹ ونڈو پہ ظاہر ہوا اور وہ آف لائن چلی گئی۔ فاخر بے ساختہ قہقہہ لگانے پہ مجبور ہو گیا۔ اسی دم دروازے سے زوہیب کی صورت نظر آئی۔
"تو ابھی تک یہیں ہے؟" وہ حیران ہوتا اس کے نزدیک چلا آیا۔
"ہاں! بس نکل رہا ہوں۔" اس کی ہنسی مسکراہٹ میں سمٹی۔
"ضرور اپنی کسی "سگی" سے باتیں بگھار رہا ہو گا۔"
زوہیب اسے چھیڑ رہا تھا۔
"کوئی شک!" فاخر کی طبیعت بالکل فریش ہو چکی تھی جبھی شوخی سے کہتا گاڑی کی چابی گھماتے ہوئے باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

سہانی شام، دلفریب سی سیاہی کی چادر چاروں اور آہستگی سے پھیل رہی تھی۔ جھاگوں جھاگ سمندر میں اترتا نرم گرم سورج اور سمندر کی اوپری سطح سے منعکس ہوتی ست رنگی شعاعیں وہیں ساحل سے کچھ دور گیلی ریت پر بیٹھی دودھ سی سفید لڑکی جو سمندر کی

آخری حد سے بے قرار مناتی لہروں کی بے چینی سے بے پروا اوپر فلک پہ لیٹا وہ سورج کی احتنک رنگ شعاعیں دیکھنے میں محو تھی۔ اس کی کانچ سی آنکھوں میں سمندر میں ڈوبتا سورج واضح نظر آرہا تھا۔ فاخر کی کمپیوٹر اسکرین پر نظر آتا یہ منظر ایک کارڈ کا تھا۔ اس نے یہ کارڈ کیٹس رخسار کے فیس بک اکاؤنٹ کی وال پہ چسپاں کیا۔ ساتھ "مس یو" لکھنا نہیں بھولا۔

ان کی نیٹ فرینڈ شپ ہوئے دو مہینے گزر گئے ان دو مہینوں میں وہ آپس میں خاصے بے تکلف ہو چکے تھے۔ فاخر کا بلاناغہ کیا جانے والا اظہار محبت رخسار کے دل میں بھی جذبوں کی آگ دہکا گیا۔ وہ روز باتیں کرتے۔ دنیا جہاں کی' یہاں وہاں کی۔ آفس کی گھر کی ادھر ادھر کی۔ لیکن کب تک خالی خولی باتوں سے خود کو بہلایا جا سکتا ہے۔ وہ دونوں ابھی تک محض چیٹنگ سے آگے نہیں بڑھے تھے۔ ویب کیم پہ چیٹنگ کرنے پہ وہ راضی نہیں تھی۔ پرسنل سیل رخسار کے پاس تھا نہیں اس کی تصویر فاخر نے جان کر نہیں مانگی تھی۔ وہ جانتا تھا رخسار کبھی نہیں دے گی۔ کیونکہ اس نے ایک مرتبہ چیٹنگ کرتے ہوئے یونہی بات برائے بات پوچھا تھا۔

"یار ایک بات تو بتاؤ۔"

"پوچھیے۔"

"یہ تم لوگ۔ آئی مین کہ فیس بک پہ تم لڑکیاں اکثر بلکہ زیادہ تر۔ desk top picture پہ اپنی تصویر نہیں لگاتیں کیوں؟"

"یہ تو آپ لوگوں۔ آئی مین کہ لڑکوں کو اچھی طرح معلوم ہونا چاہیے۔"

"واہ یہ کیا بات ہوئی۔ ہمیں کیا معلوم۔" وہ انجان بنا۔

"آپ ہی لوگ گرلز کی پکچرز کا مس یوز کرتے ہیں۔ اور موسٹلی گرلز لڑکوں کی انہی بے ہودہ حرکتوں کی وجہ سے اپنی ذاتی تصویر نہیں لگاتی ہیں۔" رخسار کا جواب فاخر کو بغلیں جھانکنے پر مجبور کر گیا۔

فاخر چاہتا تو پیش قدمی کر سکتا تھا۔ لیکن وہ جان بوجھ کر بے نیازی برت رہا تھا۔ دراصل وہ رخسار کا ضبط آزما رہا تھا۔ اگر وہ خود پہل کرتا تو رخسار کئی نخرے دکھاتی یہ ضروری بھی نہیں تھا کہ وہ اس کی بات مان ہی لیتی۔ اسی وجہ سے وہ اپنے طور اسے وقت دے رہا تھا کہ کب رخسار کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو اور خود رخسار اس روکھی پھیکی نام نہاد محبت کا کوئی نیا باب شروع کرنے کی خواہشمند ہو۔ اس صورت حال میں رخسار بلا چوں چرا فاخر کی ہر بات مان لیتی۔ سو وہ اطمینان سے اس وقت کا منتظر تھا۔

وہ زوہیب کے گھر بیٹھا تھا۔ سنڈے کی شام دونوں کا دیگر دوستوں کے ساتھ آؤٹنگ کا پلان تھا۔ زوہیب باتھ لے رہا تھا اور فاخر کارپٹ پہ نیٹ آن کیے بیٹھا تھا۔ آج وہ فیس بک پہ آن لائن جاتے ہی خوشگوار سی حیرت میں گھر گیا۔ کیٹس رخسار آن لائن تھی۔

"اوہ۔ واؤ۔ جلاؤ آج گھر پہ نہیں ہے غالباً۔" وہ جان کر رخسار کو چھیڑ رہا تھا۔ جانتا تھا وہ تپ جائے گی۔

"ہاں! بھائی نہیں ہیں گھر پہ۔" رخسار کا رد عمل بے ساختہ تھا۔

"وہ کسی مہ جبین کے ساتھ ڈیٹ پہ گئے ہوں گے۔" وہ ہنوز اسے تپانے کے موڈ میں تھا۔

"کیا چاہ رہے ہیں آپ؟ میں کچھ غلط سلط کہہ دوں گی آپ کو پھر مجھے الزام مت دیجیے گا۔" وہ دھمکا رہی تھی۔

"تم کچھ کہو تو سہی۔ تمہاری ذرا سی بے تکلفی مجھے سرشار کر دیتی ہے اور ایک تم ہو کہ محض دھمکیاں ہی دیتی ہو۔ کچھ کہتی نہیں۔"

وہ ڈائیلاگ جھاڑنے لگا۔ رخسار مسکرا دی۔ فاخر کا وارفتہ انداز اسے بھانے لگا تھا۔

"خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ کیسی ہو؟"

"میں بہت پیاری ہوں۔ بالکل پریوں جیسی۔" شرارت سے ٹائپ کر گئی۔

"مجھے کیا معلوم؟ میں نے کب دیکھا ہے تمہیں۔"

"آپ مجھے دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"ہاں۔"

"تو دیکھ لیں۔" وہ غیر سنجیدہ تھی۔

"کیسے؟" وہ حیران ہوا۔

"ووہ ہے نا۔

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

رخسار کے پیغام نے فاخر کو مسکرانے پہ مجبور کیا۔

"میری جان دل کا آئینہ فی الوقت خالی ہے تمہاری تصویر آنکھوں سے عکس بند کر کے دل کے فریم میں سیٹ کرنی پڑے گی پہلے۔" اس نے بھی کھٹا کھٹ انگلیاں چلائیں۔

"اوہ! آئی سی۔ اس طرح بھی ہوتا ہے۔" وہ مصنوعی حیرانی سے بولی۔

"بالکل اسی طرح ہوتا ہے۔ اب بولو۔"

"کیا بولوں؟"

"کب اور کہاں ملاقات ہو سکے گی؟"

"ایسا کس طرح ممکن ہے؟" وہ بدک کر بے ساختہ ٹائپ کر گئی۔

"کیوں ممکن نہیں؟ اتنے پاس تو رہتے ہیں ہم دونوں۔ ملنے میں کیا حرج ہے؟" فاخر نے ٹائپنگ کرتے ہوئے دیکھا زوہیب باتھ لے کر آچکا تھا۔

"مجھے عجیب لگے گا۔" وہ متذبذب تھی۔

"حد ہو گئی رخ! ایسا کون سا غلط کام کر رہی ہو جو تمہیں عجیب لگنے لگا۔" وہ تپ سا گیا۔

"تو ایسا کون سا اچھا کام کر رہی ہوں کہ اچھا محسوس ہو۔" وہ بھی چڑ گئی۔

"چل اٹھ جا یار۔ بند کر اسے آئی ایم ریڈی۔" زوہیب تیار کھڑا تھا۔

فاخر نے سر اٹھا کر اس کی تیاری بغور دیکھی۔

"اب دیکھ کیا رہا ہے۔ اٹھ نا۔" وہ جھینپ سا گیا۔ فاخر شرارت سے مسکرایا۔

"تو چل میں آرہا ہوں۔" فاخر جٹ وتڑوپہ ظاہر ہوتے رخسار کے نئے پیغام کی طرف متوجہ ہوا۔

"میں گاڑی نکال رہا ہوں۔" زوہیب چابی گھماتے ہوئے باہر نکل گیا۔

"ایک بات بتاؤ رخ! ابھی مجھ سے بات کر کے کیا محسوس کر رہی ہو۔ اچھا یا برا۔؟" فاخر نے پیغام لکھ کر انٹر کیا وہ خاموش تھی۔

"بتاؤ نا۔" وہ مصر ہوا۔

"مجھے اب اچھا محسوس ہو رہا ہے۔" رخسار نے لکھا۔ فاخر کا اندازہ درست تھا وہ بالکل پگھل چکی تھی۔

"مجھ سے ملو گی تو اور بھی خوشگوار احساس ہو گا۔ لیکن ابھی مجھے جانا ہے۔ اللہ حافظ۔" فاخر نے تیزی سے جواب دے کر اس کے جواب کا انتظار کیے بنا لیپ ٹاپ آف کر دیا۔ کیونکہ باہر گاڑی میں بیٹھے زوہیب نے ہارن پہ ہاتھ رکھ چھوڑا تھا۔ وہ تقریباً" دوڑتا ہوا باہر نکلا تھا مبادا زوہیب جلال میں آکر گاڑی کمرے میں ہی نہ لے آئے۔

اس نے ملاقات کے متعلق کچھ نہیں کہا تھا لیکن فاخر جانتا تھا وہ ضرور آئے گی۔

اسی رات ڈیڑھ بجے جب وہ اپنے روم میں اپنے پی سی پر فیس بک آن کر کے آن لائن گیا تو اپنے اندازے کی درستگی پر سرشار ہوا تھا۔ وہ آن لائن نہیں تھی لیکن اس کا میسج موجود تھا جس میں اس نے لکھا۔

"ازدین پارک ٹھیک رہے گا میں وہاں آ سکتی ہوں۔" فاخر خوش تھا اس کی دلی مراد بر آئی تھی۔ اگلے دن وہ پھر اسے دوپہر کے چار بجے ہی آن لائن ملی۔ فاخر بھی آفس میں بیٹھا اس کا ہی منتظر تھا۔

"کیسی ہو؟" فاخر نے سلسلہ کلام جوڑا۔

"ٹھیک نہیں ہوں۔" اس کا جواب آیا۔

"خیریت ہے۔؟" فاخر کو تشویش ہوئی۔

"ہاں! بس ذرا بخار اور فلو ہو رہا ہے۔"

"نظر اتروا لو اپنی۔" وہ شوخ ہوا۔

"پارک سے ہو آؤں پھر اتروا لوں گی۔" وہ بھی اترائی۔ فاخر ہنس پڑا۔

"کیوں بھلا؟" وہ جان کر انجان بنا۔

"وہاں مجھے کسی کی سخت کڑی نظر لگنے والی ہے۔"
رت بھرا جملہ رخسار نے لکھا تھا۔ فاخر کے چہرے
ظوظ کن مسکان تھی۔
"او شٹ! یہ اندر کی خبر آخر کون لیک آؤٹ کرتا
ہے۔" وہ مصنوعی طور پہ جھنجلایا۔
"میرا دل۔" رخسار نے لکھا تھا۔
"اپنے دل سے کہو ہمارے پاس رہ کر ہم سے
ری نہ کرے۔" وہ ہنوز متبسم تھا۔
"ایکسکیوز می! میرا دل کب سے آپ کے پاس
نے لگا ہے؟" وہ اٹھلائی۔
"خود پوچھ لو! تمہیں تو ساری باتیں بتاتا ہے نا۔"
خر نے اسے چھیڑا۔
"اچھا بس زیادہ اترانے کی نہیں ہو رہی۔"
سار نے جان چھڑائی۔ فاخر سے جیتنا مشکل تھا۔
"او کے! پھر کب آ رہی ہو پارک؟" فاخر نے کنفرم
رنا چاہا کہ کہیں اس کا ارادہ بدل تو نہیں گیا۔
"جب آپ کہیں! ویسے بھی یہ آپ کی دلی خواہش
ور پر زور فرمائش ہے۔" اس کا پیغام چیٹ ونڈو پہ نظر
یا اور فاخر تپ گیا۔ اس کی انگلیاں کی بورڈ پہ چلنے
یں۔
"تم نہیں آنا چاہتیں تو کوئی بات نہیں۔ میں فورس
یں کر رہا۔ او کے۔"
"اف! غصہ؟" اس کا پیغام "فوراً" آیا۔
"غصے میں بالکل اچھے نہیں لگتے آپ۔" فاخر اس
پیغام پڑھ کر مسکرا دیا۔
"تو پھر کیسے اچھا لگتا ہوں۔" وہ جانتا تھا کب کہاں
یسے نخرے دکھانے ہیں۔
"پہلے آپ بتایئے کب آنا ہے پارک۔" رخسار
نے بات بدلی تھی۔ فاخر نے بھی مطلب کی بات پر
اکتفا کیا۔
"سنڈے ٹھیک رہے گا چھ بجے شام۔" فاخر نے
ن اور وقت بتایا۔
"سنڈے نہیں پلیز۔ بھائی گھر پہ ہوں گے۔ پتا
ہیں کب کہیں جائیں۔ جائیں بھی یا نہیں۔"

"او گاڈ! یہ تمہارا بھائی کیوں ہر وقت تمہارے
جن، حواسوں پہ سوار رہتا ہے۔" فاخر جھنجلایا۔
"میرے بھائی بہت اچھے ہیں۔ ان کے بارے میں
اب ایسے بات مت کیا کریں آپ۔" اس کے لہجے میں
بہن بھائیوں والا مان تھا۔
"تم سے ملاقات ہو جائے نا تو پھر تمہارے بھائی کو
بھی دیکھ لوں گا۔"
وہ چونک گیا۔
"وہ کیوں؟"
"جاسوسی کر کے ان کے افیئرز تمہارے سامنے
لا ایکسپوز کروں گا تا کہ تب تم مانو گی کہ اتنا شریف کوئی نہیں
ہوتا۔"
"وہ ایسے نہیں ہیں۔" وہ دفاعی انداز میں بولی تھی۔
"وہ میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ کیسے ہیں۔ فکر مت
کرو بہت جلد دکھا بھی دوں گا۔" وہ یقین سے بولا تھا۔
"آپ غالباً" دن منتخب کر رہے تھے پارک آنے
کے لیے۔" وہ پہلو تہی کرتی اسے ٹاپک پر واپس لے
آئی۔
"جمعرات ٹھیک ہے۔"
"او کے۔ شام چھ بجے۔"
"بات سنو اس وقت تو کوئی مسئلہ نہیں ہو گا نا؟" وہ
ابھی بھی مشکوک تھا۔
"نہیں! کیونکہ اس وقت تک بھیا آفس سے آجاتے
ہیں لیکن وہ پھر ساڑھے پانچ تک باہر چلے جاتے ہیں۔
میں آسانی سے آجاؤں گی۔" وہ اسے مطمئن کر رہی
تھی۔
"اچھا سنو۔ پنک ڈریس میں آنا۔ مجھے لڑکیوں پر
پنک کلر بہت خوبصورت لگتا ہے۔" وہ اب فرمائش
کرنے لگا۔
"لیکن میں تو عبایا پہنتی ہوں۔" وہ جیسے پریشانی سے
بولی۔
"میری خاطر ایک دن مت پہننا پلیز!" مان بھرا
انداز فاخر کا تھا۔
"کتنی غیر مناسب بات ہو گی۔ میں اس کے بغیر

گھر سے نہیں نکلتی۔" وہ متامل تھی۔
"اف! ارے ایسا کرو، پارک باؤنڈری میں آکر اتار
دینا۔ اتنا تو کر سکتی ہو میرے لیے۔" وہ اسے کنوینس
کرنے لگا۔
"ٹھیک ہے لیکن مجھے اچھا نہیں لگے گا۔" وہ گھبرا
رہی تھی۔
"کوئی نہیں یار! میں پہچانوں گا کیسے تمہیں یہ بھی تو
سوچو نا۔ تصویر تک تو دیکھی نہیں ہم نے ایک دوسرے
کی۔" وہ جواز ڈھونڈ لایا۔
"ٹھیک ہے تو میں تصویر دے دیتی ہوں۔ آپ بھی
اپنی pic سینڈ کر دیں۔" وہ فوراً" راضی ہوئی تصویر
دینے۔
"نہ 'نہ! جب اتنے دن نہیں دیکھا تو اب میں
تمہیں مجسم ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔" وہ اس سچویشن کو
انجوائے کر رہا تھا۔
"اور عبایاز میں تو اتنی لڑکیاں ہوتی ہیں اور سارے
عبایاز ہوتے بھی تقریباً" ایک جیسے ہی ہیں۔ لباس پھر
بھی قدرے مختلف ہوتے ہیں اور تم مجھے پہلی ملاقات
میں بالکل گلابی رنگ میں رنگی نظر آؤ۔ میں تمہیں اپنی
پسند کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہوں او کے۔"
فاخر کا ایک ایک لفظ رخسار کی چیٹ ونڈو پہ نہیں
رخسار کے دل پہ چھپ رہا تھا جیسے وہ پڑھ کر محض
مسکرائے جا رہی تھی۔ تھوڑے ہی دنوں میں فاخر اس
کے لیے اتنا اہم ہو گیا تھا کہ وہ اس کی خواہش پر اپنی
روش بدلنے چلی تھی۔ نجانے اس کا نتیجہ کیا نکلنا تھا۔
"اور جناب میں آپ کو کس طرح پہچانوں گی؟"
رخسار کو دوسری پریشانی لاحق ہوئی۔
"میں تمہیں دیکھ لوں گا تو تم خود بخود مجھے پہچان
لو گی۔ ڈونٹ وری۔"
پارک باؤنڈری کے اندر شاپنگ مال اور پارک
کے عملی ایریا میں میرا ویٹ کرنا۔ دائیں طرف سے
لاسٹ ہلز کے پاس کھڑی ہونا۔ میں وہیں ملوں گا۔ پھر
ہم دونوں پارک میں ایز آ فیملی انٹر کریں گے۔"
وہ مزید لکھ رہا تھا اور رخسار کے پاس اس کی ہر بات
پہ سر جھکانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔
چونکہ الہ دین پارک ایک فیملی پارک ہے اسی وجہ
سے وہاں داخلہ کی شرط یہ ہے فیملی ساتھ ہو۔ خاص کر
تنہا نوجوانوں کو اندر جانے کی قطعاً" اجازت نہیں۔
تاکہ پارک کا ماحول خراب نہ ہو۔ لیکن باز کون آتا
ہے۔ نوجوان لڑکے اپنے آپ کو مین گیٹ سے کسی
بھی اندر جانے والی فیملی کا ممبر ظاہر کر کے انٹرینگ
پاس" حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن دور حاضر میں جو گرل
فرینڈ اور بوائے فرینڈ بنانے کی روایت ہمارے
معاشرے میں نمو پانے لگی ہے تو اب ان تکلفات کی
بھی ضرورت نہیں رہی۔ نئی نسل کے نمائندگان بڑی
آسانی سے اپنے فرینڈز کو اپنی فیملی ظاہر کر کے پاس
حاصل کر لیتے ہیں۔ اور پھر پارک میں جگہ جگہ لوبرڈز
کی صورت راز و نیاز میں مشغول دکھائی دیتے ہیں ایسی
ہی ایک ترغیب فاخر بھی اسے دے رہا تھا۔ اور رخسار
کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔
ایک بے ایمانی فاخر سے دوستی کر کے کی تھی
دوسری غلطی (جھجکتے ہوئے ہی سہی لیکن) اس سے ملنے
کی ہامی بھر کر کی تھی اور تیسری بے وقوفی اس کی ہر بات
پہ سر تسلیم خم کر کے کر رہی تھی۔ لیکن اب رخسار کا
خوف کسی حد تک معدوم ہو چکا تھا۔ جب کھوٹے
رستے کا انتخاب کر ہی لیا تھا تو زیاں کا خوف کیسا۔ پھر
نفع ملے یا نقصان اس بات سے بے غرض نام نہاد وقتی
لذت کی ہوس کسی اور طرف سوچنے اور دیکھنے کی
فرصت کب عنایت کرتی ہے۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن فاخر ناشتے کی میز پہ پہنچا تو ــــــ پاپا
پہلے سے موجود تھے۔ وہ صبح کا سلام کرتے ہوئے بیٹھ کر
جوس گلاس میں انڈیلنے لگا۔
"تم سے ایک بات کرنی ہے فاخر۔" انہوں نے
اخبار سائیڈ پہ رکھتے ہوئے فاخر کی طرف دیکھا۔
"جی کہیے پاپا۔" وہ متوجہ تھا۔
"کل جمال نے زوہیب اور مہر کی شادی کا ارادہ ظاہر

کیا۔"

مما بھی وہیں چلی آئیں۔ وہ زوہیب کے والد جمال انکل کی بات کہہ رہے تھے۔

"تو آپ نے کیا سوچا ہے۔" وہ اطمینان سے جوس کے گھونٹ بھر رہا تھا۔

"سوچنے کی تو کوئی بات ہی نہیں ہے بیٹا۔ کل بھی کرنی ہے شادی اور آج بھی۔ تم بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے۔" وہ رضامندی ظاہر کر رہے تھے اور فاخر کو کیا اعتراض ہونا تھا۔ زوہیب مہر کے لیے بہترین تھا' فاخر سے زیادہ کون مطمئن ہو سکتا تھا۔

"آپ راضی ہیں تو میری کیا مجال' انتظامات شروع کروتے ہیں۔" وہ سعادت مندی سے کہتا سلائس کے بائٹ لینے لگا۔

فاخر اپنے گھر کا ایک ذمہ دار فرد تھا۔ یہ سچ ہے کہ باہر اس کا جو بھی ذاتی مشغلہ رہے لیکن گھر کے باقی سارے معاملات ہمیشہ اس نے آئیڈیل بیٹا' اور بھائی بن کر سنجیدگی اور متانت سے نبھائے تھے۔ اپنی فیملی سے وہ نہ جانے کیوں بہت تکلف برتتا تھا شاید مزاجاً" وہ تنہائی پسند تھا یا نجانے کیا بات تھی۔

"مہر کہاں ہے؟ بریک فاسٹ نہیں کرنا اسے؟" حامد صاحب اپنی شریک حیات سے مخاطب تھے۔

"مہر کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ سو رہی ہے ابھی بعد میں کرلے گی ناشتا۔" وہ چائے نکالتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ حامد صاحب اور فاخر آفس جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

☼ ☼ ☼

"کیا ملتا ہے۔ تجھے ان فضول حرکتوں سے؟" وہ آفس میں بیٹھا اپنے سامنے براجمان زوہیب کو اپنے اور رخسار کے مابین ہونے والی گفتگو سنا رہا تھا جو ہمیشہ کی طرح زوہیب کو ناگوار گزری۔

"ٹائم پاس۔!" وہ بے ہودگی سے آنکھ دبا کر بولا۔

"باز آجا فاخر! یہ جو تیری گرل فرینڈز کا ڈھیر ہے نا۔ ان میں سے ایک کو نکال اور اس سے شادی کرلے۔ پھر تجھے ہر تین چار ماہ بعد نئی گرل فرینڈ نہیں ڈھونڈنی پڑے گی۔ ٹائم خود بخود پاس ہو جایا کرے گا۔" وہ مخلصانہ مشورہ دے رہا تھا۔

زوہیب مزاجاً "فیئر" رہتا تھا۔ وہ کبھی بے ایمانی کا قائل نہیں رہا۔ جس کے لیے وہ پسندیدگی کے جذبات رکھتا تھا اسے ہمیشہ کے لیے بھی اپنا بنانا چاہتا تھا۔ لیکن ہر چیز کا طریقہ ہوتا ہے زوہیب نے مہر کو طریقے سے اپنے نام کروایا تھا اور اب ڈنکے کی چوٹ پہ اسے اپنا بھی بنانے والا تھا۔

"واٹ ربش! یہ ٹائم پاس جسٹ فار انجوائے منٹ ہوتی ہیں۔ گھر بسانے کے لیے نہیں۔" وہ غیر سنجیدگی سے فاخر کو دیکھ کر رہ گیا۔

"اب دیکھیں رخسار کو ہی لے لے۔ پہلے بہت نخرے دکھاتی تھی۔ بہت شریف زادی بنتی تھی اور اب دیکھ ذرا سے اشارے کی دیر تھی۔ پکے پھل کی طرح جھولی میں گری ہے۔ ابھی دیکھنا کیسے اپنے والدین کے عزت و وقار کو پیروں تلے روندتی ہوئی آئے گی۔"

وہ تمسخر اڑا رہا تھا۔ زوہیب کو بے طرح غصہ آیا۔ فاخر نہیں۔ ان لڑکیوں۔ جنہوں نے اسے اس قدر بے لاگ بعرو کرنے کا موقع فراہم کیا۔

"تو آپ کون سا گنگا نہا کے آئے ہیں۔ آپ کی بھی تو وہی روش ہے۔" زوہیب طنز کر رہا تھا۔ فاخر ہنس پڑا۔ آپ جناب کا تکلف زوہیب کی برہمی کا پتا دے رہا تھا۔

"میری اس روش سے میری کردار کی چادر میلی نہیں ہوتی سمجھا۔ ہم لڑکے کچھ بھی کرلیں ہمارا ہر قصور معاف ہے۔ میرا نہیں معاشرے کا نظریہ ہے۔" وہ زوہیب کی گھوری سے بے نیاز تھا۔

"اور یہ معاشرہ تشکیل دینے والے کون ہیں؟" زوہیب صاف اس پر چوٹ کر رہا تھا۔

"تو خوامخواہ ہائپر ہو رہا ہے یار۔ تجھے یا مجھے ان سب باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور جن کو فرق پڑنا چاہیے۔ انہیں خود کی پرواہ نہیں ہے۔ تو کیوں ان کے غم میں دبلا ہو رہا ہے؟" وہ لاپرواہی سے کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔ اور زوہیب کے لبوں میں ہی یہ جملہ دم توڑ گیا۔

"تیری بھی بہن ہے۔ مت بھول۔" وہ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ آپس میں کتنے بھی گہرے دوست کتنے بھی بے تکلف ہو جائیں مہر کا تذکرہ اس انداز میں کرنا زوہیب کو کبھی بھی گوارہ نہیں تھا۔

"اللہ نہ کرے کہ اس کے کیے کا بھگتان مہر کو بھگتنا پڑے۔" اگلے ہی پل زوہیب نے خود پر لعنت بھیجتے ہوئے فاخر کو پکارا جو اب کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔

"کیا ہوا۔؟" وہ دروازے سے ہی پلٹ کر پوچھنے لگا۔

"شاپنگ کرنے چلے گا تو میرے ساتھ یاد رکھنا۔" زوہیب یاددہانی کروا رہا تھا۔

"ضرور یاد رکھوں گا۔ رخسار کے لیے پریزنٹ بھی تو لینا ہے۔ خالی ہاتھ ڈیٹ پہ جاتا اچھا لگوں گا کیا؟" وہ شرارت سے کہتا زوہیب کو چھیڑ رہا تھا۔ اور زوہیب اس کی بات پر مسکرا کر رہ گیا کچھ کہنا تو فضول ہی تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ باتھ لے کر کمرے میں آیا تو فاخر کا سیل فون بج رہا تھا۔ اٹھا کر دیکھا زوہیب کی کال تھی۔ اس نے یس اش کرکے کان سے لگالیا۔

"کہاں ہے تو۔؟" زوہیب کی آواز آئی۔

"یار گھر۔ ہوں تیار ہو رہا ہوں۔ آج تھرسڈے ہے نا۔" فاخر کی آواز کچھ شوخ تھی۔

"تو تھرسڈے پہلی مرتبہ تو نہیں آیا۔ ہر ہفتے آتا ہے۔" زوہیب بھی شریر ہوا۔

"تھرسڈے پہلی بار نہیں آیا۔ لیکن وہ ضرور پہلی بار آرہی ہے مجھ سے ملنے۔" وہ سیل فون شانے اور کان کے درمیان پھنسائے گفتگو کرتا ہوا۔ ڈریسنگ ٹیبل تک چلا آیا۔

"کاش! میں تیری آوارگی کا علاج تجھے کسی کھونٹے سے باندھ کر کر سکتا۔" فاخر نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

"تو فقط افسوس کرسکتا ہے۔ میرا علاج نہیں۔" وہ اب باڈی اسپرے کرتا ہوا خود کو آئینے میں دیکھ رہا تھا۔

"اتنا فارغ نہیں ہوں کہ بیٹھ کر افسوس کروں۔ اور بھی کئی کام ہیں مجھے۔"

زوہیب بیڈ پہ نیم دراز اطمینان سے کہہ رہا تھا۔

"فون تو بند کرے گا یا میں بند کروں۔" فاخر جانتا تھا۔ زوہیب جان بوجھ کر گفتگو کو طوالت دے رہا تھا۔ اتنی جلدی فاخر کی جان بخشی نہیں ہوگی لیکن اب اسے دیر ہونے لگی تھی۔

سوا پانچ بجے وہ گھر آیا تھا۔ بیس منٹ تیاری میں لگے تھے اور پارک تک کا ڈرائیونگ ڈسٹینس پندرہ سے بیس منٹ کا تھا۔ وہ وقت سے پہلے پہنچنے کے لیے کوشاں تھا۔

"تجھے میری ہونے والی بھابھی کی قسم تو فون بند نہیں کرے گا۔" زوہیب چڑانے کا کوئی موقع ضائع کردے ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ فاخر جھنجلانے کے باوجود اس کی بات سے محظوظ ہوا۔

"مجھے دیر ہو رہی ہے فون بند کر۔" فاخر ابھی بھی سیدھے طریقے سے بول رہا تھا۔

"میں نہیں کروں گا۔ اپنی ہونے والی کی کتنی فکر ہے۔ اس کی قسم دی تو فون بند نہیں کر رہا۔ دوست کی پروا نہیں۔ میں بور ہو رہا ہوں کمپنی دے مجھے۔" زوہیب فل مستی کے موڈ میں تھا۔

"تو باز نہیں آئے گا۔" فاخر نے دانت پیسے۔

"نہیں!" ڈھٹائی زوہیب پہ ختم تھی۔

"او کے۔" فاخر نے اطمینان سے کہتے ہوئے فون بنا آف کیے بیڈ پر اچھال دیا۔ اور گنگناتے ہوئے باقی ماندہ تیاری کرنے لگا۔ دوسری جانب زوہیب اس کی اس حرکت پر تلملانے کے باوجود ہنس پڑا۔

"فاخر بیٹا بات سنو۔" وہ لاؤنج سے گزر رہا تھا جب مما کی آواز پر اسے ٹھہرنا پڑا۔

"جی کہیے۔" وہ رک پوچھ رہا تھا۔ مما نزدیک چلی آئیں۔

"کہیں جا رہے ہو؟" وہ اس کی تیاری کو بغور دیکھ

رہی تھیں۔
"جی کچھ آؤٹنگ کا پروگرام ہے۔ کیوں؟" وہ جھینپ سا گیا۔
"مہر کو نازش کے گھر ڈراپ کرنا تھا برتھ ڈے پارٹی ہے اس کی آج۔ مہر بھی وہیں چلی گئی۔"
"وہ مما۔ ایسا ہے کہ مجھے پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔" وہ گھڑی پہ نگاہ ڈالتا بول رہا تھا۔ جو پونے چھ بجا رہی تھی۔
"آپ ایسا کریں زوہیب کو کال کر لیں۔ وہ ڈراپ کر دے گا مہر کو۔" وہ عجلت میں لگ رہا تھا۔
"زوہیب نہیں جا رہا تمہارے ساتھ۔؟" وہ حیران سی کہتی فون کی طرف بڑھی تھیں۔
"نہیں۔" وہ ایک لفظ کہتا پلٹ گیا۔ پلٹتے ہوئے اس نے صوفے پہ دھرے مہر کے گلابی ہینڈ بیگ کو دیکھا اور خوش کن احساس میں گھرا مسکرا دیا۔
کوئی اپنے آپ کو گلابی رنگ سے سجائے اس کا منتظر تھا۔

☼ ☼ ☼

زوہیب ٹی وی لاؤنج میں نیم دراز اسپورٹس چینل پر کرکٹ میچ دیکھ رہا تھا۔ رات کے آٹھ بجنے والے تھے۔ ابھی کچھ دیر قبل وہ مہر کی کال پر اسے نازش کے گھر سے پک کرنے بھی گیا تھا۔ فاخر ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ زوہیب نے دو مرتبہ کال کی لیکن کوئی ریسپانس نہیں ملا۔ وہ کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔
"لگتا ہے تیری ڈیٹ کچھ زیادہ ہی سکسیس فل رہی ہے۔" زوہیب میسج ٹائپ کر کے فاخر کے سیل پہ پیغام بھیجنے لگا۔ ابھی وہ سینڈ کرنے ہی والا تھا جب کال آنے لگی۔ کوئی پی ٹی سی ایل نمبر تھا۔
"زوہیب صاحب ہیں؟" اگلی جانب سے تصدیق کیا جا رہا تھا۔
"جی میں ہی ہوں۔ کہیں۔"
"مسٹر فاخر توقیر کا بہت شدید ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ ان کے پاس آپ کا کارڈ ملا تھا۔ آپ ان کے جو بھی ہیں۔ پلیز جلدی آ جائیں۔"
اگلی جانب سے ملنے والی خبر اس کی حواس گم کر گئی۔
"کہاں ہے وہ؟" وہ بے انتہا پریشان ہوا تھا۔
"میں ہسپتال سے کال کر رہا ہوں۔ ڈاکٹرز نے ابتدائی طبی امداد کر دی ہے۔ آپ آ جائیں۔" وہ کوئی ہمدرد انسان تھا جو فاخر کو ہسپتال لے گیا تھا۔
وہ بھاگم بھاگ پہنچا تھا۔ اس کی حالت بہت نازک تھی۔ دو گھنٹے بعد ڈاکٹرز نے اسے خطرے سے باہر بتایا تو زوہیب نے باقی گھر والوں کو گھر بھیج دیا اور خود فاخر کے پاس ٹھہر گیا۔ پتا نہیں کس کی نظر لگ گئی اس کے ہنستے کھلکھلاتے دوست کو۔
رات کے ساڑھے گیارہ بجے اس کے کراہنے کی آواز پر زوہیب اس کے نزدیک آیا۔ ڈاکٹر نے چیک کر کے انجکشن لگا دیا تاکہ وہ غنودگی میں تکلیف کم محسوس کرے۔
"فکر کی کوئی بات نہیں ہے زوہیب صاحب! وہ اب ٹھیک ہے۔ انجکشن لگا دیا ہے تکلیف کم ہو گی۔ ممکن ہے کچھ دیر میں سو جائیں۔ یو پلیز ڈونٹ وری۔"
ڈاکٹر تسلی دے کر چلا گیا تو زوہیب فاخر کے قریب ہی آ کھڑا ہوا۔
"فاخر شاید جاگ رہا ہے۔" زوہیب نے دل میں کہا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن لرزتی پلکیں اس کے ذہنی انتشار کا پتا دے رہی تھیں۔
"فاخر!" زوہیب نے اسے پکارا۔ وہ بے حرکت رہا۔
"فاخر اب کیسا ہے جگر۔" زوہیب ذرا سا اس کے چہرے پہ جھکا۔
"فاخر کیا ہوا؟" زوہیب کو تشویش ہونے لگی۔ وہ اب بھی بے حس و حرکت رہا۔ بس اس کی لرزتی پلکیں بتا رہی تھیں کہ وہ حواسوں میں ہے۔
جب کچھ دیر تک فاخر نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تو زوہیب پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے خود ہی فرض کر لیا کہ فاخر دوائیوں کے زیر اثر ہے اس لیے ایسا کر رہا ہے۔

ادھر فاخر کے دائیں آنکھ کے کونے سے آنسو کا ایک قطرہ پھسل کر تکیے میں جذب ہو گیا۔ اس نے سختی سے پلکیں بھینچ لیں۔ وہ ـــ نہیں چاہتا کہ زوہیب کو اس کے ذہنی انتشار کا اندازہ ہو۔ اس کے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کا علم ہو۔ عزیز از جان دوست سے پردہ پوشی آسان نہیں تھی لیکن ایسا کرنا ضروری تھا۔ دماغ میں اٹھتی ٹیسیں فاخر کو بے حال کر رہی تھیں۔ اگر چند لمحوں میں وہ واقعی غنودگی میں نہ چلا جاتا تو ضرور بی پی شوٹ کر جانے کا خدشہ تھا لیکن نیم غنودگی میں بھی وہ کب پرسکون ہو پا رہا تھا۔ شام کا منظر پوری جزئیات کے ساتھ اس کے شعور میں محفوظ اسے کچوکے لگائے جا رہا تھا۔ اس نے بند آنکھوں سے منظر نوچنے کی کوشش کی تھی لیکن بے سود وہ نڈھال ہو گیا خود سے لڑتے لڑتے۔ بالآخر ہمت ہار بیٹھا اور بند آنکھوں کے پیچھے چلتی فلم دیکھنا اس کی مجبوری بن گئی۔
الہ دین پارک کی باؤنڈری وال کے اندر بائیں طرف موجود پارکنگ میں کار پارک کر کے وہ تازہ سرخ گلابوں کا بکے لیے واک کرتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ دائیں طرف موجود ـــــ شاپنگ مالز پر سرسری سی نگاہ ڈالتا۔ مضبوط قدم بڑھاتا وہ مین ایریا میں پہنچ گیا۔ اس کے آگے باضابطہ پارک کی حدود شروع ہوتی تھیں جس کے لیے پاس ورڈ درکار تھے۔ جس جگہ فاخر کھڑا تھا وہ ایک ہال نما بڑا سا ایریا تھا۔
اس اوپن ایریا میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پہ اونچے لمبے چوڑے ستون (پلر) کھڑے تھے۔ ستون کا اوپری سرا خوبصورت گنبدوں پہ ختم ہوتا۔ ہر ستون کے اوپر چھوٹا سا خوبصورت گنبد جس سے نکلتی ننھے منے بلبز کی لڑیاں ایک ستون سے دوسرے ستون میں جڑتی اوپر گویا بلبز کی چادر تنی تھی۔ ایسی ہی لڑیاں ستونوں سے بھی لپٹی تھیں۔ یہ پورا ہال انہی چھوٹے چھوٹے ننھے منے بلبز سے بقعۂ نور بن گیا تھا۔ اس ہال کو ایک طرح سے ویٹنگ ایریا بھی کہہ سکتے ہیں۔
اکثر لوگ یہاں اسی جگہ ایک دوسرے کا ویٹ کرتے نظر آتے ہیں۔ فاخر بھی اطراف پہ نگاہ ڈالا کرنے والے پلر سے ٹیک لگائے کھڑا ہو گیا۔ اس کی نگاہیں گلابی رنگ تلاش رہی تھیں۔ مکمل گلابی رنگ میں کوئی بھی لڑکی ملبوس نہیں تھی۔ وہ بے زار ہوتا کلائی موڑ کر گھڑی دیکھنے لگا۔ ساڑھے چھ ہو گئے تھے فاخر نے سیل فون نکالنے کے لیے پاکٹ میں ہاتھ ڈالا تب اسے یاد آیا کہ وہ سیل فون بیڈ پہ ہی پھینک کر بھول آیا ہے۔
وہ زوہیب کی باتیں یاد کرتا مسکرا دیا۔
"ایڈیٹ!" زیر لب بڑبڑاتے ہوئے اس کی نگاہوں نے ان دو لڑکیوں کو گرفت میں لیا جو ابھی ابھی وہاں آئی تھیں۔ دونوں عبایا میں ملبوس تھیں۔ وہ دونوں فاخر کے بائیں طرف کنارے ہو کر کچھ فاصلے پہ کھڑی تھیں۔ فاخر نادانستہ ہی انہیں دیکھے جا رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل کھڑی کچھ گھبرائی ہوئی سی لگ رہی تھیں۔ فاخر کچھ چونک سا گیا ان میں ایک لڑکی اسے شناسا سی لگ رہی تھی۔ اسی اثناء میں فاخر کی نگاہ اس آشنا لڑکی کے ہاتھ میں تھمے ہوئے گلابی ہینڈ بیگ سے الجھ گئی۔ اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ بالکل ایسا ہی ہینڈ بیگ وہ ابھی ابھی اپنے گھر میں لاؤنج کی صوفے پر رکھا دیکھ کر آیا تھا۔ فاخر کے ارد گرد سائرن بجنے لگے۔ اسے کچھ کلک کرنے لگا۔ ان دونوں میں سے ایک کی پشت فاخر کی طرف تھی اور وہ ہینڈ بیگ اسی کے بازو سے جھول رہا تھا وہ لڑکی اب شاید حجاب کی پنیں کھول رہی تھی۔ فاخر پلر کے پیچھے سے ہوتا ہوا اپنے آپ کو ان کی نگاہوں سے مخفی رکھے کنارے کنارے چلتے ہوئے ایسی جگہ جا کھڑا ہوا جہاں سے وہ اس لڑکی کو سامنے سے دیکھ سکے اور پھر۔
اس کے سامنے کھڑی "مہر" نے حجاب اتار کر بیگ میں ڈالا۔ جس قدر وہ نروس تھی فاخر کو سمجھنے میں وقت نہیں ہوئی کہ وہ وہاں کس لیے آئی تھی۔ کیونکہ اس سے پہلے مہر کی جگہ وہ اور بھی لڑکیوں کو دیکھ چکا تھا۔ کیا ہوا جو آج اس جگہ "مہر" کھڑی تھی۔
"دیکھنا کیسے وہ اپنے والدین کی عزت و وقار کو

پیروں تلے روندتی ہوئی آئے گی۔" فاخر کو اپنی ہی تمسخر اڑاتی آواز سنائی دی۔ وہ شدید اشتعال کے عالم میں یکسر فراموش کر گیا کہ وہ وہاں کس لیے آیا تھا۔ اسے یاد رہا تو بس اتنا کہ وہ ایک غیرت مند "بھائی" ہے۔ قریب تھا کہ وہ آندھی طوفان کی طرح مہر کے سر پہ پہنچتا۔ لیکن مہر کے عبایا اتارتے ہاتھ دیکھ کر تھم سا گیا۔ منہ پہ پڑنے والا طمانچہ شدید تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس کے اور رخسار کے مابین کیا گفتگو ہوئی تھی۔

"سنوپنگ ڈریس میں آنا۔"

"لیکن میں عبایا پہنتی ہوں۔"

"میری خاطر ایک دن مت پہننا پلیز۔"

"کتنی غیر مناسب بات ہوگی۔ میں اس کے بغیر گھر سے نہیں نکلتی۔"

"اف! او کے ایسا کرنا پارک باؤنڈری میں آکر اتار دینا۔ اتنا تو کر سکتی ہو میرے لیے۔" اس کے ذہن میں مکالمے گونج رہے تھے اور وہ دم سادھے کھڑا تھا۔

مہر نے عبایا اتار کر بیگ میں رکھا اور دوسری لڑکی سے کچھ کہہ کر مسکراتی ہوئی اکیلی اسی پلر کے قریب جا کھڑی ہوئی جہاں ابھی کچھ دیر قبل فاخر کھڑا تھا۔ دوسری لڑکی پلٹ کر شاپنگ مال کی طرف چلی گئی۔ اور مہر پیشانی پہ آیا پسینہ خشک کرتی یہاں وہاں متلاشی نگاہیں دوڑانے لگی۔

تھوڑی دور کھڑا فاخر "تک تک دیدم دم نہ کشیدم" والی کیفیت کے زیر اثر سراپا گلابی رنگ سے مزین "مہر" کو دیکھتا پاتال کی گہرائیوں میں اترتا جا رہا تھا گلابی لباس، گلابی سینڈل، گلابی چوڑیاں اور گلابی میک اپ کیے وہ بے چین سی ہاتھ مسل رہی تھی۔ فاخر کی پتھرائی آنکھوں سے چیٹ ونڈو۔ میں لکھے پیغامات گزرنے لگے۔

"کراچی میں کہاں رہتی ہو؟"

"گلستان جوہر۔"

"لو گریٹ۔"

"کیا ہوا۔"

"میں بھی وہیں رہتا ہوں تمہارے قریب۔" وہ ملنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ اسے کچھ اور یاد آیا۔

"کیسی ہو۔"

"ٹھیک نہیں ہوں۔"

"خیریت ہے؟"

"ہاں بس ذرا بخار اور فلو ہو رہا ہے۔" اس کے ساتھ ہی مما کی آواز آئی۔

"مہر! ابھی طبیعت ٹھیک نہیں بعد میں کر لے گی ناشتا۔"

وہ بہت وقتوں سے ملنے کے قابل ہوا تھا۔ پیروں تلے اس کے ہاتھ سے گرا گلابوں کا تازہ بکے آیا۔ فاخر کو ہوش کب تھا۔ وہ تو نہ جانے کس کس بات کو یاد کر رہا تھا۔

"پھر کب آؤ گی؟"

"جب فرصت ملے گی تب۔"

"فرصت کب ملے گی۔"

"کل۔"

"کل کیوں؟ آج رات میں نہیں آسکتیں۔"

"نہیں! بھائی گھر پہ ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے نیٹ یوز نہیں کرتی۔"

"اوہ! یعنی تمہارا بھائی بھی ہے۔"

"ہاں! ابھی وہ آفس سے آنے والے ہیں۔ اب میں جا رہی ہوں۔ اللہ حافظ۔"

وہ کار تک پہنچتے پہنچتے بری طرح نڈھال ہو چکا تھا۔ ذہن کے دریچے میں ایک کے بعد ایک رخسار کی باتیں روشن ہو رہی تھیں۔

"آپ بھائی کے بارے میں ایسے بات مت کیا کریں۔"

"تم سے ملاقات ہو جائے نا پھر تمہارے بھائی کو بھی دیکھ لوں گا۔"

"کیوں؟"

"جاسوسی کر کے ان کے افیئرز تمہارے سامنے ایکسپوز کروں گا تب تم مانو گی کہ اتنا شریف کوئی نہیں ہوتا۔"

"وہ ایسے نہیں ہیں۔"

"تمہارا بھائی کوئی دودھ کا دھلا نہیں ہوگا۔"

"جو چیز تمہارے لیے شجر ممنوعہ ہے وہ ان کے لیے کیوں جائز ہے۔"

"مجھے کہنے دو تمہارا بھائی ایک ڈپلومیٹک آدمی ہے۔" فاخر کی اپنی ہی کہی باتیں اس کے کردار کی دھجیاں اڑا رہی تھیں۔ وہ گاڑی روڈ پہ نکال لایا۔ اندر اٹھتا بے سکون اشتعال بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ پس منظر سے زوہیب کی آواز آنے لگی۔

"کیا ملتا ہے تجھے ان فضول حرکتوں سے۔"

"ٹائم پاس۔"

"باز آجا فاخر۔"

"واٹ ربش! یہ ٹائم پاس جسٹ فار انجوائے منٹ ہوتی ہیں۔" اس کے پیروں کا دباؤ ایکسیلیٹر پہ بڑھتا جا رہا تھا۔

"میری اس روش سے میرے کردار کی چادر میلی نہیں ہو رہی سمجھا۔ ہم لڑکے کچھ بھی کر لیں۔ ہمارا ہر قصور معاف ہے یہ میرا نہیں معاشرے کا نظریہ ہے۔" لاپروا سا جملہ اس کے نزدیک ہی گونج رہا تھا۔

اس کی آنکھیں لہو رنگ ہو چکی تھیں۔ بھینچے ہوئے جبڑے اور کنپٹی کی پھڑکتی رگ اس کے پیمانہ ضبط کے لبریز ہونے کا پتا دے رہی تھی۔

اسے اپنی بے ہودہ گوئیاں یاد آئیں جو مہر کے ساتھ وہ انٹرنیٹ پر کرتا رہا تھا۔ بے باک جملے 'ذو معنی باتیں' وقتاً فوقتاً واہیات الفاظ میں کیا جانے والا اظہار محبت۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ سمندر کی لہروں میں اپنا یہی چہرہ اور وجود غائب کر دے۔ اپنے آپ کو جان سے مار ڈالے۔

قسمت نے گھٹیا وار کیا تھا اس کی عزت غیرت اور وقار کا جنازہ بہت بے دردی سے سر عام گھسیٹا گیا تھا۔ پے در پے پڑنے والی ضرب ضمیر نے اس کا پور پور لہولہان کر دیا تھا۔

فاخر کا فشار خون یک بیک بلند ہوا اور اس نے گاڑی فل اسپیڈ پہ چھوڑ دی۔ اگلے ہی پل سامنے سے آنے والے ۔۔۔ لوڈ ٹرک نے اس کی گاڑی کو ہٹ کیا۔

"بس۔" اس کے منہ سے سسکاری نکلی زوہیب فوراً نزدیک آیا سفید براق بستر پہ لیٹے فاخر کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اس کی آنکھیں ابھی بھی بند تھیں۔ شاید اب وہ شرمساری کے احساس سے مغلوب کسی سے آنکھیں ملانے کے قابل نہیں رہا تھا زوہیب فکر مند ہوتا ایک بار پھر ڈاکٹر کو بلا لایا اسے لگا شاید فاخر زخموں کی تکلیف سے بے تاب ہے۔ لیکن وہ بے خبر یہ نہیں جانتا تھا کہ فاخر کے جسم کے زخم عارضی ہیں۔ جلد یا بدیر بھر ہی جائیں گے لیکن جو زخم اس کی روح کو ضرب ضمیر سے ملے ہیں وہ کبھی نہیں بھر سکیں گے۔ اور ضمیر کی لگنے والی کاری ضرب اسے کبھی پر سکون و مطمئن نہیں ہونے دے گی۔

✡ ✡

عتیقہ محمد بیگ

وہ معصوم رو رہی تھی۔ اور اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ اماں کی بات اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

"یہ قسمت کا کھیل ہے، قسمت کا۔" اس نے روتے روتے ہاتھوں کو مسلا۔ اسے تو اپنی قسمت کی لکیر میں ایسا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر وہ دوسروں کے فیصلے کو اپنی قسمت کیسے مان لیتی۔

"اف! یہ کہاں کا انصاف ہے۔ کہ ہر لڑکی کی خواہش کو دبانا اور الزام اس کی قسمت کو دینا۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ جو دل دھڑکتا ہے' اس میں ہزار خواہشات پنپتی ہیں۔ پھر کیوں اس کی خواہش کو یا پھر کیوں ہر لڑکی خواہش کو افسانوی ناول کی کسی ہیروئن کے جملوں کی طرح لیا جاتا۔" وہ روتے روتے بولی۔

"نہیں۔۔۔ نہیں میں اتنی جلدی شادی نہیں کر سکتی۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔" اس نے گھٹنوں میں سر چھپالیا اور بے بس پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☼ ☼ ☼

پری نے میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کرلیا تھا اس سے پہلے کہ وہ کالج میں داخلہ لیتی پھوپھو جمیلہ اس کے لیے رشتہ لے آئیں۔ وہ تو سہم کر رہ گئی جو ابھی سترہ سالہ تھی۔ اس کے گھر والوں نے امریکہ کا نام سنا تو جھٹ سے رشتے کے لیے ہاں کردی۔

لو بھلا ساری قوم امریکہ جانے کا خواب سجاتی ہے۔ تو گھر والے یہ موقع ہاتھ سے کیسے جانے دیتے۔ یوں امریکہ کے نام پر اسے خوش قسمت ہونے کا لقب ملا۔

پری جو ڈاکٹر بننے کی خواہش دل میں سجا کر بیٹھی تھی' اپنے گھر والوں کی اچانک رضامندی پر فق سی ہوگئی۔

جمیلہ رشتے میں اس کی سگی پھوپھو نہ تھیں۔ اس کے ابا جان کی خالہ زاد بہن تھیں۔ جو پچھلے مہینے اپنے بیٹے وہاب کے ساتھ ان کے گھر تشریف لائی تھیں۔ وہ پاکستان بیٹے کی شادی کے سلسلے میں آئی تھیں۔ پری کو دیکھ کر ان کا ارمان پورا ہوگیا۔ جیسی بہو کا وہ سوچ رہی تھیں پری اس کے ہو بہو تھی۔ میک اپ سے پاک چہرہ اور سر پہ جما دوپٹہ جمیلہ کو بھا گیا۔ انہوں نے وہاب سے بات کی۔ تو اس نے بھی پری کے لیے سر تسلیم خم کرلیا۔ پری کی گوری رنگت' موٹی موٹی آنکھوں اور لمبے قد سے کون نفی کر سکتا تھا۔ یوں ایک ہفتے میں ہی بات پکی ہوگئی۔

مگر پری کے لبوں پر انکار تھا اور وجہ اس کے ڈاکٹر بننے کی خواہش تھی۔ فاطمہ' پری کی ماں فکر مند سی ہوگئیں۔ پری کسی صورت بھی رضامند نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے ماں کے اصرار پر ان سے بات چیت کرنا چھوڑ دی۔ فاطمہ گھبرا سی گئیں۔ پری کے رد عمل پر انہوں اپنی بڑی بیٹی کو فون پر بتایا۔ اور اسے گھر چکر لگانے کا اصرار کیا۔ ماریہ فاطمہ کی بڑی بیٹی تھی۔ جس کی شادی کو دس سال ہو رہے تھے۔ ماریہ کی ساس کی طبیعت ناساز تھی۔ اس لیے وہ گھر کم ہی آتی تھی۔ ماں کے اصرار پر ماریہ دو دن کے بعد اپنے میکے آپہنچی۔ وہ تو پری کی اتنے اچھے گھرانے میں بات طے ہونے کی بات سن کر خوش ہوگئی۔ وہ جمیلہ پھوپھو اور ان کے بیٹے وہاب سے واقف تھی۔ پری کو ادھر ادھر نہ پاکر اسے پکارنے لگی۔

فاطمہ منہ میں بڑبڑائیں۔

"اتنی اچھی جگہ بات پکی ہوئی ہے۔ مگر نہ جانے کیوں ہم لوگوں سے خفا بیٹھی ہے۔" ماریہ کے تین' چار دفعہ پکارنے پر وہ نمودار نہ ہوئی تو فاطمہ نے فکر مند لہجے میں اس کی ناراضی بیان کی کہ اس نے گھر میں بات چیت کرنا چھوڑ دی ہے۔

"کیوں۔۔۔ کیا ہوا؟ پری خفا کیوں ہے؟" ماریہ کا چہرہ بجھ سا گیا۔ وہ جو پری سے بارہ سال بڑی تھی۔ اسے اپنی بیٹی آفرین کی طرح ڈیل کرتی تھی۔ اس سے پہلے فاطمہ لب کھولتی' کنزہ ایک ہاتھ میں شربت کا گلاس اور دوسرے ہاتھ میں مٹر سبزی کی پرات سنبھالتی کمرے میں آپہنچی۔ اس نے گلاس ماریہ کو تھمایا اور صوفے پر بیٹھ کر بولی۔

"مہارانی صاحبہ کا فرمان ہے کہ انہوں نے شادی کے متعلق سوچا نہیں۔ اس لیے رشتے سے انکار کردیا

جائے۔" اس نے سبزی کی پرات اپنے گھٹنوں پر رکھ کر کہا۔ کنزہ جو ان کی اکلوتی بھابھی تھیں' ڈول کے ساتھ زبان کی بھی کنزوی' وہ بھلا کوئی موقع ہاتھ سے کیسے جانے دے سکتی تھی۔ اس نے ماں کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر پریشانی کا تاثر تھا۔ بہو کے سامنے کیا بے چاری جواب دیتیں۔ ماریہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"اماں کیا وہ لوگ جلد شادی کے خواہش مند ہیں۔" ماریہ نے شربت کا گلاس واپس ٹیبل پر رکھ دیا۔ اس کا حلق کیسے تر ہو سکتا تھا۔ پری جو خفا تھی' اس کی پیاری بہن۔

"ہاں۔ اسی سال شادی کی تاریخ مانگ رہے ہیں۔ میں اس بچی کو کیا سمجھاؤں۔" فاطمہ نے آخر کار سر پکڑ لیا۔ جیسے وہ پری سے ہار مان گئی ہوں۔ ماریہ نے آہ بھری اور بولی۔

"تو پھر اماں آپ ان لوگوں سے اگلے سال تک کی بات کر لیں۔" اس نے شائستگی سے ماں کو دیکھ کر مسئلے کا حل بتایا۔ کنزہ جو منہ نکال رہی تھی۔ اس نے خفگی بھری نظر ماریہ پر ڈالی۔ اور منہ بسور کر بولی۔

"کس بات کے لیے دیر کر رہی ہو۔ یہاں اپنے بچوں کی اسکول فیس ادا نہیں ہو رہی۔ اور وہ مہارانی ڈاکٹر بننے کا خواب دیکھ رہی ہیں۔ تم لوگوں کا بھائی سرکاری افسر نہیں۔ جس کی موٹی تنخواہ ہو اور وہ سب کی ناجائز خواہشات پوری کرے۔" اس نے لفظ چبا چبا کر جواب دیا۔ کنزہ کی بات پر ماریہ ہکا بکا رہ گئی۔

"بہو تم تو چپ رہو۔" فاطمہ نے آہ بھری اور شربت کا گلاس ماریہ کو تھمایا۔ اس نے گلاس ہونٹوں سے لگایا۔ ایک سپ لیا اور کنزہ کی بات پر پری کے متعلق سوچنے لگی کہ پری کا خواب بھی شادی کی خبر سن کر کرچیوں کی طرح بکھر گیا ہو گا۔ جس کی وجہ سے وہ سب سے خفا ہو گئی تھی۔ فون پر دو ہفتے پہلے اس کی کھنکتی آواز نے اسے خوش خبری دی۔

"ہیلو۔ آپی۔ میں نے 960 نمبر لے کر میٹرک پاس کیا ہے۔ میں پاس ہو گئی ہوں۔" پری نے خوشی خوشی فون پر بتایا۔

"واؤ۔ واؤ۔ کیا بات ہے۔ تم نے تو کمال کر دیا۔ بلکہ میری ناک سسرال میں اونچی کر دی۔" اور بولی۔

"آپ کی ناک اونچی ہو گئی۔ ایسا بھی میں نے کوئی انوکھا کام نہیں کر دیا۔ ہاں ڈاکٹر بن جاؤں گی تو پھر شاید۔" اس نے ہنستے ہنستے بہن کے سامنے اپنا خواب رکھ دیا۔

"اچھا جی ڈاکٹر بن جاؤ گی تو پھر ہم غریبوں کو کون پوچھے گا۔" ماریہ نے ہنسی دبا کر اسے چھیڑا۔

"کیوں جی آپی! ابھی میں ڈاکٹر بنی نہیں ہوں اور آپ نے بھی کنزہ بھابھی کی طرح طعنے دینے شروع کر دیے ہیں۔" اس نے قہقہہ لگایا۔

"وہ تو طعنوں کی فاسٹ باؤلر ہیں۔ میرا ان سے مقابلہ تم نہ ہی کرو۔" ماریہ نے ہنستے ہنستے جواب دیا۔ جس پر پری نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ وہ پری کی باتوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ اسے کنزہ کی آواز نے چونکایا۔

"اماں آپ ماہ نور کو پیسے دیں۔ وہ خورشید بابا کی دکان سے کولڈ ڈرنک لے آتی ہے۔ شاید ماریہ کے حلق سے گھر کا شربت نہیں اتر رہا۔" اس نے منہ بسور کر گلاس پر نظریں ٹکا دیں۔ ماریہ۔ جس نے شربت کا ایک سپ لیا تھا اور گلاس ابھی ہاتھ میں تھا۔ وہ گھبرا کر بولی۔

"نہیں۔ اماں ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے تو بچپن سے آپ کے ہاتھ کا یہ شربت پسند ہے۔" اس نے تیزی سے شربت حلق سے اتارا اور خالی گلاس کر کے ٹیبل پر رکھا۔ جیسے اس نے ثبوت دیا ہو۔

ماریہ اپنے میکے کے حالات سے واقف تھی۔ وہ خاموش رہی۔ کنزہ کی باتوں کا جواب دیتی تو الٹا اس کا غصہ اماں اور پری پر نکلتا۔ اس نے ماں کی طرف دیکھ کر سوچا کہ انہوں نے بھی کنزہ کے طعنوں کی وجہ سے پری کی جلدی شادی کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے ابا جان کی وفات کے بعد گھر پر کنزہ کا راج چل رہا تھا۔

راج تو اسی کا ہوتا ہے جس کے پاس دولت ہو۔ کنزہ امیر گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ اکثر دھمکیاں دیتی کہ وہ اصغر کو لے کر اپنے میکے چلی جائے گی۔ فاطمہ کا واحد سہارا ان کا بیٹا تھا۔ ان کے پاس کنزہ کی باتیں برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ ڈرتی تھیں کہ کہیں کنزہ کی باتوں کا جادو اصغر پر چل گیا تو وہ کیا کریں گی۔ اس لیے وہ کنزہ سے اچھا برتاؤ کرتیں۔ اصغر ایسا تو نہ تھا۔ مگر وقت کا کچھ پتا بھی تو نہیں چلتا۔ اسی وجہ سے فاطمہ نے بہو کے ساتھ کبھی جھگڑا نہ کیا۔ کنزہ کی طنزیہ باتوں سے ان کا دل بہت برا ہوا۔ ماریہ جب بھی میکے کا چکر لگاتی کنزہ طعنے دینے سے باز نہیں آتی۔ فاطمہ کی آنکھیں یکدم نم سی ہو گئیں۔ ماریہ "کنزہ کو روکتی" تو الٹا وہ اصغر کی کم آمدنی کا رونا پیٹنا شروع کر دیتی۔ اس سے پہلے کنزہ اپنے طعنوں سے مزید اس کا دل برا کرتی وہ اٹھ کر پری کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ وہ منہ میں بڑبڑائی۔

"نہ جانے میری اماں نے مجھے کیا سوچ کر ان بھکاریوں کے پلے باندھا ہے۔ نہ مرتی ہیں' نہ جان چھوڑتی ہیں۔" اس کا یہ جملہ ماریہ کے کانوں میں پڑ چکا تھا۔ مگر اس نے ان سنی کر کے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ کنزہ سے جھگڑا مول لے کر اپنی ماں کے لیے مزید مشکلیں بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ جس نے اپنے آنسوؤں پر بند باندھ رکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے دروازے پر دستک دی۔ پری کا کمرہ اندر سے لاک تھا۔

"جانی میری گڑیا' میں ہوں' دروازہ کھولو۔" دروازے پر کوئی آہٹ سنائی نہ دی تو ماریہ نے اپنی آمد کی اطلاع دی۔ پری جو آنسو بہا رہی تھی کہ اسے شادی نہیں کرنی' ماریہ کی آواز پر جھٹ سے اس نے دروازہ کھولا' اور بہن کے گلے سے لپٹ گئی۔ وہ روتے روتے بولی۔

"آپی دیکھیے یہ لوگ میری اتنی جلدی شادی کر رہے ہیں۔ میں اماں کے لیے بوجھ بن گئی ہوں۔" وہ تڑپ اٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں کئی دنوں تک رونے کی وجہ سے سوجی ہوئی تھیں۔

"او ہو میری گڑیا! کیوں اپنی جان کو ہلکان کر رہی ہو اور کس نے کہا کہ تم بوجھ ہو۔" ماریہ نے اس کے آنسو پونچھے' ماتھے پر بوسہ دیا۔ وہ بخار میں تپ رہی تھی۔

"بس آپی! گھر والوں کو منع کر دو۔ مجھے شادی نہیں کرنی۔" اس نے خفگی سے جملہ ادا کیا۔ ماریہ جانتی تھی کہ پری کا ردعمل ایسا ہی ہو گا۔ وہ مسکرائی اور اسے بیڈ پر اپنے پاس بٹھایا۔ جو کانپ رہی تھی۔

"اتنا تیز بخار ہے۔ اپنا خیال تو رکھا کرو۔" اس نے دراز میں سے ٹیبلٹ نکالی۔ ٹیبل پر پڑے جگ سے پانی گلاس میں انڈیلا اور پری کے ہاتھ میں تھما دی۔ اس نے پری کو دوائی کھلا کر واپس گلاس رکھ دیا۔

"تم اتنی کمزور ہو گئی ہو کیا کھانا ٹھیک سے نہیں کھا رہیں۔" اس نے خفگی سے پوچھا۔ وہ جو چپ ہو چکی تھی' آہستگی سے بولی۔

"آپی۔ مجھے ڈاکٹر بننا ہے۔ آپ جانتی ہیں۔ مگر یہاں کوئی میری بات سنتا ہی نہیں۔" اس نے لرزتی آواز سے جواب دیا۔ ماریہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور سنجیدگی سے بولی۔

"میں جانتی ہوں کہ تم بہت محنتی ہو۔ مگر جانو میڈیکل میں ایڈمیشن کے لیے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہاں تو کھانا بھی طعنوں سے ملتا ہے۔" اس نے آہ بھر کر اسے سمجھایا۔

"مگر آپی۔ اصغر بھائی نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔" اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

"بس۔ اب چپ کر کے سو جاؤ' اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔" اس نے پری کے بالوں کو دیکھ کر کہا۔ جس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔

"آپی۔ پلیز۔ میری مدد کریں۔ مجھے یہ شادی نہیں کرنی۔" وہ بے زاری سے بولی۔

"او ہو۔ پری چھوٹے بچوں کی طرح ضد مت کرو۔ اب تم بڑی ہو گئی ہو۔ میں بھی تو یہاں سے اپنے سسرال گئی ہوں۔" اس نے اپنی مثال دی۔

"مگر آپی۔ آپ نے ایم اے کے بعد شادی

کی۔ پھر میری شادی اتنی جلدی کیوں؟" وہ ماریہ کی بات پر تھوڑی سنبھل گئی۔ مگر مطمئن نہ تھی۔

"تو ہو۔ پری رشتہ اچھا ہے، اس لیے اور اب ہمارے ابا جان بھی تو زندہ نہیں ہیں۔" اس نے افسردگی سے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں شادی کروں گی، آپ سے وعدہ کرتی ہوں، مگر دو، تین سال کے بعد۔" اس نے بہن کی باتوں کو سمجھنا شروع کردیا کہ اس کی بہن بھی تو یہ گھر چھوڑ کر گئی ہے۔

ماریہ نے ایک ہلکی سی چپت اس کے گال پر رسید کی اور سنجیدگی سے بولی۔

"میں تو خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے میری بہن کی اتنی اچھی جگہ بات طے کروی۔ اور تمہیں خوش ہونا چاہیے۔ کنزہ کے طعنوں سے چھٹکارہ مل رہا ہے۔ تمہاری وجہ سے اماں اس کے طعنوں پر بولتی نہیں۔ تمہاری شادی کے بعد اماں آزاد ہو جائیں گی۔ تمہیں تو ڈھول پیٹنا چاہیے اور تم ہو کہ منہ پھلا کر کمرے میں بند ہو۔" ماریہ نے کہا، پری نے ایک کہری نظر ان کے وجود پہ ڈالی۔

"آپی کہیں اماں نے تو آپ کو مجھے راضی کرنے کے لیے پٹی تو نہیں پڑھادی۔" اس نے اپنا شک ظاہر کیا۔ ماریہ نے پری کا کان پکڑ لیا۔

"اتنی چالاک نہیں ہوئی ہو کہ بہن سے بازی لے جاؤ۔" اس نے ہنستے ہنستے جواب دیا اور اس کے ساتھ لیٹ گئی۔ اس نے بھی پھیکی مسکراہٹ دی۔ پھر ماریہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"پری۔ تمہاری بھلائی دیکھ کر ہی اماں نے فیصلہ لیا ہے۔ تم اماں کے لیے کبھی بوجھ نہیں ہو سکتیں۔ بس حالات ہی ان کا ساتھ نہیں دے رہے۔" فاطمہ بھی کمرے میں آگئیں۔ انہوں نے ماریہ کی بات سن لی۔ ان کی آنکھیں پرنم تھیں۔

"آیئے اماں۔ اندر آجائیں۔" ماریہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پری نے فاطمہ کو دیکھا تو اپنا سر جھکا لیا۔ اور بیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

فاطمہ، پری کے پاس آبیٹھیں۔ جس سے پری تقریباً" تین دن سے بات نہیں کررہی تھی۔ وہ افسردگی سے بولیں۔

"کوئی بھی ماں اپنی بچی کے حق میں برا نہیں سوچ سکتی۔ میں نے تمہارا اسکھ دیکھ کر یہ رشتہ طے کیا ہے۔ اور یہ قسمت کا کھیل ہے۔" انہوں نے بات مکمل کی تو ان کے آنسو گرنے لگے۔

"اماں آپ دل چھوٹا مت کریں۔ اللہ نے چاہا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے ماں کا ہاتھ تھام لیا اور پری کی طرف دیکھا۔ اس کی بھی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

"تم لوگوں کے ابا جان زندہ ہوتے تو میں کبھی اتنی جلدی فیصلہ نہ لیتی۔" فاطمہ نے روتے روتے کہا۔ پری ماں کی بات پر ان کے سینے سے لپٹ گئی۔ اور رونے لگی۔

"نہ میری بچی روتی کیوں ہے؟" پری کا غصہ آنکھوں سے آنسو بن کر بہنے لگا۔ فاطمہ اس کے سر پہ پیار دے کر اسے چپ کروانے لگیں۔

"اماں۔ مجھے معاف کردیں۔ میں بہت بری ہوں۔ میں نے آپ کو دکھ دیا۔" وہ لرزتی آواز سے بولی۔

"او ہو۔ میری بچی، بس چپ ہو جاؤ۔" انہوں نے پری کا ماتھا چوما جو ماں کے سینے سے چمٹی ہوئی تھی۔ جیسے پانچ سال کی بچی ہو۔ ماریہ ہنس کر بولی۔

"تم لوگوں کے رونے کا سین ختم ہو گیا ہو تو۔ میں کچھ عرض کروں۔" اس نے پری کا بازو دبا کر ہنستے ہنستے پوچھا۔

"ماریہ میری بچی، تمہاری بات یہ پری سمجھی ہے، ورنہ مجھے تو۔" انہوں نے ہنس کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ جس پر پری نے بے شمار الزامات لگادیے تھے۔

"میری پیاری بہن بنے گی دلہن۔" ماریہ نے شریر لہجے سے پری کو چھیڑا۔

"اماں آپی تنگ کررہی ہیں۔" وہ روتی آواز سے بولی اور ماں کی گود میں سر چھپالیا۔

"ماریہ نہ تنگ کر۔" فاطمہ نے خفگی دکھائی، ہنسی دبا کر۔

"تو جی بازی اتنی جلدی پلٹ گئی۔" ماریہ نے منہ بسور لیا۔ فاطمہ ہنس پڑیں اور پری کے چہرے پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"اچھا۔ اچھا۔ ایسی بات ہے تو میں واپس اپنے گھر چلی جاتی ہوں۔" وہ دوپٹہ سنبھال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ پری نے جھٹ سے اس کا بازو تھام لیا اور افسردگی سے بولی۔

"آپی پلیز ابھی تو آئی ہیں، بیٹھ جائیں۔" اس نے ماریہ کو زبردستی بٹھالیا۔

"نہیں۔ نہیں تم ماں بیٹی کا پیار دیکھ کر مجھے اپنی بیمار بیٹی کی یاد آگئی۔ جسے میں تنہا گھر پر چھوڑ آئی ہوں۔" ماریہ اٹھتے ہوئے بولی۔ فاطمہ نے خفگی سے پوچھا۔

"ہائے ہائے کیا ہوا میری پیاری نواسی کو۔ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔" انہوں نے شکوہ کرنا شروع کردیا۔

"اماں۔ ایسی ویسی کوئی بات نہیں۔ بخار تھا اتر چکا ہے، بس کمزوری ہے۔ کچھ دنوں میں بھلی چنگی ہو جائے گی۔" اس نے ماں کو تسلی دی۔

فاطمہ نے ماریہ کے سر پر پیار دیا اور سنجیدگی سے کہا۔

"ماریہ کچھ دنوں کے لیے گھر رہنے آجاؤ۔ جب سے تمہاری شادی کی ہے تم کبھی گھر پر ٹھہرنے نہیں آئیں۔ میں نے پہلے اصرار نہیں کیا، تمہاری ساس کی طبیعت جو ناساز رہتی تھی۔ مگر اب تو تمہاری بیٹی بھی بڑی ہو رہی ہے۔ مہینے میں کم از کم دو چکر لگا جایا کرو۔ رشتوں کی پہچان رہتی ہے۔" فاطمہ نے افسردگی سے شکوہ کیا۔

"جی اماں۔ ضرور۔ ان شاء اللہ تھوڑے دنوں تک رہنے آجاؤں گی۔ آپ آنٹی فرخندہ کے جوڑوں کے درد سے تو واقف ہیں۔ وہ آسانی سے چل پھر نہیں سکتیں۔ ایسے میں تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔" اس نے نہ آنے کا سبب اپنی ساس کی بیماری پر ڈالا جو در حقیقت ایسا نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے۔ کچھ دنوں کے بعد آجانا۔ پری تمہارے ساتھ رہے گی۔ تو کچھ سمجھ سکے گی اور کھانے پکانے میں بھی ماہر ہو جائے گی۔ کنزہ تو کچن میں کھڑا نہیں ہونے دیتی۔" فاطمہ نے افسردگی سے بتایا۔

"آپی آپ ایسا کریں اماں کو ساتھ لے جائیں، اور ضروری سامان لے کر اماں کے ساتھ ہی آجائیں۔ اماں ان کی طبیعت بھی پوچھ لیں گی۔ کیوں اماں۔" پری نے گرم جوشی سے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"نہیں بیٹا، فرخندہ کیا سوچے گی کہ میں بیمار ہوں، اور یہ اپنی بیٹی کو لے گئیں۔ وہ ماریہ کی ساس ہے، اب ماں کا درجہ رکھتی ہے۔ ماریہ بیٹی ان سے اجازت لے کر رہنے کے لیے آجانا۔" فاطمہ نے آہ بھر کر کہا تھا۔ جو کسی حد تک جانتی تھیں کہ ماریہ ان سے کچھ چھپاتی ہے۔

"جی اماں میں ان سے اجازت لے کر آؤں گی، مگر فون روز کروں گی۔" ماریہ نے ماں کو شائستگی سے جواب دیا۔ وہ چپ ہو گئیں۔

"اس لیے تو میں شادی کے لیے انکار کرتی ہوں۔ ساس صاحبہ کا ہر حکم مانو، بے شک وہ درست نہ بھی ہو۔" پری نے طنزیہ لہجے سے جملے ادا کیے۔ وہ مسکرائی اور پیار سے بولی۔

"نہیں پری میری ساس بہت اچھی ہیں۔ مجھے بہت پیار کرتی ہیں۔" اس نے اپنی نظریں چرا کر اپنی ساس کی تعریف کی۔

"اللہ کا ہمیشہ کرم رہے۔" فاطمہ نے ماریہ کی بات پر ہاتھ بلند کر کے کہا تھا۔

"اماں مجھے چلنا چاہیے۔" وہ دوپٹہ سنبھال کر بولی۔

"ہاں دھیان سے جانا شام بھی ہونے کو آرہی ہے۔" انہوں نے گھڑی پر دیکھ کر فکر مندی سے کہا تھا۔

"او ہو۔ تو۔ تین بج چکے ہیں، اماں مجھے دیر ہو رہی ہے، راستے میں گھر کا تھوڑا سامان بھی خریدنا

ہے۔" اس کی سسرال سے میکے کا فاصلہ ایک گھنٹے کا تھا۔ اسے دو بجے نکلنا تھا۔ مگر وہ ایک گھنٹہ لیٹ ہو چکی تھی۔ اس لیے پھر وہ جلدی سے اللہ حافظ کہہ کر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

کڑکتی دھوپ میں وہ تیز تیز قدم اٹھا کر بس اسٹاپ پر آپہنچی۔ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف فکر مندی سے دیکھا۔ ساڑھے تین بج چکے تھے۔ وہ منہ میں بڑبڑائی۔

"اف اللہ 'دیر ہو گئی ہے' مجھے وقت کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔ میں اماں کو کیا جواب دوں گی' ابھی تو گھر کا سودا سلف بھی خریدنا ہے۔ یا خدا آج تو میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ خدایا بچالینا۔" اس کے پاس رکشا آکر رکا ہوا' وہ تیزی سے اس میں بیٹھ گئی۔ تقریباً" پونے چار کے قریب وہ اپنے گھر کی مارکیٹ میں پہنچ گئی۔ اس نے رکشے والے کو بیس روپے زیادہ دیے۔ دوپہر کی وجہ سے ٹریفک کم تھا۔ جس کی وجہ سے وہ آدھے گھنٹے میں آگئی تھی۔

اس نے تیزی سے خریداری کی۔ وہ اللہ سے دعائیں مانگ رہی تھی کہ فرخندہ کو اس کے میکے جانے کا شک نہ ہو جائے۔ ورنہ اس کے طعنوں سے اس کی جان عذاب میں پڑ جاتی تھی۔ تمام سودا سلف لے کر وہ اپنے گھر کے روڈ پر تیز تیز قدم اٹھا رہی تھی۔ ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ سامان کے ساتھ اس سے تیز چلا بھی نہیں جارہا تھا۔ گھر آتے آتے اس کو چھ بج چکے تھے۔ اس نے دروازے کی بیل پر ہاتھ رکھا کہ دروازہ یکدم کھل گیا۔

"ہائے ہائے کچھ تو اللہ کا خوف کرو بہو' یہ کوئی وقت ہے گھر آنے کا' شرم کرو' اب تو تم اس خاندان کی بہو ہو۔ اپنی ماں کی لاڈلی بیٹی نہیں رہی ہو۔" فرخندہ نے خفگی سے اسے گھور کر کہا تھا۔

"اماں۔ مارکیٹ میں رش بہت تھا۔ گوشت کی کٹائی میں دیر ہو گئی۔" اس نے نظریں چرا کر جواب دیا۔ اور شاپر اٹھائے کچن میں جا گھسی۔ کچن میں آکر اس نے شاپر ٹیبل پر رکھے۔ اور جلدی سے فریج کی طرف لپکی۔ اس نے ٹھنڈے پانی کی بوتل منہ سے لگالی۔ پیاس سے اس کی حالت بری ہو رہی تھی۔ پانی اس کے حلق سے اترا تو اس کی سانس بحال ہوئی۔

اس نے پانی کی بوتل منہ سے ہٹائی۔ تو فرخندہ کو سامنے کھڑا پایا۔ جو اسے گھور رہی تھیں۔

"اماں۔ کچھ چاہیے۔" اس نے پیار سے پوچھا۔

"نہیں کچھ چاہیے تو نہیں' مگر پوچھنے کے لیے ضرور آئی ہوں۔"

"جی اماں بولیے۔" وہ شاپر سے سبزیاں نکالنے لگی۔ اس کا دل زور' زور سے دھڑکنے لگا۔

"کہاں گئی تھیں۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولیں۔

"مارکیٹ اور کہاں؟" اس نے اعتماد سے جواب دیا۔

"مگر اتنی دیر۔"

"اماں رش تھا اگلی دفعہ آپ خود گھر کا سامان لے آیئے گا۔ مجھ سے یہ خریداری نہیں ہوتی۔" اس نے لاپروائی جتائی۔ جیسے اس کے لیے یہ خریداری عذاب ہو۔

اس سے پہلے وہ مزید کچھ اور پوچھتی آفرین کچن میں آگئی تھی۔

"مما آپ آگئیں میرے لیے جیلی لے کر آئی ہیں نا۔" اس نے ہنستے پوچھا۔

"ہاں۔ میری گڑیا' تمہاری اس جیلی کی وجہ سے آدھا گھنٹہ گزر گیا۔" اس نے شاپر سے جیلی کا ساشہ اس کو نکال کر دی۔ فرخندہ اس کو خاموشی سے دیکھنے لگیں۔

"آفرین تمہاری فرمائشوں کی وجہ سے مجھے اپنی خریداری میں دیر ہو جاتی ہے۔ اگلی دفعہ اپنے بابا سے یہ چیزیں منگوالینا۔" اس نے خفگی ظاہر کی۔

پھر اس نے فرخندہ کو مخاطب کیا۔ جو خاموش کھڑی تھیں۔

"اماں آپ کو چائے بنادوں۔" اس نے پیار سے پوچھا۔ ان کا موڈ آف تھا۔

"نہیں۔ بس جلدی سے کھانا تیار کرلو' سعد کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔" وہ حکم دے کر چلی گئیں۔

فرخندہ کے جانے پر اس نے اپنی بیٹی کو گلے سے لگالیا' جو آٹھ سال کی تھی اور جانتی تھی کہ اس کی ماں اپنی ماں کے گھر گئی تھی۔

"آپ نانی جان سے مل آئی ہیں نا' وہ کیسی ہیں' انہوں نے میرے متعلق پوچھا۔ بڑی خالہ نے میری گڑیا کا فراک سی دی کیا۔" اس نے بے قراری سے اپنے ننھیال والوں کے متعلق پوچھا۔ جو تین ماہ پہلے ماہ نور کی سالگرہ پر وہاں گئی تھی' اس کے بعد ان کے پاس وہاں جانے کا کوئی بہانہ نہ تھا۔ اور بہانہ مل بھی جائے تو فرخندہ کی بیماری کی وجہ سے وہ جانہ پاتی۔

"چُپ خاموش رہو' دادی جان کو پتا چل گیا تو وہ بہت غصہ ہوں گی۔" ماریہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ وہ آہستگی سے بولی۔

"مما' دادی جان ہمیں نانی جان کے گھر کیوں نہیں جانے دیتیں۔ جبکہ وہ تو آپ کی مما کا گھر ہے نا۔" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"اوہو۔ جانو' میرے بچے' ابھی تم بہت چھوٹی ہو' تمہیں سمجھ نہیں آئے گی کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہیں۔"

"اچھا۔ وہ بچی ہے' تو پھر مجھے سمجھادیں۔" سکینہ کچن کے دروازے پر کھڑی تھی۔

"تم کب آئیں؟" سکینہ کو دیکھ کر ماریہ مسکرائی۔

"بس ابھی جب تم آفرین کو سمجھا رہی تھیں۔"

"اور تم۔ میکے سے کب آئی ہو۔" اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"بس۔ ابھی ابھی۔"

"شکر ہے' آنٹی خورشید تمہیں لے آئیں' آؤ بیٹھو۔" اس نے کرسی سکینہ کو دی۔

وہ کرسی پر بیٹھ گئی اور آفرین کا گال چوم کر بولی۔

"کھانا پکانے میں انہیں تکلیف ہو رہی تھی اس لیے مجھے لینے آگئیں۔"

"سکینہ۔ پاگل مت بنو' تم اب ان کے گھر کا حصہ ہو۔" اس نے تسلی دی اور فریج سے جوس کی بوتل نکال لی۔

"بھابھی۔ میرے لیے جوس نہیں' ابھی ابھی کھانا کھا کر آئی ہوں۔" اس نے پیار سے نفی کی۔

"مما۔ آنٹی خورشید اور دادی اماں' ساس ہیں کیا۔" اس نے سکینہ کی طرف دیکھ کر ماریہ سے پوچھا۔

"ہاں۔ ساس ہیں' ساس کا مطلب بہو کا سانس دبانے والی۔" اس نے قہقہہ لگایا۔

"سکینہ باز آؤ' بچی ہے وہ۔" وہ خفگی سے بولی۔

"کل کو بچی کی شادی کرنی ہے' اس کی بھی تو ساس ہوگی' ابھی سے سمجھانا چاہیے۔" سکینہ نے ہنس کر جواب دیا۔

"آنٹی میں شادی نہیں کروں گی۔ مما میں شادی نہیں کروں گی۔ میری ساس بھی سکینہ آنٹی کی ساس کی طرح مجھے ماریں گی۔ دادی اماں کی طرح مجھے آپ سے ملنے نہیں دیں گی۔" وہ ماں سے لپٹ کر بولی تھی۔ جو کافی ڈری ہوئی لگ رہی تھی۔

"جانو! ایسی باتیں چھوٹے بچے نہیں سوچتے' چلو جاؤ' کارٹون دیکھو۔" اس نے پیار سے آفرین کا ماتھا چوم کر کہا تھا۔ وہ ماں کے پیار پر مطمئن سی ہو گئی۔

"ہاں۔ آفرین تم کارٹون جا کر دیکھو' میں تو مذاق کر رہی ہوں۔" سکینہ نے فکر مندی سے آفرین کے سر پر پیار دے کر کہا تھا۔ وہ کچن سے باہر چلی گئی۔

"اف بچے بہت سمجھ دار ہو گئے ہیں۔" سکینہ نے آہ بھری۔

"مگر بچوں کی دادی جان نہ سمجھیں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"بھابھی آپ چھپ کر میکے کیوں جاتی ہیں' جبکہ سعد بھائی تو آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔" سکینہ نے افسردگی سے پوچھا۔ اس کے اپنے میاں نواز سے تعلقات اچھے نہ تھے۔ وہ ماریہ کی ہمسائی تھی۔ اس کی شادی کو تین سال ہو رہے تھے۔ آنٹی خورشید بھی فرخندہ کی طرح کڑوی مزاج کی تھیں۔ دونوں دوستوں کے سر پر سپولوں کا خمار تھا۔ سکینہ اور ماریہ غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ سکینہ کے میکے

والے خورشید کی باتوں پر سر جھکا لیتے۔ اور اسے پھر رخصت کروا دیتے۔ اور سکینہ بھی مجبور ہمیشہ تواضع کی بار کھا کر واپس چلی آتی۔ وہ تین ماہ کے بعد واپس آئی تھی۔ اس لیے آتے ہی ماریہ کے پاس آ پہنچی۔ ماریہ اس کے دکھ کی ساتھی تھی۔ سکینہ کے پوچھنے پر وہ افسردگی سے بولی۔

"میکے جاتی ہوں تو اماں چوری کا الزام لگا دیتی ہیں۔"

"کیا۔ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" وہ حیرت زدہ ہو گئی۔

"ہاں۔ اس لیے اپنے میکے کی عزت کے لیے نہیں جاتی۔ گھر میں راشن کی کمی ہو جاتی تھی۔ تو وہ مجھے طعنے دیتی تھیں کہ میں ان سے چھپا چھپا کر گھر کا راشن اپنی ماں بہن کو دے جاتی ہوں۔"

"اف! فرخندہ آنٹی کی اتنی گھٹیا سوچ ہے، مجھے تو یقین نہیں آرہا۔"

"ہاں۔ کوئی نے تو یقین نہ کرے "اتنی امیر ہونے پر وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں پر تماشا کھڑا کر دیتی ہیں۔" اس نے آہ بھری۔

"اف خدایا! ہم غریب گھرانے کی لڑکیاں ہیں۔ اس لیے ایسا ظلم سہہ جاتی ہیں۔ کسی امیر کے ساتھ ایسا کریں تو انہیں ہزار جواب گالیوں کے ساتھ ملیں۔" سکینہ نے غصے سے جواب دیا۔

اس سے پہلے ماریہ لب کھولتی فرخندہ کی چیختی آواز ابھری۔

"سکینہ ری سکینہ اپنے گھر جا۔ خورشید بلا رہی ہے۔ تم لوگوں نے ہمارے خلاف بہت باتیں کر لی ہوں گی۔ دلوں کا چین مل گیا ہو گا۔ ہائے ہائے کوئی خدا کا بندہ ہے۔ جو مجھ بڑھیا کو پانی پلا دے۔" انہوں نے خود کو معصوم کہہ کر ماریہ تک صدا پہنچائی۔ سکینہ غصے میں کچن سے نکلی۔ جبکہ اس نے تیزی سے پانی کی بوتل فریج سے نکالی۔ اور پانی کا گلاس بھر کر کچن سے باہر بھاگی کہ کہیں فرخندہ کے طعنے شروع نہ ہو جائیں۔

☆ ☆ ☆

"یہ دیکھ سونے کا سیٹ۔" فاطمہ نے اپنی الماری میں سے ایک لال رنگ کا پرانا ڈبا کھول کر پری کی جھولی میں رکھ دیا۔

"واؤ۔ اماں! یہ سیٹ کہاں سے آیا۔" اس نے ہار کو اپنے گلے سے لگایا۔ اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ فاطمہ سنجیدگی سے بولیں۔

"تیرے لیے سنبھال کر رکھا تھا۔ بس تیری ساس کو پسند آجائے "میں تو دعا کر رہی ہوں۔" فاطمہ نے جھمکے اپنے دوپٹے سے صاف کرتے کہا تھا۔

"اماں۔ یہ سیٹ آپ نے پھوپھو جمیلہ کو دینا ہے۔" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں پگلی یہ تو تیرے لیے ہے "انہیں تو وہ بانو کے گھر جو کمیٹی پچاس ہزار والی ڈالی ہوئی ہے اس کے جھمکے بنوا کر دوں گی۔ بس انہیں پسند آجائے۔" وہ گرم جوشی سے بولیں۔

"اماں۔ مجھے یہ سیٹ پسند ہے۔ اب اس سیٹ کی فکر کرنا چھوڑ دیں۔" اس نے ڈبے میں ہار رکھ کر جواب دیا۔

"بیٹا تیری ساس کو بھی تو اچھا لگے۔ ورنہ ہمیشہ کے لیے کوئی بات نہ تیرے لیے بن جائے۔" انہوں نے ہار اٹھا لیا اور اسے بھی آہستگی سے اپنے دوپٹے سے صاف کرنے لگیں۔

"اماں۔ کیسی بات اور آپ یہ تحفہ مجھے دیں گی، پھر وہ کیوں ناراض ہوں گی۔" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"کون سب ساس جو تمہاری ہو گی "انہیں جو بات پسند ہو۔ اس پر تم خوش رہنا۔ جس بات سے منع کریں بس وہ بات چھوڑ دینا۔" فاطمہ نے پری کے سر پر پیار دے کر نصیحت دی۔

"مگر اماں۔ بھابی کنزہ تو ایسا کچھ نہیں کرتیں۔" اس نے ہنس کر کہا۔ وہ گھبرا کر بولیں۔

"میری بچی! ایسی کوئی بات نہ کرنا۔ جن سے وہ تم سے خفا ہو جائیں۔ ہم لوگ چھوٹے لوگ ہیں۔ کنزہ کے گھر والوں کی طرح امیر نہیں۔ جن کی بیٹی ان کے گھر پر بیٹھ جائے۔ تو لوگ باتیں نہیں کریں گے، بلکہ سسرال والوں کے خلاف بول اٹھیں گے۔"

"اماں۔ آپ اتنی پریشان کیوں ہو گئیں۔ میں تو مذاق کر رہی تھی۔" وہ یک دم افسردہ سی ہو گئی۔

"باتیں ختم ہو گئی ہوں تو ذرا کچن کو بھی دیکھ لو۔" کنزہ خفگی سجائے کمرے میں داخل ہو کر بولی۔

"اوہ۔ باتوں میں خیال ہی نہ رہا۔" فاطمہ نے مسکرا کر جواب دیا۔ اور سونے کا سیٹ الماری میں رکھ دیا۔

"میرے خلاف باتیں چل رہی ہوں گی۔ البتہ میں چور نہیں ہوں، جو آپ نے سونے کا سیٹ الماری میں چھپا لیا ہے۔" وہ طنزیہ لہجے سے بولی۔

"کنزہ۔ یہ سیٹ تمہارے لیے تھا، تم نے ناپسند کیا۔ اور بدلے میں تمہیں نیا بنوا کر دیا تھا۔" فاطمہ نے حیرانی سے دیکھا۔ جسے اب وہ سیٹ اچھا لگ رہا تھا۔

"میں پسند ناپسند کی بات نہیں کر رہی، میں تو آپ کے یوں ایک دم سیٹ رکھنے پر کہہ رہی ہوں کہ میں چوری نہیں کروں گی، پرانا سیٹ، مجھے چوری کی عادت نہیں۔ آپ لوگوں کی طرح۔" اس نے غصے سے کہا تھا۔

"بہو۔ بات کو کہاں لے کر چلی گئی ہو۔ میں نے تو تیزی اس لیے دکھائی کہ پری کو بخار ہے تو میں اس کے حصے کا کام کر دیتی ہوں، لو ابھی پھر تمہیں سیٹ نکال کر دیتی ہوں۔" فاطمہ نے پیار سے جواب دیا۔

"بس اماں۔ اپنی مکاریاں اپنے پاس ہی رکھیں، یہ مجھ پر نہیں چل سکتیں۔ آپ کے بیٹے پر چل جاتی ہیں اس لیے تو ابھی تک فائدے میں ہیں۔"

"کنزہ بھابھی کچھ تو اماں کی عمر دیکھ کر بات کر لیا کریں۔ کیا آپ کی اماں نے یہ سبق دیا ہے کہ اپنے سے بڑوں سے خوب بدتمیزی کی جائے۔" فاطمہ کے آنکھوں میں نمی تیرنے لگی، تو پری غصے سے پھٹ پڑی۔

"ہائے ہائے۔ تیور تو دیکھو مہلو رانی کے۔ ابھی امریکہ گئی نہیں اور زبان چلنے لگی۔" کنزہ نے طنزیہ لہجے سے پری کو گھور کر جواب دیا۔

"بھابھی۔ آپ کی بدتمیزی عروج پر پہنچ چکی ہے، اس لیے مجھے بولنا پڑا۔" وہ خفگی سے بولی۔

"ہائے ہائے ایسا کیوں نہیں کہتیں کہ امریکہ کا بندہ ملنے والا ہے، پیسوں کا رعب دکھا رہی ہو۔" کنزہ نے منہ بسور کر کہا۔

"بھابھی خدا کے لیے، میں آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتی۔" پری نے بے زاری سے جواب دیا۔

"پری خاموش رہو، کنزہ بڑی ہے تم سے۔" فاطمہ نے پری کو ڈانٹا۔

"نہ اماں رہنے دیں، یہ ڈراما ہے عزتی تو اس چھوٹی سی لڑکی نے میری کر دی۔" وہ روتی آواز سے بولی۔ جیسے پری نے اس کو گالیاں دی ہوں۔

"اصغر کو آنے دو "آج تو میں یہاں رہوں گی یا پھر تم لوگ۔" وہ رونے لگی۔ فاطمہ گھبرا سی گئیں۔

"نہیں کنزہ، میری بچی، پری تم سے معافی مانگتی ہے۔ تمہیں گھر چھوڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ چل پری بھابھی سے معافی مانگ۔"

"پہلے یہ آپ سے معافی مانگیں، تو میں ان سے معافی مانگ لوں گی۔" پری نے غصیلی نظر اس پر ڈال کر جواب دیا۔ فاطمہ نے پری کا بازو جھٹک کر غصے سے کہا۔

"میں کہہ رہی ہوں کہ بھابھی سے معافی مانگ۔" فاطمہ گھبرا سی گئیں کہ کہیں وہ اصغر کو ان سے جدا نہ کر دے۔

"دیکھ لیں، یہ کل کی لڑکی مجھ سے مقابلہ کر رہی ہے۔ میری روٹیوں پر پلنے والی بلی، مجھے ہی کاٹنے کو دوڑ رہی ہے۔" کنزہ نے غصے سے پری کو گھورا اور دل میں سوچا کہ کاش وہ اس کا رشتہ کرنے پر زور نہ دیتی۔

"آپ کے پیسے نہیں کھاتی "اپنے بھائی کی کمائی کھا رہی ہوں۔" پری نے بھی غصے پر ضبط نہ رکھا اور غصے سے جواب دے مارا۔

"بس کر پری، خدا کے لیے "میں تیرے ہاتھ جوڑتی ہوں۔" فاطمہ نے پری کو سنبھالا جو غصے سے کانپ رہی

تھی۔

"اماں! بھابھی نے آپ کو چور مکار کہا۔ میں کیسے چپ رہ سکتی ہوں' ہمارا قصور کیا ہے جو روز یہ ہمیں طعنے دیتی ہیں۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

"بھتیجی جیسی زبان چلانے کا اتنا شوق ہے تو اپنے سسرال جاکر چلانا۔ وہ منٹ میں کاٹ کر رکھ دیں گے۔ میری تو بددعا ہے تمہیں کہ تمہاری ساس تمہارا جینا دوبھر کردے اور تمہاری زندگی طعنوں میں گزرے۔" وہ پاؤں پٹخ کر بددعا دے کر چلی گئی۔ پری پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"بس میری بچی چپ ہوجا' کیا ضرورت تھی اسے جواب دینے کی۔" فاطمہ نے ناراضی دکھائی۔

"اماں۔۔۔ مجھے شادی نہیں کرنی' پلیز مجھے ڈاکٹر بنادیں۔ آپ کا اور اپنا پیٹ پالوں گی۔" اس نے روتے روتے کہا تھا جو اپنی بھابھی کی بات پر مزید شادی سے بددل ہوگئی۔ فاطمہ فکر مند دکھائی دینے لگیں۔

☼ ☼ ☼

فرخندہ نے رات کو کھانے کی ٹیبل پر لرزتی آواز میں کہا۔

"ایک وقت کا کھانا مجھے دینے میں تکلیف ہورہی ہے تو میں ماتو کے گھر چلی جاتی ہوں۔" سعد جو کھانا کھا رہا تھا اس نے فکر مندی سے نوالہ چباتے چباتے پوچھا۔

"اماں کھانا آپ کی پسند کا نہیں' تو ماریہ آپ کے لیے کچھ اور بنادیتی ہے۔" فرخندہ نے کھانے کی پلیٹ جو خود سے دور کردی تھی۔

"بس سعد! تم مجھے ماتو کے گھر چھوڑ آؤ بیٹی کے گھر پر رہوں گی تو کچھ سکون ملے گا۔" وہ اپنے سر کو دبا کر بولی تھیں۔

"اماں۔۔۔ آپ کیسی باتیں کررہی ہیں' یہ گھر آپ کا ہے۔ بیٹی کے گھر پر کبھی سکون نہیں ملے گا' آپ کو کھانے کا ذائقہ پسند نہیں تو ماریہ کچھ اور بنادیتی ہے۔" اس نے ماں کی ناساز طبیعت پر ماریہ کو دیکھ کر کہا تھا جو سعد کو پچھلے ہفتے سے بخار بتارہی تھیں۔

"اماں! دلیہ بنادوں۔" ماریہ نے کھانا چھوڑ کر پوچھا۔ آفرین کھانا کھاتے کھاتے حیران سی ہوگئی۔ جس نے دوپہر کو خورشید کے ساتھ دادی کو دہی بڑے کھاتے دیکھا تھا اور سارا دن ان کا خوش گوار گزرا تھا۔

"نہیں۔۔۔ یہ جھوٹی محبت تم اپنے پاس ہی رکھو' سعد میرا بیٹا جب گھر ہوتا ہے تو ہی یہ محبت امڈ امڈ آتی ہے۔ سارا دن تو میرا برے دل سے گزرتا ہے۔ دوپہر کے کھانے میں بھی سبزیاں پکا پکا کر تم میرے پیٹ میں درد کروادیتی ہو۔" وہ رونی آواز سے بولیں۔

"اماں۔۔۔ کب۔۔۔ میں نے تو ہمیشہ کھانا آپ کی پسند سے تیار کیا ہے۔" وہ حیرت زدہ سی ہوگئی۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ میں ہی جھوٹی ہوں' بری ہوں' محلے کی ہر عورت سے تم میری چغلیاں کرتی ہو' تم نے تو سوسائٹی میں مجھے بدنام کردیا ہے۔" وہ رونے لگیں۔

"خدایا اماں! ایسا ہرگز نہیں ہے۔ میں تو کسی کے گھر آتی جاتی نہیں ہوں۔ اماں مجھے بتائیں مجھے کس دن آپ نے باہر دیکھا ہے۔" سعد اسے خفگی سے گھورنے لگا تو وہ تڑپ اٹھی۔

"اچھا آج کتنی دیر تم لگا کر آئی ہو۔ شام چھ بجے گھر آئی تھیں۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں تم کدھر تھیں؟" فرخندہ نے اس کو غصے سے پوچھا۔ ماریہ جو اس ڈر سے باہر آچکی تھی کہ فرخندہ کو اسے میکے جانے کا شک نہیں ہوا۔ وہ بوکھلا سی گئی۔

فرخندہ کے شدید غصے پر سعد بھی اسے حیرت سے دیکھنے لگا کہ اس کے پیچھے کیا چل رہا ہے۔

"اماں۔۔۔ گھر کا سامان خریدتے دیر ہوگئی تھی۔" اس نے لرزتی آواز سے جواب دیا۔

"مجھے یقین نہیں آتا تم جھوٹ بول رہی ہو' آفرین کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ کہ تم مارکیٹ کے علاوہ کہیں نہیں گئیں۔" فرخندہ نے ماریہ کا زبردستی سے ہاتھ پکڑ کر آفرین کے سر پر رکھ کر کہا تھا۔ اس نے تیزی سے ہاتھ ہٹالیا اور رونے لگی۔ وہ کبھی سوچ نہیں سکتی تھی کہ فرخندہ اس کے لیے ایسی صور

حال پیدا کردیں گی۔

"دیکھ لے بیٹا' دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔" وہ اکڑا کڑ کر بولیں۔

"اماں خدا کے لیے میں کسی سے ملنے نہیں گئی تھی۔" وہ سعد کے غصے سے ڈرتے ڈرتے بولی۔ جس کی آنکھیں غصے سے لال ہوگئی تھیں۔

"ماریہ تم کہاں گئی تھیں' کس سے ملنے کے لیے' اور کب سے یہ چکر چل رہا ہے۔" سعد نے غصے سے پوچھا۔ آفرین باپ کے یک دم خفا ہونے سے سہم کر ماں سے لپٹ گئی۔

"سعد آپ مجھ پر شک کررہے ہیں۔" اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ جس سے اس کا چہرہ بھیگ گیا تھا۔

دس سال سے وہ ایک وفا شعار بیوی بن کر اس کی خدمت کررہی تھی۔ سعد کے یوں پوچھنے پر اس کا دل ٹوٹ گیا۔ اس کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ فرخندہ طنزیہ لہجے میں بولیں۔

"اگر ایسی کوئی بات نہیں تو آفرین کے سر پر ہاتھ رکھ لو۔"

"ماریہ میں پوچھ رہا ہوں کہ تم کہاں گئی تھیں اور کس سے ملتی ہو۔" سعد نے اس کا بازو جکڑ کر غصے سے پوچھا۔ جو سر جھکا کر اس کے سامنے گناہ گار بن کر کھڑی تھی۔ اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

"سعد۔۔۔ سعد۔۔۔ ایسا کچھ نہیں۔۔۔ جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ میں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی ہے۔ اماں مجھ پر جھوٹا الزام لگارہی ہیں۔" اس نے خفگی سے جواب دیا۔

سعد نے ایک زور کا طمانچہ اس کے گال پر رسید دیا۔ آفرین رونے لگی۔ ماریہ صوفے پر جاگری۔ اس سے پہلے سعد ماریہ کی طرف بڑھتا آفرین تڑپ کر بولی۔

"بابا۔۔۔ مما۔۔۔ نانی جان کے گھر گئی تھیں۔۔۔ نانی جان کے گھر میں بھی چھپ کر نانی جان کے گھر ان کے ساتھ جاتی ہوں۔" وہ روتے روتے بولی۔

"کیوں؟" وہ حیرت زدہ سا ہوگیا۔

"چھپ کر کیوں؟" وہ ماریہ کو حیرانی سے دیکھنے لگا۔ جس نے اسے اجازت دے رکھی تھی کہ وہ کبھی بھی اپنے میکے جاسکتی ہے۔

"دادی جان۔۔۔ ہمارے وہاں جانے پر چوری کا الزام لگادیتی ہیں کہ مما چیزیں چرا چرا کر نانی جان کو دیتی ہیں۔ جبکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ نانی جان تو ہمیشہ مجھے بہت سی چیزیں دے کر گھر بھیجتی ہیں۔" فرخندہ اپنے راز کھل جانے پر ڈر سی گئیں۔

"اماں۔۔۔ کیا آپ نے منع کیا ہے؟" وہ ماں کی طرف دیکھ کر بولا۔

"وہ۔۔۔ بیٹا۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔" فرخندہ گھبراہٹ سے بول نہ سکیں۔

"بابا۔۔۔ دادی جان کو روز مما اچھے اچھے کھانے بنا کر دیتی ہیں' جبکہ کبھی کبھی تو وہ جان بوجھ کر نقص نکال دیتی ہیں اور جب دوسرا سالن ان کے سامنے آتا ہے تو وہ پہلے والا مانگتی ہیں۔" آفرین نے سعد کو گھر کی تمام صورت حال روتے روتے بتائی۔

"بس۔۔۔ چپ کر۔۔۔ تیری ماں نے تجھے ایسا کہنے کو کہا ہوگا۔ سعد میرے بچے' یہ ماں' بیٹی آپس میں مل گئی ہیں۔" وہ آفرین کو جکڑ کر بولی تھیں۔

"اماں۔۔۔ خدا کے لیے' ماریہ تو غیر ہے۔ مگر آفرین تو آپ کا خون ہے اور وہ آٹھ سال کی بچی ہے۔ یہاں پر کون جھوٹ بول رہا ہے مجھے اندازہ ہے۔ اور میں نہیں چاہتا کہ میں اپنی بچی کے سامنے کچھ آپ کو الٹا سیدھا کہوں اس لیے بہتر ہے کہ آپ آفرین کو چھوڑ دیں۔" سعد نے غصے سے ماں کو کہا تھا۔ فرخندہ نے آفرین کا بازو چھوڑ دیا اور شرمندگی سے نظریں جھکالیں۔

"بابا جانی' مما چھپ کر اس لیے گئی تھیں پری خالہ کی شادی کا مسئلہ تھا۔ میں بھی ساتھ جانا چاہتی تھی مگر مما نے کہا تھا جب تمہارے بابا کسی دن آفس سے گھر جلدی آجائیں گے تو پھر چلے جائیں گے۔۔۔ پلیز بابا جانی' مما کو مت ماریے۔" وہ ماں کے سینے سے لپٹ کر

بولی تھی۔

سعد بیٹی کی بات پر شرمندہ سا ہو گیا۔ اور اس نے سر جھکا لیا۔ پھر وہ شرمندگی میں ماریہ کے پاس صوفے پر آ بیٹھا۔ فرخندہ اپنے کمرے میں منہ بسور کر چلی گئیں انہوں نے جو گڑھا کھودا تھا اس میں وہ خود اپنے بیٹے کی نظروں میں گر گئی تھیں۔

"تم نے اماں کے خلاف بات کیوں نہیں کی۔" وہ پیار سے بولا۔ وہ روتے روتے بولی۔

"گھر کے سکون کے لیے۔"

"اور آج مجھ سے کچھ الٹا سیدھا ہو جاتا تو۔" وہ خفگی سے بولا۔

"کچھ ہوا تو نہیں۔" اس نے لرزتی آواز میں جواب دیا۔

"میرا ہاتھ تم پر اٹھ گیا۔" اس نے شرمندگی سے کہا اور اپنے ہاتھ کی طرف دیکھنے لگا۔

"آپ کی محبت تھی میں آپ سے خفا نہیں ہوں، شاید آپ کی جگہ کوئی بھی مرد ہوتا تو اس کا رد عمل ایسا ہی ہوتا۔"

"پپا جانی۔ مما آپ سے بہت محبت کرتی ہیں۔" آفرین شریر لہجے میں بولی۔

"چپ۔ چلو۔ جاؤ۔ اپنا ہوم ورک کرو۔" وہ اس پر غصہ ہوئی۔ آفرین ہنس کر ان دونوں کو اکیلے چھوڑ کر چلی گئی۔

"کل میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔ اور تمہیں تمہاری اماں سے ملوا لاؤں گا۔" اس نے ماریہ کا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔

"نہیں سعد، میں اماں کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہتی۔ اس طرح ان کے دل میں میرے لیے اور کڑواہٹ بھر جائے گی۔ مجھے اپنے گھر میں جھگڑا نہیں چاہیے۔ جھگڑے سے صرف گھر تباہ ہوتا ہے۔" اس نے سنجیدگی سے بات کا جواب دیا۔

سعد نے اس کو اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا اور پیار سے کہا۔

"تم بہت اچھی ہو۔" اور اس نے ماریہ کا گال چوم لیا۔ وہ اسے مزید پرسکون دکھائی دے رہا تھا جو جانتا تھا کہ اس کی بیوی کبھی اس کی ماں کا دل دکھانا نہیں چاہتی۔ اور ایک مرد کے لیے یہ بات بہت اہمیت رکھتی ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے کمرے میں غصے سے ٹہلنے لگیں۔

"پری کی شادی امریکہ کیسے طے ہو سکتی ہے۔ ان بھکاریوں کے گھر پر ایسا رشتہ کیسے آ گیا ہے۔ اف خدایا۔ اگر یہ شادی ہو گئی تو ماریہ کے نخرے آسمان کو چھونے لگیں گے۔ ابھی تو یہ میرے قبضے میں ہے۔ بہن نے ڈالروں سے مدد کر دی۔ تو اپنا نیا گھر بنائے گی اور مجھے باہر نکال پھینکے گی۔ یہ شادی نہیں ہونی چاہیے۔ آفرین کی بات سے اتنا تو اندازہ ہو گیا ہے کہ شادی میں کوئی مسئلہ ہے، مجھے وہ مسئلہ جاننا ہو گا۔ شاید وہ میرے کچھ کام آ سکے۔" انہوں نے ٹہلتے ٹہلتے سوچا اور پھر سیل فون بیڈ سے اٹھا لیا۔

"مجھے کنزہ سے پوچھنا چاہیے۔" اس نے کنزہ کا نمبر ڈائل کر کے کال لگا دی۔

"ہیلو۔" دوسری طرف سے کنزہ کی تیز آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ انہوں نے خود کو بمشکل سنبھالا۔

"کیسی ہو کنزہ۔" وہ پیار سے بولیں۔

"ہائے ہائے آنٹی فرخندہ، میں ٹھیک ہوں۔ بس ایک آپ ہی ہیں جو مجھ سے محبت کرتی ہیں۔ ورنہ اس گھر میں تو سب میری جان کے پیچھے پڑے ہیں۔" اس نے اپنی عادت کے مطابق خود کو مظلوم اور اپنے سسرال والوں کو ظالم قرار دیا۔

"تمہاری آواز کچھ بجھی بجھی سی لگ رہی ہے۔ کچھ ہوا ہے کیا؟" فرخندہ نے فکر مندی دکھائی۔

"ہاں۔ آنٹی فرخندہ ابھی ابھی میری نند سے میرا جھگڑا ہوا ہے۔" وہ تیکھے لہجے میں بولی۔

"پری کے ساتھ۔ کیا وہ تمہارے سامنے کیسے بول پڑی؟" انہوں نے چالاکی سے پوچھا۔

"پری، آنٹی وہ معصوم پری نہیں رہی۔ اسے امریکن پر لگ گئے ہیں۔ اس کا رشتہ امریکہ طے ہوا ہے۔ اب تو میرے ساتھ اور ظلم ہوں گے۔ اب ان لوگوں کے پاس بھی دولت آ جائے گی۔ ہائے کیا بتاؤں۔ یہاں اصغر بھی ان کی بولی بول رہا ہے۔ پری کی شکایت کی تو الٹا مجھے ہی ڈانٹ پڑی۔ ہائے ہائے میں نے کیا بے وقوفی کر دی۔ کنواری رہتی تو اسے میرے آگے بولنے کی جرأت نہ ہوتی۔" وہ بولتی چلی گئی۔ فرخندہ نے اپنے ہاتھوں سے کنپٹی کو رگڑا جو جانتی تھیں کہ اس جیسی بہو بھی خود پر ظلم برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ افسردگی سے بولیں۔

"مجھے افسوس ہوا کہ وہ عمر میں تم سے چھوٹی ہے اور بدتمیزی کرتی ہے۔" فرخندہ نے اس کی سائیڈ لی۔ کنزہ سے دوستی کا مقصد صرف اور صرف ماریہ کی خبریں لینا تھا۔ ورنہ فرخندہ کبھی کنزہ جیسی بد اخلاق لڑکی سے دوستی نہ رکھتیں اور اس دوستی کو کسی کو خبر نہ تھی۔

"بس آپ دعا کرنا۔" وہ روہانسی آواز سے بولی۔

"کنزہ۔ شادی میں کوئی مسئلہ تھا کیا؟ مجھے کچھ معلوم ہوا ہے، اس لیے کال کی۔" فرخندہ نے فکر مندی سے پوچھا۔

"ہاں۔ نواب زادی شادی کے لیے رضامند دل سے نہیں۔ ڈرتی ہے کہ شادی شدہ لائف کیسے سنبھال پائے گی۔ آپ تو جانتی ہیں، ابھی سترہ سال کی ہو رہی ہے۔ عمر کم ہے اور لوگوں کی ساس کے قصے سنتی رہتی ہے۔ اس لیے خوف زدہ ہے۔ میں تو دعا کر رہی ہوں کہ بیچ میں نہ ہو جائے۔ کم از کم میرا راج تو برقرار رہے گا۔"

"ہاں۔ تمہارے راج کے ساتھ ساتھ میرا راج بھی ڈگمگانے لگا ہے۔ ماریہ تو میرا ابھی ہر حکم مانتی ہے۔ پری کی شادی ہو گئی تو ضرور اپنے، بہن بھائی کی مالی مدد کرے گی۔ جمیلہ کے پاس تو بے تحاشا دولت ہے۔ اس نے تو کئی فلاحی ادارے وہاں پر کھولے ہوئے ہیں۔"

"ہمیں یہ شادی روکنی چاہیے۔"

"مگر کیسے؟" کنزہ نے روتی آواز میں کہا۔

"میرے پاس ایک پلان ہے۔" فرخندہ نے کچھ لمحے سوچا اور پھر مسکرا کر بولیں۔

"کیسا پلان۔ کیا میں جان سکتی ہوں۔" کنزہ نے تجسس سے پوچھا۔

"بس تمہیں ایک کام کرنا ہو گا۔" فرخندہ نے گرم جوشی سے کہا۔

"کیا۔ کام۔ شادی توڑنے کے لیے میں ہزار کام کر جاؤں۔ جلدی جلدی بتائیں۔" وہ خوشی خوشی بولی۔

"تمہیں پری کو میرے گھر کل بھیجنا ہو گا۔" فرخندہ نے ہنستے ہنستے کہا۔

"آپ کے گھر۔ وہ کیوں؟" وہ سوچ کر بولی۔

"بس۔ تم بھیجو، پھر دیکھنا کیا ہو گا۔ مجھے امید ہے کہ تمہیں بہت جلد خوش خبری مل جائے گی۔"

"سچ میں۔" وہ چیخی۔

"ہاں۔" فرخندہ نے پراعتماد ہو کر جواب دیا۔

"اچھا۔ اچھا میں رکھتی ہوں اصغر آ گئے ہیں، وہ ماہ نور کو آئس کریم کھلانے لے کر گئے ہوئے تھے۔ کہیں ان کو پتا چل گیا تو قیامت آ جائے گی، میں رکھتی ہوں، اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ، کل یاد سے بھیج دینا۔" فرخندہ نے پھر سے اسے تاکید کی۔

"ہاں۔ ہاں آپ فکر نہ کریں۔" اور دوسری طرف سے فون کٹ ہو گیا۔ فرخندہ سمجھ گئیں کہ اصغر کمرے میں آ گیا ہے۔ وہ بستر پر خوشی خوشی لیٹ گئیں کہ کل وہ ماریہ کے سب خواب توڑ دیں گی۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح کنزہ نے اصغر کے دفتر جانے کے بعد اپنے پلان پر کام کرنا شروع کیا۔ وہ جلدی سے کچن میں گھس گئی اور سب کے لیے ناشتا تیار کر لیا اور دوپہر کے لیے ہنڈیا بھی رکھ دی۔ پری کچن میں پہنچی جو کل رات کے جھگڑے کی وجہ سے دیر سے کچن میں آئی تھی کہ کہیں کنزہ پھر کوئی مسئلہ نہ کر دے۔ وہ حیران رہ گئی۔ جب

اس نے ناشتے کی ٹرے اسے تھمائی۔

"پری۔۔ اماں اور تمہارے لیے میں نے ناشتا تیار کرلیا ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولی اور پراٹھا کو بھوننے لگی۔

"بھابھی۔۔ آپ نے کیوں تکلیف کی؟" وہ ماریہ کے یوں رنگ بدلنے پر حیران تھی۔

"بس۔۔ کچھ دن تو تمہارے یہاں رہ گئے۔ پھر تم امریکہ چلی جاؤ گی۔ میں تمہارا دل دکھانا نہیں چاہتی تھی نہ جانے وہاں۔۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ پری ڈر سی گئی۔

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں تمہارے بھائی جان ہیں نا کوئی ایسی ویسی بات کہیں ہونے دیں گے۔" اس نے پیار سے مسکرا کر اسے تسلی دی۔ وہ ناشتے کی ٹرے اٹھا کر ماں کے کمرے میں چلی آئی۔

"ارے۔۔ اتنی جلدی ناشتا تیار کرلیا۔ کیا بات ہے۔ میری بیٹی اتنی جلدی اتنی سگھڑ ہو گئی۔" فاطمہ نے سلائس پر جیم لگا کر خوشی سے کہا۔ وہ افسردہ ہو گئی۔ اس کے ذہن میں کنزہ کی باتیں گونج رہی تھیں۔

"وہاں اس کے ساتھ کوئی مسئلہ نہ ہو جائے۔" اس نے بے دلی سے چائے کا سپ لیا۔

فاطمہ نے چائے کا کپ تھاما' وہ ناشتا کرچکی تھیں' جبکہ پری کا ناشتا پلیٹ میں ہی پڑا رہ گیا۔

"کیا بات ہے۔" فاطمہ نے چائے کا سپ لے کر پوچھا۔

"اماں۔۔ وہ بھابھی۔۔ چلیے چھوڑیے۔" وہ بے زاری سے بولی۔

"کنزہ نے پھر تو کچھ کہہ نہیں دیا۔ بول میری بچی۔ کیا بات ہے۔" وہ گھبرا کر بولیں۔ اور چائے کا کپ ٹرے میں رکھ دیا۔

"نہیں اماں' کنزہ بھابھی نے تو یہ ناشتا تیار کیا ہے۔"

"کیا؟" ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"ہاں۔ اماں سچ میں۔" وہ مسکرائی۔

"ایسے کیسے ہو سکتا ہے' سورج مغرب سے نکل آیا۔ اللہ نے میری رات کی دعائیں اتنی جلدی قبول کرلیں۔" وہ مسکرا کر کہنے لگیں۔

"اماں۔۔ اماں۔" کنزہ کی آواز کمرے کے پاس سے آئی۔ کنزہ مسکراتے ہوئے کمرے میں آئی اور دونوں کے پاس آبیٹھی۔ اور گرم جوشی سے بولی۔

"اماں آپ کا من پسند ساگ بنا رہی ہوں۔ سرسوں کا ساگ۔"

"سچ۔" فاطمہ خوش سی ہو گئیں۔ انہیں ساگ بہت پسند تھا۔ مگر کنزہ کو ناپسند ہونے کی وجہ سے وہ ساگ نہیں بناتی تھیں۔

"تم نے تکلیف کیوں کی؟" فاطمہ نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا مگر دل ہی دل میں وہ حیران بھی تھیں کہ کنزہ کا برتاؤ ایک دن کے بعد کیسے بدل گیا۔ پھر سوچا شاید اصغر نے سمجھایا ہو۔

"پری کے لیے میں نے کچھ کپڑے پیٹی سے نکالے ہیں۔ اماں آپ درزی کو دے آئیں۔ بیٹی کو خالی ہاتھ رخصت تو نہیں کرنا۔" وہ پری پر نظریں رکھ کر بولی۔ جو سوچوں میں گم تھی۔

"کہیں وہاب نے وہاں میم نہ رکھی ہو۔ ایسے میں اس کی زندگی کیا ہوگی۔"

"نہیں بھابھی مجھے کچھ نہیں چاہیے' جو چاہیے تھا' آپ لوگوں نے اس بات پر انکار کردیا۔" اس نے افسردگی سے جواب دیا اور چائے کا کپ ہونٹوں سے لگالیا۔

"مانگ کر تو دیکھو میں خرید دوں گی۔" وہ گرم جوشی سے بولی۔

"بھابھی مجھے اپنی تعلیم جاری رکھنا تھی۔ مگر۔۔" اس نے فاطمہ کو اپنی بات پر یک دم افسردہ دیکھا۔ تو بات ادھوری چھوڑ دی۔ کنزہ بھی سوچ میں پڑ گئی۔ مگر پھر مسکرا کر بولی۔

"اماں ہمیں لڑکے والوں سے بات کرنی چاہیے کہ شادی کے بعد ہماری بچی پڑھنا چاہتی ہے' شاید کوئی حل نکل آئے۔" وہ چالاکی سے بولی۔ پلان کے مطابق وہ اس بات تک پہنچ رہی تھی۔

"ہاں بہو' تم صحیح کہہ رہی ہو' ہمیں جمیلہ سے بات کرنی چاہیے۔ پری ماشاءاللہ ذہین ہے اور ڈاکٹر بنے گی تو وہاب کے خاندان والے بھی خوش ہوں گے۔"

"اماں آپ ماریہ سے بات کریں۔ وہ جمیلہ آنٹی سے بات چیت کرتی ہے۔ آپ کی بات پر وہ کہیں برا نہ مان جائے۔"

"ہاں۔۔ مجھے بات کرنے کا اتنا بھی سلیقہ نہیں۔ ماریہ سے بات کروں گی۔" فاطمہ نے خوشی سے پری کے سر پر پیار دے کر کہا تھا۔ کنزہ سنجیدگی سے بولی۔

"اماں ماریہ نہ جانے کب چکر لگائے۔ آپ پیغام بھجوا دیں۔ وہ فون پر جمیلہ آنٹی سے بات کرنے کی کیا خیال ہے؟" کنزہ نے گرم جوشی سے پری کو دیکھ کر بات سامنے رکھی۔

"اماں۔۔ اماں۔۔ میں ماریہ آپی کے گھر جاتی ہوں۔ اسی بہانے فرخندہ آنٹی سے بھی مل لوں گی۔" پری نے معصومیت سے کہا۔

"ہاں۔۔ چلی جاؤ' مگر سوچ لو کنزہ کوئی بات بگڑ نہ جائے۔" فاطمہ کو کنزہ کی طرف سے پری کے لیے بے یقینی سوچ میں ڈال رہی تھی۔ اس لیے انہوں نے آدھی بات کر کہا تھا۔

"اماں۔۔ آپ فکر نہ کریں' پری تم جاؤ' اور کپڑے بھی درزی کو دے آنا۔" پری کا چہرہ کھل سا اٹھا۔ اس نے ماں کا ہاتھ تھام لیا اور پیار سے بولی۔

"اماں میں جاؤں۔"

"ہاں جاؤ' مگر جلدی آجانا۔" فاطمہ نے اسے اجازت دے دی۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔

کنزہ دل ہی دل میں مسکرانے لگی کہ اس کی خوشیوں کے دیے بجھنے میں چند پل رہ گئے ہیں۔

☼ ☼ ☼

پری کے گھر سے نکلنے کے بعد وہ فوراً اپنے کمرے میں پہنچی۔ اس نے فرخندہ کو پیغام دینا تھا کہ اس نے اپنا کام مکمل کرلیا ہے۔ اور پری اس کی طرف آرہی ہے۔

کنزہ کو اپنا سیل تو نہ ملا۔ البتہ اصغر کا سیل فون مل گیا۔ وہ اصغر کا سیل فون دیکھ کر گھبرا سی گئی۔ اور منہ میں بڑبڑائی۔

"کہیں وہ میرا سیل فون تو آفس نہیں لے گئے۔ اوہو۔۔ مائی گاڈ۔" وہ خوف زدہ سی ہو گئی۔ اس نے جلدی سے فرخندہ کو کال ملائی۔ مگر نیٹ ورک نہیں مل رہا تھا۔ وہ غصے سے بولی۔

"اس نیٹ ورک نے بھی آج ہی خراب ہونا تھا۔" اس نے جلدی سے میسج ٹائپ کیا۔ مگر نیٹ ورک کے خراب ہونے سے میسج نہیں جا رہا تھا۔ وہ فکر مند سی ہو گئی اور دعائیں مانگنے لگی کہ اصغر کو اس کی آنٹی فرخندہ سے دوستی کا پتا نہ چل جائے۔

☼ ☼ ☼

وہ گھر کی صفائی سے فارغ ہو کر کچن میں آ کھڑی ہوئی۔ فرخندہ ابھی تک اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی تھیں۔ ماریہ نے سوچا شاید وہ اپنے کل کے رویے پر شرمندہ ہیں۔ سعد کو جوان کی اصلیت کا علم ہو گیا ہے۔ ماریہ نے فرخندہ کے لیے آلو گوشت بنانے کی غرض سے آلو فریج سے نکالے کہ اسے اپنے پیچھے سے سکینہ کی آواز آئی۔

"بھابھی۔۔ بھابھی۔" وہ ہانپ رہی تھی۔ اس کی کیفیت دیکھ کر ماریہ کے ہاتھ سے آلو کی ٹوکری چھوٹ گئی۔ اس کا چہرہ پیلا پڑا ہوا تھا۔ ماریہ نے فرش سے آلو اٹھاتے اٹھاتے فکر مندی سے پوچھا۔

"کیا بات ہے' اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟"

"بھابھی۔۔ وہ پری کے خلاف سازش کی گئی ہے۔" اس نے ہانپتے ہانپتے بتایا۔

"پری کے خلاف سازش' میری بہن پری' کس نے' سکینہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" ماریہ اپنی بہن کا نام سن کر گھبرا سی گئی تھی۔

"بھابھی۔۔ میں نے آنٹی فرخندہ اور اپنی ساس کی باتیں سنی ہیں۔ وہ لوگ آپ کی بہن کو ورانے کے لیے پلان بنا چکی ہیں اور میرے خیال میں پری راستے میں

ہوگی۔ اس میں آپ کی بھابھی کنزہ بھی شامل ہیں۔"
"کیسا پلان؟" ماریہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
"آپ کی بہن کی شادی امیر گھرانے میں نہ ہو، اس کے لیے فرخندہ آنٹی نے سوچا ہے۔ کہ وہ پری کے سامنے آپ کی خوب بے عزتی کریں گی۔ کہ پری کا دل ٹوٹ جائے اور وہ شادی سے انکار کر دے۔"
"مگر کیوں۔۔۔ وہ ایسا کیوں کر رہی ہیں۔ پری نے ان کا کیا بگاڑا ہے۔" ماریہ کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ وہ فرخندہ کے اچانک حملے پر گھبرا سی گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی بہن کے سامنے فرخندہ نے اسے ذلیل کیا تو وہ ڈر سی جائے گی۔ سکینہ افسردگی سے بولی۔
"فرخندہ آنٹی کو ڈر ہے کہ اس کی شادی ہونے کے بعد وہ آپ کو سپورٹ کرے گی۔ اور کہیں امریکہ نہ بلوا لے۔" سکینہ نے خورشید اور فرخندہ کی فون پر جو باتیں سنی تھیں اس نے ڈرتے ڈرتے بتا دیا کہ کہیں فرخندہ کو یہ علم نہ ہو جائے کہ اس نے ماریہ کو پہلے سے آگاہ کر دیا ہے۔
"سکینہ مجھے کیا کرنا چاہیے، مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔" وہ گھبرا سی گئی۔
"فرخندہ آنٹی کہاں ہیں۔" سکینہ نے آہستگی سے پوچھا۔
"وہ اپنے کمرے میں ہیں۔" وہ لرزتی آواز سے بولی۔
"اف وہ پھر فون پر میری ساس سے باتیں کر رہی ہوں گی، مجھے اب گھر جانا ہوگا۔ کہیں فرخندہ آنٹی میری ساس کو میری اطلاع نہ دے دیں۔" اس نے گھبرا کر کہا تھا۔
"مجھے کیا کرنا چاہیے؟" ماریہ نے فکرمندی سے پوچھا۔
"بس اللہ تعالیٰ دعا مانگیں کہ وہ آپ کے حق میں بہتر کرے۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا جیسے کوئی حل نہیں مل رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے کیا کرنا چاہیے، کیا ہوگا پری کے سامنے میری تذلیل، وہ کیا سوچے گی کہ میں نے کتنے جھوٹ ان لوگوں سے بولے ہیں، اف خدایا، میرا ساتھ دے مجھے راستہ دکھا۔" وہ رونے لگیں۔
"مما۔۔۔ مما۔۔۔ آپ کیوں رو رہی ہیں، کیا ہوا۔"
"آفرین میری بچی، تمہاری مما بہت پریشان ہیں، اللہ سے دعا کرو کہ وہ مجھے راستہ دکھائے۔"
"مما۔۔۔ آپ چپ ہو جائیں۔ میں دعا کرتی ہوں، مما آپ پلیز چپ ہو جائیں۔ آپ ڈرو مت، میں بابا جانی سے بات کروں گی۔"
"نہیں بیٹا میں ڈر نہیں رہی، مجھے پری کا ڈر ہے کہ وہ میری بے عزتی دیکھ کر کیا اثر لے گی۔" اس نے روتے روتے کہا۔
"مما کون آپ کی بے عزتی کرنے والا ہے؟" وہ گھبرا سی گئی۔
"آفرین۔۔۔ تم باہر گیٹ کو تالا لگا دو اور پری خالہ کے لیے دروازہ مت کھولنا۔" وہ گھبرا کر بولی۔
"مما، دادی جان سب کے ساتھ اچھی رہتی ہیں، پھر آپ کو دیکھ کر وہ کیوں منہ بسورتی ہیں۔" اس نے حیرت سے پوچھا۔
"بس وہ اس گھر میں اپنی حکمرانی چاہتی ہیں، ان کو لگتا ہے میرا وجود ان سے وہ رتبہ چھین لے گا، جبکہ ایسا میں نے کبھی نہیں سوچا۔"
"جی، تو اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ آپ سے ڈرتی ہیں۔" اس نے معصومیت سے جواب دیا۔
"کیا؟" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔
"ڈر۔۔۔ ڈر۔۔۔"
"کیوں کیا ہوا مما؟" اس نے ماں کو سوچ میں ڈوبا پایا تو اس سے پوچھا۔ ماریہ نے اپنے آنسو پونچھے۔ اور پھیکی مسکراہٹ اپنی بیٹی کو دی۔
"آفرین اللہ تعالیٰ نے تمہاری دعا سن لی ہے، مجھے راستہ مل گیا ہے۔" وہ سکون سے بولی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آج سارے خواب توڑ کر چکنا چور کر دوں گی، ایسے بے عزتی کروں گی کہ اس کی بہن ننگے پاؤں بھاگ کھڑی ہوگی۔"
"فرخندہ تم نے کمال کا سوچا، کچھ ترکیب مجھے بھی بتاؤ۔ کہ نواز کو کیسے سکینہ سے دور رکھوں۔ نواز کے دل میں وہ اپنی کافی جگہ بنا چکی ہے اور اب تو وہ امید سے بھی ہے۔ میں تو ہاتھ نہیں اٹھا سکتی۔"
"اوہو۔۔۔ خورشید تم فکر نہ کرو، اچھا ہے بچوں والی ہو جائے گی۔ تو پھر کوئی اور قدم نہیں اٹھائے گی۔ تمہاری نوکرانی بنی رہے گی، بچے ماں کی کمزوری ہوتے ہیں۔ ماریہ بھی تو اپنی بچی کی خاطر میری باتیں برداشت کر لیتی ہے۔" وہ ہنس کر بولیں۔
"ویسے اک بات بولوں فرخندہ۔ برا نہ ماننا۔" خورشید آہ بھر کر بولی۔
"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ کیوں نہیں۔" فرخندہ نے سنجیدگی سے کہا۔
"تمہاری بہو میری بہو سے کافی اچھی ہے۔ جو تمہاری ہر بات پر چپ رہتی ہے۔ سکینہ کی طرح منہ پھٹ نہیں ہے۔ ماریہ اچھی لڑکی ہے۔"
"کیا۔۔۔ اتنی اچھی لگ رہی ہے تو جاؤ، اس سے دوستی کر لو۔" فرخندہ اس کی تعریف پر بھڑک اٹھیں۔
"اوہو۔۔۔ میں تو بات کر رہی ہوں۔۔۔ صرف۔"
"تمہیں میرے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں رہی۔" فرخندہ نے خفگی سے کہا۔
"اوہو۔۔۔ بات کو سوچو، ابھی سکینہ کو گھر نہ لاتی، تو ماسی بتول تو گھر کا صفایا کر جاتی ہیں، کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ ہم بھی تو کبھی بہوئیں تھیں۔"
"اچھا۔۔۔ میں فون رکھتی ہوں، میرا سر درد کر رہا ہے۔" فرخندہ کو خورشید کی بات اچھی نہ لگی۔ اور انہوں نے اللہ حافظ کہہ کر فون کاٹ دیا۔ خورشید فون دیکھ کر مسکرانے لگی۔
جو جانتی تھی کہ فرخندہ اس سے خفا ہو گئی ہے۔ مگر وہ فکرمند نہ ہوئی، اسے اندازہ تھا کہ ماریہ کے خلاف چغلیاں کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی اور نہیں سوائے اس کے۔

☼ ☼ ☼

بیل بجی تو آفرین نے کہا۔
"مما۔۔۔ خالہ پری آگئی ہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔
"جاؤ۔۔۔ دروازہ کھولو۔" آفرین بھاگ کر مین گیٹ کھولنے چلی گئی۔
فرخندہ بھی اپنے کمرے سے باہر آگئیں۔ ماریہ نے ایک گہری نظر ان پر ڈالی، تو وہ اکڑ کر بولیں۔ جو جانتی تھیں کہ گیٹ پر پری ہے۔
"میرا ناشتا کون بنائے گا۔" ماریہ کے لبوں پر مسکراہٹ ابھر گئی۔
"جی اماں، ابھی بنا دیتی ہوں۔" فرخندہ نے جس انداز سے پوچھا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ ماریہ انہیں ناشتے کے لیے منع کر دے گی، مگر جواب الٹا ملا۔ تو وہ حیران رہ گئیں۔ انہوں نے اپنا غصہ پری کو دیکھ کر مزید بڑھا لیا اور اونچی آواز سے بولیں۔
"سارا دن میرے بیٹے کی کمائی پر عیش کرتی ہو، تمہیں میں نے یہ زندگی بخشی ہے، تم میرے قدموں کی خاک ہو۔" پری جو ہال میں آپہنچی تھی۔ آنٹی فرخندہ کی بات پر گھبرا سی گئی۔ ماریہ نے پری کو دیکھا۔ اور پیار سے بولی۔
"آؤ پری۔۔۔ کیسی ہو، آجاؤ۔" اس نے فرخندہ کی بات کو ان سنی کر کے پری کو پکارا۔
"اپنے میکے والوں کو بھی میرے بیٹے کی کمائی کھانے کے لیے مدعو کر لیا۔ جیسی تم ویسی تمہاری بہن۔" اس نے غصے سے پری کو دیکھ کر کہا تھا۔ پری کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے آفرین کی طرف دیکھا تو اس نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔
"خالہ پری آپ بیٹھو، میں آپ کے لیے جوس لاتی ہوں۔" آفرین کے یوں نارمل ردعمل پر پری حیرت میں پڑ گئی۔
ماریہ کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو فرخندہ کی آواز مزید اونچی ہو گئی۔ وہ چیخیں۔
"میں تمہیں اس گھر میں اپنی من مانی نہیں کرنے

دوں گی۔" انہوں نے انگشت شہادت اٹھا کر کہا تھا۔
فرخندہ کے اس رویے پر پری چکرا کر صوفے پر گر پڑی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس کی بہن کیسے مطمئن ہے۔ جو آفرین کو آواز دے کر کہہ رہی تھی۔
"خالہ پری کے لیے انناس جوس لے کر آؤ اور برف بھی ڈالنا۔"
"آپا۔ آنٹی فرخندہ آپ سے مخاطب ہیں۔" پری نے فرخندہ کو غصے میں سانس لیتے دیکھ کر بہن سے کہا تھا جو اپنی ماں کے متعلق پوچھ رہی تھی۔
"اماں۔ آپ مجھ سے مخاطب ہیں۔" وہ انجان بن کر فرخندہ کی طرف دیکھ کر بولی تھی۔ فرخندہ حیرت زدہ رہ گئیں کہ ماریہ جیسی حساس دل رکھنے والی اپنے آنسو کیوں نہیں نکال رہی وہ تو کچھ اور چاہتی تھیں کہ ماریہ ان کے سامنے ہاتھ جوڑتی ان کے چیخنے پر معافی مانگتی اور وہ اسے خوب ذلیل کرتیں مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ تو وہ غصے سے بولیں۔
"مجھے ناشتا بنا کر دو۔ بہن سے بعد میں گپ شپ کرنا۔" انہوں نے ملازمہ کی طرح اسے حکم دیا' وہ مسکرا کر بولی۔
"جی اماں میں ابھی تیار کرتی ہوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی تو وہ مزید حیرت میں پڑ گئیں کہ ماریہ کیسے کیسے رنگ بدل رہی ہے۔
پری کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ البتہ اس کی آنکھوں میں نمی آ چکی تھی۔ آفرین مسکرا کر پری کے لیے جوس لے آئی اور دادی سے مخاطب ہوئی۔
"دادی اماں آپ کا فون کب سے بج رہا ہے۔ میں یہاں لے آؤں۔"
"نہیں۔" وہ آفرین کے مسکراتے چہرے پر غصے سے بولی تھیں اور اپنے کمرے کی طرف لپکیں کہ ماریہ کے لیے کچھ اور سوچا جائے' ان کی بازی الٹی پڑ گئی تھی۔

✵ ✵ ✵

وہ کچن میں پری کو بھی ساتھ لے آئی۔ فریج سے اس نے آٹے کا تسلا نکالا اور چولہے پر توا رکھا۔
"آپا۔ آپا۔ آنٹی فرخندہ کیا کہہ رہی تھیں' آپ کی ساس اتنی بری ہیں۔ آپ نے کبھی ذکر نہیں کیا۔" اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔
"تو جی ایسی بات ہوتی تو میں نہ روتی' تم کیوں رو رہی ہو تمہاری ساس ایسی نہیں ہوں گی۔"
"نہیں۔ مجھے شادی نہیں کروانی۔ یہ سب دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ انسان کے دو چہرے ہوتے ہیں۔" وہ خفگی سے بولی۔ اس نے پیڑا لیا اور اسے گھی لگا کر بیلنے لگی۔
"آپا۔ آپ اتنی مطمئن کیسے ہیں؟" اس نے تجسس سے پوچھا
آفرین کھی کھی کرنے لگی تو پری نے ماریہ سے کہا۔
"کیا بتائیے ماجرہ کیا ہے۔ آفرین اور آپ سب کچھ ہونے کے باوجود خوش اور مطمئن ہیں۔" اس نے توے پر پراٹھا ڈالا۔ اور مسکرا کر بولی۔
"مجھے اپنی پیاری ساس کے لیے ناشتا تو بنا لینے دو پھر بتاتی ہوں۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ آفرین نے ایک کٹوری میں دہی لیا اور ٹرے میں سجا کر بولی۔
"خالہ پری آپ کی شادی پر میں نے ساڑھی پہننی ہے' مما نے مجھ سے وعدہ کیا ہے' کیوں مما؟" آفرین نے ہنستے ہنستے کہا تھا۔ پری کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر ماں' بیٹی اتنی پر سکون کیسے ہیں۔ ماریہ نے ناشتا آفرین کے ہاتھ فرخندہ کو بھیجا۔ اور اس کے بعد سکون سے بولی۔
"میری ساس بری نہیں ہیں۔ بس ان کا ڈر برا ہے' وہ ڈر کی مریضہ ہیں۔"
"ڈر۔" پری نے حیرت سے کہا۔
"ڈر کی مریضہ' میں سمجھی نہیں۔" پری نے فکر مندی سے کہا۔
"ان کو ڈر لگا رہتا ہے کہ میں ان سے یہ گھر چھین لوں گی' اسی ڈر کی وجہ سے وہ سارا دن سوچتی ہیں' اس سے وہ بیمار رہتی ہیں اور آج جو بھی انہوں نے

عزتی سے کہا' یہ بھی ان کے اندر کا ڈر بول رہا تھا۔ وہ سعد سے بہت پیار کرتی ہیں۔ جیسے ہماری اماں اصغر سے' کنزہ کی باتیں اس لیے برداشت کرتی ہیں کہ کہیں وہ ان کا بیٹا چھین کر نہ لے جائے' کچھ سمجھ میں آیا۔"
"ہاں۔ ہاں۔ آپا۔ مجھے سمجھ میں آ رہا ہے اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جیسے آنٹی بھی میری وہاب کے ساتھ شادی ہونے پر ڈر کا شکار ہو جائیں گی۔"
"ہاں۔ تم نے درست فرمایا۔ کتنی سیانی ہو گئی ہو۔"
"اب بتاؤ۔ میری ساس بری ہیں کیا۔" وہ ہنس کر بولی۔
"نہیں۔ نہیں آپ کی ساس بری نہیں' بلکہ میرے خیال میں کسی کی ساس بری نہیں ہوتی۔ اس کے اندر کا ڈر برا ہوتا ہے' جو اس سے غلطی سرزد کرواتا ہے۔"
"تمہیں وہاب سے شادی کے بعد ایک مریضہ ڈر کی مل جائے گی۔ تمہیں ڈاکٹر بننے کا شوق ہے نا تو اچھا ڈاکٹر وہ ہوتا ہے جو اپنے مریض کو ٹھیک کرے۔"
"ہاں۔ آپا۔ آپ نے ٹھیک کہا' میری قسمت میں ڈاکٹر بننا ہو یا نہ ہو۔ البتہ گھر میں تو ڈاکٹرین کر رہوں گی۔" وہ ہنسی۔
"آپا میں چلتی ہوں' کچھ کپڑے درزی کو بھی دینے ہیں' اپنی شادی کے۔"
"واہ جی' شادی کی تیاری شروع بھی کر لی۔" وہ اس کی بات پر کھل اٹھی۔
"ہاں کیا آپ بھی تیاریاں شروع کر لیں۔"
"کیوں نہیں۔ سب سے پہلے تو ایک کام ضرور کرنا ہے۔" وہ فکر مندی سے بولی۔
"کیا آپا۔" وہ اس کی فکر مندی پر گھبرا سی گئی۔
"بندا۔ ڈھونڈنا ہے' جو ڈھولک بجانے میں ماہر ہو۔"
"آپا خدا کے لیے' کیوں' میری شادی کو کامیاب شادی کا خطاب دلوانا ہے۔" وہ قہقہہ لگا کر بولی تھی۔ پھر اس نے آنے کا مقصد بتایا اور پھر خود ہی فیصلہ لیا کہ وہ اپنے خواب کے لیے خود اپنے میاں سے بات کر لے گی۔
وہ ماریہ کے گھر سے پر سکون ہو کر نکلی تھی۔ آفرین کارٹون دیکھ رہی تھی۔ وہ کچن کی طرف لپکی۔ جہاں سے جلنے کی بدبو آ رہی تھی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ چولہا تو بند کرنا بھول گئی تھی۔
کچن میں اس نے ہنڈیا کی غرض سے آلو کاٹے ہی تھے کہ اسے فرخندہ کی چیختی آواز سنائی دی۔
"ڈر۔ کیسا ڈر' میری جوتی بھی تم سے نہیں ڈرتی۔" پھر فرخندہ کے کمرے کا دروازہ زور سے بند ہوا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ ابھری۔
"اف۔ انہوں نے میری باتیں چھپ کر سن لی ہیں۔ اب تو روز ایک ہی بات اسے سننے کو ملنے والی تھی۔ "میری جوتی بھی تم سے نہیں ڈرتی۔ میری جوتی بھی تم سے نہیں ڈرتی۔" وہ ہنسی' اور خود سے مخاطب ہوئی کہ شاید وہ دنیا کی پہلی بہو ہو گی' جس نے اعتراف کیا تھا کہ اس کی ساس بری نہیں۔

✵ ✵ ✵

وقت یوں ہی گزرتا گیا اور مزدوروں کا ضبط جواب دے گیا۔ میرے ہزار منع کرنے کے باوجود وہ دروازے کی جگہ موجود پتھریلی چٹان پر ٹوٹ پڑے۔ پہلے تو محض زور آزمائی کرتے رہے‘ مگر لحظہ بہ لحظہ ان پر وحشت سوار ہوتی گئی۔ وہ ہذیان بکنے لگے‘ چیخنے چلانے لگے‘ پھر راہ داری میں پڑے نوادرات پر جھپٹے۔ خنجر‘ تلوار‘ مجسمے‘ جس کے ہاتھ جو لگا وہ اٹھا کر اس ٹھوس چٹان پر حملہ آور ہو گیا۔ اہرام کا گہرا سکوت نہ جانے کس کھائی میں جا گرا‘ تمام ہیبت جیسے اچانک کرچی کرچی ہو گئی۔ اہرام کے اندر ایک شور بپا ہو گیا۔

میں اپنا آپ بچاتے ہوئے دروازے کے قریب سے ہٹا اور راہ داری میں پڑے تابوت کی جانب بڑھ گیا۔ اچانک کھانسی کا شدید دورہ بے دار ہوا اور میں تابوت میں پڑے سنہرے مجسمے پر جھکتا چلا گیا۔

بے حسی اور لاعلمی کے یہ سیاہ پردے جانے کتنی مدت تک مجھے لپیٹے رہے‘ پھر جب مجھے ان پردوں سے نجات ملی‘ یہ سیاہیاں چھٹیں تو میں نے خود کو اپنے ہی اسپتال کے آئی سی یو میں پایا۔

میرے منہ پر گیس ماسک لگا ہوا تھا‘ پھر ایک پر مسرت آواز میرے کانوں سے ٹکرائی میرے خوابیدہ سے حواس برق رفتاری سے بے داری کی جانب لپکے۔

”شکیل صاحب ہوش میں آ رہے ہیں۔“ آواز نوجوان ڈاکٹر اختر انصاری کی تھی۔ غالباً کسی کو مخاطب کیا گیا تھا۔ میں نے زاویہ نگاہ بدلا۔ چند متفکر چہرے لپک کر میرے قریب آ گئے۔ ان میں خوب صورت جوان اختر انصاری۔ سینئر ڈاکٹر عقیل بن عاص دوسرے ڈاکٹر عارب وقاص تھے اور چوتھی جو شخصیت تھی ان پر نظر پڑتے ہی میں چونکے بغیر نہ رہ سکا‘ وہ پروفیسر فاضل بصاری تھے۔

ڈاکٹر عقیل‘ عارب اور اختر انصاری تینوں کے چہروں پر مسکراہٹ رینگ گئی‘ البتہ پروفیسر کی گہری آنکھوں سے تشویش کے سائے تو ہٹ گئے‘ مگر چہرے پر سنجیدگی چھائی رہی۔

میں نے خود کو پوری طرح فریش محسوس کرتے ہوئے منہ سے ماسک ہٹا دیا۔

”تھینکس گاڈ! آپ ہوش میں تو آئے۔“ ڈاکٹر عقیل نے گہری سانس لی۔

”اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟“ اختر انصاری میرے مزید قریب آ گیا۔ میں نے حلق اور نتھنوں کی جلن کو محسوس کیا‘ مگر ایسا کوئی احساس نہیں تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”بالکل پرفیکٹ بگ۔ میں‘ یہاں تک کیسے پہنچا؟“ حیرت میرا انداز تھی۔

”اور پروفیسر صاحب آپ؟“ میں اپنا جملہ مکمل نہیں کر سکا۔

”یہ آپ کی خوش بختی تھی شکیل صاحب‘ پروفیسر یہاں چلے آئے‘ ورنہ شاید جب تک ہم آپ تک پہنچتے آپ کہیں اور پہنچے ہوئے ہوتے؟“ ڈاکٹر عارب نے اپنے مخصوص گمبھیر لہجے میں کہا تو ان کا اشارہ سمجھتے ہوئے میرے حرام مغز میں کہیں برف کی ڈلی سی چٹخی۔

"عارب صاحب! آپ اسے پروفیسر اور شکیل صاحب کی محبت کا نام بھی دے سکتے ہیں۔"

وہ کہتے ہیں نا کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے' ادھر شکیل صاحب مصیبت میں پھنسے اور ادھر پروفیسر مضطرب ہو کر یہاں ان سے ملنے کی غرض سے چلے آئے۔ ہے کہ نہیں کمال کی بات؟" اختر انصاری کی عادت ہی کچھ ایسی تھی۔ وہ ہر وقت ہنسنے ہنسانے والا بندہ تھا۔

"اور وہ مزدور۔ عبدل' ایکلاس' وہ سامان' اس کا کیا بنا؟" میری بات پر سب سنجیدہ ہو گئے' پھر کسی اور کے بولنے سے پہلے پروفیسر صاحب بول پڑے۔

"پہلے تو تم یہاں سے اٹھو کوئی اور سوال نہ کرنا' باہر پولیس اور انٹیلی جنس کے کچھ آفیسر موجود ہیں۔ تمہیں ان کے سامنے بھی جوابدہ ہونا ہے۔" پروفیسر صاحب کی بات سن کر میں بری طرح چونک پڑا۔

"پولیس۔ انٹیلی جنس؟"

"ہاں! تم نے بہت بڑی حماقت کا ثبوت دیا ہے۔ ساڑھے چار ہزار برانا اہرام دریافت کر لیا اور کسی کو خبر تک نہیں کی' کم از کم مجھے تو آگاہ کر دیتے۔" پروفیسر صاحب نے خفگی کا اظہار کیا۔

"پروفیسر صاحب میں آپ کی طرف آنے ہی والا تھا کہ صورت حال کچھ اس تیزی سے تبدیل ہوئی کہ ہم اہرام کے اندر محصور ہو کر رہ گئے! اس کے بعد اب آپ کے سامنے ہی ہوش آ رہا ہے۔"

"تم نے جب کھدائی کا ارادہ کیا تھا' تمہیں اس وقت چاہیے تھا کہ تم میرے پاس آتے' یقیناً" تمہیں اچھا مشورہ دیتا۔"

"پروفیسر صاحب میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہاں کوئی اہرام مدفن ہو گا۔ وہ تو پہلے کھدائی کرنے والوں کا ایک مزدور زخمی حالت میں یہاں آیا تھا تو ان کے سپروائزر نے کچھ ایسے ناقابل یقین واقعات کا تذکرہ کیا کہ میں تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہاں جا پہنچا۔ یہ کھدائی تو محض ایک بہانہ تھا' حقیقت تو یہ تھی کہ میں وہاں کچھ عرصہ گزارنا چاہتا تھا اور ان واقعات کا مشاہدہ کرنا چاہتا تھا جو اس نے میرے سامنے بیان کیے تھے' اب یہ اتفاق رہا کہ یہاں سے اہرام برآمد ہو گیا اور ہم نے اہرام کے اندر سے ایک تابوت اور کچھ نوادرات بھی حاصل کر لیے تھے۔ اہرام کا اکلوتا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ اہرام کے اندر ایک تو آکسیجن کی کمی' دوسرا زہریلی فضا جس کے باعث میں بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بعد مجھے اب آپ کے سامنے ہوش آ رہا ہے۔" میں نے مختصراً" حال کہہ سنایا۔

"آپ چار گھنٹے کی طویل بے ہوشی کے بعد ہوش میں آ رہے ہیں۔ اس دوران وہ سونے کے مجسمے والا تابوت اور نوادرات ہم پوری رازداری کے ساتھ آپ کی خواب گاہ تک پہنچا چکے ہیں۔" ڈاکٹر عقیل نے مجھے مخاطب کیا تو میں ان کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"ان نوادرات کے متعلق کسی کو علم نہیں اس بات کا خیال رکھیے گا۔"

"مگر یہ پولیس' انٹیلی جنس کیوں؟ ان کو کیسے خبر ہو گئی؟" میں نے متفکر لہجے میں سوال کیا۔

"نہیں میں نے خبر کی ہے۔" پروفیسر صاحب کی بات پر میں حیرت زدہ رہ گیا۔

"آپ نے۔؟"

"ہاں میں نے! اور ایسا میں نے تمہارے بھلے کے لیے کیا ہے۔" پروفیسر صاحب کی بات پر میں محض سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

"ایک اہرام کا دریافت ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں شکیل صاحب اور ایسی باتیں چھپائے نہیں چھپتیں۔ آج نہیں تو کل یہ خبر پھیلنی ہی تھی' اب انتظامیہ اور آثار قدیمہ والوں تک یہ اطلاع تمہاری طرف سے پہنچی ہے۔ کل اگر یہی اطلاع ان تک کسی اور ذریعے سے پہنچتی تو تمہارے لیے سخت مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ کہیں سے کچھ بھی برآمد ہو وہ حکومت کی ملکیت ہے اور اگر حکومت کے علم میں لائے بغیر خفیہ طور پر کہیں کھدائی کر کے کوئی نوادرات کوئی شخص حاصل کرتا ہے اور حکومت کو اس سے بے خبر رکھتا تو یہ قانونی طور پر جرم ہے اور ایسا کرنے والے کے خلاف حکومت کوئی بھی سخت قدم اٹھا سکتی ہے' بات عقل میں آئی یا نہیں؟"

"میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں پروفیسر مگر۔ مسئلہ تو اب بھی کھڑا ہو جائے گا؟" میں نے پریشانی سے کہا۔

"کیا مسئلہ کھڑا ہو جائے گا؟"

"وہ۔ وہ تابوت اور نوادرات جو میری خواب گاہ تک پہنچائے گئے ہیں۔"

"تو پھر۔ کیا ہے ان کو؟"

"پروفیسر صاحب جب انتظامیہ والوں کو اہرام کے اندر کچھ ملے گا ہی نہیں تو وہ پھر مجھ پر چڑھ دوڑیں گے۔"

"نہیں ایسا کچھ نہیں ہو گا؟ اس بات سے تم بے فکر رہو' انہیں اہرام کے اندر سے مزید نوادرات بھی مل جائیں گے۔ فی الوقت تو تم اپنے ذہن کو صرف اس بات پر تیار کرلو کہ جو آفیسرز تمہارے منتظر ہیں ان کو تم نے کس طرح مطمئن کرنا ہے اور ایک بات سے میں تمہیں آگاہ کر دوں کہ۔" پروفیسر اچانک خاموش ہوئے تو میرا دل ایک انجانے سے خوف سے دھڑک اٹھا۔ ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی سمٹ آئی۔

"کیا بات ہے پروفیسر صاحب؟ آپ اس طرح خاموش کیوں ہو گئے؟" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

چند لمحوں کے توقف کے بعد پروفیسر صاحب گمبیر لہجے میں گویا ہوئے۔

"شکیل! تمہارے ساتھ جو مزدور اہرام کے اندر پھنس گئے تھے' ان میں سے صرف تین زندہ بچے ہیں۔ عبدل اور ایکلاس کو بھی اہرام نے نگل لیا ہے۔" پروفیسر صاحب کے کہے ہوئے الفاظ پگھلے ہوئے لوہے کی طرح میرے کانوں میں اترے۔ میں اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔ عبدل' ایکلاس اور دوسرے مزدوروں کے چہرے میری نظروں کے سامنے نمودار ہو گئے۔ زندگی کے لیے زندہ رہنے کے لیے کتنا مچل رہے تھے وہ۔ موت کا کیسا خوف جما ہوا تھا ان کے چہروں پر' کتنی حسرتیں اور امیدیں ان کی آنکھوں میں گڑگڑا رہی تھیں زندگی کے لیے۔

اذیت کے تاثرات میرے چہرے پر امنڈ آئے۔

ڈاکٹر عقیل اور عارب دونوں میرے دائیں بائیں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر مجھے اپنے سہارے کا احساس دلانے لگے۔

"شکیل صاحب خود پر کنٹرول رکھیں۔ اللہ کا شکر ادا کریں کہ آپ زندہ بچ گئے۔ ان بے چاروں کی موت یوں ہی لکھی ہوگی اور۔ اور ابھی تو تین مزدور زندہ بچ گئے ہیں جن کی زندگیاں ابھی باقی تھیں' وہ صاف موت کے منہ سے بچ کر نکل آئے ہیں اور جن کا وقت پورا ہو چکا تھا' وہ اپنے خالق حقیقی کے سامنے جا پیش ہوئے ہیں' آپ پلیز ریلیکس نہیں لیں۔"

"اب تم ان لوگوں کے متعلق سوچو باہر تمہارے منتظر ہیں ان سے کیا کہنا ہے۔" پروفیسر صاحب نے نرم لہجے میں کہا۔ اور میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

"آئیں دیکھتے ہیں۔" میں نے کہا اور بیڈ سے اٹھ

کھڑا ہوا۔ پھر ہم سب اکٹھے ہی باہر نکلے۔ کچھ دیر بعد میں اپنے آفس میں تھا۔

ڈاکٹر عقیل، عارب، اختر اور پروفیسر فاضل انصاری صاحب کے علاوہ اس وقت آفس میں ایک انسپکٹر، سپرنٹنڈنٹ اور محکمہ آثار قدیمہ کے چند آفیسرز موجود تھے۔ میں نے انہیں یہی بیان دیا تھا۔

"ہمارے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اس مقام پر کوئی اہرام مدفن ہو گا۔ مجھ سے پہلے کوئی خبطی بوڑھا یہاں کھدائی کر رہا تھا اس کا خیال تھا کہ اس جگہ کوئی صدیوں پرانا مقبرہ دفن ہے، اور اس بات کا علم مجھے تب ہوا جب ایک روز کھدائی کرنے والے مزدوروں میں سے ایک مزدور اتفاقی طور پر شدید زخمی ہوا اور اس کے ساتھی بروقت میڈیکل ٹریٹمنٹ کے لیے یہاں لے آئے۔ پھر جب میری ملاقات ان کے سپروائزر سے ہوئی تو اس نے یہی تفصیل بتائی، مگر میں نے کوئی تاثر نہیں لیا، نہ ہی میرے نزدیک یہ کوئی ایسی بات تھی۔ کچھ عرصہ مزید گزر گیا۔ زخمی مزدور اس دوران یہیں ایڈمٹ رہا۔ میری ایک بار پھر سپروائزر سے ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا کہ ہمارا کھدائی کا کام بند ہو چکا ہے۔

میرے استفسار پر اس نے ایسے عجیب و غریب اور ناقابل یقین واقعات کا ذکر کیا کہ مجھے دلچسپی محسوس ہوئی۔ حالانکہ اس نے بھوتوں، بدروحوں کا ذکر کیا تھا اور مجھے ان باتوں پر قطعی یقین نہیں۔ مگر اس نے تمام واقعات کچھ ایسے وثوق سے بیان کیے کہ میں تذبذب کا شکار ہو گیا اور اسی تذبذب کی ہوا نے میری آتش اشتیاق کو بھڑکا دیا۔ اور میں نے چند راتیں اس مقام پر جانے کا ارادہ کر لیا۔ کھدائی کے کام کو بہانہ بنایا اور کھدائی بھی شروع ہو گئی۔ سپروائزر کے کہے کے بموجب کوئی واقعہ وقوع پذیر نہیں ہوا، البتہ مسلسل کھدائی کے بعد ایک چٹان دریافت ہو گئی اور پھر جب مزید کھدائی کرائی گئی تو اس چٹان کے نیچے سے اہرام برآمد ہوا۔ پھر اتفاقیہ طور پر ہی اہرام کا دروازہ کھل گیا اور ہم اندر کا حال جاننے کے لیے بغیر سوچے سمجھے بے اختیار اہرام میں داخل ہو گئے اور ہمارے اندر داخل ہوتے ہی اہرام کا دروازہ نامعلوم کیسے بند ہو گیا اور ہم اندر پھنس کر رہ گئے۔ میں اس وقت آخری سانسوں پر تھا جب دروازہ دوبارہ کھلا اور پروفیسر صاحب اندر داخل ہوئے۔ بے ہوش ہونے سے قبل میں نے پروفیسر صاحب سے درخواست کی تھی کہ اس اہرام کی دریافتگی کے متعلق محکمہ والوں اور انتظامیہ کو مطلع کیا جائے۔"

میں نے بیان میں کاٹ چھانٹ اور کمی بیشی سے کام لیتے ہوئے انہیں تفصیل بتا دی۔ جاں بحق ہونے والے مزدوروں کے متعلق سوال پر میں نے ایک غیر متوقع حادثے کا بیان دیا اور یہی دونوں بیان میں نے تحریری طور پر سپرنٹنڈنٹ اور آثار قدیمہ کے ڈائریکٹر کو دیے اور میری بچت ہو گئی۔ میں نے ہزاروں سال پرانی تہذیب اور اس تہذیب کے متعلق ایک دارالاسرار دریافت کر کے حکومت کے محققین کے حوالے کیا تھا۔ سو وہ الٹا میرے شکر گزار ہو کر واپس لوٹے اور ان کے چلے جانے کے بعد میں نے اطمینان کی ایک طویل سانس لی۔ میں نے خود ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اعصاب پر مسلط تناؤ گویا یک دم تحلیل ہو گیا تھا۔

"شکیل صاحب! اب اللہ کا شکر ادا کیجیے کہ آپ ہر بات سے بری الذمہ ہو گئے ہیں۔ نہ تو مزدوروں کی موت کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوئی اور نہ ہی حکومت سے اجازت لیے بغیر اس وسیع پیمانے پر کھدائی کرانے کے باعث آپ کو مجرم ٹھہرایا گیا، حالانکہ قانون کی رو سے یہ بھی اچھا خاصا جرم ہے۔" ڈاکٹر عقیل مسکرائے۔

میں نے انٹرکام پر ملازم کو کافی کا کہا اور دوبارہ ان کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"شکیل صاحب نے صدق و دروغ کا آمیزہ بڑی روانی سے بنایا ہے۔ اگر ذرا بھی گڑبڑا جاتے تو اچھی خاصی جھنجٹوں میں پھنس جاتے۔" اختر اپنے مخصوص انداز سخن میں گویا ہوا تو ہم سب کے چہروں پر بھی ہلکی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"زندگی ہے تو یہ جھنجٹیں ہیں اور ان سے بچ جانا میرے لیے اہم بات نہیں۔ میرے لیے یہ اہم بات ہے کہ موت کے منہ سے زندہ سلامت بچ آیا ہوں اور یقیناً "میری یہ زندگی پروفیسر صاحب کی مرہون منت ہے کیونکہ مجھے صدقِ صد یقین ہے کہ پروفیسر صاحب نہیں ہوتے تو وہ دروازہ کوئی انسان نہ تو ڈھونڈ پاتا اور نہ ہی اسے کھولنے میں کامیاب ہوتا۔ کیوں پروفیسر صاحب میں درست کہہ رہا ہوں نا؟"

"کہہ تو تم درست رہے ہو مگر اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ ابھی تمہاری زندگی بھی باقی تھی اور شاید کچھ ادھورے کام بھی تمہاری سانسوں سے منسوب کر رکھے ہیں خدائے لم یزل نے جو تم زندہ بچ گئے۔ کیونکہ میرا ادھر آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا بالکل اچانک ہمارا پروگرام بن گیا یہاں پہنچ کر اس نئی کہانی کا علم ہوا کہ موصوف ڈاکٹری چھوڑ کر آرکیالوجی کے امتحان دینے میں مصروف ہیں۔"

انہیں باتوں کے دوران سلام کافی کے برتن رکھ کر چلا گیا اور اختر نے ایک ایک کپ سب کے سامنے رکھ دیا۔

"پروفیسر اگر ایسی بات ہے تو یقیناً" ڈاکٹر کے بیڈ روم میں پڑے تابوت میں جو لاش استراحت فرما رہی ہے وہ مکمل "ممی" نہیں ہوگی۔ اسے پوری طرح حنوط نہیں کیا گیا ہو گا اور اس کے ڈاکٹر کی خواب گاہ تک پہنچ جانے میں خدا کی یہی مصلحت پوشیدہ ہوگی کہ ڈاکٹر اسے حنوط کر کے مکمل ممی بنا دے۔ ہے نا؟" ڈاکٹر عارب نے کافی کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔ تو میرے ذہن میں فوراً "وہ سونے کا مجسمہ" آ گیا جو میں نے اہرام کے اندر تابوت میں دیکھا تھا۔

"پروفیسر صاحب! کیا آپ نے وہ تابوت چیک کیا تھا؟"

"ہاں!"

"کیا آپ کو حیرت نہیں ہوئی؟" میرے لہجے میں سوال سے زیادہ حیرت تھی۔

"کس بات پر؟"

"میرا تو خیال تھا کہ اس میں صدیوں پرانی کوئی لاش ہوگی۔ اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا مگر حیرت کی بات ہے کہ تابوت میں کسی لاش کی بجائے ایک سونے کا مجسمہ موجود تھا؟" میں نے شدید حیرت سے کہا۔

میری بات پر پروفیسر کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھا گئی اور آنکھوں میں جیسے سوچ کے بھنور نمودار ہو گئے۔ پھر وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں گویا ہوئے۔

"شکیل! میں کوئی توہم پرست ضعیف الاعتقاد شخص نہیں ہوں مگر نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا ہے جیسے قدرت تم سے کوئی بہت ہی عظیم کام لینے والی ہے۔ تمہیں کسی امتحان میں ڈالنے والی ہے۔"

"پروفیسر صاحب میں سمجھا نہیں کہ آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں یا کیا کہہ رہے ہیں۔" الجھن میرا انداز تھی۔ پروفیسر صاحب کی پیشانی پر بھی الجھن کی لکیریں ابھر آئیں۔ ڈاکٹر عقیل، عارب اور اختر انصاری بھی استفہامیہ نظروں سے پروفیسر صاحب کی جانب دیکھنے لگے۔

"دیکھو میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرنا۔" پروفیسر صاحب نے کافی کا کپ ٹیبل پر رکھا اور کرسی پہ پہلو بدل کر رہ گئے۔ ان کے چہرے سے اضطراب مترشح تھا۔

"دیکھو اس پوری کائنات میں یا۔۔۔ یا تمام جہانوں میں جو کچھ تھا، ہے، ہوگا۔ یا جو کچھ ہو رہا ہے، وہ۔۔۔ وہ سب فطری اصولوں کے مطابق ہے۔ ہم کسی بھی چیز کو یا کسی بھی عمل کو چاہے وہ انسانی ہے یا حیوانی، غیر فطری کہنے کے مجاز نہیں کیونکہ فطرت کو ترتیب دینے والی اللہ کی ذات ہے اب اگر کچھ غیر فطری ہے تو گویا وہ فطرت کے دائرہ کار سے خارج ہے اور جو فطرت کے دائرے سے خارج۔ گویا وہ فاطر کی دسترس سے خارج اور یہ کسی طور ممکن نہیں۔ تم سمجھ رہے ہو نا؟" پروفیسر صاحب نے تائید طلب نظروں سے میری سمت دیکھا۔

"پروفیسر صاحب مجھے الجھن سی ہو رہی ہے۔ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"فی الحال تو خود میرا ذہن الجھ رہا ہے۔ بہرحال جو میرے ذہن میں چبھ رہا ہے وہ تمہیں بتا رہا ہوں باقی تجزیہ تم خود کر لینا۔ فطرت سے ٹکر لینے والے بدبخت ہر دور میں پیدا ہوتے ہیں اور ان کا انجام بڑا عبرت ناک ہوا کرتا ہے۔ کچھ بدبختوں نے فطرت کے درمیان رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوشش کی ہیں۔ انسانوں کے ناپاک ارادے انسان ہی ختم کرتے ہیں۔ تم یوں سمجھ لو کہ تمہیں فطرت کے خلا بھرنے کے لیے فاطر نے منتخب کیا ہے۔ کچھ۔۔۔ کچھ عقدے ڈالنے کی منحوس جسارتیں کی گئی ہیں۔ تمہیں فطرت کے وہ عقدے کھولنے ہیں؟ اور تم بات کر رہے تھے نا سونے کے مجسمے کی کہ تابوت میں لاش ہونی چاہیے تھی؟" پروفیسر چند لمحے کے توقف سے دوبارہ گویا ہوئے۔

"تابوت میں جو سونے کا مجسمہ ہے نا وہ صرف مجسمہ نہیں وہ ہزاروں سال پرانی لاش ہی ہے۔" پروفیسر صاحب کی بات سن کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ ڈاکٹر عقیل، عارب اور علی اختر کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہ تھی۔ وہ بھی تحیر و بے یقینی کے عالم میں پروفیسر کی صورت دیکھ رہے تھے۔

"پروفیسر! کیسی بے تکی باتیں کرنے لگے ہیں آپ۔ ہم نے خود وہ مجسمہ دیکھا ہے، خالص سونے کا بنا ہوا ہے اور آپ اس مجسمے کو ہزاروں سال پرانی لاش بتا رہے ہیں۔" عارب کا لہجہ تندی لیے ہوئے تھا۔

"پروفیسر صاحب یہ تو کوئی تسلیم کی جانے والی بات نہیں۔" میں نے بے یقینی کے انداز میں کہا۔

"جس وقت تم بے ہوشی کے عالم میں پڑے تھے اس دوران میں اس مجسمے اور تابوت پر تحقیق کے لیے مسلسل مغز ماری کرتا رہا ہوں۔ تابوت پر کندہ تحریر کا ترجمہ بھی میں نے کیا ہے اور چند ایک سطریں مجسمے کی بھی ترجمے میں ڈھالی ہیں اور صفحات تمہاری خواب گاہ میں موجود ہیں۔ ذرا کافی پی لو پھر چل کر جائزہ لیتے ہیں۔" پروفیسر صاحب نے پرسکون لہجے میں کہا اور ٹیبل سے کافی کا کپ اٹھا کر چسکیاں لینے لگے۔

"کس چیز کا جائزہ لیتے ہیں کیا وہ مجسمہ اٹھ بیٹھے گا"

ڈاکٹر عقیل نے تمسخرانہ انداز میں کہا تو پروفیسر صاحب اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔

"نہیں! ان کاغذات کا جائزہ لیتے ہیں جن پر میں نے تابوت پر کندہ قدیم تحریر کا ترجمہ اتارا ہے۔۔۔ میرا خیال ہے کہ میں کچھ بھول رہا ہوں الفاظ کی ترتیب میرے ذہن میں گڈمڈ ہو رہی ہے۔ لیکن اتنا تو مجھے یاد ہے کہ مجسمے کے سینے پر تحریر تھا کہ "اس کے اندر بدنصیب مراقس کا زندہ وجود ہے۔" ہاں کچھ ایسی ہی تحریر تھی۔" پروفیسر کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں رقصاں تھیں۔

"زندہ وجود! زندہ وجود سے کیا مراد ہے آپ کی؟" ڈاکٹر عارب نے حیرت سے کہا۔

"زندہ وجود سے میری کوئی مراد نہیں۔ میں وہ بتا رہا ہوں جو مجسمے پر تحریر ہے اب اصل حقیقت کیا ہے یہ میں نہیں جانتا' ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ کچھ انہونی ہونے والی ہے۔"

"آپ بھی کمال کرتے ہیں پروفیسر صاحب! ساتھ ساتھ عجیب و غریب بیان بھی دیے جا رہے ہیں اور یہ بھی کہے جا رہے ہیں کہ حقیقت کا مجھے علم نہیں۔۔۔ عجیب بات ہے۔" ڈاکٹر عارب کا لہجہ ناخوشگوار ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر اس موضوع پر مزید کچھ دیر گفتگو ہوتی رہی تو بلاوجہ کشیدگی پیدا ہو جائے گی سو میں نے مداخلت کرتے ہوئے گفتگو کا رخ موڑ لیا۔

"پروفیسر صاحب چھوڑیں اس مسئلے کو ابھی چلیں گے آپ کا کیا ہوا ترجمہ دیکھیں گے اور آگے کا ترجمہ مکمل ہونے کے بعد اس مسئلے پر گفتگو کریں گے۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ کا اس طرح اچانک بغیر کوئی اطلاع کے ادھر آنے کا پروگرام کیسے بن گیا' سب خیر خیریت تو تھی نا؟"

"ہوں خیریت ہی تھی وہ۔۔۔ میرا ایک شاگرد انڈیا سے آیا ہوا تھا دو روز پہلے 'جسونت دیال' اسے یہاں کوئی کام تھا' مجھ سے اس نے ذکر کیا۔ میں نے سوچا کہ چلو میں بھی ساتھ چلا چلتا ہوں تم سے ملاقات ہوئے بھی کافی عرصہ ہو گیا تھا سو سوچا کہ چلو اسی بہانے تم سے بھی مل لوں گا۔ ارادہ تھا کہ خود یہاں رک جاؤں گا اور اسے کہوں گا کہ بھئی تم اپنا کام نمٹا آؤ واپسی میں مجھے یہاں سے پک کر لینا۔ مگر جب ہم یہاں پہنچے تو پتا چلا کہ یہاں تو کہانی ہی کچھ اور بنی ہوئی ہے۔ یہاں سے پھر ہم اختر کے ساتھ تمہاری طرف گئے تو خیموں میں موجود مزدوروں نے بتایا کہ اہرام کا دروازہ کھل گیا تھا تم اندر داخل ہونے کی تیاری میں لگ گئے اور جو چند مزدور تمہارے ساتھ تھے ان کو تم نے اوپر واپس بھیج دیا۔ پھر جب ہم نیچے پہنچے تو نہ کوئی روزن نہ کوئی دروازہ! اور جب دروازہ کھلا تو اندر کا ماحول ہی عجیب و غریب تھا۔ تمام مزدور دروازے کے سامنے ہی بے سدھ پڑے تھے تم خود چند قدم کے فاصلے پر تابوت کے اندر اوندھے ہوئے پڑے تھے۔ بہرحال ہم تمہارے ساتھ ساتھ وہ تابوت اور نوادرات بھی اٹھا لائے۔ جسونت ذرا جلدی میں تھا اس لیے یہاں آنے کے بعد وہ اپنے کام کے سلسلے میں چلا گیا اور ڈاکٹرز تمہاری وجہ سے پریشان ہو گئے۔ تمہاری چار گھنٹے کی بے ہوشی کے دوران میں نے سرسری طور پر ان نوادرات' تابوت اور مجسمے کا بھی ذرا جائزہ لے لیا! اب باقی کی تمام صورت حال تمہارے سامنے ہے۔"

"تو وہ۔۔۔ جسونت دیال صاحب کیا واپس نہیں آئے؟"

"نہیں ابھی تو نہیں آیا۔۔۔ ویسے چار پانچ گھنٹے ہونے والے ہیں اب تک آ تو جانا چاہیے تھا اسے۔۔۔ بہرحال آ جائے گا۔" پروفیسر صاحب نے لاپروائی سے کہا۔

سب کافی ختم کر چکے تو ڈاکٹر عارب نے کہا۔

"اب آپ لوگوں کے کیا ارادے ہیں۔۔۔؟ میرا خیال ہے کہ چل کے اب ذرا اس مجسمے کا جائزہ لے لیا جائے۔"

ڈاکٹر عقیل اور اختر نے کندھے اچکا دیے۔ میں نے پروفیسر صاحب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ کرسی کھسکاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ہاں اب کوئی جھنجھٹ نہیں چلو سب چلتے

ہیں۔" اور ہم سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہسپتال کی عقبی عمارت میں ایک طرف ملازمین کے کوارٹرز بنے ہوئے تھے اور اس سے ملحقہ عمارت میں ڈاکٹرز کی رہائش گاہیں تھیں۔

میں چونکہ شروع ہی سے تنہائی اور سکون پسند طبیعت کا مالک تھا اس لیے میری رہائش ان سے الگ تھلگ تھی۔ ملازم بھی صرف دو تھے، ایک چوکیدار' دوسرا خانساماں جو سودا سلف لے کر مالی تک سبھی فرائض انجام دیتا تھا۔

ہم آفس سے نکل کر ہسپتال کی عمارت کی عقبی سمت چل پڑے۔ عارب اپنی فطرت کے مطابق پروفیسر سے الجھ رہا تھا۔

"پروفیسر آپ باتیں ہی ایسی کرتے ہیں کہ کوئی ذی شعور انسان ان پر یقین نہیں کر سکتا۔"

"میں نے ایسی کون سی بات کر دی ہے۔ جس پر یقین کرنے میں تمہارا شعور مانع ہے؟"

"آپ خود ہی تو کہہ رہے ہیں کہ اس سنہری مجسمے کے اندر کسی "مرافس" کا زندہ وجود ہے۔ کیسی خلاف عقل بات ہے کہ ہزاروں سال قدیم ایک ایسے اہرام کے جو زمین کی گہرائیوں میں دفن تھا اندر سے ایک تابوت برآمد ہوتا ہے اس میں سے ایک مجسمہ نکلتا ہے اور اس مجسمے کے اندر ہزاروں سال سے ایک زندہ وجود مقید ہے۔ بھلا یہ کوئی تسلیم کی جانے والی بات ہے"

"تو میں نے ایسا اپنی طرف سے تھوڑی کہا ہے۔ میں نے بتایا تو تھا کہ یہ تابوت پر تحریر ہے۔"

"اور آپ نے یقین کر لیا کہ ایسا ہی ہو گا؟"

"ایسا ہونا ناممکنات میں سے بھی نہیں ہے۔"

"واہ۔ پروفیسر! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ ذرا بات کی وضاحت تو کریں کہ یہ کیسے ممکن ہے؟"

"مسٹر عارب! اس جہاں میں کچھ بھی ناممکن نہیں۔ انسان رب کا نائب ہے' اشرف المخلوقات ہے تم نے صرف ان الفاظ کو تسلیم کیا ہو گا۔ معنی مفہوم اور ان الفاظ کی گہرائی میں اترنے کی کبھی کوشش نہیں کی ہو گی۔ تم نہیں سمجھ سکتے کہ انسان کیا بلا ہے۔ وہ بھی انسان ہی تھا جو مردوں کو زندہ کر دیا کرتا تھا۔ وہ بھی انسان ہی تھا جس کے ہاتھ میں آ کر فولاد موم بن جاتا تھا۔ وہ بھی انسان ہی تھا جس کے لیے دریائے نیل کا پانی دو اطراف سمٹ گیا تھا اور وہ بھی انسان ہی تھا جس کی ایک جنبش انگشت پر چاند دو ٹکڑوں میں منقسم ہو گیا تھا۔ اس حضرت انسان سے کچھ بعید نہیں۔"

"وہ تو انبیا تھے پروفیسر! آپ ان کا ذکر کیوں درمیان میں لے آئے؟"

"کیا انبیا انسان نہیں ہوا کرتے تھے۔ ان کا تعلق کسی اور مخلوق سے تھا؟"

اور پھر میں بات انبیاء کی نہیں کر رہا علم کی کر رہا ہوں اور علم کبھی بھی کسی کی میراث نہیں رہا وہ ذات جسے جتنا چاہے اس دولت سے نواز دے۔ اب یہ تو ظرف کی بات ہے کہ وہ اس کا کیسا استعمال کرتا ہے۔ اب موٹی سی مثال ہے شیطان کو ہی لے لو کتنی طاقت ہے اس کے پاس اور کتنا علم ہے! خون کی حدت میں حل ہو کر رگوں میں بہتا ہے۔ اسم اعظم وہ جانتا ہے اور مزے کی بات کہ اگر وہ اسم اعظم پڑھ کر توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول ہو جائے گی۔ اور اس سے بڑھ کر مزے کی بات یہ کہ قیامت سے چالیس برس قبل ہی وہ اسم اعظم بھول جائے گا؟ اب اس پر غور کرو۔ وہ بھولے گا نہیں اسے بھلا دیا جائے گا۔ کیوں کہ اللہ کی یہی مرضی ہے۔ اب علم اور طاقت تو اس نے شیطان کو بھی دے رکھی ہے اور کھلی چھوٹ بھی۔ اب یہ اس کا فعل کہ وہ اس کا استعمال کیسے کرتا ہے اور جوابدہ اللہ کے سامنے ہو گا۔" پروفیسر صاحب کی اتنی گہری تفصیلی بات بھی اس کی عقل میں نہیں آئی۔ اس کی سوئی ہنوز وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"پروفیسر آپ نے اتنی لمبی تقریر کر دی مگر آپ کی اس گفتگو کا اس زندہ وجود سے کیا تعلق ہے۔ ہزاروں سال سے زندہ؟ یہ تو فطرت سے تصادم ہو گیا!"

"عجیب احمق مغز ہو تم بھی۔ بات تمہاری عقل میں نہیں آئی۔ بھئی علم کی بنیاد پر ایسا ہونا ممکن ہے۔" پروفیسر صاحب کے لہجے میں ناگواری و بے زاری اتر آئی۔

"رہی بات فطرت کی تو وہ جو ہزاروں سال سے غار میں سو رہے ہیں۔ اصحاب کہف' کیا وہ فطرت سے متصادم نہیں؟"

"وہ تو اللہ کی مرضی سے سو رہے ہیں۔"

"تو ممکن ہے کہ اس زندہ وجود میں بھی اللہ کی مرضی ہو۔ ہزاروں انسان پیدا ہو رہے ہیں۔ براہ راست آسمان سے تو نہیں گرتے! نہ ہی زمین سے اگ رہے ہیں۔ انسانی ذرائع سے ہی دنیا میں آ رہے ہیں۔ اسی طرح وہ ذات ہر کام کسی نہ کسی ذریعے یا تیہ تکمیل تک پہنچاتی ہے۔ اگر مجسمے کے اندر حقیقتاً "کوئی زندہ وجود ہے تو ہزاروں سال گزرنے کے بعد اب اس کا ہم تک پہنچنا۔ اس میں بھی یقیناً" پروردگار کی کوئی مصلحت پوشیدہ ہو گی۔"

"پروفیسر صاحب وہ بات تو اپنی جگہ۔ مگر آپ مجھے یہ سمجھائیں کہ ایک چیز جو فطرت کے تقاضوں پر اس دنیا میں آئی وہ فطرت سے ماورا کیسے ہو سکتی ہے؟ ایک انسان کا اعصابی نظام اپنی طبعی عمر پیدا کرنے کے بعد۔ بلکہ طبعی عمر کیا ہزاروں سال بعد تک فعال کیسے رہ سکتا ہے؟"

"تمہارے دماغ میں عقل نام کا مواد ہے یا نہیں۔" پروفیسر صاحب بری طرح جھنجلا گئے۔

"اپنی ہی ہانکے جا رہے ہو۔ مادیت کا چشمہ پہن کر ہر چیز دیکھو گے تو حواس گنوا بیٹھو گے۔ روحانیت بھی کوئی چیز ہے' اور تمام مادیت' روحانیت کی ہی مرہون منت ہے۔ اگر روحانیت نہیں تو مادیت بھی نہیں۔ اور اب مجھ سے مزید کوئی بے ہودہ سوال نہیں کرنا۔" پروفیسر صاحب نے برے برے منہ بناتے ہوئے کہا تو ڈاکٹر عارب کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

انہی باتوں کے دوران ہم رہائشی حصے میں آ گئے۔ مین دروازہ کھلا ہوا تھا مگر یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ ہم اپنے اپنے خیالوں میں گم اندر داخل ہو گئے۔ مگر جیسے ہی ہم دروازے سے اندر داخل ہوئے بے اختیار ہمارے قدم ٹھٹک کر رک گئے۔

پروفیسر اور ڈاکٹر عقیل کے منہ سے بے معنی سی آوازیں آزاد ہو گئیں۔ دروازے سے داخل ہوتے ہی راہداری آتی تھی۔ اس مختصر سی راہداری کے ایک طرف کچن تھا اور دوسری طرف میرا اسٹڈی روم اور باتھ روم جب کہ اس مختصر سی راہداری کی دوسری جانب لان تھا اور تین کمرے ایک ڈرائنگ روم کی طرز پر تھا دوسرا میرا بیڈ روم اور تیسرا' کبھی کبھار مہمان خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ کیونکہ اکثر چچا زاد آ جایا کرتے تھے یا پھر بھولے بھٹکے چچا خود اور والد صاحب آ جاتے تھے اور اکثر میرے دونوں بھائی۔ عقیل ظفر اور نبیل ظفر آتے رہتے تھے چونکہ ان سب کا میری اس داستان حیات سے تعلق نہیں ہے۔ اس لیے ان کا ذکر بھی ضروری نہیں سمجھا ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ہم اندر داخل ہوتے ہی ٹھٹک کر رک گئے۔ ہماری آنکھیں حیرت اور بے یقینی کے سے عالم میں پھیل گئیں۔ اور دماغ میں جیسے زلزلے بپا ہو گئے؟ ہم سے چار قدم کے فاصلے پر راہداری میں چوکیدار کی لاش پڑی تھی۔ یہ صورت حال ہمارے لیے کچھ ایسی غیر متوقع تھی کہ کچھ دیر کو تو ہم سب اپنی اپنی جگہ بے حس و حرکت سنگی مجسموں کی مانند کھڑے رہ گئے۔ پھر اس سکتے کو پروفیسر صاحب کی گمبھیر آواز نے ہی کرچی کرچی کیا۔

"ہو کھیل کا آغاز ہو رہا ہے۔ بہت خون بہے گا؟" لہجہ پراسرار تھا مگر میں کوئی تبصرہ کیے بغیر چوکیدار کی لاش کی طرف بڑھ گیا۔

میرے مکان میں میرے چوکیدار کا قتل۔ کیوں۔ ؟ یہ کیوں بڑی اذیت ناک اور پریشان کن تھی۔ میں تیزی سے آگے بڑھ گیا میرا رخ اپنے بیڈ روم کی

طرف تھا۔ باقی سب میرے عقب میں تھے اختر نے آگے آنے سے پہلے ہی دروازہ لاک کر دیا تھا۔

بیڈ روم کا دروازہ خلاف توقع کھلا ہوا تھا اور اندر سے ٹی وی چلنے کی آواز آرہی تھی۔ میرے قدم رک گئے اعصاب لاشعوری طور پر ایک تناؤ کا شکار ہو گئے۔

میں نے محتاط قدموں سے آگے بڑھ کر اندر جھانکا اور اندر کا منظر مجھے حیران کر گیا۔ ڈاکٹر عقیل 'عارب' اختر اور پروفیسر میرے عقب میں چونکنے کھڑے تھے میرے چہرے کی بدلتی رنگت دیکھ کر اختر فوراً" آگے بڑھ آیا۔ اس نے کوئی سوال نہیں کیا سیدھا اندر جھانکا اور اس کے چہرے پر بھی سنسنی کے تاثرات ابھر آئے۔

ڈاکٹر عقیل 'عارب اور پروفیسر کی حالت بھی کچھ مختلف نہ ہوئی۔

"مجسمہ اور نوادرات بھی غائب ہیں۔" پروفیسر کی گمبیر آواز نے انکشاف کیا۔ ہم اندر داخل ہو کر اندر کا جائزہ لینے لگے۔ ہر چیز اپنی جگہ پر موجود تھی کسی چیز کو چھیڑا نہیں گیا تھا۔ کمرے کے سامان اور ترتیب میں کوئی کمی نہیں تھی۔ جبکہ اختر' عقیل 'عارب اور پروفیسر کے مطابق کمرے سے تابوت اور نوادرات غائب تھے جس پر وہ سب حیرت کا اظہار کر رہے تھے مگر میرے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ میرا دماغ تو اپنے ذاتی ملازم کے میرے ہی بنگلے میں قتل پر آندھیوں کی زد پر آیا ہوا تھا۔

"یہ قتل یقیناً" اس تابوت اور نوادرات کی وجہ سے ہوا ہے۔ جنہیں یہاں سے چرایا گیا ہے۔" ڈاکٹر عارب نے قیاس آرائی کی۔

"یہ بعد میں سوچیں گے کہ اس قتل کا محرک کیا رہا — فی الحال تو یہ سوچیں کہ اس لاش کا اب کیا کرنا ہے" اختر نے کہا پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔

"سر آپ کیا سوچ رہے ہیں؟"

"کوئی سوچ ہی تو ذہن میں جنم نہیں لے رہی اختر! سمجھ نہیں آرہی — کچھ بھی — دماغ ماؤف سا ہو گیا ہے۔"

"اپنے حواس مجتمع رکھو شکیل! ابھی تو اس کھیل کا آغاز ہوا ہے اور تمہارا دماغ ہے کہ ابھی سے ماؤف ہونے لگا۔ آنے والے حالات کا سامنا تم کس طرح کرو گے؟"

"پروفیسر صاحب خدا کے لیے بس کریں۔ ایک تو پہلے ہی دماغ کی کھچڑی بنی ہوئی ہے اوپر سے آپ خوفناک پہیلیاں بجھوانے پر تلے ہوئے ہیں۔" میں نے بے زاری سے کہا۔

"میں تو یہی کہوں گا کہ یہ پہیلیاں بوجھنے کی اب عادت ڈال لو۔ آگے تمہاری اپنی مرضی مگر ایک بھیش کوئی میں کروں تم نے صدیوں پر محیط فاصلہ سمیٹا ہے' ماضی کے اندھیروں کو حال کی روشنیوں سے ہمکنار کیا ہے' ہزاروں سال سے بند داستان کا پہلا ورق الٹا ہے۔ اب اس داستان کے آخری ورق تک تمہیں سفر کرنا ہے اور جانے کیوں مجھے یقین سا ہے کہ اس داستان کے اختتام پر "ختم شد" کی لکیر تمہارے ہاتھوں سے ہی کھنچے گی — تم لاکھ نظریں چراؤ' اس داستان کے مطالعے سے مفر نہیں پا سکو گے۔" پروفیسر صاحب کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ چند لمحے تک تو میں کچھ بول ہی نہ سکا۔

"جو ہونا تھا وہ ہو چکا پروفیسر صاحب — اگر یہ قتل اس سونے کے مجسمے اور نوادرات کے حصول کی خاطر کیا گیا ہے تو قاتل وہ مجسمہ اور نوادرات لے جا چکے ہیں۔ بات ختم ہوئی اب مجھے یہ بھی جاننے کی ضرورت نہیں کہ وہ نوادرات کون لے گیا ہے اور کہاں لے گیا! قصہ ختم۔"

"قصہ تو ابھی شروع ہو رہا ہے شکیل میاں! اختتام تو ابھی بہت دور ہے۔"

"پروفیسر لعنت ڈالیں قصے کہانیوں پر" کیا لغو قسم کی قیاس آرائیاں کرنا طے کر رکھا ہے۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی پہلے موجودہ صورت حال کے متعلق تو کچھ فیصلہ کر لیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہمارے لیے کوئی مصیبت کھڑی ہو جائے۔" ڈاکٹر عارب نے ہماری توجہ چوکیدار کی جانب مبذول کرائی۔ میں ایک بار پھر تشویش

میں مبتلا ہو گیا۔

"کیا ارادہ ہے" کیا پولیس کو انفارم کیا جائے؟" ڈاکٹر عقیل نے سوال طلب نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ ایک احمقانہ حرکت ہو گی۔" پروفیسر نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ پولیس والے ہزار طرح کے سوال اٹھائیں گے۔ کیا جواب دیا جائے گا ان کو؟ کیا وجہ بتائیں گے کہ یہ قتل کیوں ہوا؟ کیا مجسمے اور نوادرات کو وجہ قتل بتایا جائے گا؟ آج اہرام کی دریافت کے متعلق انتظامیہ کو انفارم کیا جا رہا ہے اور آج ہی ڈاکٹر شکیل ظفر کے بنگلے پر یہ واقعہ ہو جاتا ہے۔ پولیس آفیسر جب کڑیاں ملانے لگیں گے تو سچ جھوٹ کے کئی دھبے ہمارے چہروں کو مسخ کر دیں گے۔"

پروفیسر صاحب کی بات واقعی درست تھی۔ میری پریشانی دوچند ہو گئی۔

"تو پھر اس مسئلہ کا حل کیا کیا جائے؟" میں نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ پروفیسر صاحب چند لمحے کے لیے خاموش ہو گئے اور ان کی آنکھوں میں سوچ کے بھنور نمودار ہو گئے اور پھر جیسے وہ مطمئن ہو گئے۔

"اس مسئلے کا سب سے بہتر حل یہ ہے کہ لان میں گڑھا کھود کر اس کو دفن کر دیا جائے اور یہ واقعہ ذہنوں سے کھرچ کر نکال دیا جائے گویا کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔"

چند لمحات کے لیے ہم سب ہی اپنی اپنی جگہ سوچوں میں گم ہو گئے اور پھر جیسے سب کی سوچیں ایک ہی نکتے پر آکر جم گئیں اور ہم سب حرکت میں آگئے۔ تقریباً" ایک گھنٹے بعد پورے بنگلے میں کسی قتل کا کوئی ہلکا سا نشان تک باقی نہیں تھا۔

لاش دیوار کے ساتھ دفن کرنے کے بعد اوپر گملے سجا دیے گئے تھے۔

ہر طرف سے مکمل اطمینان ہو جانے کے بعد میں نے ایک گہری سانس لی۔

میرے سامنے والے صوفے پر ڈاکٹر عقیل اور پروفیسر صاحب برابر برابر بیٹھے تھے اور دائیں طرف والے صوفے پر ڈاکٹر عارب اور اختر تھے۔ ڈاکٹر عقیل اور عارب کے درمیان نوک جھوک ہو رہی تھی۔ میں اختر خاموش بیٹھے تھے جبکہ پروفیسر صاحب سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے ہوئے جانے کن سوچوں میں غرق تھے۔

اچانک کافور کی تیز خوشبو کا ایک جھونکا سا میرے نتھنوں سے ٹکرایا اور مجھے یوں لگا جیسے کوئی نادیدہ وجود میرے برابر صوفے پر آبیٹھا ہو' ہلکی سی کپڑوں کی سرسراہٹ بھی ابھری تھی۔ میں نے چونک کر اپنے برابر صوفے پر نظر ڈالی تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ایک یخ بستہ سلاخ سی میری کھوپڑی کی پشت میں اترتی چلی گئی۔ صوفہ اپنی جگہ سے یوں نیچے کو دب گیا تھا جیسے سچ مچ کوئی اس پر آبیٹھا ہو۔ میں نے بول کر دوسروں کی توجہ صوفے کی جانب متوجہ کرنا چاہی تو یکبارگی کافور کی تیز خوشبو کا ایک اور جھونکا میرے چہرے سے آٹکرایا اور میں باوجود ارادے کے منہ سے ایک لفظ بھی نکال نہیں پایا۔ کافور کی وہ مسحور کن خوشبو جیسے ایک لطیف جھلی کی طرح میرے چہرے کے خدوخال کے ساتھ لپٹ کر رہ گئی۔ میرے حواس جیسے سن ہو کر رہ گئے' سماعت میں صرف ایک گونج رہ گئی' آنکھوں کے سامنے کیا تھا ذہن اس کی تمیز کھو بیٹھا' کان کیا سن رہے تھے' حواس اس سے بے نیاز ہو گئے' وجود جیسے پور پور جھڑ کر فرش پر بچھے قالین پر بکھر گیا۔

اور پھر اچانک گنبد سر کے اندر بپا گونج میں میری آواز ابھری۔ میں خود سے مخاطب تھا۔

"شکیل ظفر! تم مجسمے اور ان نوادرات سے اس قدر لاتعلقی اختیار کر رہے ہو؟ کتنی تگ و دو' دردسری اور کتنا پیسہ برباد کرنے کے بعد تم انہیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تھے — تمہاری کتنی راتوں کا آرام و سکون غارت ہوا' کیا اتنی جلدی فراموش کر بیٹھے کہ کتنے مزدوروں نے اس کوشش میں اپنی جانیں گنوا دیں — کیا یہ زندگیاں اتنی ہی ارزاں اور بے وقعت تھیں —؟ ان درندوں سے ان زندگیوں کا حساب کون لے گا شکیل ظفر؟ کوئی تمہارے گھر میں گھس کر تمہارا

سامان، تمہاری ملکیت، تمہارا حق اٹھا کر لے جاتا ہے اور تم اس سب کو نظر انداز کر کے بیٹھ جاتے ہو۔ کیا تمہارا یہ فیصلہ درست ہے؟ کہاں ہے تمہاری خودداری، تمہاری انا، تمہاری غیرت ۔۔۔! تمہاری اصول پرستی ۔۔۔؟

خود کو سنبھالو شکیل ظفر! پرکھو درست غلط کو، جائز ناجائز میں تمیز کرو۔ اپنے اصولوں کی کسوٹی پر پرکھ کرو۔ تمہیں ۔۔۔ تمہیں ان درندوں کو ڈھونڈنا ہے ۔۔۔ ان معصوم زندگیوں کا حساب برابر کرنا ہے۔ اپنا حق واپس لینا ہے۔ وہ مجسمہ اور وہ نوادرات تمہاری ملکیت تھے اور لے جانے والے انہیں تمہارے بنگلے، تمہارے بیڈ روم سے اٹھا کر لے گئے ہیں۔ تمہارے منہ پر طمانچہ مار گئے ہیں وہ تمہیں چیلنج کر گئے ہیں ۔۔۔ تمہیں اس طمانچے کا جواب دینا ہے ۔۔۔ تمہیں وہ سب حاصل کرنا ہے ۔۔۔ ان کا چیلنج قبول کرنا ہے ۔۔۔ وہ مجسمہ اور نوادرات ان سے واپس چھیننا ہے تمہیں۔ یہ تمہارا حق ہے۔" کوئی نادیدہ قوت تھی جو میرے حواس کو گرفت میں لیے ہوئے تھی۔ مجھے ہپناٹائز کیا جا رہا تھا۔ میری سوچوں کا رخ موڑا جا رہا تھا۔ یہ سب کیسے ہو رہا تھا یہ بات میری عقل سے ماورا تھی۔

میری یہ سحر زدہ کیفیت اس وقت ختم ہوئی جب ڈاکٹر عارب نے مجھے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ میرے حواس عود کر آئے تو میں نے ڈاکٹر عارب کو اپنے سامنے پایا وہ مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب ۔۔۔ ڈاکٹر صاحب ۔۔۔؟"

"آں ۔۔۔ ہاں کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟" میں ہونقوں کی طرح اس کی صورت دیکھنے لگا۔

"عجیب مذاق ہے الٹا ہم سے پوچھا جا رہا ہے کہ کیا ہوا ۔۔۔ آپ بتائیں کہ آپ کو کیا مسئلہ ہے، کہاں گم ہو گئے تھے بیٹھے بیٹھے؟" سب کی سوالیہ نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اپنے برابر صوفے پر نظر ڈالی دبا ہوا صوفہ فوراً "ابھر آیا۔ کمروں کی سرسراہٹ بے دار ہوئی اور لحظہ بہ لحظہ دور ہوتی گئی۔ کافور کی تیز خوشبو بھی مدھم پڑ گئی۔

یہ میرا وہم ہرگز نہیں تھا میں نے واضح طور پر محسوس کیا تھا کہ کوئی غیر مرئی وجود میرے برابر سے اٹھ کر ڈرائنگ روم کے دروازے کی طرف گیا تھا۔ میری متحیر نظریں دروازے کی جانب ہی مرکوز تھیں مگر کوئی ہلکا سا عکس بھی مجھے دکھائی نہیں دیا۔

"شکیل صاحب آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا ۔۔۔ کیا مسئلہ ہے ۔۔۔ کیا نظر آ گیا آپ کو؟" ڈاکٹر عقیل نے تشویش زدہ لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

"شکیل ۔۔۔!" پروفیسر صاحب نے گہری نظروں سے میرا جائزہ لیا۔

"کیا نظر آیا تھا تمہیں؟"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" میں نے الٹا سوال کر دیا۔

"کیا محسوس کر رہے تھے ابھی تم؟"

"اوہ! پروفیسر صاحب، جو آپ سب سمجھ رہے ہیں ایسی کوئی بات نہیں دراصل چند روز قبل گھر سے والد صاحب کا فون آیا تھا گھر میں کچھ پرابلم ہے۔ ذرا پرائیویٹ اور سیریس قسم کی "اسی لیے بس ذرا ۔۔۔" میں نے بات بنائی مگر سب کی آنکھوں سے محسوس کیا جا سکتا تھا کہ وہ پوری طرح میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوئے۔

"اچھی بات ہے یہ لیں کافی پئیں۔" ڈاکٹر عارب نے کافی کا کپ میری جانب بڑھایا پھر شاید میری آنکھوں میں ابھرتی حیرت کو وہ خود ہی سمجھ گیا۔

"جب آپ مراقبے میں پہنچے ہوئے تھے اسی دوران اختر بنا کر لایا تھا۔" اس نے میری حیرت رفع کی اور اپنی جگہ واپس جا بیٹھا۔

کپ سے اٹھتی ہوئی ہلکی ہلکی مہک ہی حواس کو لطف دے گئی۔ میں خاموشی سے کافی کے گھونٹ بھرنے لگا۔

"ہاں تو پروفیسر اب آپ بتائیں ۔۔۔ ذرا وہ کاغذات دکھائیں جن پر آپ نے تابوت اور مجسمے کی عبارت کا ترجمہ تحریر کیا تھا!" ڈاکٹر عارب نے پروفیسر کو مخاطب کیا۔

"وہ بھی غائب ہیں۔ میں نے وہ کاغذات تابوت کے اوپر ہی رکھ دیے تھے کہ بعد میں اطمینان سے باقی عبارت کا بھی جائزہ لوں گا۔ لے جانے والے وہ صفحات بھی لے گئے ہیں۔"

"یہ بھی اچھی رہی ۔۔۔"

"مگر کچھ تھوڑا بہت مجھے یاد ہے ۔۔۔ تابوت پر ہیرے جوڑ کر ایک نام لکھا گیا تھا۔" پروفیسر کی نظریں خلا میں کسی نادیدہ نقطے پر مرتکز ہو گئیں۔

"وہ نام یقیناً" اس شہزادی کا تھا جو اس مجسمے کے اندر محبوس ہے۔ "مرافس ۔۔۔ ہاں یہی نام تھا!"

"حیاں نصیب ماں کی حرماں نصیب بیٹی مرافس

جو نہ مردہ ہے اور نہ زندہ ہے۔

"بالکل بلاشک و شبہ تابوت پر یہی عبارت تھی ۔۔۔ اور مجسمے پر کندہ عبارت میں کسی مسیحا کو مخاطب کیا گیا تھا ایک ۔۔۔ ایک ایسے مسیحا کو جو مردوں کو زندہ کر دینے والا علم جانتا ہے! جس کی آنکھیں جسموں کے اندر دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ کچھ ایسی ہی عبارت تھی وہ اور اگر غور کیا جائے تو با آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ الفاظ ایک ڈاکٹر ایک سرجن کے تخاطب میں کندہ کیے گئے ہوں گے کیونکہ ایک سرجن کے پاس ہی یہ علم ہو سکتا ہے کہ وہ جسموں کے اندر "انسان کے اندرونی اعضاء تک دیکھ لیتا ہے اور آپریشن کے ذریعے ایک طرح کے مردے کو زندہ کر دیتا ہے اور شکیل ظفر وہ سرجن، وہ ڈاکٹر ۔۔۔ یعنی مجسمے پر کندہ عبارت میں جس مسیحا کو مخاطب کیا گیا ہے وہ کوئی اور نہیں ۔۔۔ تم ہو۔" پروفیسر صاحب کی بات سن کر ڈاکٹر عقیل، عارب اور اختر تینوں چونک پڑے جبکہ مجھے یوں لگا جیسے میرے ذہن سے بہت بڑا بوجھ سرک گیا ہو۔ میں جس تذبذب کا شکار تھا اس سے چھٹکارا مل گیا۔ ایک فیصلہ سکون بن کر میرے اندر اترتا چلا گیا۔

"پروفیسر! آخر آپ ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں؟ آپ کا ایسی باتیں کرنے کا مقصد کیا ہے؟ آپ خود کو پراسرار شخصیت ثابت کر کے اپنا رعب جمانا چاہتے ہیں یا ہمیں خوفزدہ کرنا چاہتے ہیں؟" عارب پروفیسر صاحب پر بگڑ پڑا۔ پھر پروفیسر صاحب کے کچھ بولنے سے پہلے ہی میں بول پڑا۔

"پروفیسر! میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے جو بتایا تابوت اور مجسمے پر وہی کندہ ہو گا اور اس عبارت سے جو مفہوم آپ نے اخذ کیا ہے وہ درست ہے۔ مگر اب آپ یہ بتائیں کہ وہ مجسمہ تو نہ جانے کون لے گیا اور اس وقت کہاں ہو گا اس کا بھی کچھ اندازہ نہیں اب اگر اسے حاصل کرنا ہو تو کیا کیا جائے؟" میری سنجیدگی کو محسوس کر کے میرے ساتھی ڈاکٹرز متحیر نظروں سے میری سمت دیکھنے لگے جبکہ پروفیسر کی آنکھیں اندرونی مسرت کی شدت سے چمک اٹھیں۔

"ہم کوشش کریں گے شکیل، مجھے یقین ہے کہ ہم جلد کوئی نہ کوئی سراغ پانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"پروفیسر صاحب کیا آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ یہ کام کس کا ہو سکتا ہے؟"

"یہاں مصر میں ایسے بہت سے گروہ ہیں جو بھاری معاوضہ لے کر نوادرات چرانے کی وارداتوں میں ملوث ہیں ۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کارروائی کسی ایسے ہی گروہ کی ہو۔ مگر یقین کے ساتھ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا ۔۔۔ ۔۔۔ کہ اس سارے معاملے کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے یا یہ کس کی حرکت۔"

"پروفیسر صاحب! میں نے ایک خیال کے تحت کہا۔

"کہیں یہ کام مزدوروں کا نہ ہو؟"

"نہیں یہ ناممکن ہے مزدوروں کو تو ان نوادرات کا علم ہی نہیں! یہ پوری راز داری کے ساتھ یہاں پہنچائے گئے تھے، مزدوروں کے تو خواب و خیال میں بھی نہیں ہو گا۔"

"پروفیسر صاحب یہ کیسے ممکن ہے؟ اگر یہ کام کسی پیشہ ورانہ گینگ کا بھی ہے تو آخر اس گینگ تک بھی تو انہیں سے اطلاع پہنچی ہی ہو گی نا ورنہ انہیں

"الہام تو ہوا نہیں ہوگا۔"

"ہاں یہ بات تو تمہاری درست ہے۔" پروفیسر صاحب کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔

"مگر میرے ذہن میں ایسا کوئی پہلو نہیں جو کمزور رہ گیا ہو۔ جہاں سے یہ نقب لگائی گئی ہے۔"

"اور پھر ابھی تو کوئی وقت بھی نہیں گزرا تھا۔۔۔؟"

"جو بھی ہے تم بے فکر ہو جاؤ۔ میرے چند جاننے والے ہیں جن کا ایسے جرائم کرنے والوں میں اٹھنا بیٹھنا ہے۔ میں دو چار دن میں ہی پتا چلا لوں گا کہ یہ کام کن لوگوں کا ہے۔"

"محترم میں تو مشورہ دوں گا کہ اس تجسس سے اپنے ذہنوں کو نجات دلا دیں کہیں کوئی اور احمقانہ حرکت کر بیٹھے تو شاید پچھتانے کا موقع بھی میسر نہ ہو۔" عارب نے درمیان میں مداخلت کی۔

"کون سی احمقانہ حرکت۔۔۔؟" پروفیسر کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"یہی مجسمے کا سراغ لگانے کی یا ان کریمنلز تک پہنچنے کی جنہوں نے مجسمہ چرایا ہے۔ جس انداز میں یہ ساری کارروائی ہوئی ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کام کرنے والے کوئی معمولی کریمنلز نہیں ہیں۔ چند گھنٹوں کے اندر جس برق رفتاری اور منظم انداز میں یہ سب ہوا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مجرم انتہائی ذہین اور خطرناک ہیں۔ قتل بھی کر گئے ایک تابوت اور کئی نوادرات بھی لے اڑے اور اپنے عقب میں کوئی ہلکا سا نشان تک نہیں چھوڑ کر گئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ لوگ ان کا سراغ لگانے کے چکر میں ہوں اور وہ آپ کی کھوپڑیوں میں سوراخ کر جائیں اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہو۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا تم بے فکر رہو۔"

"کیوں آپ کیا سلیمانی ٹوپی پہن کر گھومیں گے؟ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ آپ کو توقع نہیں ہے مگر ایسا ہو سکتا ہے۔ ہم لوگوں کی طرف سے وہ اتنے بے خبر نہیں ہوں گے۔ نامعلوم وہ کتنے باوسائل ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم خوش فہمیوں کا شکار ہوں اور اس وقت یہاں جو پلان ترتیب دیے جا رہے ہیں وہ سب کہیں بیٹھے سن رہے ہوں۔ ان کے بااثر ہونے کی منہ بولتی مثال تابوت اور نوادرات کی چوری ہے۔" عارب نے سرسری سے انداز میں کہہ دیا پر اسے خود احساس نہ ہوا کہ اس نے کیسی سنگین صورت حال ہمارے سامنے بے پردہ کر دی ہے۔

چند لمحے کے لیے پروفیسر صاحب کو بھی چپ لگ گئی۔ عین ممکن تھا کہ ہمارے آس پاس ہی کہیں کوئی حساس آلہ چھپایا گیا اور ہمارے مابین ہونے والی گفتگو کو کسی دوسری جگہ سنا جا رہا ہو۔ پروفیسر صاحب نے مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ گفتگو یہیں پر رکنے کا اشارہ کیا اور گفتگو کا رخ موڑ دیا۔ کچھ دیر ہم ادھر ادھر کی گفتگو کرتے رہے پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆ ☆ ☆

رات کو جب میں بنگلے پر سونے کے لیے آیا تو۔ ذہن میں عجیب سی سرسراہٹیں جنم لے رہی تھیں اور رگوں میں دوڑتا خون جھٹکے لے لے کر گردش کر رہا تھا۔

ذہن کو ان خیالات سے چھٹکارا دلانے کی غرض سے میں نے سوچوں کا رخ موڑ لیا۔

پروفیسر صاحب جاتے ہوئے کہہ گئے تھے کہ وہ اپنے طور پر مجسمے کا سراغ لگانے کی کوشش کریں گے اور چند روز بعد دوبارہ چکر لگائیں گے۔ میں بذات خود بڑی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح آنکھ جھپکتے ہی اس سنہرے مجسمے تک پہنچ جاؤں۔ رگوں میں اضطراب کھولنے لگا اور اپنی یہ کیفیت خود میری سمجھ سے بالا تھی۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا میرے ذہنی انتشار اور اضطراب میں اضافہ ہوتا گیا۔ میں اٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔

اسی کیفیت میں رات نصف سے زیادہ گزر گئی تقریباً ڈھائی تین بجے کا وقت رہا ہوگا جب لان سے ایک سمجھ نہ آنے والی آواز بلند ہوئی اور میں چونک

پڑا۔

آواز بہت مدھم تھی مگر یہ میرا وہم نہ تھا۔ چند لمحے مزید گزرے آواز ایک بار پھر بلند ہوئی اس بار وہ میرے ذہن میں خطرے کے الارم بجا گئی۔

"لان میں کوئی ہے۔ کوئی ہے۔" میں نے تیزی سے بیڈ سائیڈ دراز کھولی اور پسٹل نکال لیا۔ پہلا خیال میرے ذہن میں یہی آیا کہ جن لوگوں نے مجسمہ چرایا ہے وہی ہوں گے اور ہو نہ ہو میرے قتل کے ارادے سے بنگلے میں داخل ہوئے ہیں۔

پھر ایک خیال آتے ہی میں تیزی سے ٹیلیفون کی طرف بڑھ گیا۔ آئندہ لمحے میں ڈاکٹر عقیل کے نمبر پریس کر رہا تھا۔

پانچویں بیل پر ریسیور اٹھا لیا گیا۔

"ہیلو۔" ڈاکٹر عقیل کی نیند سے بوجھل آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"ہیلو ڈاکٹر عقیل! میں شکیل بات کر رہا ہوں۔ میرے بنگلے میں کوئی گھس آیا ہے آپ فوری طور پر عارب کو ساتھ لیں اور یہاں پہنچیں۔ چوکیدار کو بھی ساتھ لے لیجیے گا۔" میں نے تیز لہجے میں کہا۔

"کیا؟" ڈاکٹر عقیل جیسے اچھل پڑے۔

"کون گھس آیا ہے؟ آپ۔۔۔ آپ فکر مت کریں شکیل صاحب میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔" ڈاکٹر عقیل نے بدحواسی سے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ میں نے ریسیور رکھا اور لپک کر کمرے کی لائٹ آف کر دی۔ پورا کمرہ گاڑھے اندھیرے سے بھر گیا۔

میں دبے قدموں دروازے کی سمت بڑھنے لگا۔ اعصاب ایک سنسنی کا شکار تھے۔ دل تھا کہ دھک دھک کر رہا تھا۔ پسٹل میں نے دائیں ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے بلٹ لوڈ کی اور ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر رکھ دیا۔ چند لمحے میں دروازے سے کان لگائے خاموش کھڑا رہا مگر باہر مکمل خاموشی طاری تھی۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔ آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا جن کی مدھم روشنی میں لان کے اطراف رکھے پھولوں کے گملے چھلاووں کی صورت دکھائی دے رہے تھے۔ فضا سناٹے میں جکڑی ہوئی تھی۔ کہیں کوئی آواز کوئی آہٹ نہ تھی۔ لان بھی سنسان سا تھا کہیں کسی انسان کا سایہ دکھائی دے رہا تھا نہ ہیولا۔

میں محتاط قدموں سے باہر نکلا اور برآمدے کے ستون سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے کان کسی بھی آہٹ، کسی بھی آواز کے منتظر تھے۔ مگر فضا پر خاموشی کی دبیز تہہ جمی ہوئی تھی۔ کہیں کسی آواز کی ہلکی سی گرد تک نہیں تھی۔

کچھ دیر کے انتظار کے بعد ستون کی اوٹ سے نکلا اور چوکنے انداز میں لان کی مغربی دیوار کی سمت بڑھ گیا۔ جہاں "گلبو" کے دو درخت لگے ہوئے تھے۔ جن کے پھولوں کی خوشبو نے پوری رات کو مہکا رکھا تھا۔

میں آہستہ روی سے آگے بڑھ رہا تھا اور میری نظریں تیزی سے اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ لان کے وسط میں پہنچ کر اچانک میری نظریں اپنے سامنے چند قدم کے فاصلے پر پڑیں تو بے اختیار میرے قدم ٹھٹک کر رک گئے۔

میرے سامنے چار قدم کے فاصلے پر لان کی گھاس پر دو انسانی وجود منہ کے بل پڑے تھے۔ ان کی پوزیشن احساس دلاتی تھی کہ وہ زندگی سے محروم ہیں۔

اچانک صندل اور کافور کی تیز خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکرائی اور میں چونک پڑا۔ ایک عجیب سی آہٹ نے مجھے پلٹنے پر مجبور کر دیا اور پھر جو منظر میرے احاطہ بصارت میں آیا اس نے مجھے مبہوت کر کے رکھ دیا۔ پورے وجود کے رونگٹے گویا تن کر الف ہو گئے۔

میرے سامنے سفید دھوئیں کا ایک ستون سا ایستادہ تھا جس کے اندر گردش کرتی روشنیوں نے اس دھوئیں میں ایک خیرہ کن چمک پیدا کر دی تھی اور اس دھوئیں کے اندر ایک انسانی پیکر کھڑا تھا۔ غالباً اس پیکر نے بھی سفید ہی لبادہ اوڑھا ہوا تھا کیونکہ اس کے وجود کا ہلکا سا عکس ہی تھا جس کی جھلک دکھائی دے رہی تھی البتہ چہرے کے خدوخال واضح تھے۔ وہ کوئی

عورت تھی ادھیڑ عمر مہربان صورت۔ کشادہ پیشانی لمبی لمبی آنکھیں باریک ہونٹ اور تیکھی ناک۔ چہرے پہ ایک عجیب سا سکوت ایک وقار۔

"گھبراؤ نہیں بیٹا تمہیں مجھ سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" آواز میں ایک نرمی تھی۔

"آ۔ آپ۔" میری زبان ہکلا گئی اور میں اپنی بات مکمل نہیں کرسکا مگر شاید وہ میرے دل کی بات خود ہی سمجھ گئی۔

"میں۔ جہاں نصیب مریاقس کی ماں ہوں۔ یوسا۔"

"مریاقس۔" میں زیر لب بڑبڑایا اور میری نظریں ایک لمحے کو اپنے عقب کی جانب سرک گئیں۔

"اور یہ لاشیں؟"

"انہیں میں نے زندگی سے نجات دلائی ہے۔ کیونکہ یہ تمہیں ہلاک کرنے کی نیت سے آئے تھے۔ ہاں۔ اور تم میرے لیے۔ مریاقس کے لیے رحمت کا فرشتہ ہو مسیحا ہو۔ کیونکہ صرف تم ہی ہو جو مریاقس کو جاں عذاب سے نجات دلا سکتے ہو۔"

"میں مریاقس لعذاب؟" میرا ذہن الجھن کا شکار ہوگیا۔

"آپ ذرا تفصیل سے بتائیں مجھے۔" میرا انداز الجھن آمیز تھا۔

"اے نیک مسیحا! میرے پاس اتنا اختیار نہیں۔ میں ایک بدنصیب بچی کی ماں ہوں۔ میری ممتا کو سکون میسر نہیں۔ ہزاروں سال گزر گئے میری لخت جگر اذیت ناک عذاب جھیل رہی ہے۔ میں۔ میں تم سے درخواست کرتی ہوں۔ اے مسیحا! ایک مضطرب ماں تم سے التجا کرتی ہے کہ میری بچی کو ڈھونڈو اور اسے اس عذاب سے رہائی دلاؤ جس میں وہ ہزاروں سال سے مبتلا ہے۔" ٹھیک اسی لمحے کال بیل چیخ اٹھی۔

"مگر میں اسے کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں اور۔ اور بھلا میں اسے کسی عذاب سے کیسے نجات دلا سکتا ہوں؟" بیل کی آواز ایک مرتبہ پھر بلند ہوئی۔ دھوئیں میں ملفوف یوسا کا پیکر جھلملانے لگا۔

"مریاقس کہاں ہے یہ تم "جسونت دیال" سے پوچھ سکتے ہو۔ جب اسے ڈھونڈ لو گے تو باقی کی حقیقت تم پر از خود منکشف ہو جائے گی۔ اب میں چلتی ہوں تم تمام لائٹیں روشن کردو اور اس بات کا کسی سے ذکر مت کرنا۔" وہ پیکر، وہ دھواں شاید فضا میں ہی کہیں تحلیل ہوگیا اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ بیل کی آواز تیسری بار بلند ہوئی اور میں اندرونی جانب بڑھ گیا۔ بیڈ روم، برآمدہ، ڈرائنگ روم اور راہداری کی لائٹیں آن کرتے ہوئے میں دروازے کی سمت بڑھ گیا۔ میں نے پوچھا کہ کون ہے دوسری جانب عقیل تھے۔ میرے دروازہ کھولتے ہی وہ تیز لہجے میں بولے۔

"سب خیریت تو ہے نا؟" چوکیدار بھی ان کے ہمراہ تھا۔

"ہاں سب خیریت ہے کوئی مسئلہ نہیں۔" میں نے پسٹل نیفے میں اڑس لیا۔ پھر چوکیدار کو مخاطب کیا۔

"تم واپس چلے جاؤ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔" اور وہ بغیر کچھ کہے واپس پلٹ گیا۔ ڈاکٹر عقیل اندر آگئے ان کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ میں نے دروازہ لاک کیا اور پلٹ پڑا۔

"کیا مسئلہ تھا۔ کون تھا؟" ڈاکٹر عقیل بری طرح گھبرائے ہوئے تھے۔ انہوں نے لباس بھی چینج نہیں کیا تھا' شب خوابی کے لباس میں ہی اٹھ کر دوڑے آئے تھے۔

"ہوگا کوئی چور میں نے پکڑنے کی کوشش تو کی تھی مگر بھاگ گیا۔" ہم چلتے ہوئے دوسرے حصے میں پہنچے تو میں چونک پڑا۔ ڈاکٹر عارب اور علی اختر ہاتھوں میں پستول پکڑے ہمارے سامنے کھڑے تھے۔

"تم لوگ کدھر سے آئے؟" حیرت میرا انداز تھی۔

"دیوار سے" ڈاکٹر عقیل نے کہا تھا کہ جب تیسری بیل کی آواز سنائی دے تو تم لوگ دیوار پھاند کر اندر داخل ہو جانا۔ مسئلہ کیا تھا؟" ڈاکٹر اختر نے مسکراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ میری نظریں بے اختیار لان کی جانب اٹھ گئیں۔ حیرت کا ایک دھچکا سا لگا۔ لاشیں

غائب تھیں۔ یقینی بات تھی کہ یوسا کی روح نے انہیں غائب کردیا ہوگا۔ میں مسکراتے ہوئے ڈرائنگ روم میں کی جانب بڑھ گیا۔

"کوئی چور تھا بھاگ گیا۔"

"میری صلاح مانیں ڈاکٹر صاحب تو اب یہ بنگلہ چھوڑ دیں۔ اس بنگلے کی گردش شروع ہوگئی ہے۔ دن میں نوادرات غائب ہوتے ہیں اور رات کو چور آجاتے ہیں۔ حیرت ہے۔" اختر نے معنی خیز انداز میں کہا۔ میں اس کے لہجے کا مطلب تو سمجھ گیا تھا مگر میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

"آپ کا فون آیا تو میں تو گھبرا گیا تھا۔ یہاں آتے ہوئے دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ اللہ خیر کرے اور آج تو بڑی مدت کے بعد اتنی اچھی نیند آئی تھی کیا خوبصورت خواب تھا۔" ڈاکٹر نے صوفے پر تقریباً گرتے ہوئے کہا تو اختر ہنس پڑا۔

"عقیل صاحب آپ کی جوانی ڈھل رہی ہے' بڑھاپے کا آغاز ہے اور اس عمر میں خوبصورت خواب؟ عجیب سی بات ہے۔"

"کیوں بھئی اس میں عجیب بات کیا ہے۔ بھلا بڑھاپے کا خوابوں سے کیا تعلق؟ اور پھر بڑھاپا کہاں سے آگیا۔ ابھی تو جوانی پوری طرح وارد نہیں ہوئی اور تم بڑھاپے کو لے آئے۔" ڈاکٹر عقیل نے کچھ اس انداز سے کہا کہ بے اختیار مجھے ہنسی آگئی۔

"نہیں ابھی تو آپ پر بچپنا بھی پوری طرح نہیں آیا۔"

"نہیں ابھی یہ پیدا بھی نہیں ہوئے۔" ڈاکٹر عارب نے اپنے مزاج کے مطابق کھردرے لہجے میں کہا۔

"ہاں اور تم مجھے پیدا ہونے بھی نہ دینا۔ تمہارا تو وہ حال ہے کہ کھیلنا اور نہ کھیلنے دینا۔"

"نہیں عقیل صاحب یہاں تو آپ کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ پیدا ہونا اور نہ کسی کو پیدا ہونے دینا۔" اختر کے بھی قہقہہ لگایا۔ وہ مذاق پر مگن ہوگئے اور میں سوچوں میں۔ میرے ذہن میں جسونت دیال کا نام گونج رہا تھا۔ جسونت دیال پروفیسر فاضل بصاری کا شاگرد جو

چند روز قبل ہی انڈیا سے یہاں آیا تھا اور جب مجھے اہرام سے بے ہوشی کے عالم میں نکالا گیا تھا تو وہ بھی ساتھ تھا۔ نوادرات اور مجسمے کے متعلق اسے بھی آگاہی تھی۔ تمام صورت حال مجھ پر واضح ہوگئی اور ذہن نے ایک مضبوط فیصلہ کرلیا۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ مجسمے کو دوبارہ حاصل کرنے کا جنون جیسے میرے دماغ کی آغوش میں پرورش پا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

میں نے گزشتہ رات کی ساری رام کہانی فون پر پروفیسر صاحب کے گوش گزار کردی۔ میری ساری بات سننے کے بعد پروفیسر صاحب سنجیدہ لہجے میں گویا ہوئے۔

"اس صورت حال میں ہم جسونت پر صرف شک کرسکتے تھے شکیل کیونکہ شروع سے ہی اس کا ریکارڈ کچھ ایسا ہی ہے مگر مریاقس کی ماں یوسا کی روح کے خود آکر جسونت کے بارے میں ایسے الفاظ کہہ دینے سے شک یقین میں بدل جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم جسونت کے ذریعے مریاقس کا تابوت دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔"

"پروفیسر اس صورت حال میں مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

"شکیل اس معاملے میں تمہارے کام آنا میں اپنے لیے اعزاز سمجھوں گا۔ بلکہ میری تم سے درخواست ہے کہ اس کہانی میں مجھے بھی اپنا ہم سفر بنالو۔ اس داستان میں میری ذات کا ملوث ہونا میرے لیے کسی اعجاز سے کم نہیں ہے۔ میں تمہارے ساتھ مل کر صدیوں سے الجھی ہوئی اسرار کی یہ گتھیاں سلجھانا چاہتا ہوں۔"

"پروفیسر صاحب یہ میری خوش نصیبی ہوگی کہ مجھے آپ کا تعاون حاصل رہے گا۔ آپ جسونت کو ہمراہ لیے میرے بنگلے پر چلے آئیں۔ اب اصل کیا ہے یہ اس کی زبان سے ہم نہیں اگلوائیں گے۔"

"ٹھیک ہے شکیل! اگر یہ سب میرے پیشے اور

مرتبے سے متصادم ہے مگر مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔ اس معاملے میں میں کسی بھی حد تک جاسکتا ہوں۔ تم انتظار کرو میں جسونت کو لے کر پہنچ رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے میں منتظر ہوں۔" میں نے ریسیور رکھا۔ چند لمحے اپنے منصوبے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں نے ریسیور اٹھا کر ڈاکٹر عارب کے نمبر پریس کردیئے۔

"عارب فوراً میرے آفس میں پہنچو۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔ کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر عارب میرے آفس میں موجود تھا اور میں نے بغیر تمہید باندھے اسے اپنے ارادے سے آگاہ کردیا۔

"ٹھیک ہے یہ سب اگر مناسب سمجھتے ہیں تو آپ کی مرضی۔ میں ہر تعاون کے لیے تیار ہوں۔" عارب نے کندھے اچکادیئے۔

"تو ٹھیک ہے میں بنگلے پر جارہا ہوں۔ جیسے ہی پروفیسر آئیں تم انہیں ساتھ لے کر چلے آؤ۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"او کے۔" میں آفس سے نکلا اور سیدھا بنگلے پر آگیا۔

واقعات کی کڑیاں ایک دوسرے سے مربوط ہو کر ایک زنجیر کی صورت اختیار کرنے لگیں۔

میری ذات پر بہت کچھ واضح ہوتا جارہا تھا۔ نہ جانے میں کب تک ان سوچوں کے درمیان الجھا رہا۔ یہ سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب کال بیل کی آواز میرے پردہ سماعت کو جھنجوڑ گئی۔ میری توقع کے مطابق ڈاکٹر عارب پروفیسر صاحب اور جسونت دیال کو ساتھ لے کر آیا تھا۔

جسونت کوئی تیس سال کا چھریرے بدن اور درمیانے قد کا جوان تھا۔ اس نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا تھا۔ میں پروگرام کے مطابق انہیں لے کر اپنے بیڈ روم میں آگیا جبکہ عارب پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق کافی بنانے کے لیے چلا گیا۔

"ڈاکٹر صاحب سنائیں اب طبیعت کیسی ہے؟" گفتگو کا آغاز جسونت نے ہی کیا۔

"ذات باری تعالیٰ کا خاص کرم ہے۔ بالکل پرفیکٹ ہوگیا ہوں۔"

"دراصل مجھے کچھ ایمرجنسی تھی اس لیے میں چلا گیا تھا ارادہ تو تھا کہ جلد لوٹ آؤں گا مگر مسئلہ کچھ ایسا تھا کہ مجھے تاخیر ہوگئی اور میں نہیں آسکا۔" جسونت نے شرمندہ سے لہجے میں کہا۔ بڑا شاندار اداکار معلوم ہوتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اسے کیا ایمرجنسی آپڑی تھی اور یہ کہ وہ کہاں گیا تھا؟

اسی دوران عارب ٹرے میں چار کپ کافی لے آیا۔ سب سے پہلے اس نے جسونت کو کپ پیش کیا پھر مجھے اور پروفیسر کو کپ پکڑایا اور چوتھا کپ خود اٹھا کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

"آپ کا یہاں مصر میں کب تک رکنے کا پروگرام ہے؟" میں نے جسونت سے سوال کیا۔ پروفیسر صاحب بڑی گہری نظروں سے میری صورت دیکھ رہے تھے۔ شاید انہوں نے میرے چہرے پر پھیلی ہوئی سنگینی کو محسوس کرلیا تھا۔

"میں جن امور کی تکمیل کے لیے یہاں آیا تھا وہ مکمل ہوگئے ہیں میں آج رات بارہ بجے کی فلائٹ سے واپس انڈیا جارہا ہوں۔" جسونت نے کافی کا گھونٹ بھرا۔

"کس سلسلے میں آئے تھے آپ یہاں؟"

"بس کچھ ذاتی قسم کے مسئلے مسائل تھے۔"

"پروفیسر صاحب نے بتایا تھا کہ تاریخ کے ساتھ ساتھ آپ کو آثار قدیمہ سے بھی گہری دلچسپی ہے۔"

"ہاں جی۔ انہوں نے درست فرمایا ہے۔ تاریخ اور آثار قدیمہ کا تو آپس میں گہرا ربط ہے۔ عہد قدیمہ کی تہذیب سے متعلق تجسس تو میری فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے تب سے میں آثار قدیمہ میں بڑی اٹریکشن فیل کرتا ہوں۔"

"آپ کو نوادرات جمع کرنے کا بھی شوق ہوگا؟"

"جنون کی حد تک مگر میرے پاس اتنے وسائل نہیں کہ میں اپنے اس ذوق کی تسکین کرسکوں۔" جسونت نے آخری گھونٹ بھرا اور کپ سامنے ٹیبل پر رکھ دیا۔

"تو محدود وسائل ہونے کی صورت میں آپ کس طرح اپنے اس ذوق کی تسکین کرتے ہیں۔"

"تسکین ہی تو نہیں ہو پارہی جس کے باعث روز بہ روز میری تشنگی میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔"

"کیا ان میں کوئی ممی بھی ہے؟" میری بات پر جسونت کے چہرے پر ایک سایہ سا آکر گزر گیا۔

"نہیں یہ اپنے اختیارات اور حیثیت سے بہت اوپر کی بات ہے۔" جسونت نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"اور کوئی مجسمہ وغیرہ۔؟" اس بار واضح طور پر جسونت کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی مگر اس نے اپنے تاثرات بڑی تیزی سے چھپالیے۔

"کس قسم کا مجسمہ۔؟"

"مسٹر جسونت اداکاری تو تم اچھی کرلیتے ہو مگر ابھی بہت کمی ہے۔ ہاں اداکاری کی صلاحیتیں تم میں ضرور موجود ہیں۔" میں صوفے سے پشت ٹکا کر مطمئن انداز میں بیٹھ گیا۔ میرے لہجے کی تبدیلی محسوس کرکے جسونت کے چہرے کے تاثرات الجھن آمیز ہوگئے جب کہ عارب اپنی جگہ مستعد ہو بیٹھا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" جسونت سیدھا ہو بیٹھا۔

"اب بننے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ میں حقیقت جان چکا ہوں۔ تمہاری صحت کے لیے بہتر ہوگا کہ تم معاملہ خود ہمیں بیان کردو کہ ممی کہاں ہے ورنہ دوسرا طریقہ کار تمہارے لیے بھی دردناکیوں کا پیغامبر ہوگا اور ہمیں بھی فضول میں سردردی ہوگی۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ جسونت کی پیشانی پر بل پڑ گئے وہ رخ بدل کر پروفیسر صاحب سے مخاطب ہوا۔

"پروفیسر صاحب یہ کیا بہک رہے ہیں؟ آپ تو ان کی بہت تعریفیں کررہے تھے اور ان کو بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں۔"

"برخوردار نہیں تو غیر جانبدار ہوں یہ جو جاننا چاہتے ہیں انہیں خود ہی بتادو ورنہ انہیں تو سلیقہ نہ سہی تمہیں یہ بات کرنے کا سلیقہ ضرور سکھا دیں گے۔" پروفیسر صاحب چشمے کے موٹے شیشوں کے اوپر سے جسونت کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں گویا ہوئے۔

"کیوں مسٹر جسونت کیا خیال ہے پھر۔؟"

"کس بارے میں۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں کیا چاہتے ہیں میں کچھ نہیں سمجھ رہا۔" جسونت نے بے زاری سے کہا۔ میں نے عارب کی طرف دیکھا وہ اٹھ کر دروازے کی سمت بڑھ گیا اور میں جسونت سے مخاطب ہوا۔

"تمہیں امن سکون اچھا نہیں لگتا۔ بدامنی کے خواہاں ہو تو ٹھیک ہے۔ یونہی سہی۔" عارب نے دروازہ بند کرکے چٹخنی چڑھادی۔

"یہ۔ یہ سب کیا کررہے ہیں۔ کیا چاہتے ہیں آپ؟"

"ہم ممی کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ وہ یہاں سے کیسے چرائی گئی اور کہاں پہنچائی گئی ہے؟"

"دیکھیے آپ۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"دکھایئے نہیں بتایئے۔ وہ ممی کہاں ہے۔ دیکھو جسونت اب بھی تمہارے پاس وقت ہے اگر تم کچھ دیر مزید یونہی رد و قدح کرتے رہے تو ہم بھی تمہیں موت کے منہ میں جانے سے بچا نہیں سکیں گے۔" میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔ جسونت کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی۔ پورے وجود کا خون جیسے یکایک خشک ہوگیا۔

"شکیل صاحب یقین کریں۔ بھگوان سوگند میں نے کوئی ممی چوری نہیں کی۔" جسونت ہاتھ جوڑتے ہوئے گڑگڑایا۔

"یقین کرلیا۔ یہ بتاؤ کہ کس نے چرائی ہے اور کیوں چرائی ہے؟"

"وہ۔ وہ اگر میں نے آپ کو بتادیا تو وہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔" جسونت نے تھوک نگلتے

ہوئے کہا۔

"یعنی تم کچھ نہیں بتاؤ گے؟" جسونت فرش پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا۔

"اگر۔۔۔ اگر میں نے ان لوگوں کے خلاف زبان کھولی تو وہ مجھے ہلاک کردیں گے وہ۔۔۔ وہ بہت خطرناک ہیں۔"

"تو ٹھیک ہے مت کھولو زبان اور مرجاؤ۔ زیادہ وقت نہیں، صرف پندرہ منٹ۔ تم نے جو کافی پی ہے اس میں زہر تھا۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں آپ کو بھگوان۔۔۔ آپ کو اپنے خدا کا واسطہ مجھے شما کردیں۔۔۔ مجھے بچالیں، چھوڑ دیں مجھے۔" جسونت بری طرح گڑگڑانے لگا اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلملانے لگے تھے۔

"دیکھو جسونت وہ لوگ تو جب تمہیں کوئی نقصان پہنچائیں گے تب پہنچائیں گے لیکن اگر تم نے ہمیں اصل حقیقت نہ بتائی تو کچھ ہی دیر میں تم ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اذیت ناک موت مرجاؤ گے۔ اب فیصلہ خود کرلو کہ چند دن زندہ رہ کر ان خطرناک لوگوں کے ہاتھوں مرنا چاہو گے یا ابھی یہیں مرو گے۔ یہاں سے اگر زندہ بچ گئے تو ان لوگوں سے تو ویسے بھی خود کو چھپ چھپا کر بچاسکتے ہو بہرحال۔۔۔ سوچ لو۔" میں نے بے فکری کا مظاہرہ کیا۔

"ٹھیک ہے آپ جو پوچھنا چاہتے ہیں پوچھیں۔۔۔ میں سب کچھ بتاتا ہوں۔"

"ہوں۔۔۔ یہ ہوئی نا عقلمندی کی بات۔ اب بتاؤ کہ وہ ممی کہاں ہے؟"

"وہ۔۔۔ وہ آج ہی۔۔۔ اب سے دو گھنٹے قبل ایک طیارے کے ذریعے انڈیا کے لیے لے جائی گئی ہے۔"

"انڈیا۔" میں چونک پڑا۔

"کون لے کر گیا ہے اسے؟"

"شیخ حارث طمانی کے آدمی وہ بڑا اسمگلر ہے۔ اس سے پہلے بھی وہ اس قسم کی وارداتوں میں ملوث رہا ہے۔ یہاں سے نوادرات اسمگل کرکے وہ انڈیا پہنچاتا ہے اور اس کے بدلے مہاراجہ رام پرشاد اسے بھاری معاوضہ دیتے ہیں۔"

"حارث طمانی کو اس ممی کے متعلق کیسے پتا ہوا؟" میں نے گہری چبھتی نظروں سے جسونت کی آنکھوں میں جھانکا۔

"اس۔۔۔ اسے میں نے بتایا تھا۔ بس میرا اتنا ہی قصور ہے۔ اس کے علاوہ میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔۔۔ آپ میری بات کا یقین کریں۔"

"ہم نے یقین کرلیا۔ تم یہ بتاؤ کہ تم نے اسے کیوں بتایا تھا؟"

"وہ۔۔۔ وہ میں نے مہاراجہ رام پرشاد کی وجہ سے اسے ان نوادرات کے متعلق بتایا تھا۔"

"یہ موصوف مہاراجہ کون ہیں اور تمہارا ان سے کیا تعلق ہے؟"

"وہ ریاست رام پور کے مالک ہیں۔۔۔ بہت باوسائل اور لمبے ہاتھ ہیں ان کے۔ دولت جائیداد کا کوئی شمار نہیں۔ انہیں نوادرات جمع کرنے کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ ان کے محل میں لاکھوں کروڑوں کے نوادرات موجود ہیں۔ ان کے عجائب خانے میں اتنے نوادرات اور ایسے نادر روزگار نمونے موجود ہیں کہ یوں سمجھ لیں انہوں نے محل کے ایک حصے میں گویا ایک عالم عجائب بنا رکھا ہے۔ مگر اس کے باوجود روز افزوں ان کی اس نوادرات جمع کرنے کی ہوس میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ اپنے اس ذوق کی تسکین کی خاطر وہ اپنے مطلب کے افراد کو اپنی عنایات سے اپنا گرویدہ بنا کر رکھتے ہیں یا پھر اسے کسی جال میں پھانس کر اس حد تک اپنا مطیع کرلیتے ہیں کہ وہ بلا چون و چرا ان کے احکام کی بجا آوری کرنے لگے۔ میرا ان سے رابطہ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے اور دنیا کے ان بیشتر ممالک میں جہاں سے قدیم تہذیبوں کے آثار دریافت ہوئے ہیں ان کے ایسے روابط ہیں جو بھاری معاوضے کے عوض نوادرات اسمگل کرکے ان تک پہنچاتے ہیں اور وہ ان نوادرات کو اپنے عجائب خانے میں سجا دیتے ہیں۔ یہاں سے چرائے گئے نوادرات اور ممی یا وہ سونے کا مجسمہ بھی ان کے عجائب خانے میں ہی پہنچایا جائے گا۔" بولتے بولتے جسونت کی آواز میں غنودگی اتر آئی۔

آنکھوں میں سرخی تیرنے لگی اور پلکیں بوجھل ہوگئیں۔۔۔ بے ہوشی کی دوا نے اپنا اثر دکھانا شروع کردیا تھا۔

"اب کیا ارادہ ہے تمہارا؟" میں نے چند لمحے خاموش نظروں سے پروفیسر صاحب کی طرف دیکھا اور پھر عارب سے مخاطب ہوا۔

"عارب تم انڈیا جانے والی پہلی فلائٹ میں ہی سیٹوں کا بندوبست کرو۔ میں اور پروفیسر تو جائیں گے ہی۔ تمہارا ارادہ ہو تو خود بھی تیار ہو جاؤ۔ ہمیں فوراً انڈیا روانہ ہونا ہے۔" میں نے عارب کو ہدایات دیں اور کھڑا ہو گیا۔

"ہاں اس کا بھی کوئی بندوبست کرو۔" میں نے بے ہوش پڑے جسونت کی طرف اشارہ کیا۔

☼ ☼ ☼

طیارہ ہزاروں فٹ کی بلندی پر محو پرواز تھا۔ باہر آسمان کی وسعتوں میں تاریکی رچی ہوئی تھی اور طیارہ تاریکی کا سینہ چیرتے ہوئے اپنی منزل کی جانب بڑھ رہا تھا۔ تیز روشنیاں آف کردی گئی تھیں جس کے باعث طیارے میں ملگجا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

آدھے سے زیادہ مسافر سو رہے تھے اور باقی کے نیم غنودگی میں مبتلا تھے مگر میری آنکھوں سے نیند ابھی ایسے دور تھی جیسے افق پر زمین سے ہم آغوش ہوتا آسمان درحقیقت دور ہوتا ہے۔ میرے ساتھ اس وقت طیارے میں پروفیسر صاحب اور عارب کے علاوہ ڈاکٹر عقیل اور اختر بھی موجود تھے۔ روانگی سے قبل ڈاکٹر عقیل سے میری بڑی گرما گرم قسم کی بحث بھی ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنی سرتوڑ کوشش کی تھی کہ میں کسی بھی طرح اس سفر اور ممی کی تلاش کا ارادہ ترک کردوں۔ انہوں نے استدلال کی روشنی میں مجھے قائل کرنے کی تمام کوششیں کر ڈالی تھیں مگر ڈھائی گھنٹے کی طویل بحث کے باوجود بھی وہ میرے ارادے متزلزل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے تھے اور آخر کار انہوں نے ہار مان لی اور اس مہم میں میرا ساتھ دینے پر بھی تیار ہوگئے۔

اس سلسلے میں انہوں نے انڈیا میں موجود اپنے ایک دوست سے بھی رابطہ کیا جو ان کی تعلیم کے اوائل دور کا دوست تھا اور ان دنوں دہلی میں ایک پرائیویٹ ڈیٹیکٹو ایجنسی کا چیف ایگزیکٹو تھا۔ ڈاکٹر عقیل اور ان کے دوست "شلندر رائے ہریجن" نے ایف ایس سی تک تعلیم ساتھ ہی حاصل کی تھی۔ ڈاکٹر عقیل کو چونکہ شروع سے ہی میڈیکل میں دلچسپی تھی اس لیے ان کے راستے الگ ہوگئے تھے۔ ڈاکٹر عقیل ایم بی بی ایس کرنے کے بعد ڈاکٹر بن گئے جیسا کہ "شلندر رائے ہریجن" نفسیات میں ماسٹر کرنے کے بعد کرمنالوجی میں ماسٹر کرنے کی تیاریوں میں لگ گیا اور ماسٹر کرنے کے بعد اس نے سراغ رسانی کا شعبہ جوائن کرلیا اور آج وہ سراغ رسانی کا اپنا پرائیویٹ ادارہ قائم کیے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر عقیل نے کسی حد تک شلندر کو صورت حال سے آگاہ کردیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ شلندر نے اپنے طور پر کام بھی شروع کردیا ہوگا۔

آنے سے قبل ہوسا کی روح ذتیبراطوس اور انا آطو (ذتیبراطوس کی بیوی) نے مجھ سے الوداعی ملاقات بھی کی تھی اور مجھے ہر لحظہ محتاط رہنے کی تلقین کی تھی۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنی معذوری کا اظہار کردیا تھا کہ وہ میری کسی بھی قسم کی مدد نہیں کرسکیں گی کیونکہ ان کا اختیار صرف سرزمین مصر کی حدود پر تھا اس سے باہر کچھ کرنے کی وہ قدرت نہیں رکھتے تھے اور حقیقی بات تو یہ تھی کہ اگر میں زندہ سلامت اس وقت سفر کررہا تھا تو میری یہ زندگی انہی کی مرہون منت تھی۔ وہ غائبانہ طور پر میری مدد کرتے رہے تھے مگر میں بے خبر تھا کہ کیسی شیطانی طاقتیں میری تاک میں ہیں۔

میرے استفسار کے باوجود انہوں نے مراقس کی داستان حیات سے پردہ نہیں ہٹایا تھا کہ وہ کس المیے سے دوچار ہے، کس مصیبت، کس عذاب میں مبتلا ہے اور میں اسے کس طرح نجات دلا سکتا ہوں۔ میرے

استفسار پر تینوں کا ایک ہی جواب تھا کہ ہمیں اس بارے میں کچھ کہنے کی اجازت نہیں ہم کچھ بھی نہیں بتا سکتے اور ہمیں دی گئی مہلت بھی پوری ہوگئی۔ اب ہم اس دنیا میں مزید نہیں رک سکتے ہمیں بلاوا آچکا ہے اور اب ہم ہمیشہ کے لیے جارہے ہیں آگے جو بھی کرنا ہے وہ تمہاری ذمہ داری ہے اور تمہیں ہی انجام دینا ہے۔ ہم آگے پہنچ کر مریاقس کے منتظر رہیں گے یقیناً "تم اسے نجات دلانے میں کامیاب ہوجاؤ گے۔

صبح کے آٹھ بجے تھے اور ہم پانچوں دہلی ایئرپورٹ سے باہر آرہے تھے۔

سڑک کے ایک طرف سات آٹھ ٹیکسیاں کھڑی تھیں ہمارے رکتے ہی قریبی ٹیکسی کا ڈرائیور جو ٹیکسی کے شیشوں پر کپڑا رگڑ رہا تھا لپک کر ہمارے قریب آگیا۔

"جی صاحب جی! حکم کریں ٹیکسی چاہیے۔"

"ایک نہیں دو چاہئیں۔"

"دو کیا صاحب دس بھی مل جائیں گی۔" پھر وہ پلٹتے ہوئے ایک ٹیکسی کے قریب کھڑے نوجوان سے مخاطب ہوا۔

"اوئے رنگو ادھر صاحب کے بیگ رکھو۔" وہ جوان تیزی سے آگے بڑھا۔ ہم نے اپنے بریف کیس ان کو تھمائے اور ٹیکسیوں کی طرف بڑھ گئے۔

"کسی اچھے سے مسلم ہوٹل چلو۔" میں نے ڈرائیور کو مخاطب کیا اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ پروفیسر میرے ساتھ تھے جبکہ عقیل، عارب اور اختر تینوں دوسری ٹیکسی کی طرف بڑھ گئے۔ ڈرائیور پلٹتے ہوئے اسی نوجوان سے مخاطب ہوا۔

"رنگو لوائٹ اسٹار۔" یہ یقیناً کسی ہوٹل کا نام تھا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور ٹیکسی ایک ہلکے سے ارتعاش کے بعد حرکت میں آگئی۔

"شکیل!" پروفیسر صاحب نے مجھے مخاطب کیا۔

"یہ عقیل اپنے جس سراغ رساں دوست کا ذکر کررہا تھا کیا اسے ہماری آمد کے متعلق علم ہے؟"

"ہاں اسے عقیل نے فون پر آگاہ کردیا تھا۔" پروفیسر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد دوبارہ گویا ہوئے۔

"عقیل نے تمام صورت حال سے اسے آگاہ کردیا ہے یہ مجھے کچھ مناسب نہیں لگا۔" پروفیسر کے لہجے میں تشویش تھی۔

"تو اس سے کیا فرق پڑے گا؟"

"مجھے نہیں لگتا کہ یہ شخص عقیل کے ساتھ مخلص ہے اور دوسرا مجھے یہ انتہائی غیر ذمہ دار بھی لگا ہے۔ ایک بہترین دوست ایک طویل عرصے کے بعد ہزاروں میل کی دوری سے اس کے پاس آیا ہے اور وہ ایئرپورٹ پر ریسیو کرنے تک نہیں آیا۔" پروفیسر کی پریشانی کی وجہ جان کر بے اختیار میرے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

"پروفیسر صاحب! اسے علم ہے کہ ہم انڈیا پہنچ رہے ہیں مگر کب اس بات کا اسے علم نہیں۔ کیونکہ جس وقت عقیل نے اسے فون کیا تھا اس وقت فلائٹ کنفرم نہیں تھی اور نہ ہی توقع تھی کہ اتنی جلدی ہمیں انڈیا کی کسی فلائٹ میں سیٹیں مل جائیں گی۔ لہٰذا اس بات سے اس بے چارے کے خلوص پر شک کرنا جائز بات نہیں۔"

"جو بھی ہو ان دونوں کی طویل عرصہ ہوا کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ کیا خبر اس دوران اس کی مصروفیات کس قسم کی رہی ہیں اور وہ کسی قماش کا شخص ہے۔ ممکن ہے کہ وہ گھٹیا ذہنیت کا مالک ہو۔ وہ اپنے مفاد کے چکر میں پڑ جائے اور اس پردیس میں ہم کسی اور بڑی مصیبت میں پھنس جائیں۔"

"آپ کے اندیشے درست بھی ہوسکتے ہیں پروفیسر اور محض قیاس آرائیاں اور مفروضات بھی ثابت ہوسکتے ہیں۔ فی الحال کچھ بھی وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ ہمیں پوری طرح محتاط رہنا ہوگا تاکہ کوئی بھی ناگہانی صورت حال پیش آئے تو ہم ذہنی طور پر اس سے نمٹنے کے لیے تیار ہوں۔" اس کے بعد پروفیسر خاموش رہے۔ تقریباً بیس منٹ بعد ہم ایک اعلا درجے کے ہوٹل تک پہنچ گئے۔ رہنے کے لیے دو کمرے مناسب خیال کیے گئے۔ کچھ دیر بعد ہم تیسری

منزل پر دو برابر برابر کمروں میں تھے۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ پہلے فریش ہوا جائے اس کے بعد ناشتا کمرے میں منگوالیا جائے اور اسی دوران ڈاکٹر عقیل، شلندر رائے کو فون پر یہاں اپنی موجودگی کے متعلق آگاہ کردیں گے۔

میں اور پروفیسر ایک کمرے میں آگئے جبکہ ڈاکٹر عقیل، عارب اور اختر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ پروفیسر صاحب شاور لے کر نکلے تو میں باتھ روم میں گھس گیا۔ ٹھنڈا پانی اعصاب کو بڑی طمانیت بخش رہا تھا، میں کافی دیر تک نہاتا رہا۔ آخر دروازے پر دستک ہوئی اور ساتھ ہی اختر کی آواز سنائی دی تو میں باہر نکلا۔

"بس کریں شکیل صاحب! کوئی چار قطرے نل میں بھی چھوڑ دیں۔" میں باہر نکلا تو سبھی وہاں موجود تھے اور ناشتے کی ٹرالی بھی۔

"کیا آج پانی میں گھل کر باتھ روم میں کیچڑ کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھے! آپ سے انتظار کررہے ہیں۔"

"انتظار کی عادت بھی ہونی چاہیے انسان کو ورنہ زندگی کے کچھ مخصوص حصوں میں بڑی اذیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور ڈاکٹر عقیل کے برابر بیٹھ گیا۔

"چلیں شروع کریں۔" میں نے ایک توس اٹھاتے ہوئے کہا۔

ناشتے کے دوران ہی ڈاکٹر عقیل نے بتایا کہ میں نے شلندر کو فون کیا تھا مگر وہ آفس میں موجود نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے اس کے لیے پیغام ریکارڈ کرادیا ہے۔

ناشتے کے ساتھ ساتھ ہم آپس میں اپنے آئندہ اقدام کے متعلق بھی ڈسکس کرتے رہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔

اس گفتگو کے دوران ہی میں ایک عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا۔ اعصاب میں ہلکی ہلکی سنسنی سی ہلکورے لینے لگی۔ لاشعور کی اتھاہ گہرائیوں میں کہیں الارم سا بج رہا تھا جس کی آواز شعور کی دنیا میں آتے آتے اتنی مبہم ہوجاتی تھی کہ کوئی تمیز کرنا ناممکن تھا۔ میری چھٹی حس ہلکے ہلکے کسمسا رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ صرف میں ہی نہیں میرے ساتھی بھی ایسی ہی کیفیت کا شکار ہیں۔ دفعتاً لاشعور کی گہرائیوں میں گونجنے والا الارم پوری شدت سے چیخ اٹھا۔ ذہن پر یکایک گاڑھی دھند نے یلغار کردی۔ میرے ساتھیوں کے چہرے بھی زرد پڑ رہے تھے اور آنکھوں میں ایک بوجھل پن اتر آیا تھا۔ عارب ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوگیا۔

"ڈاکٹر صاحب ہمارے ساتھ کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔" اس کا لہجہ گہرا اضطرار لیے ہوئے تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا مگر قدم ڈگمگا گئے۔ پورے وجود میں جیسے کسی نے پارہ بھر دیا تھا۔ مجھے اتنا احساس ہوا کہ میں گر رہا ہوں اس کے بعد کھوپڑی میں جیسے اندھیرے گھس گئے۔ آنکھوں میں دھند اتر آئی اور میں بے حسی کے کسی گہرے کنویں میں اتر گیا۔ یہ تو علم نہیں کہ بے حسی اور لاعلمی کا یہ دورانیہ کتنا طویل تھا ہاں جب ہوش آیا تو میں نے اختر کو اپنے اوپر جھکے ہوئے پایا وہ مجھے ہوش دلانے کی کوشش کررہا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب آر یو آل رائٹ؟" میری خالی الذہنی کی کیفیت "فوراً" اڑن چھو ہوگئی۔ میں فرش پر چاروں شانے چت پڑا تھا اور اختر گھٹنوں کے بل میرے قریب بیٹھا تھا۔

"آئی ایم آل رائٹ۔" میں "فوراً" اٹھ بیٹھا۔ ڈاکٹر عقیل، عارب اور پروفیسر بھی قریب ہی بے سدھ پڑے تھے۔

"ڈاکٹر صاحب ہمارے ساتھ ہاتھ ہوگیا ہے۔ یقیناً "کھانے میں کچھ ملایا گیا تھا۔"

"یہ لوگ میری توقع سے کہیں زیادہ تیز نکلے ہیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"مجھے تو لگتا ہے کہ ہم شروع سے ان کی نظروں میں ہیں یا پھر جب ہم مصر سے روانہ ہوئے اس وقت ہماری مخبری ہوئی ہے۔"

"ہوں۔ بڑے فعال اور باوسائل لوگ لگتے ہیں ادھر ہم یہاں پہنچے اور ادھر انہوں نے ہمیں اپنے جال

میں جکڑ لیا۔"

"ڈاکٹر صاحب شاید یہ ہماری توقع سے بڑا نیٹ ورک ہے۔"

"کوئی بات نہیں دیکھا جائے گا تم ان کو دیکھو۔" میں نے بے ہوش پڑے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا تو اختر ان کی طرف متوجہ ہو گیا میں اس قید خانے کا جائزہ لیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

اچھا خاصا وسیع اور کشادہ کمرہ تھا۔ دیواریں تو بالکل درست حالت میں تھیں البتہ فرش کا سیمنٹ جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا۔ کہیں چھوٹے چھوٹے گڑھے تھے تو کہیں ہلکی ہلکی دراڑیں۔ چھت اس قدر بلند تھی کہ یوں احساس ہوتا تھا کہ کسی کمرے میں نہیں بلکہ گہرے کنویں میں کھڑے ہیں۔ چھت کے ساتھ ایک صدیوں پرانا پنکھا سا جھول رہا تھا اور پنکھے کے دائیں جانب بلب روشن تھا مگر اونچائی اتنی زیادہ تھی کہ نیچے پہنچتے پہنچتے اس کی روشنی خاصی بیمار اور بدرونق ہو گئی تھی۔ فضا عجیب سیلن زدہ اور بدبودار تھی۔ بائیں طرف کونے میں ایک بڑا سا فولادی دروازہ نظر آ رہا تھا۔ اس دروازے کے علاوہ کوئی کھڑکی کوئی روزن نہ تھا۔ میں آگے بڑھ کر دروازے کا جائزہ لینے لگا۔ وہ بہت مضبوط تھا اور یقینی بات تھی کہ باہر سے لاک بھی۔ کچھ دیر کی زور آزمائی اور مغزماری کے بعد میں پیچھے ہٹ آیا۔ ڈاکٹر عقیل اور عارب تو پوری طرح حواسوں میں دکھائی دے رہے تھے البتہ پروفیسر کچھ مضمحل نظر آ رہے تھے۔ سب کے کپڑوں کی حالت بتا رہی تھی کہ ہمیں کس عزت و احترام سے لا کر یہاں لٹایا گیا ہو گا۔

"پروفیسر! آپ ٹھیک تو ہیں؟" میں آگے بڑھ کر پروفیسر کے قریب بیٹھ گیا۔

"ہاں ٹھیک ہوں۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں بس ذرا سر درد ہو رہا ہے۔"

"ہوں... اور تم لوگ؟" میں نے ڈاکٹر عقیل اور عارب کی طرف دیکھا۔

"فی الحال تو ٹھیک ہی ہیں مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک ٹھیک رہیں گے کیونکہ صورت حال بتا رہی ہے کہ باعزت ڈاکٹروں کی مٹی پلید ہونے والی ہے۔" عارب نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"کوئی بات نہیں جو ہونا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔"

"ظاہر ہے اگر اوکھلی میں سر دیا ہے تو اب موسلوں سے کیا ڈرنا۔ سر پر پڑی ہے تو بھگتنا پڑے گی۔"

"کم بختوں نے ڈالا بھی ایسی جگہ پر ہے کہ جہاں سے نکلنے کی کوئی آس امید نہیں ہے کوئی روزن تک نہیں رکھا۔" اختر نے چاروں طرف سے جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"تو تمہارا کیا خیال ہے کہ ہمیں کاغذ کے پنجرے میں رکھتے کہ لو بچہ جب جی چاہے بھاگ جانا۔"

"نہیں کاغذ کے پنجرے کا تو میں نہیں کہہ رہا لیکن کم از کم قیدیوں کے لیے کوئی نہ کوئی سہولت تو ہونی چاہیے نا اپنے بچاؤ کے لیے۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو کوئی آتا ہے تو اسے اس قیمتی مشورے سے ضرور آگاہ کرنا۔"

"چہک لو چہک لو کچھ وقت ہے تمہارے پاس بعد میں شاید حسرت ہی رہ جائے ان خوش گفتاریوں کی۔" ڈاکٹر عقیل بھناتے ہوئے انداز میں گویا ہوئے۔

"تو آپ کا کیا خیال ہے کہ ہم قبل از وقت واویلا کرنے لگیں! اس سے بھلا کیا حاصل ہو گا۔" ڈاکٹر عارب ڈاکٹر عقیل کی طرف پلٹ پڑا۔ عجیب آدمی تھا کسی مسئلے، کسی بات کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ شاید ان میں تلخی ہو جاتی مگر درمیان میں پروفیسر بول پڑے۔

"دوستو! یہ وقت آپس میں الجھنے کا نہیں۔ ہم بہت کمزور پوزیشن میں ہیں، صورت حال کی سنگینی کو سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"پروفیسر میں بھی تو انہیں یہی احساس دلانا چاہتا ہوں لیکن یہ یوں خرمستیاں کر رہے ہیں جیسے کسی دعوت میں آئے ہوئے ہوں۔" ڈاکٹر عقیل نے کہا۔

"بس ٹھیک ہے ختم کرو اس تلخی کو اور اس افتاد سے گلو خلاصی کے متعلق سوچو کہ یہ سب کیا ہے اور اب کیا کرنا ہے؟" کچھ دیر کے لیے سبھی کو چپ لگ گئی۔

"ایک بات تو طے ہے کہ ہم یہاں کسی غلط فہمی کے نتیجے میں نہیں پہنچے بلکہ ہمارے دشمنوں نے اچھی طرح سوچ سمجھ کر اور باقاعدہ منصوبہ بندی کرنے کے بعد ہمیں اس قید خانے میں پہنچایا ہے۔ اب یہ معلوم نہیں ہمارے ساتھ ان کا رویہ کیا ہو گا؟ ہم پہلے قدم پر ہی ان کے جال میں پھنس گئے ہیں اور اب پوری طرح ان کے رحم و کرم پر ہیں۔" میں نے سنجیدہ انداز میں کہا۔

"کون لوگ ہو سکتے ہیں یہ۔" ڈاکٹر عقیل نے فکر مندی سے کہا۔

"ظاہری سی بات ہے کہ کرائے کے غنڈے مہاراجہ رام پرشاد کے پالتو کتے۔ یا کوئی ایسا جرائم پیشہ گروہ جس کی پشت پناہی پر مہاراجہ رام پرشاد کا ہاتھ ہو گا۔"

"پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ مہاراجہ ہمیں زندہ رکھنا چاہتا ہے ورنہ ہماری زندگیاں کب کی ختم ہو چکی ہوتیں۔" اختر نے کہا۔

"اور یہ بھی ممکن ہے کہ مہاراجہ ہمیں اپنے سامنے یا اپنے ہاتھوں سے ہلاک کرنا چاہتا ہو اور اس کے انتظار میں ہمیں زندہ رکھا گیا ہو۔" ڈاکٹر عقیل نے رائے دی۔

"تو ہم نے کیا چوڑیاں پہن رکھی ہیں۔ ہماری زندگیاں کیا اتنی سستی ہیں۔ ان کے باپ کی کھیتی ہے جو اجاڑ دیں گے۔" عارب کے نتھنے پھول گئے۔

"ذہن ٹھنڈے رکھنا ہوں گے۔" پروفیسر بول پڑے۔

"جوش کی نہیں ہوش کی ضرورت ہے۔ دشمن ہمارے لیے اتنا تر نوالہ ثابت نہیں ہوں گے۔ میں نے اندازہ لگا لو کہ انہوں نے ہمارے ہاتھ پاؤں باندھنا بھی ضروری نہیں سمجھا یعنی وہ اتنے پر اعتماد اور مطمئن ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ان کے گھر میں موجود ہیں اور وہ یہاں کے مالک و مختار ہیں۔ ہماری ذرا سی حماقت ہمارے عرصہ حیات کو تنگ کر سکتی ہے اس لیے غصے یا جذبات میں آنے کی ضرورت نہیں۔ وہ جسمانی اور انفرادی طاقت میں بھی ہم سے مستحکم ہیں اور وسائل میں بھی۔" پروفیسر کی بات مکمل ہوئی ہی تھی کہ فولادی دروازے پر آہٹ پیدا ہوئی تو ہم سب چونک پڑے۔ عارب ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اس کی آنکھوں میں عقاب کی سی چمک پیدا ہو گئی اگلے لمحے دروازہ ایک زور کی آواز سے کھلا اور عارب جو آگے بڑھنے کا ارادہ رکھتا تھا اپنی جگہ کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

کھلے ہوئے دروازے سے یکے بعد دیگرے چار جوان اندر داخل ہو گئے۔ ان کے ہاتھوں میں جدید رائفلیں تھیں۔ دو تو وہیں دروازے کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے جبکہ دو آگے بڑھ آئے۔ ان کی رائفلوں کا رخ ہماری جانب ہی تھا اور ان کے تیور بتا رہے تھے کہ اگر ہم نے ایک سانس بھی ان کی مرضی کے خلاف لی تو وہ بلا جھجک فائر کھول دیں گے۔

"کھڑے ہو جاؤ!" آگے آنے والے دو میں سے ایک نے کرخت لہجے میں ہمیں مخاطب کیا اور ہم بلا چون و چرا اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"پیچھے دیوار کے ساتھ گھٹنے ٹیک کر بیٹھ جاؤ۔"

"بھائی صاحب ہمارا قصور کیا ہے؟ ہمیں کس لیے یہاں قید کیا گیا ہے؟" اختر نے معصوم لہجے میں سوال کیا۔

"بکواس نہیں کرو۔ جو کہا ہے وہ کرو ورنہ ماتھے میں روشن دان کھل جائے گا۔" ہم نے خاموشی سے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ ظاہر ہے کہ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ ہم پانچوں عقبی دیوار کے ساتھ ایک قطار کی صورت گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور وہ بھیڑیا ایک طرف ہو کر مستعد انداز میں کھڑا ہو گیا۔ ہم خاموشی سے ایک دوسرے کی شکلیں تک رہے تھے سمجھ سے باہر تھا کہ وہ کرنا کیا چاہتے ہیں۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ہماری آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔ ایک شعلہ جوالہ دروازے سے اندر داخل ہوئی تھی اس کے ساتھ ایک اور ادھیڑ عمر آدمی بھی تھا

جو شکل و صورت اور پہناوے کے لحاظ سے کوئی اچھا خاکسار نہیں معلوم ہوتا تھا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ میرے ساتھ ساتھ میرے ساتھیوں کی نظریں بھی فقط اس قتالہ عالم کا طواف کر رہی تھیں۔ اس نے بلیک لیدر کی چست پتلون پہنی ہوئی تھی اور لیدر کی ہی جیکٹ۔ پاؤں میں چرمی شوز' کھلے بال اس کے چوڑے کندھوں کی اوٹ سے جھانک رہے تھے۔ بڑی بڑی آنکھوں میں سیماب کی سی چمک' عنابی ہونٹ اور بالوں کی آغوش سے جھانکتا ہوا روشن چہرہ دیکھ کر سیاہ بادلوں کے حصار میں مقید چاند کا تصور ذہن کو گدگدا تا تھا۔ چال میں ایک وقار' ایک کافرانہ تمکنت' ایک ایک عضو ایسا ڈھلا۔ ایسا ترشا ہوا تھا کہ دل پر ہزار ہا بجلیاں گر گئیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس زمین کی مخلوق ہی نہ ہو بلکہ آسمانی بجلی کو انسانی قالب میں ڈھال دیا گیا ہو۔

میں ڈاکٹر ہوں مگر ان لمحوں میرا دل شاعری کرنے کو چاہ رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی نظروں کو اس مقناطیسی وجود سے ہٹایا۔

وہ دونوں ہمارے سامنے آکھڑے ہوئے۔ مجھے بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ میرے ساتھیوں کی نظریں بھی اس حسن کے "بھانبڑ" کی تاب نہ لاتے ہوئے جھک گئی ہیں البتہ اختر کی گردن تنی ہوئی تھی اور یقیناً" اس کی نظریں اس شعلہ جوالہ کے سلگتے ہوئے چہرے پر مرتکز تھیں۔ اور ہمارے یا اس کے حق میں یہ کوئی اچھی علامت نہ تھی۔

خاموش فضا میں قدموں کی چاپ بلند ہوئی پھر ایک آہٹ پیدا ہوئی اور وہ نووارد اور وہ برق آسمان پیچھے ہٹ گئی۔

"مسٹر شکیل ظفر!" ایک گنگناتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو میں نے سر اٹھایا۔ "غالباً" ایک گارڈ کرسیاں اٹھا کر لایا تھا کیونکہ جب میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو چند قدم کے فاصلے سے وہ دونوں برابر برابر کرسیوں پر براجمان تھے۔

"ڈاکٹر صاحب! کیسے مزاج ہیں آپ کے؟ کوئی تکلیف تو نہیں پہنچی؟" وہ حسینہ آرزو خیز مجھ سے مخاطب تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ رقصاں تھی۔

"کیا میں جان سکتا ہوں کہ آپ لوگ کون ہیں اور ہمیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟" میرا لہجہ پوری طرح پُراعتماد تھا۔ میرے سوال پر اس کی مسکراہٹ کچھ مزید گہری ہو گئی اور جلتے ہوئے گالوں میں خفیف سے بھنور نمودار ہو گئے۔

"کیوں نہیں۔۔۔ یہ تو آپ کا حق بنتا ہے! آپ کا تعارف نامہ تو ہم تک پہلے ہی پہنچ چکا ہے ہاں البتہ اپنا تعارف ہم کرائے دیتے ہیں۔" اس نے اپنے برابر بیٹھے اس خوش پوش شخص کی جانب اشارہ کیا۔

"انہیں ویر چندر کہتے ہیں۔ یہ مہاراجہ رام پرشاد کے دست راست ہیں اور ریاست رام پور کے اندرونی امور کے انچارج ہیں اور مجھے آپ سمترا دیوی کہہ سکتے ہیں۔ میرا ریاست رام پور یا مہاراج کے نزدیک کیا مقام ہے اس کو آپ رہنے ہی دیں۔ باقی رہی بات آپ کی یہاں موجودگی کی تو اس کو آپ سے بہتر تو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔" کمبخت کا لہجہ اور بولنے کا اسٹائل بڑا قیامت خیز تھا۔

"میرا خیال ہے کہ میں نہیں سمجھ سکا۔ اگر آپ بتانے' سمجھانے کی زحمت گوارا کر لیں تو آپ کا احسان ہو گا۔"

"بہت خوب! ہمیں خوشی ہوئی کہ آپ کو گفتگو کے انداز اور آداب سے آگہی ہے۔"

"جی شکریہ!"

"دیکھیں ڈاکٹر صاحب سیدھی سی بات ہے کہ اگر تابوت یا ممی آپ کے ہاتھ سے نکل گئی تھی تو آپ کو اس قصے پر لعنت بھیج دینا چاہیے تھی تاکہ یہ آپ سوچے سمجھے بغیر احمقوں کی طرح اس کی تلاش میں یہاں تک آپہنچے۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ نتیجہ کیا نکلے گا اور نہ ہی آپ نے یہ سوچا کہ مہاراجہ رام پرشاد کتنے ذرائع اور وسائل کے مالک ہیں اور تو اور آپ نے شیخ حارث کے آدمیوں کا بھی گھونٹ بھر لیا۔ بس ہمیں سے ہم آپ کی طرف سے محتاط ہو گئے کہ اگر آپ کا بندوبست نہ کیا گیا تو آپ خطرناک ثابت ہو سکتے ہو۔" اتنا کہنے کے بعد وہ خاموش ہو گئی۔ ایک شریر سی مسکراہٹ بدستور اس کے ہونٹوں پر رقصاں تھی اور چمکدار آنکھیں ہماری ہی جانب نگراں۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میں نے کہا۔

"یہ سب تو اپنی جگہ درست رہا آپ یہ بتائیں کہ اب ہمیں یہاں رکھنے سے آپ کا مقصد کیا ہے؟"

"تو آپ کا کیا خیال ہے کہ پوری آزادی دے دی جائے کہ مہاراج کے لیے سر دردی پیدا کریں؟ مہاراج کا تو ارادہ تھا کہ آپ کو ایئرپورٹ پر ہی اڑا دیا جائے۔ آپ کی قسمت کچھ اچھی تھی کہ بروقت مصر سے شیخ حارث کا پیغام پہنچ گیا کہ ان کے دو آدمیوں کو آپ کی تحویل سے بازیاب کرایا جائے' اسی بہانے آپ کی کچھ سانسیں بڑھ گئی ہیں ورنہ اب تک تو آپ سب سورگ باش ہو چکے ہوتے۔"

"کون سے دو آدمیوں کی بات کر رہی ہیں آپ؟"

"انہی کی جو رات کے وقت آپ کے قتل کے ارادے سے آپ کے بنگلے میں گھسے تھے مگر اس کے بعد سے اب تک ان کی کوئی خیر خبر نہیں۔"

"اور اگر میں کہوں کہ مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تو؟"

"تو۔۔۔ آپ اپنے ساتھ ساتھ اپنے ساتھیوں پر بھی ظلم کریں گے۔ آپ کی موت بڑی اذیت ناک ہو جائے گی اور آپ کے ساتھ آپ کے ان دوستوں۔" بولتے بولتے اس نے میرے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا تو یکایک اس کو چپ لگ گئی اور اس کی نظریں اختر پر جم کر رہ گئیں۔ لمحہ بھر میں اس کے تاثرات متغیر ہو گئے۔ پہلے ایک ذرا حیرت پھر ناگواری۔ بے ساختہ میں نے بھی گردن گھما کر اختر کی طرف دیکھا۔ وہ یک ٹک کسی پتھر کے بت کی طرح سمترا کو تک رہا تھا۔ گویا اسے اپنے اردگرد اور صورت حال کا کچھ احساس ہی نہ تھا۔

"اے۔۔۔ مسٹر! کیا گھور رہے ہو؟" سمترا نے خشک لہجے میں اختر کو مخاطب کیا۔ مگر اس نے جیسے سنا ہی نہ تھا۔

"اے۔۔۔ میں تم سے مخاطب ہوں۔" سمترا کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔

"ہم تو پہلے ہی جھٹکے میں مردار ہو گئے ہیں دیوی جی! اب آپ کون سی اذیت ناک موت کی بات کر رہی ہیں؟" اختر یوں بولا جیسے نیند کے عالم میں بول رہا ہو۔

"بکواس بند کرو اور نظریں جھکا کر بیٹھو۔"

"دیوی جی! مجھے آج اور ابھی تو علم ہوا ہے کہ آنکھیں کتنی بڑی نعمت ہوتی ہیں۔ اب میں ان کو جھکا کر اور خدا کی قدرت سے موڑ کر ناشکرا کیسے ہو سکتا ہوں میں اس گناہ کا مرتکب نہیں ہو سکتا!" چند ثانیے کے لیے تو سمترا کو چپ سی لگ گئی' بس گہری نظروں سے اختر کو گھورتی رہی۔ اختر کے ہونٹوں پر ایک شریر مسکراہٹ اتر آئی تھی پھر آہستہ آہستہ سمترا کے چہرے کا تناؤ ختم ہو گیا۔

"لگتا ہے کہ زندگی سے عاجز آچکے ہو۔" نہ جانے سمترا کے لہجے میں ایسا کیا تھا کہ میں جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔

"آپ کے ان نازک ہاتھوں سے مرنا چاہوں گا۔"

"تمہاری ہر خواہش پوری کر دیں گے لیکن ایک شرط ہے۔"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر!"

"ہمیں بتا دو کہ شیخ حارث کے دو آدمی کہاں ہیں؟"

"کیا پوچھتے ہو ہم سے ہم خود کو بھلائے بیٹھے ہیں۔ ہمیں تو اپنی خبر نہیں کہ ہم کہاں ہیں کسی اور کے متعلق آپ کو کیا بتائیں گے؟"

"اچھی طرح سوچ سمجھ لو؟"

"ہماری سوچیں منجمد ہو چکی ہیں۔" اس گفتگو کے دوران ویر چندر پہلی دفعہ بولا۔

"سمترا! وقت ضائع نہیں کرو ہمیں جو حکم ہوا ہے وہ پورا کرو اور واپسی کا سوچو۔"

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"مسٹر شکیل! ہم آپ سے نہ کوئی فضول بات کرنا

چاہتے ہیں اور نہ آپ سے ان دو آدمیوں کے متعلق سچ اگلوانے کے لیے آپ لوگوں پر تشدد کر کے وقت ضائع کرنے کے حق میں ہوں گے۔ یہاں سے زندہ اور صحیح سلامت صرف آپ اپنے ملک واپس جاسکتے ہیں۔ آپ کے دوست زندہ تو جاسکتے ہیں مگر صحیح سلامت نہیں یعنی۔ ٹانگوں سے محروم ہو کر۔ اور ایسا بھی اس صورت میں ممکن ہو گا کہ جب آپ ہم سے تعاون کریں گے اور آئندہ کے لئے بھی ہمارے ساتھ ایگریمنٹ کرلیں گے بصورت دیگر مہاراج کے حکم کے مطابق آپ کے چار ساتھی ہیں ہم چار دفعہ آپ سے ان دو آدمیوں کے متعلق سوال کریں گے اور ہر انکار یا لاعلمی کے اظہار پر آپ کا ایک ساتھی موت کا شکار ہو گا اور ان کی موت کے بعد ہم آپ کو مہاراج کے سامنے پیش کردیں گے اور وہاں پر آپ کی سانسیں اجیرن کردی جائیں گی۔ یقیناً" میری بات آپ کی سمجھ میں آگئی ہوگی۔ اب فیصلہ آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے! اور ایک بار پھر کہہ رہا ہوں کہ ہم فضول بات کریں گے اور نہ تشدد وغیرہ میں وقت ضائع کریں گے۔ ایک سوال۔ اور۔ ایک زندگی! اب بتائیں آپ کا کیا ارادہ ہے؟" ساتھ ہی اس نے ایک گن مین کو اشارہ کیا۔ وہ سمترا کے برابر آکھڑا ہوا۔ باقی تینوں بھی اپنی اپنی جگہ چوکس ہو گئے۔

لاشعوری طور پر اعصاب دباؤ کا شکار ہو گئے۔ ویر چندر کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اس نے جو کہا ہے وہ وہی کرے گا۔ اور مجھے یقین تھا کہ ان دو آدمیوں کی گمشدگی کی حقیقت بتاؤں گا تو کوئی بھی یقین نہیں کرے گا۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ مجھے خود کچھ علم نہ تھا کہ وہ دونوں یا ان کی لاشیں کدھر گئیں۔ اس بارے میں تو صرف یوسا ہی بتا سکتی تھی۔ بڑی نازک پچویشن تھی موت سامنے تھی صرف ایک اشارے کی دیر تھی۔

"مسٹر شکیل! ہمارا وقت بہت قیمتی ہے اور آپ ہمارا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ ہمیں جواب چاہیے۔" ویر چندر کا لہجہ سرد ہو گیا۔

"تو آپ میرے کہے پر یقین کریں گے؟" میں نے متذبذب انداز میں پوچھا۔

"ہم آپ سے کوئی کہانی نہیں سننا چاہتے صرف ان دو آدمیوں کے بارے میں بتائیں۔"

"دیکھیں ویر چندر صاحب۔" گن مین نے بلٹ چڑھائی میری بات درمیان میں ہی رہ گئی۔

"مسٹر شکیل! آپ اچھے خاصے عقل مند اور ذی ہوش انسان دکھائی دیتے ہیں۔ دکھائیں نہیں صرف بتائیں۔ شیخ حارث کے دو آدمی کہاں ہیں؟" گن مین نے رائفل اختر کی طرف کردی۔

"آپ۔ آپ رائفل کا رخ ہٹوائیں میں بتاتا ہوں۔ مجھے نشانے پر رکھ لیں۔" میں حقیقت میں قدرے بوکھلاہٹ کا شکار ہو گیا۔ ویر چندر میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے گن مین سے مخاطب ہوا۔

"اگر دس سیکنڈ کے اندر مسٹر شکیل اصل نکتے پر نہ بولے تو فائر کھول دینا۔" گن مین کی آنکھوں میں درندگی کی چمک ابھر آئی اور ویر چندر کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ رقصاں ہو گئی۔ فرط ہیجان کے باعث میں کچھ بول ہی نہ پایا تھا کہ اختر کی آواز ابھری۔

"دیوی جی! یہ ستم نہیں کریں اگر مجھے ہلاک کرنا ہی ہے تو اپنے مقدس ہاتھوں سے کریں۔ میں آپ کے ہاتھوں جام شہادت نوش کرنا چاہتا ہوں۔" سمترا کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہوئی اور گن مین کے ہاتھ سے رائفل اس نے لے لی۔

"چلو آخری سمجھ کر تمہاری یہ خواہش پوری کیے دیتی ہوں۔" اس نے اختر کا نشانہ لیا اور پھر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور ظالم نے میرے بولنے کا انتظار کیے بغیر فائر کھول دیا۔ سماعت سے دھماکے کی آواز ٹکرائی اور اندر کی دنیا میں جیسے سکوت پھیل گیا۔

باقی آئندہ شمارے میں

بقیہ سروے

اکانومی کے اعتبار سے بہتر کام کیا جائے۔ اکانومی بڑی

تیزی سے اپ ڈاؤن ہو رہی ہے۔ اس کی بہتری کے لیے کام کرنا چاہیے۔ 2012ء معیشت کے اعتبار سے پاکستان کے لیے کافی ٹف سال ہو گا۔ معیشت' معاشرت اور سیاست یہ تینوں ایک دوسرے سے الجھے ہیں۔ معیشت اچھی ہوگی تو معاشرے میں بہتری آئے گی۔ عوام کا اعتبار حکومت پر بحال ہو گا۔ ایک پرسکون فضا قائم ہوگی۔ اگر معیشت ڈاؤن ہوگی تو یقیناً" معاشرت میں بگاڑ پیدا ہو گا۔ ایک انارکی کی کیفیت پیدا ہوگی۔ عوام کے مسائل بڑھیں گے تو معیشت بہت اہم ہے۔ اور اس پر کام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

2 میرا خیال ہے کہ میڈیا اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے نبھا رہا ہے۔ آج سے پہلے جب میڈیا کو اتنے اختیارات حاصل نہیں تھے اس وقت بھی بہت سے اداروں میں متنازعہ معاملات ہوتے رہے مگر ان پر بات نہ ہو سکی۔ وہ عوام کے سامنے نہیں لائے گئے۔ جس سے جمہوری نظام کو نقصان ہوا۔ میمو گیٹ کا معاملہ ہی لے لیں میڈیا کے ذریعے عوام کے سامنے لایا گیا۔ اور عوام تمام تر حقائق سے واقف ہوئی اپنے تجربے کی روشنی میں یہ بات کہہ رہی ہوں کہ پاکستان کی میڈیا بہت مضبوط ہے اور معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں کو سامنے لاتی ہے۔

3 ہنستے ہوئے ایسا ممکن تو نہیں ہے لیکن پھر بھی ایسا ہوا تو تین چیزیں ضرور کروں گی۔

1 فوج کو سیاست میں کوئی رول ادا نہیں کرنا چاہیے۔ صرف ملک کے دفاع میں اپنا کردار ادا کریں۔

2 عدالت انصاف کی فراہمی میں اپنا رول پلے کریں۔

3 گورنمنٹ اپنے گورنر بہتر کریں۔ روٹی' کپڑا' مکان کا جو نعرہ لگاتے ہیں۔ ان کو پورا کریں۔ عوام کی توقعات کو پورا کریں۔ ملک کے وزیراعظم کو تمام تر اختیارات حاصل ہوں گے۔ اصل جمہوری نظام کا اطلاق ہو گا۔

ہمایوں سعید (اداکار)

1 میں پوزیٹو بندہ ہوں اور ہمیشہ پوزیٹو ہی سوچتا ہوں' اس لیے امید ہے کہ 2012ء (ان شاء اللہ) ہمارے ملک کے لیے بہتر ہو گا۔

2 میڈیا کے حوالے سے صرف اتنا ہی کہوں گا کہ وہ چیزیں بھی منظر عام پر آنے لگی ہیں جو نہیں آنی چاہئیں۔ غلط چیزوں کو بہت زیادہ پرموٹ کیا جارہا ہے۔

3 اگر مجھے یہ عہدہ ملا تو تعلیم پر بہت زیادہ توجہ دوں گا۔

☼ ☼

مہوش افتخار

ادارہ

(1) "نام بتائیے؟"
☆ "مہوش افتخار۔"
(2) "تاریخ پیدائش / اسٹار؟"
☆ "7 مئی / ثور۔"
(3) "خدا سے تعلق؟"
☆ "حق بندگی نبھانے کی کوشش کرتی ہوں۔ اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ میری اس کوشش کو قبول فرمائے۔" (آمین)
(4) "فرصت کا وقت گزارنے کا پسندیدہ طریقہ؟"
☆ "اچھی سی کتاب کا مطالعہ۔"
(5) "کون سی چیز خوشگوار تاثر قائم کرتی ہے؟"
☆ "خوب صورت اور آرٹسٹک تحریر۔"
(6) "وہ چیز جو موڈ خراب کردے؟"
☆ "بے ترتیبی اور پھیلاوا۔"
(7) "مشکل ترین لمحہ؟"
☆ "جب میری مما کے کڈنی کی سرجری ہوئی تھی۔"
(8) "بہترین تعریف جو وصول کی؟"
☆ "اپنی تحریروں کے جواب میں قارئین کی جانب سے ملنے والی ہر تعریف میرے نزدیک بہترین تعریف ہے۔"
(9) "وقت ضائع کرنے کا بہترین طریقہ؟"
☆ "انٹرنیٹ، چیٹنگ اور فیس بک۔"
(10) "زندگی کا خوفناک واقعہ؟"
☆ "واقعات تو بہت سے پیش آئے ہیں۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ ان میں سے کوئی بھی کسی بھی اعتبار سے خوفناک نہیں۔"
(11) "بہترین تحفہ میری نظر میں؟"
☆ "جو کسی کو اس کی شخصیت اور مزاج کے مطابق دیا گیا ہو۔"
(12) "ایسی تاریخی شخصیت جس سے ملنا چاہوں؟"
☆ "کم عمر فاتح محمد بن قاسم۔"
(13) "پسندیدہ ہستی؟"
☆ "حضور نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس۔"
(14) "پسندیدہ ساتھی؟"
☆ "میری بہن حرا۔"
(15) "پسندیدہ پروفیشن؟"
☆ "جیولری ڈیزائننگ۔"
(16) "بہترین کاوش؟"
☆ "اگر ذاتی کاوش کی بات ہو رہی ہے تو پھر "نیند پہ سلوٹ" اور "حصار ذات سے حصار یار تک۔"
(17) "پسندیدہ ملکیت؟"
☆ "میری تحریریں۔"
(18) "زندگی کی خواہش؟"
☆ "اللہ تعالیٰ میرے والدین کا دل اپنے تینوں بچوں کی جانب سے ہمیشہ خوش اور مطمئن رکھے۔"
(19) "پریشان کن لمحہ؟"
☆ "جب میری فیملی کا کوئی فرد مشکل میں ہو۔"
(20) "جب موڈ آف ہو تو کیا کرتی ہوں؟"
☆ "یہ تو اس بات پہ منحصر ہے کہ موڈ کیوں آف ہے۔ کبھی تو خاموش ہو جاتی ہوں اور کبھی بول کے غصہ نکال لیتی ہوں۔"
(21) "کوئی ایسا فرد جس کے سامنے کھڑی نہ رہ سکوں؟"
☆ "ایسا کوئی نہیں الحمدللہ مجھ میں کانفیڈینس کی کمی نہیں۔"
(22) "فیشن کب مسئلہ بنتا ہے؟"
☆ "جب اس میں اچانک تبدیلی کر دی جائے۔"
(23) "انسان کا دل کب ٹوٹتا ہے؟"
☆ "جب اس کی Expectations یعنی توقعات ٹوٹتی ہیں۔"
(24) "کیا چیز جذباتی کر دیتی ہے؟"
☆ "اپنے ملک کے حالات۔"
(25) "زندگی کا یادگار دن؟"
☆ "بہت سے ہیں۔"
(26) "موسیقی میرے نزدیک؟"
☆ "سکون کا ذریعہ۔"
(27) "پسندیدہ گانا؟"
☆ "وقار علی کا "میرا نام ہے محبت" اس کے علاوہ جگجیت سنگھ کی بہت سی غزلیں ہیں، جو مجھے بے حد پسند ہیں۔"
(28) "پسندیدہ فقرا؟"
☆ "Dont judge things by their appearence۔"
(29) "پسندیدہ کردار؟"
☆ "ہاشم ندیم کے ناول "خدا اور محبت" کا ہیرو "حماد امجد" اور میری اپنی کاوش "نیند پہ سلوٹ" کا علی حمزہ۔"
(30) "سب سے زیادہ عزیز اور قیمتی اثاثہ؟"
☆ "میرا کردار۔"
(31) "اچھا اور خوب صورت موسم؟"
☆ "گرمیوں میں بارش کا اور سردیوں میں نرم پیلی دھوپ کا۔"
(32) "ناقابل فراموش واقعہ؟"
☆ "جب ہماری گاڑی سگنل پہ کھڑی تھی اور فٹ پاتھ پہ اچانک دو آدمیوں کے درمیان شروع ہونے والی ہاتھا پائی میں ایک نے دوسرے کو خنجر نکال کر گھونپ دیا تھا۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو شاید میں کبھی فراموش نہ کر سکوں۔"
(33) "پہلی کاوش شائع ہونے پر تاثرات؟"
☆ "کافی ایکسائیٹڈ ہوئی تھی۔"
(34) "وہ رات جو کبھی نہ بھولے گی؟"
☆ "اکتوبر 2008ء کی رات جب کوئٹہ سمیت بلوچستان کے بہت سے علاقوں میں بہت شدید زلزلہ آیا تھا۔"
(35) "میرا خواب؟"
☆ "ایک نہیں بہت سے خواب ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں پورا کرے۔"
(36) "پسندیدہ مزاح؟"
☆ "جس سے کسی کی دل آزاری نہ ہو۔"
(37) "حسد محسوس کرتی ہوں؟"
☆ "الحمدللہ، کبھی نہیں اور اللہ تعالیٰ آگے بھی روح کو اس مرض سے محفوظ رکھے۔"
(38) "خوشبو پسند ہے تو کیوں؟"
☆ "کیونکہ یہ آپ کی شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔"
(39) "پسندیدہ خوشبو؟"
☆ "Black Cashmere۔"
(40) "آخری کتاب جو میں نے پڑھی ہو؟"
☆ "ماہا ملک کی "جو چلے تو جاں سے گزر گئے۔"
(41) "پسندیدہ جگہ؟"
☆ "زیارت۔"
(42) "وہ جگہ جہاں چھٹی گزارنا پسند کروں؟"
☆ "کوئی بھی پرفضا اور پرسکون جگہ۔"
(43) "میری قوت ارادی؟"
☆ "بہت نہیں لیکن مضبوط۔"
(44) "گھر کا پسندیدہ کمرہ؟"
☆ "اپنا بیڈ روم۔"
(45) "کیا پہننا پسند کرتی ہوں لباس میں؟"
☆ "شلوار قمیص۔"
(46) "پسندیدہ رنگ؟"
☆ "بلیک اور گرین۔"
(47) "پسندیدہ مصنف؟"
☆ "بہت سے ہیں۔ کوئی ایک نام لینا ممکن نہیں۔"
(48) "پسندیدہ شاعر؟"
☆ "غالب، احمد فراز، قتیل شفائی، وصی شاہ، Wordsworth، John Keats ایک لمبی لسٹ ہے۔"

(49) "ویران جنگل میں جزیرے پر سب سے پہلا کام کیا کروں گی؟"
☆ "وہاں سے نکلنے کا کوئی بندوبست کروں گی۔"
(50) "خود اپنی بری عادت؟"
☆ "میں لوگوں سے بہت جلد گھلتی ملتی نہیں ہوں۔ جس کی وجہ سے اکثر لوگ مجھے مغرور سمجھتے ہیں۔"
(51) "کھانے کی پسندیدہ جگہ؟"
☆ "کوئی بھی ایسی جگہ جہاں کا کھانا ذائقے دار اور ماحول خوشگوار ہو۔"
(52) "اگر میں مصنفہ نہ ہوتی تو؟"
☆ "تو اپنے ذوق جمالیاتی کی تسکین کے لیے آرٹ کی ہی کسی اور فیلڈ مثلاً" شاعری 'پینٹنگ وغیرہ سے وابستہ ہوتی۔"
(53) "ایک لفظ جو مجھے واضح کردے؟"
☆ "Optimistic پرامید۔"
(54) "جنس مخالف کے بارے میں رائے؟"
☆ "عورت کے وجود سے منسلک رشتوں کی تو عزت کرتے ہیں مگر عورت کی بحیثیت عورت عزت نہیں کرتے۔"
(55) "محبت کے بارے میں خیال؟"
☆ "کسی کے دل کی ان کہی خواہشوں کو جان لینے اور پھر ان خواہشات کا احترام خود پہ لازم قرار دینے کا نام محبت ہے۔"
(56) "پسندیدہ رشتہ؟"
☆ "والدین کا۔"
(57) "اگر محبت کی تو کیا نتائج نکلیں گے؟"
☆ "اول تو محبت کی نہیں ہو جاتی ہے اور جب یہ ہو جاتی ہے تو پھر میرے خیال میں سبھی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کی محبت بہ خیر و خوبیا بہ تکمیل تک پہنچے' یہ الگ بات ہے کہ آخری فیصلہ بہرحال مقدر کا ہوتا ہے۔"
(58) "پسندیدہ لو اسٹوری؟"
☆ "A walk to Remember۔"
(59) "کوئی ایسی فلم جو بار بار دیکھنا چاہیں؟"
☆ "ایسی کوئی خاص فلم نہیں۔"
(60) "چہرے کچھ بتاتے ہیں؟"
☆ "بہت کچھ اور جن لوگوں کے چہرے سپاٹ ہوتے ہیں ان سے بات کرنا کم از کم میرے لیے تو خاصی الجھن کا باعث ہوتا ہے۔"
(61) "شاعری کے بارے میں خیال؟"
☆ "دریا کو کوزے میں بند کرنے والے نرم اور خوب صورت الفاظ کا مجموعہ۔"
(62) "میری جستجو' میری کھوج؟"
☆ "فی الحال تو اپنی ہی ذات کو کھوجنے میں مصروف عمل ہوں۔"
(63) "بہترین کامیابی؟"
☆ "ایک مصنفہ کی حیثیت سے اپنی پہچان بنانا گوکہ اس لحاظ سے ابھی میں خود کو طفل مکتب سمجھتی ہوں مگر مجھے اس بات پہ ازحد فخر اور خوشی ہے کہ چند ایک ہی سہی لیکن لوگ مہوش افتخار کو پہچاننے لگے ہیں۔"
(64) "وہم کا ازالہ کس طرح کرتی ہوں؟"
☆ "اللہ کا شکر ہے میں وہمی نہیں۔"
(65) "سائنس کی بہترین ایجاد؟"
☆ "ہوائی جہاز۔"
(66) "بدترین ایجاد؟"
☆ "ہر طرح کے ہتھیار۔"
(67) "ایسی شخصیت جو شدت سے یاد آتی ہے؟"
☆ "ایسا کوئی نہیں۔"
(68) "بستر پر جانے سے پہلے کیا جانے والا آخری کام؟"
☆ "نائٹ کریم لگانا۔"
(69) "ایک بات جو ہمیشہ یاد رہی؟"
☆ "یہ کہ نیکی تو کی جائے مگر دوسروں سے اچھائی کی امید نہ رکھی جائے۔"
(70) "زندگی کا خوب صورت ترین دن؟"
☆ "زندگی میں خوب صورت دن تو بہت سے آئے ہیں۔ لیکن "خوب صورت ترین" کے لیے میں یہی کہہ سکتی ہوں کہ ابھی آیا نہیں۔"
☆ ☆

شعاع عمیر

ہر نیک عمل صدقہ ہے

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔
"ہر مسلمان آدمی کے لیے صدقہ لازم ہے۔"
صحابہؓ نے عرض کیا۔
"اگر وہ کچھ نہ پائے؟" فرمایا۔
"اپنے ہاتھوں سے کام لے' اپنے نفس کو نفع پہنچائے اور صدقہ کرے۔" صحابہؓ نے عرض کیا۔
"اگر اس کی طاقت نہ رکھے یا ایسا نہ کر سکے تو؟"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔
"کسی ضرورت مند غمگین شخص کی اعانت کرے۔" صحابہؓ نے عرض کیا۔
"اگر وہ ایسا بھی نہ کر سکے تو؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"نیکی کا حکم دے۔" پھر پوچھا گیا کہ "اگر وہ ایسا بھی نہ کر سکے تو؟" یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"وہ خود برائی سے رکا رہے یہ اس کے لیے صدقہ ہے۔"

(بخاری و مسلم)

ریحانہ علی احمد۔۔۔ کراچی

اللہ کے نام کی برکت

امام رازی رحمتہ اللہ علیہ اپنی کتاب "تفسیر کبیر" میں تحریر فرماتے ہیں کہ۔
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا گزر ایک ایسی قبر کے پاس سے ہوا' جسے قبر کا عذاب دیا جا رہا تھا۔ کچھ عرصے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا گزر پھر اسی قبر کے پاس سے ہوا۔ دیکھا کہ قبر میں رحمت کے فرشتے موجود ہیں اور مغفرت کا نور چار جانب پھیلا ہوا ہے اور قبر منور ہو رہی ہے۔ آپ علیہ السلام کو حیرت ہوئی۔ اللہ عزوجل کے حضور دعا فرمائی اور اس عقدے کو حل کرنے کی استدعا کی' اللہ نے آپ علیہ السلام پر وحی نازل کی اور کہا۔

"اے عیسیٰ علیہ السلام یہ بندہ گناہ گار تھا اور مسلسل عذاب میں مبتلا تھا جب اس شخص کا انتقال ہوا تو اس کی بیوی امید سے تھی۔ چند ماہ بعد بیٹا تولد ہوا اور جب اسے مکتب میں داخل کرایا گیا تو استاد نے اس بچے کو بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھائی۔ جب اس کے بیٹے نے زمین کے اوپر میرا نام لیا تو میں نے اس شخص پر سے زمین کے نیچے دیا جانے والا عذاب ختم کر دیا۔"

(تفسیر کبیر)

صدف عبداللہ۔۔۔ لاہور

موتیوں جیسے لفظ

☆ جسے جس کے ساتھ محبت ہے' قیامت کے دن وہ اس کے ساتھ ہو گا۔

(حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم)

☆ لوگوں کے دلوں میں اپنا مقام اس طرح بناؤ کہ مر جاؤ تو تمہارے لیے روئیں اور زندہ ہو تو تم سے ملنا پسند کریں۔

(حضرت علیؓ)

☆ جس طرح شبنم کے قطرے مرجھائے ہوئے پھول کو تازگی بخشتے ہیں اسی طرح اچھے الفاظ مایوس دلوں کو روشنی بخشتے ہیں۔

☆ گناہ کے بعد ندامت بھی توبہ کی شاخ

(حضرت مجدد الف ثانیؒ)

☆ مجھے بارش میں چلنا بہت پسند ہے' تاکہ کوئی میرے آنسو نہ دیکھ سکے۔

(چارلی چپلن)

☆ زندگی بس ایک ڈائری کی مانند ہے۔ جس کے ہر نئے صفحے پر تاریخ ماہ و سال چھپا ہے۔ صفحہ ایک سے آخر تک زندگی اس پر بے شمار تحریریں لکھتی ہے۔ اس تحریر کی نوعیت ہر زندگی کے مزاج پر منحصر ہے۔

(خلیل جبران)

خوشاب۔۔۔ (چیل)

☆ دعا کبھی رائیگاں نہیں جاتی' البتہ قبول ہونے کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں' جسے ہم سمجھ نہیں پاتے۔
☆ اگر دکھوں کا دریا عبور کرنا چاہتے ہو تو آنسوؤں کو جذب کرنا سیکھو۔
☆ لباس اس طرح کا پہنو کہ کوئی تمیز نہ کر سکے کہ تم امیر ہو یا غریب۔
☆ خوش نصیبی ایک ایسا پرندہ ہے جو تکبر کی منڈیر پر کبھی نہیں بیٹھتا۔
☆ بعض لوگوں کو اس بات کا غرور ہوتا ہے کہ وہ مغرور نہیں ہیں۔

حرمت روا اکرم۔۔۔ ڈلوال

کانچ کی چوڑی

سنو اے دوست
ان آنکھوں میں روشنی
لبوں پر ہنسی
اور زندگی کے سارے رنگ
تم سے ہی تو تھے
تمہارے بنا میں ایسے بکھری
جیسے کانچ کی چوڑی

شگفتہ خان۔۔۔ بھلوال

باتوں سے خوشبو آئے

☆ جتنا کسی کا ساتھ پرانا ہو' اتنا ہی اس کی بے وفائی کے لیے تیار رہنا چاہیے' کیونکہ تبدیلی کائنات کا خمیر ہے۔
☆ کبھی راکھ پر محل تعمیر ہو جاتے ہیں اور کبھی چٹانوں پر محض جھونپڑیاں بن پاتی ہیں۔
☆ جو لوگ کپڑوں کی طرح رشتے بدلتے ہیں' وہ کبھی کسی کے بھی نہیں ہوتے اور ہمیشہ تنہا رہتے ہیں۔
☆ آپ اپنا کام کرتے جائیں' وقت آپ کے لیے دوستیاں اور محبت خود پیدا کرے گا۔
☆ خاموش انسان' خاموش پانی کی طرح گہرے ہوتے ہیں۔
☆ روح لطیف ہے اور نفس کے شور میں کھو کر روح کی پکار پر کو تحریر وحیان دیا جا سکتا ہے۔
☆ غم کا نقش تمہارے اندر جتنا گہرا ہو گا اسی قدر تم میں مسرت و شادمانی کی گنجائش ہو گی۔

صائمہ نورین۔۔۔ شورکوٹ

دلچسپ و عجیب

☆ امریکیوں کے عقیدے کے مطابق اگر ریچھ سات سال بعد بچے کو جنم دے تو علاقے میں بیماری پھیلنے کی علامت ہے۔
☆ انڈونیشیا کے علاقے لیماہیرا کی قبائلی عورتیں مختلف پھولوں کی پتیوں کا بنا ہوا سینٹ لگاتی ہیں' جس کی خوشبو مہینوں برقرار رہتی ہے۔
☆ ڈاکٹر جان برو گھیس ملک ہالینڈ کی یونیورسٹی برونینگن میں دس سال تک ریاضی کے پروفیسر رہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ نابینا تھے۔
☆ ورجینیا میں 1874ء میں ایک لڑکا پیدا ہوا' اس کا نام مارچی ٹوس تھا۔ جب یہ بچہ پیدا ہوا تو اس کے منہ میں دانتوں کا پورا سیٹ موجود تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جب وہ مرا تو اس کے منہ میں دانتوں کا پورا سیٹ موجود تھا' اس وقت اس کی عمر 105 سال تھی۔
☆ کرسٹوفر کولمبس (1506-1447ء) کے

انتقال کے فوری بعد یہ تعین نہ ہو پایا تھا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے۔ اس کی مقبولیت کی وجہ تھیں ایسے شہر تھے جہاں کے لوگوں کا دعوا تھا کہ کولمبس وہاں کا باشندہ ہے۔ اس کی جائے پیدائش کے ساتھ ساتھ اس کی تاریخ پیدائش میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے' کیونکہ چھبیس مختلف تاریخیں اس کی پیدائش کی بتائی جاتی ہیں۔ سب سے تعجب کی بات یہ ہے کہ کولمبس کو مرنے کے بعد ایک نہیں بلکہ آٹھ بار ایک جگہ سے دوسری جگہ دفن کیا گیا۔

انیتا اعوان۔۔۔ کراچی

کتا

کتا پالتو جانور ہے' ہمارے شہر کی کارپوریشن اسے پالتی ہے اور مختلف علاقوں میں چھوڑ دیتی ہے۔ کتابوں میں آیا ہے' جو کتے بھونکتے ہیں' وہ کاٹتے نہیں۔ کاٹنے والوں کو بھونکنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بھونکنا وہ ہے' جسے کاٹا جائے' جس کو گزند پہنچے۔ کتوں اور عاشقوں میں کئی چیزیں مشترک ہوتی ہیں' دونوں راتوں کو گھومتے ہیں اور اپنا کلام پڑھ پڑھ کر لوگوں کو جگاتے ہیں اور اینٹ پتھر کھاتے ہیں۔ ہاں ایک کتا لیلیٰ کا بھی تھا' لوگ رسائی حاصل کرنے کے لیے اس سے پیار کرتے تھے' اس کی خوشامد کرتے تھے' جس طرح صاحب کے چپڑاسی کی کرنی پڑتی ہے۔

(ابن انشاء کی کتاب "اردو کی آخری کتاب" سے اقتباس)

افشاں۔۔۔ کراچی

جنت کی تلاش

☆ جس کو اللہ تعالیٰ مقبول کرتا ہے اس پر ظالم مسلط کیا جاتا ہے' جو اس کو رنج دیتا ہے۔

☆ بندہ اگر اپنی ہر خطا پر ایک کنکر گھر میں ڈال دیا کرے تو کچھ ہی عرصہ میں اس کا گھر کنکروں سے بھر جائے گا۔

☆ وہ بنیاد جو کبھی ویران نہ ہو' عدل ہے' وہ تخم جس کا آخر شیرینی ہو' صبر ہے اور وہ شیرینی جس کا آخر تلخ ہو' شہوت ہے۔

☆ یہ عجیب بات ہے کہ بعض لوگ دن میں پانچ دفعہ منہ دھوتے ہیں' مگر دل کو پانچ سال میں ایک بار بھی نہیں دھوتے۔

☆ ہم اپنے دین کے ٹکڑے کر کے اپنی دنیا کو پیوند لگاتے ہیں۔ پس نہ ہمارا دین رہتا ہے اور نہ وہ جسے ہم پیوند لگاتے ہیں۔

☆ جو اپنی نظر کو کھلا چھوڑ دیتا ہے اس کا غم طویل ہو جاتا ہے۔ جو اپنی امید کو کھلا چھوڑ دیتا ہے اس کا عمل برا ہو جاتا ہے۔ اور جو اپنی زبان کو کھلا چھوڑ دیتا ہے' وہ اپنے آپ کو ہلاک کرتا ہے۔

تانی چوہدری۔۔۔ آکسفورڈ یو کے

باتیں بڑی کمال کی

میری دانست میں محبت کوئی شرط نہیں ہوتی' محبت صرف کی جاتی ہے' چاہے دوسرا کرے نہ کرے' محبت ایک ہاتھ کی تالی ہے' اس میں نہ شکوے کی گنجائش ہے نہ شکایت کی' نہ وفا کی شرط ہے' نہ بے وفائی کا گلہ' محبت لین دین نہیں' صرف دین ہے۔"

(ممتاز مفتی) انجم۔۔۔ لاہور

مفت مشورہ

ایک موٹی عورت نے تیزی سے کمرے میں داخل ہو کر بے تابی سے پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب آپ ٹھیک ٹھاک بتائیں میرے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟" کمرے میں موجود صاحب نے اس کا سر سے پیر تک جائزہ لیا اور تحمل سے بولے۔

"سب سے پہلے تو آپ کو پچاس ساٹھ پونڈ وزن کم کرنے کی ضرورت ہے' اس کے علاوہ اگر آپ میک اپ نہ کریں تو زیادہ خوب صورت لگیں اور دوسری بات کہ میں ڈاکٹر نہیں آرٹسٹ ہوں' ڈاکٹر کا کمرہ اوپر ہے۔"

حمیرا عبدالغنی بٹ۔۔۔ ور نجف لودھرے

نئے سال

کس تذبذب میں ہے نئے سال کی دہلیز پر
جو کھویا ہے اس کا غم نہ کر جو پانا ہے اس کا عہد کر
نہیں کچھ حاصل محرومیوں کے شمار سے
گزرے غموں کو بھول کر نئی خوشیاں تلاش کر

کرن عدنان۔۔۔ کراچی

زہر

سانپ کا زہر کنچلی میں اور بچھو کا دم میں ہوتا ہے' بھیڑیے کا زہر ڈنک میں ہوتا ہے اور پاگل کتے کا زباں میں' انسان واحد حیوان ہے' جو اپنا زہر دل میں رکھتا ہے۔

(مشتاق احمد یوسفی آب گم سے)

فوزیہ ثمر بٹ۔۔۔ گجرات

سال نو

اس سے پہلے کہ
جنوری کی دھند میں آنکھیں
برف کی چادر اوڑھ لیں
آجاؤ کہ
سال نو کی آمد نزدیک ہے

نواب زادی سولنگی۔۔۔ تحصیل مورو سندھ

سوالاً "جواباً"

"بیگم تمہیں کچن میں گئے تین گھنٹے ہو گئے' کیا چاپیں ابھی تک تلی نہیں جاسکیں؟"

"تلی تو میں نے لی تھیں۔ لیکن وہ ٹھیک نہیں لگ رہی تھیں' گلی نہیں تھیں' اس لیے میں نے انہیں بھون لیا' لیکن بھوننے سے وہ جل گئیں' اب اگر آپ ذرا سی دیر اور صبر کریں تو میں انہیں ابال کر لا رہی ہوں۔"

ہانیہ عمران۔۔۔ گجرات

بکھرے ذرے

☆ خاموشی عبادت بھی ہے اور بھرم بھی۔

☆ مسائل کہنے سے حل نہیں ہوں گے' بلکہ عزت کم ہو جائے گی۔

☆ مسائل اور مصائب مصیبت نہیں بلکہ آزمائش ہیں۔

☆ شخصیت میں جھول حالات کے اظہار سے آتا ہے۔

☆ کبھی بھی کسی کو اپنا کمزور پہلو بتا کر اپنی شخصیت کا بھرم نہ کھو۔

روحی یاور۔۔۔ بہاولنگر

خوشبو جیسی بات

☆ دعا کبھی بے کار نہیں جاتی' البتہ قبول ہونے کی صورتیں مختلف ہیں۔

☆ رشتے اور سودے میں بہت فرق ہوتا ہے' رشتے قائم کیے جاتے ہیں' جبکہ سودے طے کیے جاتے ہیں۔

☆ بعض رشتے ایسے ہوتے ہیں' جنہیں بدلتے ہوئے پل صراط پہ سے گزرنے کا گمان ہوتا ہے۔

☆ کمزور لمحے ہر انسان پر آتے ہیں۔ اگر ہم ان کمزور لمحوں کی گرفت سے نکل جائیں تو انسانیت کی معراج کو چھو لیتے ہیں۔

نوشابہ منظور۔۔۔ بھریا روڈ

نیا سال

نہ جانے کیا ہوا ہے سال بھر میں
دیا روشن کہ مدھم ہو گیا ہے
ہمیں معلوم ہے اتنا کہ ایک سال
ہماری عمر سے کم ہو گیا ہے

امبر آصف۔۔۔ کراچی

☆ ☆
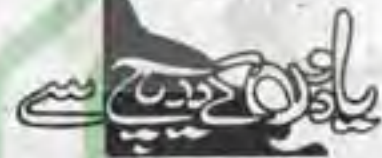
مشعال جنید، کی ڈائری میں تحریر
علامہ اقبال کی غزل

نہ تُو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے، تو نہیں جہاں کے لیے

رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک
ترا سفینہ ہے بحرِ بے کراں کے لیے

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لیے

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

ذرا سی بات تھی، اندیشۂ عجم نے اسے
بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لیے

مرے گلو میں ہے اک نغمہ جبرئیل آشوب
سنبھال کر جسے رکھا ہے لامکاں کے لیے

نمرہ، اقراء، کی ڈائری میں تحریر
اعزاز احمد آذر کی نظم

جنوری لوٹ آئی ہے،

وہی گلیاں وہی کوچے وہی سردی کا موسم ہے
اسی انداز سے اپنا نظامِ زیست برہم ہے

یہ حسنِ اتفاق ایسا کہ نکھری چاندنی بھی ہے
وہی ہر سمت ویرانی اداسی تشنگی سی ہے

وہی بھیگی ہوئی سوچوں کی وہی تنہائیاں پھر سے
مسافر اجنبی اور دشت کی پنہائیاں پھر سے

مجھے سب یاد ہے کچھ سال پہلے کا یہ قصہ ہے
وہی لمحہ تو ویرانے کا اک آباد حصہ ہے

میری آنکھوں میں وہ اک لمحہ موجود اب بھی ہے
وہ زندہ رات میرے ساتھ لاکھوں بار جاگی ہے

کسی نے رات کی تنہائی میں سرگوشیاں کی تھیں
کسی کی نرم گفتاری نے دل کو لوریاں دی تھیں

کسی نے میری تنہائی کا سارا کرب بانٹا تھا
کسی نے رات کی چنری میں روشن چاند ٹانکا تھا

چمکتے جگنوؤں کا اک سبیل بخشا تھا راتوں کو
دھڑکتا سا نیا عنوان دیا تھا میرے خوابوں کو

میرے شعروں میں وہ الہام کی صورت اترا تھا
معانی بن کے جو لفظوں میں پہلی بار دھڑکا تھا

وہ جس کے ہونے سے زندگی نغمہ سرائی ہے
اسے کہنا کہ بھیگی جنوری پھر لوٹ آئی ہے

عائشہ، تحریم، کی ڈائری میں تحریر
ایک نظم

یکم جنوری،

ہر طرف دھند ہے
دھند ہی دھند ہے
ایسے لگتا ہے جیسے زمیں آسماں
دھند کے اس اجل خیز سیلاب میں
خاروخس کی طرح
بہتے بہتے کہیں دور کھو جائیں گے
وہ مناظر جو گنتی میں آتے نہ تھے
ایک ہو جائیں گے
بے یقینی کے رنگوں میں الجھی ہوئی
چاندنی درد کی جگمگاتی نہیں
دھند کی جھیل پر تیرتی ہے مگر
راہ پاتی نہیں
وہ نظر جو ستاروں کی ہم راز تھی
دس قدم دور تک ساتھ جاتی نہیں
روشنی بھی کہیں کچھ دکھاتی نہیں
آنکھ کہتی ہے باہر بہت دھند ہے
دل کہتا ہے اندر بھی کم تو نہیں

صدف عبداللہ، کی ڈائری میں تحریر
ساحر لدھیانوی کی غزل

خودداریوں کے خون کو ارزاں نہ کر سکے
ہم اپنے جوہروں کو نمایاں نہ کر سکے

ہو کر خراب مے ترے غم تو بھلا دیے
لیکن غمِ حیات کا درماں نہ کر سکے

ٹوٹا طلسمِ عہدِ محبت کچھ اس طرح
پھر آرزو کی شمع فروزاں نہ کر سکے

ہر شے قریب آ کے کشش اپنی کھو گئی
وہ بھی علاجِ شوقِ گریزاں نہ کر سکے

کس درجہ دل شکن تھے محبت کے حادثے
ہم زندگی میں پھر کوئی ارماں نہ کر سکے

مایوسیوں نے چھین لیے دل کے ولولے
وہ بھی نشاطِ روح کا ساماں نہ کر سکے

ریحانہ علی احمد، کی ڈائری میں تحریر
گلزار کی نظم

اعتراف،

مجھ کو بھی ترکیب سکھا کوئی یار جلاہے
اکثر تجھ کو دیکھا ہے تانا بُنتے
جب کوئی دھاگا ٹوٹ گیا یا ختم ہوا
پھر سے باندھ کے
اور سرا کوئی جوڑ کے اس میں
آگے بُننے لگتے ہو
تیرے اس تانے میں لیکن
ایک بھی گانٹھ گرہ بُنتر کی
کوئی دیکھ نہیں سکتا
میں نے تو اک بار بُنا تھا ایک ہی رشتہ
لیکن اس کی ساری گرہیں صاف نظر آتی ہیں
میرے یار جلاہے

کلثوم آصفہ، کی ڈائری میں تحریر
پروین شاکر کی نظم

یہاں پر جو دھویں شب کو
سخن کے بھید کھلتے ہیں کہیں
نیتھی کا مصرعہ کہیں میر کی رمزیں
کہیں انشا کا جادو کہیں بہزاد کی رمزیں
جرأت اپنا جگاتی ہے
خوشبو کی سفیر بال پنے جھٹک کر جب
سب سے داد لیتی ہے
تو سارے حسن تھیں کے دل پھرتے
مچلتے ہیں

لاہور
سال تو میں اک ایسی بارش ہو میرے شہر پہ جو
سارے دل، سارے در دریچے دھو جائے

...م ممتاز — سیالکوٹ
وہ خنک رُت، یہ نئے سال کا پہلا لمحہ
دل یہ کہتا ہے کہ موسم کوئی اب لوٹ آئے
ہم نے ماضی کی سخاوت پہ جو پل بھر سوچا
دکھ بھی کیا کیا ہمیں یاروں کے سبب یاد آئے

...سہیل — کراچی
میں بھی ہوں اگر خاموش آج تو ہنسا تو بھی نہیں
مجھ سے بچھڑ کے کسی اور سے ملا تو بھی نہیں
خنک خنک سی مسکراہٹ کے ساتھ سال گزرنے والے
مان لے مجھ سے زیادہ خود کو جانتا تو بھی نہیں

... — کراچی
جنوری کی سردیوں میں اک آتش دان کے پاس
گھنٹوں تنہا بیٹھنا، بجھتے شرارے دیکھنا
جب کبھی فرصت ملے تو گوشۂ تنہائی میں
یادِ ماضی کے پرانے گوشوارے دیکھنا

...نعم اعوان — کراچی
نئی رتیں، نئے خواب ہیں اور چاہتوں کے سلسلے
سال نو کے سنگ ہیں تیری گلاب رفاقتوں کے سلسلے
کبھی دن بھر تجھے سوچنا، کبھی رات بھر سے جاگنا
تیری یاد ہے، میں ہوں اور جنوری کی شاموں کے سلسلے

... — کراچی
کس طرح گزری جدائی اور سفر کیسا لگا
اتنی مدت بعد آئے ہو تو گھر کیسا لگا
خواہشوں کا اور جذبوں کا اثر کیسا تھا
سچ بتاؤ خود کو تنہا جان کر کیسا لگا

صابرہ یار محمد — اسلام آباد
تیرا خیال بہت دیر تک نہیں رہتا
کوئی ملال بہت دیر تک نہیں رہتا
اداس کرتی ہے اکثر تمہاری یاد مجھے
مگر یہ حال بہت دیر تک نہیں رہتا

مہرین طارق — کراچی
میں ریزہ ریزہ تو ہوتا ہوں ہر شکست کے بعد
مگر ندھال بہت دیر تک نہیں رہتا
جواب مل ہی تو جاتا ہے ایک چپ ہی نہ ہو
کوئی سوال بہت دیر تک نہیں رہتا

امبرین — کبیر والا
غم فراق میں آنکھیں تو ریزہ ریزہ ہوئیں
جو آنسو شیشہ بنے ٹوٹ کر بکھر نہ سکے

شہزادی تحسین — کراچی
یہ بھی اک طرز کا اندازِ مسیحائی ہے
سل گئے ہونٹ مگر زخم نہ سلنے پائے
درد، غم، زخم، لہو، داغ، ندامت، الزام
کتنے انعام وفا حضرتِ دل نے پائے

عروسہ — کراچی
وقت گزرا تو یہ ملال ہوا
ختم اک زندگی کا سال ہوا
کتنی شدت سے کوئی یاد آیا
آج جینا بڑا محال ہوا

آسیہ حنیف — کوئٹہ
دراڑیں پڑ گئیں چہرے پہ کتنی
کہا تو تھا تمہیں اتنا نہ سوچو

گل رعنا — کراچی
کتنا رویا تھا میں تیری خاطر
اب جو سوچوں تو ہنسی آتی ہے

آسمہ ناز محمد — میرپور ساکرو
پتھر بنا دیا مجھے رونے نہیں دیا
دامن بھی تیرے غم نے بھگونے نہیں دیا
دل کو تمہاری یاد کے آنسو عزیز تھے
کوئی بھی درد اور سمونے نہیں دیا

اقصیٰ اعظم — ڈنمارک
آج رو تا ہوا اک دوست بہت یاد آیا
اچھا گزرا ہوا کچھ وقت بہت یاد آیا
جو ہر درد کو سینے میں چھپا لیتا ہے
آج جب درد ہوا مجھ کو بہت یاد آیا

ندا، فضہ — کراچی
رہا نہ دل میں وہ بے درد اور درد رہا
مقیم کون ہوا ہے مقام کس کا تھا

سدرہ وزیر — خوشاب (جہلم)
حکم تیرا ہے تو تعمیل کیے دیتے ہیں
زندگی ہجر میں تحلیل کیے دیتے ہیں
تو وصل کی خواہش پہ بگڑتا کیوں ہے
راہ ہی ہے چلو تبدیل کیے دیتے ہیں

نوشین اقبال نوشی — گاؤں بدو مرجان
ملے گا تو روئے گا اب بھی وہ لگ کے سینے سے
کہ اپنے حال کا ماضی سے فاصلہ نہ رہے
اتار کر تجھے دل میں، میں چھوڑ لوں آنکھیں
پلٹ کر جا بھی سکے تو وہ راستہ نہ رہے

کرن، بینش — کراچی
تم کو کیا خبر جاناں ہم اداس لوگوں پر
شام کے سبھی منظر انگلیاں اٹھاتے ہیں

حنہ حبیب — عبدالحکیم
حسن سے تکمیلِ عشق، عشق سے تکمیلِ حسن
اک کمی تیرے بغیر، اک کمی میرے بغیر

اسماء حبٹ — عبدالحکیم
تسکین دل کے واسطے وعدہ تو کیجیے
ہم جانتے ہیں آپ سے آیا نہ جائے گا

زینب احسن — منصور آباد
کتنا مشکل ہے محبت کی کہانی لکھنا
جیسے پانی پہ پانی سے پانی لکھنا

حنیفہ مہوش — اٹک
وہ انکار کرتے ہیں اقرار کے لیے
نفرت بھی کرتے ہیں پیار کے لیے
الٹی چالیں چلتے ہیں یہ دیوانگانِ عشق
آنکھوں کو بند کرتے ہیں دیدار کے لیے

یاسمین کنول — پسرور
گفتگو کیجیے کہ فطرتِ انساں ہے شکیب
جالے لگ جاتے ہیں جب بند مکان ہوتا ہے

تانی چوہدری — آکسفورڈ یوکے
دھوپ میں ہو جو چھاؤں کی طرح
ایسا اک مہربان تلاش کریں
پیار کے پھول جس میں کھلتے رہیں
چاہتوں کا جہان تلاش کریں

سونیا ربانی — قاضیاں محلہ بالا
ہوا چلی تو خوشبو میری بھی پھیلے گی!!
میں چھوڑ آئی ہوں درختوں پہ اپنے ہاتھ کے رنگ

صائمہ سلیم سندھو — گوجرہ
ناشناسا کی طرح جو آج ملتا ہے مجھے
اک تعلق سا کبھی اس کو میری ذات سے تھا

خورشید مقبول — کھیوڑہ
کتنے بے درد ہیں تیرے قید خانے کے محافظ ساقی
آنکھ لگتی ہے تو زنجیر ہلا دیتے ہیں

نوشابہ منظور — پھر یا روڈ
اداس شاموں کا تم کچھ حساب رکھ لینا
دلِ حزیں میں محبت کا باب رکھ لینا
نہ بیٹھنا کبھی تنہا اداس موسم میں
نظر کے سامنے دل کی کتاب رکھ لینا

مدیحہ — فیصل آباد
اک ذرا ہاتھ بڑھا میری طرف
خود کو میرا تو ہم سفر کر دے
تم میری زیست کا حاصل ہو
اتنا کہہ اور معتبر کر دے

نازیہ یوسف — گوجرہ
اب کے بہت ہے تجھے نگاہِ ہنر لوں کا رنگ
دیکھ تو اپنے پاؤں کی زنجیر توڑ کر!

حسن و صحت

ادارہ

صندل اور ایلوویرا قدرتی حسن کے محافظ

برصغیر کے خطے کو قدیم روایات کا حامل ایسا حصہ قرار دیا جاتا ہے، جہاں کے باشندے صدیوں قبل ہی حسن کی رعنائی کے لیے قدرتی اجزا کے خواص جان چکے تھے۔ محدود وسائل کے باعث نباتاتی خزانے حقیقی شکل میں استعمال کیے جاتے تھے۔ جب ترقی یافتہ اقوام نے بھی ان کی افادیت کو سائنسی اصولوں پر پرکھا تو یہی نباتات آرائش حسن کی مصنوعات میں شامل کی جانے لگیں اور یہ سلسلہ آج اس قدر عروج پر جا پہنچا ہے کہ قدرتی اجزاء کے خالص مادوں سے تیار شدہ مصنوعات جلد کے لیے سب سے زیادہ بہتر سمجھی جاتی ہیں۔

اکثر خواتین شگفتہ اور حسین نظر آنے کے چکر میں بہت سے اشتہارات کی جادو بیانی کے سحر میں جکڑ جاتی ہیں اور پھر ادھر ادھر ایسی مصنوعات خرید سکتی ہیں، جو ان کی جلد کے لیے قطعی مناسب نہیں ہوتیں۔ ضروری تو نہیں کہ جو چیز کسی دوسرے کو فائدہ پہنچا رہی ہو، وہ آپ کو بھی اتنا ہی فائدہ پہنچائے۔ خواتین اگر ماضی کی خواتین کی طرح قدرتی اجزاء اور قدرتی نباتات کی طرف توجہ دیں تو وہ اپنی جلد پر مثبت نتائج بھی حاصل کر سکیں گی اور ان کا ماہانہ بجٹ بھی متاثر نہ ہو گا۔

صندل

صندل ایک طفیلی پھل ہے۔ یہ زیادہ تر بھارت کے مقام میسور میں پایا جاتا ہے۔ دراصل صندل ایک مضبوط اور خوشبودار درخت کی لکڑی ہوتی ہے۔ جو اپنے اندر ٹھنڈک کی خصوصیات اور صحت بخش اجزا رکھتی ہے۔ یہ بہت ہی خوشبودار اشیا بنانے کے کام آتی ہے، جن میں تیل، پرفیوم، صابن، فیس پیک پاؤڈر اور کئی دوسری چیزیں شامل ہیں۔ صندل کا پاؤڈر اور تیل جلد کی حفاظت (Skin Care) کی کئی مصنوعات میں استعمال کیا جاتا ہے۔

صندل کے پاؤڈر کو پانی یا عرق گلاب کے ساتھ ملا کر چہرے پر لگا کر ٹھنڈک حاصل کی جاتی ہے اور چہرے کی خوب صورتی کو بڑھایا جاتا ہے، ماتھے پر اسے لگانے سے ماتھا ٹھنڈا رہتا ہے اور یہ آپ کی پریشانیوں اور ٹینشن کو دور بھگاتا ہے اور اگر آپ کی جلد آلودگی کی وجہ سے خراب ہو گئی ہے یا سخت اور کھردری ہو گئی ہے تو اسے چہرے پر لگا کر خشک ہونے کے بعد چہرہ دھو لیں یہ پیسٹ خصوصاً گرمیوں میں لگایا جاتا ہے تاکہ سورج کی مضر شعاعوں سے بچا جا سکے۔ صندل کے پاؤڈر کا لیپ جلی ہوئی جلد کے لیے بھی بہترین ہے۔ یہ ایک اینٹی سیپٹک کا کام کرتا ہے اور جلے ہوئے حصے میں ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ صندل کا پیسٹ جلد کی بہت سی بیماریوں اور خرابیوں کے لیے بھی فائدہ مند ہے۔

چکنی جلد کے لیے صندل کی لکڑی سے بنے صابن اور فیس پیک نہایت فائدہ مند ہیں۔ جلد کے داغ دھبوں اور جسم سے آنے والی بدبو کو دور کرنے کے لیے اس کا صابن نہایت مفید سمجھا جاتا ہے۔ الرجی، کیل مہاسوں اور داغ دھبوں والی جلد کو صندل کی لکڑی سے بنا صابن فوری فائدہ دیتا ہے اور جلد اس قدر صاف ستھری اور چمک دار ہو جاتی ہے کہ کیل مہاسوں، داغ دھبوں کا شائبہ تک نہیں رہتا۔ صندل کی لکڑی کو سن اسکرین کریموں کا اہم عنصر سمجھا جاتا ہے۔ یہ جلد کو شفاف، چمک دار اور تروتازہ رکھتی ہے۔ اپنی ٹھنڈی خاصیت کی وجہ سے یہ جلد کو سکون بخشتی ہے۔

صندل میں جلد کو بیرونی موسمی اثرات سے محفوظ رکھنے کی صلاحیت ہے۔ جلدی مسائل کے لیے صندل کی لکڑی کا برادہ صدیوں سے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

صندل کے کرشمے

صندل کے قدرتی اجزا کے سلسلے میں ہم چند ایسے نسخے پیش کر رہے ہیں، جن کے متواتر استعمال سے نا صرف آپ کی جلد شگفتہ ہو گی، بلکہ ہر طرح کے مضر اثرات سے بھی محفوظ رہے گی۔ صندل آپ کو اپنی جلد کی بہتری اور صفائی کے لیے ایک قدرتی عطیہ محسوس ہو گی اور یہ آپ کی دسترس میں بھی ہے۔ صندل پر مشتمل یہ سارے نسخے آزمودہ اور بے حد فائدہ مند ہیں لہٰذا انہیں آپ بھی آزمائیے۔

☆ صندل کی لکڑی کا پاؤڈر ایک چمچ لیں، اس میں عرق گلاب شامل کریں اور پیسٹ بنا کر اپنے چہرے اور گردن پر لگائیں۔ خشک ہونے پر دھو لیں۔ یہ روغنی جلد اور کیل مہاسوں والی جلد کے لیے نہایت مفید ہے۔ اس سے آپ کی جلد کو ایک تروتازہ اور روشن لک (Look) ملے گی۔

☆ صندل کی لکڑی کے پاؤڈر میں ناریل کا دودھ ملا کر پیسٹ بنائیں اور چہرے کی رنگت کو نکھارنے کے لیے استعمال کریں۔ چہرے کی جلد صاف ستھری ہو جائے گی۔

☆ چہرے کی چمک کے لیے دودھ کو شہد میں ملائیں اور اس سے چہرے کا مساج کریں پھر صندل کے پاؤڈر میں پسا ہوا چینا، لیموں اور بادام کا پیسٹ ملا کر اس کو چہرے پر ملیں، اس سے آپ کا چہرہ صاف ستھرا اور چمک دار ہو جائے گا۔

☆ دانوں کے خاتمے کے لیے اپنی جلد کو عرق گلاب سے صاف کریں اور متاثرہ حصے پر ٹماٹر کور گڑیں، اس طریقے سے جلد کی چکنائی کم ہوتی ہے اور مسام بند ہو جاتے ہیں پھر صندل کا پاؤڈر چہرے پر لگائیں۔

☆ سورج کی شعاعوں سے پڑنے والے نشانات کو ختم کرنے کے لیے چار چمچ صندل کا پاؤڈر لیں اور اس میں چار چمچ پسا ہوا آلو بخارا اور دو چمچ بادام کا تیل ملائیں، اور اس کو متاثرہ جگہ پر لگائیں۔ اس کے علاوہ صندل والی کریم سے مساج کریں اور ملتانی مٹی اور صندل کے پاؤڈر کا پیسٹ بنا کر متاثرہ حصے پر لگائیں۔

☆ تین چمچ زیتون کا تیل لیں اور اس میں تین چمچ صندل کا تیل ملائیں۔ اب اس کو بے جان بالوں پر لگائیں، بالوں کو تولیے میں لپیٹ کر پندرہ منٹ کے لیے چھوڑ دیں۔ اب بال دھو کر خوب صورت اور نرم ملائم بالوں کا لطف اٹھائیں۔

☆ آنکھوں کے گرد حلقوں کو ختم کرنے کے لیے یہ ماسک بنائیں۔ ایک چمچ بادام کا پیسٹ، آدھا چمچ پسا ہوا آلو، دس قطرے لیموں کا رس اور آدھا چمچ تازہ کریم۔ ان سب کو آپس میں ملا کر پیسٹ بنائیں، اب اسے حلقوں پر لگائیں اور خشک ہونے پر دھو لیں۔

☆ ملتانی مٹی کو باریک پیس لیں۔ ایک حصہ ملتانی مٹی میں آدھا حصہ صندل پاؤڈر اور آدھا حصہ پسی ہوئی ہلدی ملا کر پیالی میں رکھ لیں۔ بوقت ضرورت تھوڑا سا لے کر شہد اور لیموں کا عرق ملا لیں اور چہرے پر لگائیں، اگر آپ کی جلد خشک ہے تو اس میں چند قطرے بادام یا زیتون کا تیل شامل کر لیں۔ اس گھریلو نسخے کے روزانہ استعمال سے حیران کن نتائج سامنے آئیں گے۔

ایلوویرا

ایلوویرا جسے گھیکوار بھی کہا جاتا ہے۔ ایک کیکٹس (Cactus) کی قسم کا پودا ہوتا ہے، جس کا تعلق سوسن کے پھول کے خاندان سے ہے۔ اس میں وٹامن E اور C کے علاوہ زنک (Zinc) اور کئی دوسرے اجزا بھی پائے جاتے ہیں، جو جلد اور صحت کے لیے نہایت فائدہ مند ہیں۔ ایلوویرا کی ٹھنڈی خصوصیات ہماری جلد کو دھوپ کی تمازت سے محفوظ رکھتی ہیں۔ اس میں وٹامن E اور C کی وافر مقدار جلد کے لیے بہترین سمجھی جاتی ہے۔ آج کل ایلوویرا کی کئی اقسام با آسانی دستیاب ہیں اور لوگ اپنی جلدی کی مناسبت سے اس کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ یہ جیل، لوشن

موئسچرائزر اور جوس کی شکل میں بھی ملتا ہے۔ جوس (رس) کی صورت میں اس کے استعمال سے جلد کو شاندار نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ انتہائی خشک جلد اور حساس جلد پر ایلوویرا جیل کا استعمال مفید ہے۔

گھیکوار کا پودا جلے ہوئے اعضا کے لیے اکسیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے پتے سے شفاف جیلی نما گودا نکال کر جلے ہوئے حصے پر لگا دیا جائے تو جلن یا درد نہیں ہوگا۔ قدرت نے اس پودے میں نہایت حیرت انگیز خصوصیات کو یکجا کر دیا۔ یہ پودا زخموں کو بھرنے، درد سے نجات دلانے، جلد کا سرطان، خارش، ایگزیما اور دیگر جلدی امراض، بالوں کے گرنے اور خشکی کو دور کرنے، جوڑوں کے درد، نیند نہ آنے، معدہ کی خرابی، مسوڑھوں کے امراض، السر، قبض، بواسیر، سر درد، گردے کے امراض اور کئی دوسری تکالیف میں بے حد مفید ثابت ہوا ہے۔ حتیٰ کہ ایکسریز اور ایٹم بمباری سے پیدا ہونے والے زخم جب کسی طرح مندمل نہ ہوتے تو ڈاکٹروں نے گھیکوار کی خدمات حاصل کیں اور اسے زخموں پر آزمایا تو اس کے حیرت انگیز نتائج سامنے آئے، جس نے انہیں حیرت زدہ کر کے رکھ دیا۔

ایلوویرا سے قدرتی حسن

انسانی جلد پر قدرتی اشیا کے حیرت انگیز نتائج ملتے ہیں۔ ایلوویرا ایک قدرتی جڑی بوٹی ہے۔ جو خواتین کی جلد کا خیال رکھتی ہے۔ آج کل بہت سی کریموں اور لوشنز میں ایلوویرا جیل کا استعمال کیا جا رہا ہے اور اس کے نتائج اس قدر حیران کن ہوتے ہیں کہ ایک بے جان جلد بھی خوب صورتی اور شادابی کی مثال بن جاتی ہے۔ اپنی ایسی ہی شاندار خصوصیات کی بدولت ایلوویرا نہایت تیزی کے ساتھ دنیا بھر میں مقبول ہوتا جا رہا ہے اور کئی ادارے اس پودے سے مختلف اقسام کی دوائیں، مرہم، شیمپو، کریم، کنڈیشنر اور دوسرا سامان آرائش تیار کر رہے ہیں۔

چہرے کی دیکھ بھال اور آرائش رنگت میں نکھار لانے، جھریوں کو دور کرنے اور جلد کو ترو تازہ رکھنے کے لیے گھیکوار اپنی مثال آپ ہے۔ اس سے سینکڑوں اقسام کی کریمیں اور کنڈیشنر بنائے جا رہے ہیں۔ جلد کو میک اپ کی مصنوعات سے پہنچنے والے نقصانات کو دور کرنے میں بھی گھیکوار اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ دراصل جلد کے خلیات کے لیے محرک ثابت ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے جلد میں دوران خون بڑھ جاتا ہے۔ گھیکوار کا رس چہرے پر لگا کر دو سے تین گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں پھر منہ دھولیں۔ اگر آپ کی جلد خشک ہے اور گھیکوار کے استعمال کے بعد آپ کو چہرے پر خشکی کا احساس ہو تو اس میں روغن زیتون یا روغن بادام شامل کر لیں۔

چہرے پر نکلنے والی مختلف طرح کی پھنسیاں اور دانے، مہاسے کہلاتی ہیں۔ جن سے نجات حاصل کرنے کے لیے خواتین بے شمار ٹوٹکے آزماتی ہیں اور کئی اقسام کی کریمیں لگاتی ہیں۔ گھیکوار کا گودا یا رس نکال کر دن میں تین بار لگانے سے یہ شکایت دور ہو جاتی ہے۔ اگر مہاسوں سے پیدا ہونے والے دھبوں یا نشانات پر گھیکوار کا رس مسلسل چھ ماہ تک استعمال کیا جائے تو یہ دھبے بھی جاتے رہتے ہیں۔

آنکھوں کے پپوٹوں کے کناروں پر پلکوں کی جڑوں میں اکثر دانے نکل آتے ہیں، انہیں "گوہانجنی" کہتے ہیں، ان پر بھی گھیکوار کا گودا لگایا جائے تو یہ ختم ہو جاتے ہیں۔

خواتین کی آرائش بالوں کے بغیر ادھوری رہتی ہے۔ سر کی جلد اور بالوں کی حفاظت میں گھیکوار استعمال کریں تو حیرت انگیز نتائج ملتے ہیں۔ گھیکوار کا رس نکال کر غسل کرتے وقت شیمپو کے طور پر استعمال کیا جائے یا غسل سے کچھ دیر قبل بالوں میں لگا کر چھوڑ دیں اور پھر نہالیں۔ یہ بالوں کی قدرتی خوب صورتی کا ذریعہ ہے۔ اس کے کوئی سائیڈ افیکٹس نہیں ہیں۔ بالوں میں خشکی ہو یا سر میں دانے نکل آئے ہوں تب بھی گھیکوار کا گودا لگانا مفید ہے۔

مسکراتی کرنیں

ریحانہ امجد بخاری
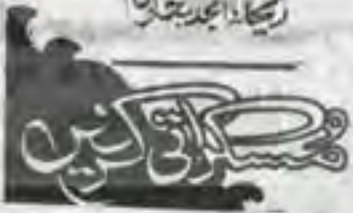
ساتواں نمبر

ایک صاحب چند دوستوں کے درمیان بیٹھے ہوئے ایک واقعہ سنا رہے تھے، جو انہیں کچھ دن پہلے پیش آیا تھا۔ وہ بولے

"ساتویں مہینے کی سات تاریخ تھی۔ میں لاٹری خریدنے گیا۔ میں نے سوچا، ساتواں مہینہ ہے اور سات تاریخ ہے تو وہ کیوں نہ وہ کوپن خریدوں، جس کا آخری نمبر بھی سات ہی ہو۔ پھر میں نے ایسا ہی کیا اور اس وقت تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب سات سو ستر ڈالر کا انعام میرے نام نکل آیا۔ میں سوچا کہ سات نمبر مجھ پر عاشق ہو گیا ہے۔ میں فوراً ہی گھوڑ دوڑ کے میدان میں پہنچا اور اپنی ساری رقم سات نمبر کے گھوڑے پر لگا دی۔" اتنا کہہ کر وہ صاحب خاموش ہو گئے۔ کچھ توقف کے بعد ان کے دوستوں میں سے ایک نے پوچھا۔

"پھر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا۔" وہ صاحب برا سا منہ بنا کر بولے۔

"میرا اندازہ بالکل صحیح نکلا سات نمبر واقعی مجھ پر عاشق تھا۔"

"آخر ہوا کیا؟" اسی دوست نے استفسار کیا۔

"گھوڑا بھی دوڑ میں ساتویں نمبر پر آیا۔" وہ صاحب سنجیدگی سے بولے۔

امبر۔ کراچی

دریافت

ایک ٹھیکیدار جس نے کچھ سرنگوں کی کھدائی کا ٹھیکہ لیا تھا۔ کام کا معائنہ کرنے گیا۔ اس نے دیکھا کہ مزدوروں کو جہاں کھدائی کرنا چاہیے تھی وہ اس جگہ سے کافی ہٹ کر کھدائی کر رہے تھے۔ اس نے کار روکی اور سخت غصے میں پوچھا۔

"یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

"سرنگ بیٹھ گئی ہے، اس کی کھدائی کر رہے۔" ایک مزدور نے اس کی طرف توجہ دیے بغیر کہا اور کھدائی جاری رکھی۔

"کیا فورمین کو اس سرنگ کے متعلق پتا ہے؟" ٹھیکیدار نے پوچھا۔ مزدوروں نے جواب دیا۔

"اگر پتا نہیں ہے تو ہم بتا دیں گے اگر پہلے اسے کھود کر نکال تو لیں۔"

آمنہ اقبال۔ کراچی

بات سمجھ کر...

جنرل میک آرتھر جب کیڈٹ تھے تو انہیں آئن اسٹائن کی تھیوری یاد کرنے کے لیے کہا گیا۔ تھیوری بے حد مشکل تھی۔ میک آرتھر نے اسے لفظ بہ لفظ رٹ لیا۔ جب کرنل فیبو جر نے ان سے اسی تھیوری کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے آنکھیں بند کر کے پوری تھیوری لفظ بہ لفظ سنا دی۔ کرنل فیبو جر نے آنکھیں پٹپٹا کر پوچھا۔

"کیا تم نے یہ تھیوری اچھی طرح سمجھ لی ہے؟" میک آرتھر کے لیے یہ بڑا نازک لمحہ تھا۔ مگر انہوں نے فوراً جواب دیا۔

"جی نہیں۔" پورے ہال میں سناٹا چھا گیا۔ کرنل فیبو جر نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"خود میری سمجھ میں بھی یہ تھیوری نہیں آئی۔"

کلاس برخاست۔"

آسیہ سہیل۔۔۔ کراچی

عظیم عیاشی

ڈرل شروع ہوئی اور خوب تیزی اور تندی سے حکم ملنے لگے۔ "سیدھے دیکھو' چھاتی باہر' تھوڑی اوپر' بازو ہلاؤ' ہلومت' مکھی مت اڑاؤ' منحوس مت۔" وغیرہ وغیرہ ان سب میں "ہلومت" کے حکم پر عمل کرنا عذاب عظیم تھا۔ سیدھے بت بنے کھڑے ہیں کہ کان پر کھجلی محسوس ہوتی ہے۔ اب ہاتھ کو جنبش دینا جرم ہے۔ کندھا کان تک نہیں پہنچ سکتا۔ کان کا خود ہلنا منشائے فطرت نہیں اور وہاں تک ہاتھ لے جانا "منشائے سارجنٹ" نہیں۔ عین اسی وقت ایک مکھی ناک پر نازل ہوتی ہے۔ مکھی کو فنا کرنے کی بے پناہ خواہش دل میں پیدا ہوتی ہے۔ لیکن سارجنٹ سے آنکھ بچانا "کراما" کاتبین سے آنکھ بچانا ہے۔ مکھی پر دست درازی کا خیال آتا تو سارجنٹ گویا ہاتھ ہلانے کے خیال ہی کو دیکھ لیتا ہے اور چلا اٹھتا ہے۔ "مکھی مت مارو۔" ہاتھ وہیں کا وہیں سوکھ جاتا ہے اور مکھی نہایت اطمینان سے ناک کے نشیب و فراز کا معائنہ کرتی ہے۔ ایسے اشتعال انگیز حالات میں بے حرکت کھڑے رہنا صحیح معنوں میں نفس کشی تھی۔ اس وقت زندگی کی واحد خواہش صرف اتنی ہوتی ہے کہ کب ڈرل ختم ہو اور جی بھر کر ناک اور کان کھجائیں اور جب ڈرل ختم ہوتی اور ہم بلاخوف تعزیر کانوں کو چھو سکتے اور مکھی اڑا سکتے تو ہمیں محسوس ہوتا کہ کان کھجانا اور مکھی اڑانا بھی کس قدر عظیم عیاشی ہے۔

(کرنل محمد خان کی کتاب "بجنگ آمد" سے اقتباس)

صدف عبداللہ۔۔۔ لاہور

مہنگائی

ایک اجنبی کسی عورت کے پیچھے کپڑوں کی دوکان میں داخل ہوا۔ یکایک عورت نے ایک چیخ ماری۔ اجنبی فوراً دوکان سے نکل بھاگا مگر بھاگتے ہوئے ایک پولیس والے کے ہاتھوں پکڑا گیا۔ تلاشی لینے پر پتا چلا کہ وہ سمگلر تھا اور پولیس کو ڈکیتی کی ایک واردات میں اس کی تلاش تھی۔

دوکاندار نے عورت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"محترمہ اگر آپ نہ چیختیں تو میں لٹ جاتا مگر آپ نے یہ کیسے جانا کہ وہ ڈاکو ہے؟" عورت نے جواب دیا۔

"میں تو اس نگوڑے کو جانتی بھی نہیں' میں تو ساڑھی کی قیمت سن کر چیخی تھی۔"

عروج۔۔۔ لاہور

سیاست کہیں جسے

ایک کمیونسٹ صدر نے اپنے کمیونسٹ وزیر اعظم سے پوچھا۔

"کامریڈ! تمہیں معلوم ہے کہ بلی کو مرچیں کیسے کھلانا چاہیے؟"

"بلی کو مرچیں کھلانے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔" وزیر اعظم نے جواب دیا۔

"ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اسے چاروں خانے چت کر دیا جائے پھر اس کے منہ میں مرچیں ٹھونس دی جائیں۔"

"یہ طریقہ ہمارے مسلک کے خلاف ہے۔ دشمن اخبارات شور مچائیں گے کہ ہم تشدد پسند ہیں اور کمزور کو اپنی طاقت کے بل بوتے پر دبا لیتے ہیں۔ دوسرا طریقہ بتاؤ۔"

"دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم مچھلی کے پیٹ میں مرچیں بھر دیں اور مچھلی کو بلی کے سامنے ڈال دیں۔ وہ خود ہی ہنسی خوشی مچھلی کو ہڑپ کر جائے گی۔"

"دنیا ہمیں پہلے ہی فریبی اور دھوکے باز کہتی آرہی ہے کامریڈ' بلی کو مرچوں بھری مچھلی کھلائی تو اور زیادہ بدنامی ہوگی۔ ایسا طریقہ بتاؤ جس پر عمل کرکے ہم بلی کو مرچیں بھی کھلا دیں اور دنیا والے بھی ہم پر انگشت نمائی نہ کر سکیں۔"

"مجھے تو بس یہی دو طریقے آتے ہیں۔"

"کیوں ہار مانتے ہو؟"

"ہاں۔۔۔ ہار مانتا ہوں۔" صدر نے کہا۔

"دیکھو کامریڈ انسان کی آنکھوں میں مرچیں جھونکنا یا بلی کو مرچیں کھلانا ایک ہی طریقے سے ممکن ہے۔ بلی کی دم پر پسی ہوئی مرچوں کا لیپ کر دو۔ وہ اپنی رضا اور خوشی سے ساری مرچیں چاٹ لے گی اور انسان کے ہاتھ میں مساوات فیکٹری کی پسی ہوئی مرچوں کا ڈبا تھما دو' وہ رغبت اور چاؤ سے پورا ڈبا اپنی آنکھوں میں جھونک لے گا۔"

اقراء۔۔۔ کوئٹہ

پاس داری

ایک دفعہ ٹریفک کانسٹیبل نے ایک موٹر سائیکل سوار کو روکا اور کہا۔ "ایک موٹر سائیکل پر دو سواریاں کیوں بٹھائی ہیں۔ چلو نام لکھواؤ تاکہ تمہارا چالان کیا جاسکے۔" موٹر سائیکل سوار نے کہا۔

"میں وکیل ہوں اور قانون کے مطابق ایک موٹر سائیکل پر دو سواریاں سفر کر سکتی ہیں۔" اس پر کانسٹیبل نے کہا۔

"اچھا۔۔۔ تم وکیل ہو۔۔۔ تو چلو جاؤ۔۔۔ معاف کیا۔" اس کے بعد کانسٹیبل نے ایک اور موٹر سائیکل کو روکا جس پر ایک ہی شخص سوار تھا اور کہا۔

"موٹر سائیکل پر دو سواریوں کی اجازت ہے۔ تم ایک کیوں جارہے ہو؟۔۔۔ چلو چالان کراؤ۔"

امبرین اسلم۔۔۔ کراچی

تعارف

ایک فرانسیسی نے اپنے بچوں کے بارے میں ایک دوست کو بتایا۔

"میرا بڑا لڑکا سیاستدان ہے اور دوسرا لڑکا بھی خبطی ہے۔ تیسرا لڑکا بینک میں کام کرتا ہے اور چوتھا بھی جیل میں ہے۔ پانچواں پادری ہے اور چھٹے کو بھی عبادت سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

انجم۔۔۔ کراچی

کرسی کے فائدے

یہ کیا ہے؟ یہ کرسی ہے۔ اس کے کیا فائدے ہیں؟ اس کے بڑے بڑے فائدے ہیں۔ اس پر بیٹھ کر قوم کی "بے لوث" خدمت بہت اچھی طرح کی جاسکتی ہے' اس کے بغیر نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے جب لوگوں میں قومی خدمت کا جذبہ زور مارتا ہے تو وہ کرسی کے لیے لڑتے ہیں' بلکہ کرسیوں کے لیے لڑتے ہیں اور ایک دوسرے پر اٹھا کر پھینکتے ہیں۔

کرسی بظاہر لکڑی کی بڑی معمولی چیز ہے' مگر لوگوں میں اخلاق حسنہ پیدا کرتی ہے۔ بڑے بڑے پائے خان جب اس کے سامنے آتے ہیں تو خودی کو بلند کرنا بھول جاتے ہیں' اسے جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ اگر کوئی نہ بھی بیٹھا ہو تو تب بھی سلام کرتے ہیں۔

(ابن انشاء کی "اردو کی آخری کتاب" سے اقتباس)

شمائلہ۔۔۔ کراچی

پریشانی

دو روحیں آسمان پر پرواز کر رہی تھیں۔ ایک روح بار بار آہ بھر رہی تھی۔ دوسری روح نے اس کی بے چینی دیکھ کر پوچھا۔

"کیا بات ہے' کیوں پریشان ہو؟" پہلی روح نے کہا۔

"میرے دوست! نیچے زمین پر میری بیوی شدید بیمار ہے' اس کی حالت خاصی تشویشناک ہے۔" دوسری روح بولی۔

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے' تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ وہ بہت جلد تمہارے پاس آجائے گی؟" پہلی روح نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔ اسی لیے تو میں اتنا پریشان ہوں۔"

شافعہ اعوان۔۔۔ کراچی

☼ ☼

کرن کا دسترخوان

خالدہ جیلانی

اٹالین نوڈلز بیف کباب

اجزا :

گائے کا گوشت (بوٹی)	آدھا کلو
لہسن، ادرک (پیسٹ)	دو کھانے کے چمچے
لال مرچ (کٹی ہوئی)	حسبِ ذائقہ
ہلدی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
سیاہ مرچ پاؤڈر	حسبِ ذائقہ
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسبِ ذائقہ
سویا سوس	ایک کھانے کا چمچہ
ایگ نوڈلز (ابلے ہوئے)	آدھا کپ
چلی سوس	ایک کھانے کا چمچہ
اویسٹر سوس	ایک چائے کا چمچہ
آلو (ابلا ہوا)	ایک عدد
چائنیز نمک	آدھا چائے کا چمچہ
انڈے (پھینٹ لیں)	چار عدد
بریڈ کرمبز	دو کپ
تیل	ڈیپ فرائی کے لیے

ترکیب :

پتیلی میں گوشت کی بوٹیاں، لہسن، ادرک کا پیسٹ، کٹی لال مرچ، ہلدی پاؤڈر، سیاہ مرچ پاؤڈر، لیموں کا رس، نمک، سویا سوس، چلی سوس، اویسٹر سوس اور دو گلاس پانی ڈال کر گوشت گلا کر پانی سکھا لیں۔ کڑاہی میں تھوڑا تیل ڈال کر گوشت، ایگ نوڈلز اور آلو ڈال کر اچھی طرح فرائی کریں تاکہ کچا پن نہ رہے۔ اسے ٹھنڈا کر کے اچھی طرح میش کر لیں۔ اس میں سیاہ مرچ پاؤڈر، سرخ مرچ، چائنیز نمک شامل کر دیں۔ ضرورت ہو تو نمک کا استعمال کریں۔ چوپر میں نہ پیسیں بلکہ ہاتھ سے گوشت کے ریشے کر لیں۔ آلو اور نوڈلز کو اچھی طرح مکس کر کے تھوڑے لمبے اور گول شیپ کے کباب بنا لیں۔ اسے پھینٹے ہوئے انڈے میں ڈپ کر کے بریڈ کرمبز میں اچھی طرح کوٹ کر دیں۔ تھوڑی دیر فریج میں رکھیں اس کے بعد گرم تیل میں ڈیپ فرائی کریں۔ ٹماٹر کیچپ اور چٹنی کے ساتھ سرو کریں۔

فرائیڈ چکن بوٹی

اجزا :

چکن (بون لیس) (گول بوٹیاں کاٹ لیں)	دو عدد
نمک	حسبِ ذائقہ
میدہ	ایک کپ
سفید مرچ پاؤڈر	حسبِ ذائقہ
کارن فلور	دو کھانے کے چمچے
مسٹرڈ پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
چاول کا آٹا	ایک کھانے کا چمچہ
لہسن پاؤڈر	چوتھائی چائے کا چمچہ
چکن پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
انڈا	ایک عدد
تیل (تلنے کے لیے)	حسبِ ضرورت

ترکیب :

بوٹیوں کو کوکنگ ہیمر یا بیلن سے پھیلا لیں اور اس پر چھری سے نشان ڈال کر نمک، سفید مرچ پاؤڈر، مسٹرڈ پیسٹ، لہسن پاؤڈر، چکن پاؤڈر اور انڈا لگا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ ایک پیالے میں میدہ، کارن فلور، چاول کا آٹا اور سفید مرچ پاؤڈر ڈال کر مکس کر دیں۔

گوشت کو میدے کے مکسچر میں اچھی طرح لگائیں اور درمیانی آنچ پر آئل گرم کر کے اس میں گولڈن ہونے تک فرائی کریں۔ ٹشو پر نکال لیں اور سلاد گارلک سوس کے ساتھ سرو کریں۔

بیف رائس میکرونی ویجی ٹیبل

اجزا :

گوشت کی بوٹیاں (ابلی ہوئی)	250 گرام
گاجر (گول کاٹ لیں)	ایک عدد
زوکنی یا تری (گول کاٹ لیں)	ایک عدد
نمک	حسبِ ذائقہ
سیاہ مرچ (کٹی ہوئی)	ایک چائے کا چمچہ
لہسن کے جوے (چوپ کر لیں)	دو عدد
تیل	تین کھانے کے چمچے
چاول (ابلے ہوئے)	ایک کپ
میکرونی (ابلی ہوئی)	ایک کپ
سرکہ	ایک کھانے کا چمچہ
سویا سوس	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب :

ایک سوس پین میں تیل گرم کریں۔ اس میں گاجر زوکنی یا تری اور لہسن ڈال کر فرائی کریں۔ اس کے بعد اس میں گوشت ڈال کر ہلکا سا فرائی کریں۔ چاول، میکرونی، نمک، سیاہ مرچ، سرکہ، سویا سوس ڈال کر مکس کر کے دو منٹ تک دم پر رکھیں سرو کریں۔

اسپائسی چکن میکرونی

اجزا :

میکرونی	آدھا پیکٹ
مرغی کا گوشت (ابلا ہوا)	ایک کپ
نمک	حسبِ ذائقہ
لال مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
تیل	تین کھانے کے چمچے
لہسن (چوپ کیا ہوا)	ایک کھانے کا چمچہ

ہری پیاز (چوپ کی ہوئی)	آدھا کپ
گاجر (کش کرلیں)	ایک عدد
سویا سوس	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب:

میکرونی کو ابال کر چھان لیں۔ گوشت کے ریشے کر کے اس میں نمک اور لال مرچ پاؤڈر ملا دیں۔ تیل میں لہسن ڈال کر فرائی کریں۔ اس کے بعد اس میں ہری پیاز اور گاجر ڈالیں ایک منٹ کے بعد میکرونی اور گوشت ڈال کر مکس کریں۔ آخر میں سویا سوس ڈالیں مکس کر کے پلیٹ میں نکال لیں اسپائسی چکن میکرونی تیار ہے گرم گرم سرو کریں۔

نوڈلز فرائیڈ رائس

اجزا:

نوڈلز	ایک پیکٹ
مٹر (ابلے ہوئے)	ایک کپ
گاجر (کیوبز میں کٹ کرا لیں)	ایک کپ
بند گوبھی (کٹی ہوئی)	آدھا کپ
نمک	حسب ذائقہ
شملہ مرچ (کٹی ہوئی)	ایک کپ
ٹماٹو سوس	آدھا کپ
آلو (ابلے ہوئے)	دو عدد
سرکہ	ایک کھانے کا چمچہ
ثابت لال مرچیں	سات عدد
چلی سوس	ایک کپ
سفید مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت
ہری پیاز (کاٹ لیں)	ایک کپ
چاول	ایک کلو

ترکیب:

نوڈلز کو ایک کھانے کا چمچہ تیل اور ایک چائے کا چمچہ نمک ڈال کر ابال لیں اور پانی نتھار لیں چاول صاف کر کے پندرہ سے بیس منٹ کے لیے بھگونے کے بعد ابال لیں۔ آلو تھوڑے موٹے موٹے کاٹ لیں۔ ایک سوس پین میں تیل گرم کریں اس میں باری باری بند گوبھی اور شملہ مرچ ڈال کر فرائی کریں۔ آلو' مٹر اور گاجر فرائی کریں اس کے بعد اس میں نوڈلز بھی ڈال کر فرائی کرلیں۔

ایک دیگچی میں تیل گرم کریں اس میں ہری پیاز فرائی کر کے اس میں چلی سوس' ٹماٹو سوس' سرکہ' ثابت لال مرچیں' سفید مرچیں اور نمک ڈال کر مکس کریں اور ڈیڑھ کپ پانی ڈال کر دو سے تین مرتبہ جوش دیں۔ اس میں پہلے سے ابلے ہوئے چاول ڈالیں اور حسب ضرورت پانی ڈال کر ہلکے ہاتھ سے مکس کرلیں اور دم پر لگا دیں۔ مزے دار نوڈلز فرائیڈ رائس تیار ہے۔ سلاد اور دھنیے' پودینے کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

☼ ☼

ہماری مصنفہ فوزیہ یاسمین کے ہاں گزشتہ ماہ ایک پیاری سی بیٹی کی ولادت ہوئی ہے۔ ادارہ کرن انھیں اس موقع پر مبارک باد پیش کرتا ہے۔
فوزیہ یاسمین اپنی ان ہی خوش گوار مصروفیات میں "دست کوزہ گر" کی بائیسویں قسط تحریر نہیں کرسکیں قارئین ان شاءاللہ آئندہ ماہ ان کی تحریر پڑھ سکیں گے۔

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ ۱۹۷۸ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں ۱۹۹۱ء کے شمارے کے سوال وجواب شائع کیے جارہے ہیں۔

ذوالقرنین

شاہینہ رباب۔۔۔ جھنگ

س ذوالقرنین جی! آخر یہ تمام لڑکیاں آپ کے اور آپ کی شرٹ کے پیچھے کیوں پڑگئی ہیں؟
ج انہیں ہماری کفایت شعاری سے چڑ ہے اس لیے شرٹ کے پیچھے پڑگئی ہیں البتہ میرے پیچھے پڑنے والی اطلاع غلط ہے۔

مانو۔۔۔ جہلم

س اگر آپ کو بلب پھونکوں سے بجھانا پڑے تو آپ کیا کریں گے؟
ج بس اتنی سی بات بی بی ذرا تکلیف کرو اور سوچ آف کرو تب سمجھ میں آجائے گا کہ ہم کیا کریں گے۔
س اگر آپ کو اپنی سالگرہ پر کیک کاٹنے کے بجائے تربوز کاٹنا پڑے تو؟
ج تربوز کاٹنے کے لیے آپ کو بلوالیں گے جہلم سے۔

شفق شہزاد۔۔۔ کراچی

س کیوں ذوالقرنین صاحب آپ کے بھی منہ کو لگ گئی؟
ج بھئی کیا لگ گئی منہ کو؟ بس وہ کرتی رہتی ہو اپنا کنفیوز۔

شفق سلطان۔۔۔ منچن آباد

س چنگیا کے نینو اجلدی سے بتاؤ عید کیسی گزری؟
ج بھلا ہو تمہارا' تمہاری دعاؤں سے اچھی گزری اپنی عید تم اپنی سناؤ۔

تمکین زیدی۔۔۔ کراچی

س اب تک آپ کیسا محسوس کررہے ہیں اپنے آپ کو اس محفل صنف نازک میں؟
ج خوش باش ٹھیک ٹھاک البتہ اس محفل صنف نازک میں آپ لوگوں کو کھٹک رہا ہوں۔

ممتاز کنول۔۔۔ کراچی

س جلدی سے بتایئے اپنی آخری خواہش کہ ہمیں بے پناہ غصہ آگیا ہے اور ہم جوڈو کراٹے سیکھ رہے ہیں؟
ج آپ سے پہلے بھی کسی نے پوچھی تھی ہماری آخری خواہش۔ تعجب ہے اس کے بعد بھی آپ پوچھ رہی ہیں۔
س کیا ہمارے خطوں میں بہت غذائیت ہوتی ہے جو آپ انہیں ہضم کرجاتے ہیں؟

ج بی بی! آج کل غذائیت تو خالص گھی میں بھی نہیں ہوتی۔

مسرت جبیں قادری۔۔۔ جلال پور

س عورت زندگی میں سب سے زیادہ کس چیز کی تمنا کرتی ہے؟
ج بے پناہ کماؤ شوہر کی۔
س عورتوں سے اگر غلطی ہوجائے تو وہ سجدے میں گرجاتی ہیں کیا مرد بھی ایسا کرتے ہیں؟
ج تو آپ کا کیا خیال ہے مردوں کا خدا دوسرا ہے جو انہیں غلطی کی سزا نہیں دے گا۔

افشاں سہیل اکرام۔۔۔ سندھ

س لڑکیوں نے بال کٹوالیے۔ لڑکوں نے بڑھا لیے کچھ عرصہ بعد میرا خیال ہے لڑکیاں' لڑکوں کے گھر بارات لے کر جائیں گی۔ نینی جی آپ کا کیا خیال ہے؟
ج پھر تو وارے کے نیارے ہوں گے لڑکوں کے کہ لڑکیاں خود چل کر گھر آیا کریں گی اور کسی ظالم سماج کا خوف نہ ہوگا۔

سیمیں اسعد۔۔۔ کراچی

س بھئی میں نے سنا ہے کہ تم نے پنجو نمبر 14' اپنے لیے بک کرالیا ہے؟
ج مگر تم نے وہ پنجو کیوں چھوڑا۔

نسرین سکندر۔۔۔ لطیف آباد

س خوب صورت مرد بد صورت عورت سے شادی کیوں نہیں کرتا؟
ج اس کی مرضی' بھئی مرد کی ویلیو زیادہ ہے ہر جگہ کھپ جاتا ہے۔ اپنی باری پر وہ انتخاب ذرا زوردار کرتا ہے۔

توحید صدیقی۔۔۔ کراچی

س انسان اپنی ناکامی کی وجہ اپنی تقدیر کو کیوں ٹھہراتا ہے؟
ج بھئی! بزدل انسان ہمیں قطعی پسند نہیں۔
س نینی جی! خواہشات کی انتہا کہاں ہوتی ہے؟
ج کوئی انتہا نہیں' نہ ہی پابندی' جتنی چاہے خواہشات کرو۔

رضیہ نادر۔۔۔ جلال پور جٹاں

س عورتوں کو ناقص العقل کیوں کہا جاتا ہے؟
ج کیا آپ نے اپنے نام کے ساتھ لیڈی ڈاکٹر لکھنا چھوڑ دیا ہے۔

راحیلہ عتیق۔۔۔ روہڑی

س لڑکی کے سر سے دوپٹہ کیوں اتر جاتا ہے؟
ج اچھا تو آج کل لڑکیاں گلے میں جو رسی ڈالے پھرتی ہیں وہ سر سے اتر جاتی ہے اور آپ اسے دوپٹہ کہتی ہیں۔

خالدہ کوثر۔۔۔ لاہور

س بچے سے جوان' جوان سے بوڑھا اور بوڑھے سے؟
ج کچھ کہتے ہیں پھر بچہ' کچھ کہتے ہیں کہ اللہ میاں کی عدالت میں پیشی ہوتی ہے۔

شاہدہ انجم۔۔۔ نامعلوم

س بزم میں پہلی بار شرکت کررہی ہوں اور آپ مجھے خوش آمدید نہیں کہیں گے؟
ج آیئے! آیئے تشریف لایئے۔ کہیے کیسے آنا ہوا۔

ناظمہ انوار۔۔۔ فیصل آباد

س آپ خود کو شہزادہ گلفام سمجھتے ہیں کیا؟
ج نانا' گلفام کا شہزادہ سمجھتا ہوں۔

عابدہ صفدر لودھی۔۔۔ گوجرانوالہ

س بڑھتی ہوئی مہنگائی کے بارے میں آپ نے کیا سوچا؟
ج جو آپ نے سوچا۔

☼ ☼

مبشرہ ناز — نامعلوم

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گی اور دعا ہے کہ اللہ پاک آپ کو ہمیشہ صحت مند اور خوش و خرم رکھے (آمین) سب سے پہلے تو ماہنامہ کرن اور پورے اسٹاف کو نیا اسلامی اور عیسوی سال بہت مبارک ہو۔ ہماری دعا ہے کہ خدائے برتر اس نئے سال میں بھی اسے مزید بلندیوں اور کامیابیوں سے نوازے۔

کئی ماہ گزر گئے۔ کئی بار سوچا کہ اس بار کرن میں حاضری لگوا دینی چاہیے مگر آپ کی بے رخی اور خطوط کے معاملے میں اصول و ضوابط دیکھ کر ہمارے حوصلے دم توڑ گئے کیونکہ ہم یا تو مختصر لکھ سکتے ہیں یا جامع کہ ہمیں دونوں الفاظ ایک دوسرے کے متضاد لگتے ہیں مختصر لکھنے کے لیے بہت سوچنا پڑتا ہے۔ الفاظ ترتیب دے کر جملے مرتب کرنے پڑتے ہیں اور ان میں ربط بھی بحال رکھنا ہوتا ہے۔ آج کرن کے سال نو میں شرکت کرنے کے لیے حاضر ہیں اور کرن سے پہلا تعارف اور آج تک اس سے جڑے رہنے کی وجہ بیان کرنے کا ارادہ کیا ہے۔

کرن سے پہلا تعارف نبیلہ ابر راجہ کے ناول "زرد زمانوں کا سویرا" کے ذریعے ہوا جو آج تک قائم ہے اور اس کے قائم رہنے میں جہاں آپ کی محبت اور اسٹاف کی محنت شامل ہے وہیں ہماری ان رائٹرز کا بھی ہاتھ ہے جو پاکستان کے ہر کونے میں رہنے کے باوجود اپنی تحریروں سے نا صرف ہمارے دلوں پر راج کر رہی ہیں بلکہ اپنے قلم کے ذریعے شہرت کی بلندیوں کے ساتھ ہماری محبتوں کو بھی ہر ماہ سمیٹتی ہیں کرن کی سب سے بہترین خوبی یہ ہے کہ یہ رائٹرز کے لیے اکیڈمی کا بھی درجہ رکھتا ہے وہ تمام رائٹرز جو کرن کے ساتھ شعاع اور خواتین ڈائجسٹ کی بھی ضرورت اور پسندیدگی کی فہرست میں شامل ہیں کرن ان کے لیے یقیناً "ماں کی گود کی طرح پہلی درسگاہ ثابت ہوا جن میں سرفہرست عمیرہ احمد' فرحت اشتیاق' عنیزہ سید' ثروت بخاری' نمالیہ بخاری' نبیلہ عزیز و نبیلہ ابر راجہ' سعدیہ عزیز آفریدی اور دیگر نام جو تحریر نہ ہو سکے کرن ان کے لیے حقیقتاً "شہرت کی بلندیوں پہ پہنچنے کے لیے پہلا قدم' پہلی سیڑھی ثابت ہوا اور آج مزید نئے لکھنے والوں کے لیے بھی اکیڈمی کا کام کر رہا ہے دعا ہے کہ قلم کے مسافروں کو ان کی منزل تک پہنچانے کے لیے اس راہ خضر کو خدائے عزوجل مزید کامیابیوں اور بلندیوں سے نوازے (آمین)

اب تبصرہ کریں گے اس ماہ کے شمارے پر۔ اس ماہ ٹائٹل بے حد خوب صورت تھا ویسے (آپس کی بات ہے) کرن کا ٹائٹل ہمیشہ ہی بہت اچھا ہوتا ہے۔ مگر اس ماہ ٹائٹل واقعی دل نشین تھا۔ حمد و نعت پڑھنے کے بعد سیدھے فوزیہ یاسمین کے ناول کی طرف بڑھ گئے "دست کوزہ گر" اب ان ہی دنوں دست طلب بنتا جا رہا ہے۔ دوسرا سلسلے وار ناول "وردل" نبیلہ عزیز کا بہت زبردست ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ ناول نبیلہ عزیز کے دیگر ناولز کی طرح بہترین ہوگا — ویسے بھی نبیلہ عزیز میری پسندیدہ رائٹر ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ان کا ناول زبردست نہ ہو۔

مکمل ناولز اور ناولٹ بھی بہت بہترین تھے جبکہ "یادوں کے دریچے" میں اپنے پسندیدہ شعرا کرام کا نام دیکھ کر دل خوش ہو گیا جس کے لیے میں خصوصی طور پر "بشریٰ محمود" کا شکریہ ادا کروں گی۔

خط لکھنے کی اصل وجہ سال نو میں شرکت کرنے کے علاوہ میری تحریر "متاع ذات" ہے جو میں آج پورے ایک سال بعد آپ کے معیار کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھیج رہی ہوں۔

مجھے امید ہے کہ آپ میری تحریر کو پذیرائی بخش کے مجھے قلم کا حق ادا کرنے کا موقع ضرور دیں گی باوجود اس کے کہ میں کہانی کے سولہ سنگھار تو دور ابجد سے بھی واقف نہیں ہوں مگر بہت مان و یقین کے ساتھ آپ کو خط اور تحریر بھیج رہی ہوں کہ آپ اپنے دل کے ساتھ سال نو میں ضرور جگہ دیں گی۔ اس گزارش کے ساتھ کچھ باتوں کی معلومات اور اجازت چاہتی ہوں امید ہے آپ جواب ضرور دیں گی۔

میں نبیلہ عزیز کو خط لکھنا چاہتی ہوں اس کے لیے کیا طریقہ کار اختیار کرنا ہوگا۔

خط طویل ہونے کی معذرت چاہتی ہوں مگر محبت ہمیشہ بے حساب ہوتی ہے اور کرن سے ہمیں بے تحاشا و بے حساب محبت ہے۔

نواب زادی سومرو — تحصیل مورو سندھ

کچھ دکھ' کچھ بہت سی ان کہی اداسیاں اور کچھ ناقابل تلافی سی جدائیاں دے کر 2011 چلا گیا۔

اور اب سال نو دہلیز پہ آ کر بیٹھ گیا ہے' خدا کرے یہ سال ہمارے پیارے وطن اور ہمارے ہم وطنوں کے نام بہت سی خوشیاں اور امن کی نوید لے کر آئے۔ (آمین)

کرن اس بار جلدی ہی مل گیا تھا اور ٹائٹل بھی بہت پسند آیا تھا۔ سب سے پہلے تو آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے میری لکھی ہوئی نظم کو "کرن" میں جگہ دی شکریہ کرن ہاں البتہ میرا لکھا ہوا خط نظر نہیں آیا دسمبر کے رسالے میں جو کہ میں نے بہت پیارے تبصرے سے پر کر کے بھیجا تھا۔ خیر جانے دیں ہو جاتا ہے کبھی ایسا بھی دل کے ساتھ۔

سب سے پہلے نایاب جیلانی سے ملاقات کی جو کہ زیادہ مسرور نہ کر سکی کیونکہ اس قسط میں کوئی بھی خاص نوعیت کی بات بیان نہیں کی گئی' بس لگتا ہے کہ بے جا طول دیا جا رہا ہے کہانی کو بس زرجان کی حرکم سے جوڑی سوٹ ہو گی۔ مستقل ناولوں میں سے فوزیہ یاسمین کا ناول بہت اچھا جا رہا ہے۔

دوسرا مکمل ناول "مقید خاک" پڑھ تو لیا ہے البتہ لگتا ہے کہ کوئی جاسوسی اسٹوری تھی بس اب دوسری اور آخری قسط کا انتظار ہے کہ تاکہ پتا چلے کہ رائٹر نے پرزور الفاظ لکھ کر ہمیں ڈرانے کی جو کوشش کی تھی اس کا مطلب کیا نکلتا ہے۔

افسانے سارے ہی اچھے لگے' سب نے اپنے قلم کا فرض پورا کیا کسی ایک کا ذکر کرنا مشکل لگ رہا ہے۔ انٹرویو میں اپنی فیورٹ کی "نادیہ امین" کو پڑھ کر بہت اچھا لگا' بس ان سے عرض ہے کہ پلیز ٹائم نکال کر "کرن" کے لیے کوئی اچھا سا ناول لکھیں۔

اور اب "کرن" کی پرانی رائٹرز کے لیے عرض ہے یا تو آپ ان کی پرانی کہانیاں دوبارہ ہر ماہ کرن میں شائع کیا کریں یا پھر ان کو کہیں سے ڈھونڈ کر لائیں' خاص طور پر محترمہ نبیلہ ابرار راجہ' یاسمین نشاط اختر' شازیہ عطا' رخ چوہدری' فوزیہ فرخ' ایم افسر سلطانہ' میسا سراج' شائستہ جبیں' میسا مناف اور بہت سی ہماری پیاری رائٹرز کی یادگار تحریریں ہم دوبارہ پڑھنا چاہتے ہیں پلیز ریحانہ جی! اس عرض کو ضرور سوچ کا پیراہن دے کر ہمیں خوش کر دیجیے گا۔

کرن میں شاعری کے حوالے سے بھی اچھا اور انوکھا سلسلہ شروع کریں تاکہ یا تو نئے لکھنے والے منظر عام پر آسکیں یا پھر ہمارے وطن کے نامور شعراء کرام کے کلام سے ہمیں ملاقات کا موقع ملے۔

امبر گل آپ کے دکھوں کا پڑھ کر بہت دکھ ہوا ہم تو جانتے تک نہیں تھے کہ گزشتہ عرصے میں آپ پر کیا بیت چکی ہے اللہ آپ کو ہمت اور حوصلہ دے۔ ہم سب کی دعائیں اور محبتیں امبر آپ کے ساتھ ہیں۔ کرن کے لیے ڈھیروں دعائیں اور پیار بھرا سلام۔

فوزیہ ثمرٹ' نادیہ عمران — گجرات

انیس دسمبر کی ٹھٹھرتی اور اداس شام کو کرن ملا۔ سادہ سی ماڈل صاحبہ کی چوڑی والے ہاتھ اچھے لگ رہے تھے۔ ہمیشہ کی طرح حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پڑھ کر دل و دماغ معطر کیا۔

اس بار تو شاہین صاحب نے کمال ہی کر دیا ہے۔ انٹرویوز میں تمام کے تمام مہمان میری فیورٹ لسٹ میں ہیں۔ "منیر اعجاز" کمال کے اداکار ہیں۔ ڈرامہ مزاحیہ ہو یا سنجیدہ رول ہر کردار کو بخوبی نبھاتے ہیں۔ تنویر فاطمہ میں ایک حساس ماں کی حیثیت سے انہوں نے اپنی اعلیٰ اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ دو کا پہلا ہم سفر کے ہیرو اشعر "فواد خان" سے ملاقات اچھی رہی اور اس کم عمری میں شوگر کا مرض' افسوس ہوا۔ یہ سن کر اللہ پاک صحت کاملہ عطا فرمائے۔

"مجھ سے ملیے" نادیہ امین جی سے ملاقات اچھی رہی ان کے ابتدائی جملے بہت پسند آئے ایسی سوچ انسان کو ہر گناہ سے بچاتی ہے اور اپنے رب سے قریب رکھتی ہے۔ ان سے شکوہ ہے کہ اتنا کم کیوں لکھتی ہیں نئے سال میں ان کی بہت اچھے سے ناول کی امید ہے۔

ناول میں سب سے پہلے "اورے پیا" پڑھا۔ نایاب کی قسط بھی ایک ہی نقطہ پہ آ رکی ہوئی محسوس ہوئی۔ تھوڑا سا تیز کریں تاکہ ہمیں مونی کی زندگی کے راز و نیاز معلوم ہو سکیں۔ ارے یہ خوب صورت خیال ہمارے دماغوں میں کیوں نہیں آیا۔ محسن اور حانی کی جوڑی پرفیکٹ رہے گی۔ دونوں کول خوش مزاج طبیعت کے ہیں۔ فیضا بے چاری کے ساتھ اب کیا ہونے والا ہے۔ دونوں ماں بیٹی کی آزمائش ہی نہیں ختم ہو رہی ہے۔ سچ کہتے ہیں اللہ ہمیشہ اچھے لوگوں کو آزماتا ہے اور پلیز حریم کی خوشی کو اب کسی کی بھی نظر نہیں لگنی چاہیے۔

مکمل ناول "مقید خاک" ضوباریہ ساحر اس بار ایک منفرد ناول ڈھونڈا ہے۔ رات کے گیارہ بجے ایمرجنسی لائیٹ میں ناول شروع تو کر لیا لیکن اگر مجھے تھوڑا بھی علم ہوتا۔ اس بار ضوباریہ جی اس دہشت زدہ تحریر سے میری جان نکالنے والی ہیں تو کبھی بھی مقید خاک کو رات میں نہ پڑھتی۔ شکیل ظفر کی طرح میں بھی اپنی فطری تجسس کے باعث ناول کے ہیرو کے ساتھ مصر اہرام میں جا پہنچی کہ آخر ضوباریہ صاحبہ کہاں تک دل کو ہلا سکتی ہیں۔ اہرام کی جو ضوباریہ نے منظر کشی کی ہے۔ کیا یہ سب حقیقت میں ہے؟

باقی آخر میں نے ناول کا سارا مزا کرکرا کر دیا۔ اتنی اچھی تحریر میں یہ باقی آخرہ ذرا بھی اچھا نہیں لگتا۔ بہرکیف ناول مزے دار تھا۔ اب آگے دیکھتے ہیں ضوباریہ جی کیا کچھ دکھلاتی ہیں۔

ناولٹ "آتش دروں" اچھا کیا جو اینڈ ہو گیا۔ شائستہ بڑی بری فطرت کی نکلی۔ فرہاد کی زندگی تباہ کر دی۔ کیا ملا اسے ایسا کر کے مرد بھی تو سدا کا بے وقوف ہے۔ عظمی سے محبت کی شادی تھی اس کی اپنے ہنستے بستے گھر کو اجاڑ کے رکھ دیا۔ سچ ہے نیتوں کا دار و مدار عملوں پہ ہے اور مرد کی نیت بدلنے یا بدلنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔

"آماج" اچھی تحریر تھی۔ عجیب فطرت کی ہیروئن ڈھونڈی ہے روشنی بخاری نے اور کوئی ٹھوس وجہ بھی نہیں بتائی کہ شہزہ کیوں ایسی فطرت رکھتی ہے۔ شہزہ خالد گھر والے کا رتا ہے شاید بچ جاتی۔ مگر مسز جمالی کی ذہانت نے کام کر دکھایا اور جو کام پولیس کے افسر بھی نہ کر سکے۔ وہ شہزہ کے ایک جملے سے جمالی نے حل کر دیا ہے۔ افسانہ "محروم تعبیر" نے ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ کیا ایسا بھی ہوتا ہے۔ سعدیہ نے ازدواجی زندگی بچانے کے لیے اپنی آخرت تباہ کر لی۔ سنبل کا "بھرم" بھی اچھا رہا۔ یہ ہائی سوسائٹی کی لڑکیاں مڈل کلاس والوں کو کیا سمجھتی ہیں۔

"بول کہ لب آزاد ہیں"

یہ سلسلہ پھر سے شروع کیا ہے اچھا لگ رہا ہے۔ مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح لاجواب تھے "یادوں کے دریچے" میں خود کی غزل بہت پسند آئی۔

"تمہارے میرے نام" میں امبر گل آپ نے طویل عرصہ کے بعد خط لکھا۔ بہت افسوس ہوا آپ کی والدہ کا سن کر۔ اللہ پاک ان کی مغفرت کرے اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ یہ مائیں بڑی ہی صبر والیاں ہوتی ہیں۔ بیٹوں کے ہر دکھ سکھ کو اپنی صبر کی چادر میں چھپانے والی ہر لمحہ ہر پل اپنی اولاد کو دعاؤں کے حصار میں رکھتی ہیں۔ اللہ پاک سب کی ماؤں کی عمر دراز کرے (آمین)

اپنی دعاؤں میں ہمیشہ میرا بھی حصہ رکھیے کہ مجھے دعاؤں کی بہت ضرورت ہے۔

ثمرین حبیب..... ٹمین واٹر

ادارہ کرن کے اسٹاف تمام رائٹرز اور سب قارئین کو نیا سال مبارک ہو۔ بہت عرصے بعد قلم اٹھایا اور بقول شاعر

لکھنے والے ہی جان سکتے ہیں
لفظ لکھنے میں جو قیامت ہے

اتنے عرصے بعد کرن میں شرکت کر رہی ہوں زندگی کے گزرے پانچ سالوں میں بہت کچھ سہا ماں جیسی بھابھی کی جان لیوا بیماری نے سب کو جیسے ایک بند کمرے میں لا کھڑا کیا تھا۔ ان کی صحت پانی ایک معجزہ ہے میرے رب کا جتنا شکر کریں کم ہے۔ مما کو گردوں کا مسئلہ ہے جس کی وجہ سے میری مما نامل بیمار ہیں (دعا کیجیے کہ میری مما کی تکلیف دور ہو جائے) بجو کی شادی اور صرف تین ماہ میں وہ شادی ختم دنیا اندھیر ہو گئی تھی جیسے کوئی راہ دکھائی نہ دے رہی تھی۔

گزرتے وقت نے ہر دکھ ہر زخم پہ مرہم رکھا اور حالات جیسے بھی رہے "کرن" نے ہمیشہ مجھے کچھ پل کی ہی خوشی ضرور نصیب کی بہت بار دل چاہا کہ خط لکھوں۔ تبصرہ کروں لیکن ایسی سستی آڑے آتی رہی۔ مگر اس دفعہ قلم اٹھا ہی لیا۔ تبصرہ حاضر ہے۔ نبیلہ جی نے اس دفعہ بہت مختصر لکھا ہے۔ بہت تشنگی سی محسوس ہوتی رہی۔ "اورے پیا" مونی کی حالت اور انکشافات اف عجیب سی کیفیت ہو رہی پڑھ کر۔ حریم پہ مجھے کبھی کبھی بہت ترس آتا ہے۔ میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ حریم کو بہت بڑی آزمائش کا سامنا ہو گا آنے والے دنوں میں مونی کی باتیں نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ نایاب ایک درخواست ہے "ماہیر" کو مت ماریے گا۔

ضوباریہ ساحر کا "مقید خاک" مکمل ہو جائے تو ہی کچھ کہا جا سکتا امید ہے آپ بھی بہت اچھا اضافہ ہوں گی ہماری بہترین لکھاریوں کی صف میں۔ صباحت جی خوش آمدید افسانہ اچھا لگا۔

"بول کہ لب آزاد ہیں" حرا رشید کیا بولیں جناب میرے دل کی باتیں آپ نے اپنے قلم سے کہہ دیں۔ بہت بڑا المیہ ہے یہ ہمارا "آزاد...؟ (سوالیہ نشان اس لیے کہ کیا واقعی آزاد ہے ہمارا میڈیا) میڈیا بہت بہت مبارک ہو۔

سردیوں کے حوالے سے کوئی خاص تحریر نظر نہیں آئی۔ جس میں ذکر ہوتا بھی ٹھٹھرتی شاموں کا دھند کا آنچل اوڑھے نیلی صبحوں کا کچھ لٹریچر کا ڈرائی فروٹس کا اور چستی بھرتی جسموں میں بھاپ اڑاتی چائے کا کچھ نرم چمکیلی دھوپ میں کھٹے میٹھے مالٹوں کا ذائقہ منہ میں گھلاتی تحریر پلیز کچھ لکھوائیں ہماری رائٹرز سے ایسا اب اجازت دیں انتظار رہے گا اپنے خط کا کرن میں۔

نامعلوم.....

تمام قارئین اور کرن کے اسٹاف کو دلی سلام۔ میں کرن کی محفل میں پہلی دفعہ شرکت کر رہی ہوں اور مجھے اپنے پیارے کرن سے پوری امید ہے کہ وہ میرے لیے تھوڑی سی جگہ تو ضرور نکال لے گا۔

کرن ماشاء اللہ ایک معیاری پرچہ ہے۔ ہم نے پچھلے سال لگوایا اور اب باقاعدگی سے پڑھتی ہوں۔ تمام رائٹرز عمدہ تحریر لکھتی ہیں۔ فوزیہ یاسمین نبیلہ عزیز نبیلہ ابر راجہ آمنہ ریاض نایاب جیلانی اور آپی نازیہ کنول نازی میری موسٹ فیورٹ رائٹرز ہیں۔ آتی ہوں تبصرہ کی طرف تو "دردل" اور "دست کوزہ گر" کرن کی جان ہیں۔ کیا زبردست ناولز ہیں پڑھ کر بہت لطف آتا ہے۔ بندہ ایک دم فریش ہو جاتا ہے۔

"دست کوزہ گر" آپی اتنی باریکی اور شائستگی سے لکھتی ہیں کہ مزا آ جاتا ہے۔ ابرار بھائی اتنے سفاک ہیں کیا شاطرانہ چال چلی ہے انہیں اپنے اسٹیٹس کا خیال ہے۔ بمن سے زیادہ بے چاری رومیلہ کو اب معلوم نہیں کیا کیا بھگتنا پڑے گا۔ سنبل اور الیان کے کریکٹر مجھے زیادہ پسند ہیں۔ سنبل اب نئے جھگڑے کو ہوا دے رہی ہے۔ زوبیہ کی طرف سے ابھی شائستہ خالہ کا بھید ابھی کھلنے کو ہے۔

اب آتی ہوں پیاری آپی نبیلہ عزیز کے ناول "دردل" کی طرف۔ کیا خوب چل رہی ہے کہانی یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے ہم بھی ٹرپ کا حصہ ہوں بہت انجوائے منٹ ہو رہی ہے۔ شہزادی علیزہ کے کیا کہنے.... دل آور شاہ منصور حسین اور عدیل کے کردار بہت اچھے لگ رہے ہیں دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے....؟ "اورے پیا" میں نایاب آپی بھی عمدہ طریقے سے رواں دواں ہیں۔ ناول پہلے کی نسبت اب زیادہ دلچسپ ہو گیا ہے۔ پرت در پرت کہانی کھل رہی ہے۔ مونی کا کردار نہایت پراسرار ہے کتنے رنگ ہیں۔ یوں لگ رہا ہے کہ حریم کو کوئی بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ شاید ماہیر..... معلوم نہیں آگے کیا کیا انکشافات ہوتے ہیں۔ مجھے سب سے زیادہ زرجان کا کریکٹر پسند ہے۔ کیا نائس بندہ ہے! کاش ہر بندہ زرجان بن جائے۔

"یادوں کے دریچے" میں الماس علی کی ڈائری میں سے ابن انشا کی نظم نے زیادہ متاثر کیا۔ "بول کہ لب آزاد ہیں" دو کا پہاڑا مجھ سے ملیے "کرن کرن خوشبو" بہترین سلسلے ہیں۔ بقیہ ناولٹ اور افسانے ابھی پڑھے نہیں تو تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔ ان شاء اللہ اگلے ماہ اس خط کی اشاعت کے بعد حاضری دوں گی۔ تب تک کے لیے اللہ حافظ اس دعا کے ساتھ اللہ کرن اور اس سے منسلک تمام افراد کو ترقی عطا کرے؟ (آمین)

ڈریم گرل..... فیصل آباد

مجھے کرن میں خط لکھنے پر مجبور کیا صرف "محروم تعبیر" نے صائمہ کا افسانہ پڑھ کر مجھے اتنا دکھ ہوا کہ رات کو نیند ہی نہیں آئی کہ ایک عورت ماں بننے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے۔ صائمہ نے بے اولاد عورتوں کو اپنا گھر بچانے کے لیے ایک غلط راستہ دکھایا ہے۔ سعدیہ نے اپنا گھر بچا لیا مگر آخرت.....؟ اس افسانے کے آخر میں صائمہ نے لکھا ہے

کہ "سعدیہ جب جب اپنے ارسلان کا چہرہ دیکھتی اسے اس کے معصوم چہرے میں ساگر بنگالی کا عکس دکھائی دیتا تو اس کے چہرے پر احساس جرم کی سیاہی پھیل جاتی۔" (افسوس)

میری تمام لکھنے والوں سے گزارش ہے کہ آپ کی کہانیاں سب عمر کی عورتیں پڑھتی ہیں۔ اس لیے ایسا لکھا کریں جو کمزور کو مضبوط بنائے۔ کسی کو گناہ کی طرف نہ لے کر جائے۔

صائمہ اگر آپ کو برا لگا تو سوری مگر پلیز نیکسٹ ٹائم ایسا نہ لکھنا۔

پلیز میرا خط ضرور شائع کریں آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔ اچھا اب اجازت دیں پھر حاضر ہوں گے۔

سحرش رشید۔۔۔ کراچی

میں پہلی بار کرن میں شرکت کر رہی ہوں کرن کے تمام سلسلے ہی بہت زبردست ہیں کرن کی تعریف گویا سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ میرے تمام گھر والے کرن کے دلدادہ ہیں۔ میں اپنی غزل بھیج رہی ہوں اس امید کے ساتھ کہ آپ اسے ضرور شائع کریں گی اور میری حوصلہ افزائی کریں گی۔ پلیز میرے خط کا جواب ضرور دیجیے گا۔

آخر میں کرن کے لیے صدق دل سے دعائیں کہ اللہ تعالیٰ کرن کو ہمیشہ اسی طرح کامیابی سے ہمکنار کرے۔ (آمین)

انیلا گل نوشین گل۔۔۔ ایبٹ آباد

خوب صورت رنگوں سے سجا کرن ڈائجسٹ خلاف توقع سترہ دسمبر کو ہی مل گیا۔ سب سے پہلے فوزیہ یاسمین کا "دست کوزہ گر" پڑھا۔ پلیز نمل اور خرم کا ہی جوڑ بنائیے گا۔ یہ دونوں ساتھ ساتھ بہت اچھے لگتے ہیں۔ اس کے بعد نبیلہ عزیز کے پاس پہنچے۔ علیزے کا منصور حسین پر غصہ کرنا بہت برا لگا۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ "آتش دروں" کو مکمل ناول کی صورت میں شائع کر دیتے تو زیادہ بہتر تھا۔ ویسے ہی تین ماہ انتظار کروا لیا۔ نایاب جیلانی تو تجسس میں مبتلا کر رہی ہیں غیب کے حوالے سے ناول بہت اچھا ہے۔

دوسرے مکمل ناول ضوباریہ ساحر کے "مقید خاک" میں تو سسپنس ہی سسپنس ہے۔ پہلی قسط تو بہت اچھی لگی اب پتا نہیں دوسری قسط کیسی ہوگی۔ ناولٹ سارے اچھے لگے۔ امبر گل کی والدہ کے بارے میں پڑھ کے دلی افسوس ہوا۔ ویسے ام مریم کا ناول ہمیں تو بہت پسند آیا۔ پتا نہیں باقی بہنوں کو کیوں پسند نہیں آیا۔ نیر اعجاز سے ملاقات اچھی رہی۔

آخر میں آمنہ ریاض کو زندگی کا نیا سفر شروع کرنے پہ ڈھیروں مبارک باد اور دعائیں۔

سمیرا عبدالغنی بٹ۔۔۔ در نجف لودھرے

کرن کے اسٹاف اور تمام قارئین کو نیا سال بہت مبارک ہو اللہ کرے یہ نیا سال ہمارے پیارے وطن کے لیے امن کا پیامبر بن کے آئے اور میری سوہنی دھرتی پہ چھائے اداسی کے تمام بادل چھٹ جائیں۔ (آمین)

کرن اٹھارہ دسمبر کو موصول ہوا ٹائٹل اچھا تھا۔ سب سے پہلے اپنا فیورٹ ناول "اور رے پیا" پڑھا نایاب جی اس ناول میں آپ نے اتنا سسپنس قدم قدم پہ رکھا ہے کہ ہم تو چکرا کر رہ گئے ہیں اور پلیز حریم کی تکلیفوں کو ختم کیجیے اور حریم کی ساس کا رویہ بدلنا کھٹکنے پہ جھٹکا دیتا ہے ویسے ناول ہے لاجواب۔ مسلسل ناولز میں "دردل" بازی لے گیا ہے اور "دست کوزہ گر" لگتا ہے اب اپنے اختتام کی طرف گامزن ہے۔ "آتش دروں" ناولٹ پہلی قسط سے کافی بورنگ لگا اینڈ اچھا لگا نازیہ جمال، روشنی بخاری، ملیحہ رفیق، سنبل کے ناولٹ بھی اچھے لگے اور ناول "مقید خاک" لاجواب تھا۔

افسانوں میں تینوں افسانے ٹھیک تھے اور جناب ہمارے فیورٹ نیر اعجاز سے ملاقات بہت پسند آئی اور نادیہ امین "مجھ سے ملنے" میں ہمیں شرف ملاقات بخش گئیں کرن کے تمام مستقل سلسلے لاجواب تھے۔ اب اجازت دیں آئندہ پھر حاضر ہوں گے۔

کلثوم آصف۔۔۔ فیض پور

ہم کرن کے سات سال سے قاری ہیں کرن کے سبھی سلسلے بہت اچھے اور زبردست ہوتے ہیں نایاب جیلانی کا ناول "اور رے پیا" ہمیں بہت پسند ہے۔ پلیز نایاب حریم کے ساتھ کچھ برا مت کیجیے گا۔ باقی تمام کہانیاں بھی بہت اچھی تھیں۔ ہم پہلی بار کرن کی محفل میں حاضر ہو رہے ہیں۔ پلیز میرا خط ضرور شائع کیجیے گا۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گی۔ اب اجازت دیں۔